جنوری 2014
کرن
سال نو مبارک
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

بیادِ ابنِ انشا

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---- 600 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 6000 روپے

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

جنوری 2014

جلد 36 شمارہ 10

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

آداب

جنوری 2014ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
لمحے گزرتے وقت نے ایک کیلنڈر تبدیل کیا۔
2013 رخصت ہوا اور 2014 کو ہم نے خوش آمدید کہا۔
ایک سال تمام ہوا اور ایک اور سال کے سفر کا آغاز ہوا۔
وقت اسی طرح رواں دواں رہتا ہے۔ روز و شب اسی طرح ماہ و سال میں ڈھلتے، صدیوں میں تبدیل ہوتے، قرنوں کا حصہ بنتے زمانوں کا روپ دھارتے ۔ ماضی کے بحرِ بیکراں میں غرق ہوتے رہتے ہیں۔
سالِ گزشتہ بہت سی تلخ یادوں اور واقعات کی طویل فہرست چھوڑ گیا ہے۔ معاشی بدحالی، خودکش بم دھماکے، امن و امان کے گمبھیر مسائل ۔ یہ سارے ناسور نہ صرف ہمارے وجود کو کھوکھلا کر رہے ہیں بلکہ دنیا میں ہماری رسوائی کا باعث بھی بن رہے ہیں۔ بے شک آج کی تکالیف ہمیں دکھ دے رہی ہیں لیکن آنے والے کل اور آئندہ برس کے ممکنہ دکھوں سے بچا جا سکتا ہے۔ ماضی میں رہ کر حال کو خراب نہیں کریں۔ طلوع ہونے والا سورج بہت سی امیدوں، آرزوؤں کا پیغام لے کر آتا ہے۔ ایک نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھیں۔ اپنی کوتاہیوں غلطیوں کا اعتراف کر کے ان کی اصلاح خلوصِ نیت اور سنجیدگی سے کریں۔ ضرورت صرف مثبت فکر اور سوچ کی صحیح سمت کے تعین کی ہے۔
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ موجودہ سال ہم سب کے لیے خوشیاں لے کر آئے۔
سالِ گزشتہ جن کٹھن لمحات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سال ان سے محفوظ رہیں۔ (آمین)
قارئین کرام کو سالِ نو مبارک۔

بیادِ ابنِ انشا،

ابنِ انشا دنیائے ادب کے شناور تھے۔ اردو شاعری اور مزاح کی تاریخ انشا جی کے بغیر نامکمل ہے۔ مزاح میں وہ صاحبِ طرز اسلوب کے مالک اور سفرناموں میں نئی طرز رکھنے والے انشا پرداز تھے۔ انشا جی کی شاعری میں آہوں کا دھواں اور درد کی گھلاوٹ ہے۔ چاند نگر کا یہ جوگی گو کہ ہمارے درمیان نہیں مگر وہ اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں آج بھی زندہ ہے۔
11 جنوری کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- بیادِ ابنِ انشا،
- "دل اور دھیان کی سیڑھیاں" سالِ نو پر قارئین سے دلچسپ سروے،
- "گزر گئے برس" معروف شخصیات سے گزرے سال کے حوالے سے شاہین رشید کے کچھ سوالات،
- حرا قریشی کے اس ماہ ۔ "مقابل ہے آئینہ"،
- اداکار فاعلی عباس کہتے ہیں "میری بھی سنیے"، "آواز کی دنیا سے" اس ماہ کرن کی مہمان ہیں "گلناز جاوید"
- نبیلہ عزیز اور فوزیہ یاسمین کے سلسلے وار ناول، فاخرہ گل، سعدیہ عزیز آفریدی اور آمنہ عنبرین کے مکمل ناول،
- ثنا یاسمین اور سحانہ امجد بخاری کے دلکش ناولٹ،
- حیا بخاری، میمونہ صدف، تمثیلہ زاہد، آسیہ ریاض اور کرن عابد کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،

کرن کتاب "دنیا میرے آگے" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ مفت پیشِ خدمت ہے۔ استفادہ کریں۔

حمد باری تعالیٰ
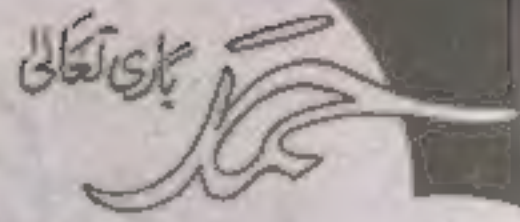
ترا حکم اس میں اگر نہ ہو
کسی رات کی بھی سحر نہ ہو

جو متاعِ علم و یقیں ملے
مرا مدعا کبھی زر نہ ہو

مجھے آشنائے جمال کر
غمِ دو جہاں کی خبر نہ ہو

جو کبھی ہو تجھ سے گریز پا
کوئی تیرا ایسا بشر نہ ہو

یہ نہیں کہ تجھ کو پکاروں جب
تو مری دعا میں اثر نہ ہو

تری حمد کے ہو بغیر جو
کوئی ساعت ایسی بسر نہ ہو

ترے ذکر سے ہے یوں خالی دل
کہ صدف میں جیسے گہر نہ ہو

نعمان فاروق

نعت

شجر حجر تمہیں جھک کر سلام کرتے ہیں
یہ بے زباں تمہیں سے کلام کرتے ہیں

زمیں کو عرشِ معلیٰ ہے تیرا گنبدِ سبز
تری گلی میں فرشتے قیام کرتے ہیں

مسافروں کو ترا در ہے منزلِ آخر
یہیں سب اپنی مسافت تمام کرتے ہیں

جنہیں جہاں میں کہیں بھی اماں نہیں ملتی
وہ قافلے یہاں آ کر قیام کرتے ہیں

نظر میں پھرتے ہیں تیرے دیار کے منظر
اسی نواح میں ہم صبح و شام کرتے ہیں

سکونِ دل کی اسی سے امید ہے ناصر
جو اپنا فیض غریبوں پہ عام کرتے ہیں

ناصر کاظمی

چاند نگر کے انشا جی

آسیہ مقصود

پہلے کچھ ہوا کرتے تھے۔ گھنے شجر جیسے میٹھے پانیوں کے جھرنوں جیسے جن کے ہوتے دھوپ بادل کی طرح آنگن میں اترتی تھی۔ ہاں انشاء جی جیسے کچھ لوگ ہوا کرتے تھے جن کے دم سے ہر موسم موسم بہار ہوتا تھا۔

کتنے ہی گراں مایہ لوگ زمانے سے اٹھتے جا رہے ہیں اور زمانہ بے ثمر درخت کی مانند بانجھ ہو رہا ہے ہماری نسل اس محروم ہوتے وقت کی فضاؤں میں جینے پر مجبور ہے۔

کاش وہ چہرہ' وہ خدوخال ہم نے بھی دیکھے ہوتے۔ اس لہجے کی پھوار ہم پر بھی برستی۔ ان کی محفل سے اپنے حصے کے موتی ہم بھی سمیٹتے۔ آہ' وہ چاند نگر کے باسی کب کے زمانے کو بنجر کر گئے۔ قلم بے قرار ہے ان کی یاد کے دیپ جلانے کے لیے گو ان کی یاد ہمارے لفظوں کی محتاج نہیں ہم چپ بھی رہیں گے تو چراغاں ہو گا۔ وہ تو آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ اپنی تحریروں کی صورت' اپنی باتوں کی صورت ان کے لفظوں کی پھوار تو اب بھی دلوں کو بھگوتی ہے۔ وہ میٹھے بول سُروں میں ڈھل کر اب بھی فضاؤں میں ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ ان کی نگری کا چاند جب ندی میں اپنا عکس دیکھتا ہے تو اب بھی بے قرار ہو کر لہروں پر رقص کرنے لگتا ہے۔ پنگھٹ پر ٹھہری گوری آج بھی محبت کا درد سہتی ہے۔ سجنی انہیں یاد کرتی ہے۔ وہ تو ہر زمانے کا من بھاتا ساز ہیں جو جلترنگ بکھیرتا رہے گا۔ آنگن میں اترتی سرما کی دھوپ کی طرح نرم' خوش رنگ' خوش اطوار۔

دنیا کی سیر کو نکلو تو وہ ہمراہ ہوتے ہیں۔ کبھی لندن کی برف سے ڈھکی کسی گمنام سڑک پر اچانک ہی مل جاتے

ہیں اور سرد ہواؤں کی شکایت کرنے لگتے ہیں۔ چین کے سفر پر تو بطور خاص ان کی شگفتہ باتوں کی بازگشت ہمراہ چلتی ہے۔ کبھی گھڑیوں کے آگے پیچھے کے چکر کو سمجھنے میں الجھتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ کبھی کہیں قہوہ پینے بیٹھو تو چپکے سے ایک نشست آ سنبھالتے ہیں۔ کبھی جاپانی رقص کے تماشائیوں کے ہجوم میں تنہا کھڑے ملتے ہیں تو کبھی سومو پہلوانوں سے لفظوں میں نبرد آزما پائے جاتے ہیں۔ ابن بطوطہ کے تعاقب میں جانے والے ابن انشاء کے قدموں کی آہٹ ہر آن آپ کو اپنے تعاقب میں محسوس ہو گی۔

صرف ہم اور آپ ہی نہیں ان کے چاہنے والوں میں۔ ان کے سنگی ساتھیوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے اپنے حوالے سے بات کرتے کرتے انشاء جی کے ہمراہ چل پڑتے ہیں۔

وہ دیکھیے سامنے ممتاز مفتی صاحب تشریف فرما ہیں شاید کچھ فرما رہے ہیں۔ میں چپکے سے برابر جا بیٹھتی ہوں۔

"انشاء بہت پیارا انسان ہے' بہت ہی پیارا۔" ان کا مخصوص لہجہ ابھرتا ہے۔" مگر ہے بہت گہرا۔ ہر ایک پر نہیں کھلتا۔" وہی گہری تجزیاتی نظر جو مفتی صاحب کا خاصہ ہے۔

"لیکن مجھ سے نہیں چھپاتا وہ کچھ بھی۔" "یہ احمد بشیر ہیں۔" "ہر بات' ہر دکھ کھول کر میرے سامنے رکھ دیتا ہے۔"

"دکھ!" میرے دل پر ایک گھونسہ پڑتا ہے۔

"نہیں۔ آج دکھ کی بات جانے دو۔" میں بوجھل ہوتے دل کے ساتھ اٹھ آتی ہوں۔

اونچے نیچے ناہموار راستے پر چلتے ہوئے دور ایک فقیر کی کٹیا پر نظر پڑتی ہے۔ میرے آگے چلتے ہوئے دو خوش پوش' خوش مزاج جوان اس کٹیا کی جانب محو سفر ہیں۔

"آ جینوں بابے نال ملاواں' انشاء!" اشفاق احمد کہتے ہیں۔

"نہیں رہنے دو۔ یہ بابا وغیرہ میری ٹائپ نہیں۔ میں تو صرف تم سے ملنے آیا ہوں۔" دوستی کا مان اور خلوص ان کے لہجے سے جھلک رہا ہے۔ میں سرشار ہو جاتی ہوں۔

چھوٹی چھوٹی نوک جھوک کے ساتھ دونوں آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی ہنسی میں ایک سی گونج ہے لیکن ـــــ میں ٹھٹک کر رک جاتی ہوں۔ خوشی کے اس پردے کے نیچے ایک کسک ہے جس سے اداسی کا دھواں اٹھتا ہے۔ اداسی کی زمین میرے پاؤں پکڑ لیتی ہے آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ آخر بوجھل دل کو تھپکتے ہوئے مجھے پھر پلٹنا پڑتا ہے۔ کیا دیکھتی ہوں سامنے ہی ایک وسیع و عریض عمارت کی ریسپشن پر قدرت اللہ شہاب کھڑے ہیں۔ آگے کو جھکتے ہوئے وہ اپنے دھیمے منکسر المزاج لہجے میں کچھ پوچھ رہے ہیں۔

"ابن انشاء کا روم نمبر ـــــ؟"

ـــــ تو لندن ہاسپٹل ہے۔" میرا دل بیٹھ جاتا ہے آگے بڑھنے کی قوت سلب ہو جاتی ہے۔ شہاب صاحب نے تلے قدم اٹھاتے کب کے راہ داری کے دوسرے سرے پر گم ہو چکے ہیں۔ لیکن میں اپنی سانسوں کو متوازن کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ہمت مجتمع کرتی ہوں اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اس سمت چل پڑتی ہوں۔

بڑی سی کھڑکی کے شفاف شیشوں سے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا ہے۔ بیماری سے جنگ لڑتا ہوا ایک مریض بستر پر دراز ہے۔ قدرت اللہ شہاب اس کا ہاتھ تھامے برابر میں کرسی پر براجمان ہیں مگر میری نظریں کسی اور چہرے کی متلاشی ہیں وہ خوش وضع خوش گفتار قہقہے بکھیرتا ہوا انسان کمرے کے کسی کونے سے نمودار نہیں ہوتا۔ میں اطمینان کی سانس لے کر واپس پلٹنے والی ہوں کہ شہاب صاحب کی آواز سماعت سے ٹکراتی ہے۔

"انشاء! اللہ نے چاہا تو تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"کیا ـــــ انشاء جی!" دل کا غبار آنکھوں کے رستے میرے رخساروں پر بہہ نکلتا ہے۔

اب میری واحد پناہ گاہ وہ نگر ہے جہاں چاند کی اجلی روشنی ہے۔ فضاؤں میں تازگی ہے۔ خوشی ہے۔ پنگھٹ کی منیاریں ایک من چلے کو دیکھ کر سرگوشیاں کرتی ہیں۔ آنکھوں میں انتظار سجائے سجنی چوکھٹ تھامے کھڑی ہے۔ پائل میں ملن کے گیت ہیں۔

لیکن ـــــ پھر عمر کی نقدی ختم ہو جاتی ہے اور میرے اردگرد پھیلا طلسماتی نگر یکایک غائب ہو جاتا ہے۔ اب تاحد نگاہ تک پھیلا صحرا ہے' بے آب گیاہ صحرا اور ایک مانوس آواز کی گونج۔

"انشاء جی اب کوچ کرو۔ اس شہر میں دل کو لگانا کیا۔"

اور انشاء جی دل کے اتنے فرماں بردار نکلے کہ کوچ کرنے میں دیر نہ لگائی.....

ہم بے ثمر زمانے میں جی رہے ہیں۔ وہ زمانہ کب کا بیت گیا جب ثمر دار گھنی چھایا والے پیڑ ہوا کرتے تھے۔ سچ ہی تو کہا ہے خالد انور نے۔

"پہلے کچھ لوگ ہوا کرتے تھے جن کے ہوتے
دھوپ آنگن میں اتر آتی تھی بادل کی طرح
نرم خوش رنگ خوش اطوار
بہت دیر ہوگئی
اب کہیں کوئی نہیں
پہلے کچھ لوگ ہوا کرتے تھے آباد جزیروں کی طرح
جن کو دریافت کیا جاتا تھا
پہلے ہر شہر میں کچھ لوگ ہوا کرتے تھے
اب کہیں کوئی نہیں
دھوپ سے رنگ اڑا جاتا ہے میدانوں کا۔"

☼ ☼

زندگی کے یہ سوالات کہاں تھے پہلے
اتنے الجھے ہوئے حالات کہاں تھے پہلے

اس میں شک نہیں کہ حالات میں جتنا الجھاؤ آج ہے اتنا پہلے کبھی نہ تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ زندگی آج جن سوالات سے دوچار ہے وہ یا تو پہلے سامنے نہ آئے تھے یا اس قدر شدت سے ذہنوں میں نہ ابھرے تھے۔ زندگی کی تیز رفتاری سے ہم قدم ہونے کے لیے فرد کو جو کوشش کرنی پڑ رہی ہے وہ اسے کہیں دم لینے دے رہی ہے نہ چین۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وہ اپنی "حاصل" کردہ کامیابیوں پہ مسرور ہونے کا بھی وقت نہیں رکھتا۔ آج کا انسان ایسی ریس کا گھوڑا ہے جو وہ کبھی نہیں جیت سکتا۔ اس پہ وقت کی کمی کا احساس شدت سے غالب رہتا ہے جو اسے ٹھہرنے نہیں دیتا۔ اور اس کی ہوس نے آج کے انسان کو ATM مشین میں بدل کر روز کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے محروم کر دیا ہے روحانی طور پر وہ تنہا ہوتا جا رہا ہے۔

کسی نے راز کھولا نہ آگہی کے سوا
کہ زندگی میں سب ہی کچھ ہے زندگی کے سوا

زندگی کہاں اور کیسی گزری؟ کیا ویسی گزری جیسی آپ نے گزارنا چاہی؟ اسی حوالے سے کچھ سوالات معروف شخصیات سے پوچھے گئے ہیں۔

☆ 2013ء کیسا گزرا؟ کوئی قابل ذکر بات جو بتانا چاہیں؟
☆ کچھ یاد ہے بچپن میں نیا سال کیسے مناتے تھے؟ کوئی خاص بات بتائیے؟
☆ انسان کی زندگی میں نئے سال کی اہمیت کیا ہے؟ انسانی نفسیات پہ کچھ اثر ہوتا ہے۔

گزر گئے برس

ـــــ شاہین رشید

سکینہ سموں : (آرٹسٹ + ڈائریکٹر + پروڈیوسر)

1 2013ء اچھا گزرا اس لحاظ سے کہ میرے تین سیریلز آئے اور ماشاء اللہ سے تینوں ہی کامیاب رہے۔ "گوہر نایاب" "امیر زادی" اور "محبت صبح کا ستارہ" تو جو سال کامیابیاں دے وہ اچھا ہی لگتا ہے اور ویسے بھی اللہ کا بڑا کرم رہا کوئی کرائسس نہیں آیا۔"

2 "بچپن میں تو نیا سال منانے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا اب تو انٹرنیٹ اور فیس بک کی دنیا نے انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ پہلے تو بس اتنا ہی تھا کہ جیسے عید کا دن یا کوئی بڑا دن اہم ہوتا تھا اس طرح نیا سال بھی اہم ہوتا تھا۔ مگر سیلیبریٹ کرنے کا کوئی تصور نہیں

ہوتا تھا۔"

3 "مجھے تو سارے سال ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ جیسے عمر گزرتی چلی جا رہی ہے اس طرح سال بھی گزرتے چلے جا رہے ہیں' ہم دیکھا جائے تو اینڈ کی طرف ہی جا رہے ہیں نئے سال سے اچھے کی امید ہی ہوتی ہے اللہ پر ہی بھروسہ ہوتا ہے ورنہ انسان کو تو اگلے پل کا پتا نہیں ہوتا اہمیت صرف اتنی ہی ہوتی ہے کہ نیا سال شروع ہو رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ دور کی مت سوچیں کل کی فکر مت کریں بلکہ اپنا آج بہتر گزاریں' ہم لوگ کل کی فکر میں اپنا آج بھی خراب کر دیتے ہیں' جو کہ غلط بات ہے۔ کبھی لمبی پلاننگ نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ زندگی کب قابل بھروسہ ہے۔"

تجل : (آرٹسٹ)

1 "2013ء کو اگر کامیابیوں کے حساب سے دیکھوں تو بہت اچھا گزرا' تقریباً" پورے سال ہی میرے سیریلز چلے اور سب میں میرے کردار بہت اچھے تھے اور سب نے پسند بھی بہت کیے۔" نتھ "بہت مقبول ہوا اور "آج کل" سناٹا "بہت ہٹ جا رہا ہے دونوں میں ہی میرے کردار انتہائی مشکل تھے۔ مگر میرے ڈائریکٹرز اور سینئر فنکاروں کی محنت سے میں انہیں کرنے میں کامیاب رہی اور چھوٹے موٹے

کرائسس تو زندگی کے ساتھ ساتھ ہیں انہیں فیس کرتی رہتی ہوں۔"

2 "بچپن کے دور میں تو ابھی میں ہوں (ہنسی) کیونکہ ابھی اتنی بڑی کہاں ہوئی ہوں) اور میرا خیال ہے کہ دن اور سال منانے کا رواج اب بہت زیادہ ہو گیا ہے پہلے ایسا نہیں تھا۔ اب موبائل کے ذریعے سے سب سے رابطہ رہتا ہے تو ایک دوسرے کو مبارک باد دے دیتے ہیں۔ بچپن میں تو ایسا نہیں تھا۔ جو مل گیا اسے نیا سال مبارک کہہ دیتے تھے۔"

3 "ہر نیا دن' ہر نیا سال انسان کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے' کیونکہ انسان ایک نئی امید اور ایک نئے پلان کے ساتھ اس کا آغاز کرتا ہے گزشتہ سال پہ نظر دوڑاتا ہے کوشش کرتا ہے کہ غلطی کو نہ دہرائیں اور ایک نئے عزم کے ساتھ نئے سال کا آغاز کریں۔"

فہیم خان : (4 مین شو فیم)

1 2013ء بہت اچھا گزرا اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ مجھے بہت اچھے پروجیکٹ ملے میرا شو "4 مین شو" ایک نئی ٹیم کے ساتھ کافی کامیاب رہا' پورے سال کا جائزہ لوں تو یہ سال بہت بہترین گزرا۔"

2 "بچپن اتنا پرانا نہیں ہوا کہ یاد نہ ہو' بچپن میں زی ٹی وی پر نیو ایئر شو دیکھ کر نیا سال مناتے تھے جس میں مادھوری اور دیگر فنکارائیں خوب صورت میوزک پر رقص پیش کیا کرتی تھیں۔ بچپن میں تو یہی سب کچھ اچھا لگتا ہے بڑے ہونے کے بعد تو انسان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔"

3 "نئے سال کی بہت اہمیت ہے انسان کی زندگی میں' اسے نئی ڈائری خریدنی پڑتی ہے نیا کیلنڈر لینا پڑتا ہے اور ان تمام فارغ لوگوں کی برتھ ڈے جنہیں گزشتہ سال گفٹ دیا ہوا ہوتا ہے ان کے لیے پھر سے گفٹ خریدنے کی تیاری ہوتی ہے اور نفسیات پر یہ اثر پڑتا ہے کہ — کوئی چیک بناتے وقت 2013ء کی تاریخ ڈال دی جاتی ہے بجائے 2014ء کی اور پھر انگریزی کی گالی دے کر نیا چیک بنانا پڑتا ہے۔"

عاطف حسین : (ڈرامہ ڈائریکٹر)

1 "2013ء بہت اچھا گزرا' بہت سی کامیابیاں ملیں میرے سیریلز بہت کامیاب ہو گئے مثلاً "اک تمنا لاحاصل سی" "سپرہٹ گیا پھر "قرض" بھی بہت پسند کیا گیا اور آج کل آپ "کلموہی" دیکھ رہے ہیں اور "کلموہی" بھی بہت پسند کیا جا رہا ہے اور اپنی ان کامیابیوں پر میں اپنے خدا کا بہت شکر گزار ہوں۔"

2 "بچپن میں نئے سال کو بہت انجوائے کرتے تھے' ایسی خوشی ہوتی تھی جیسے عید آنے والی ہو مگر اب سب کچھ بدل گیا ہے حالات اتنے خراب ہو گئے ہیں کہ اب ایسا لگتا ہے جیسے ہم جیل میں زندگی گزار رہے ہوں۔۔۔ بس گھر سے کام اور کام سے گھر اب یہی زندگی رہ گئی ہے ہماری۔"

3 نئے سال کے لیے انسان بہت امیدیں لگاتا ہے کہ نیا سال پہلے سال سے اچھا گزرے گا۔ اس لیے انسان کی زندگی میں نئے سال کی بہت اہمیت ہوتی ہے کہ وہ نئی امیدوں کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کرتا ہے اور خدا سے دعا گو ہوتا ہے کہ وہ اسے حوصلہ اور ہمت دے۔"

عمران اسلم : (آرٹسٹ)

1 میرا 2013ء بہت اچھا گزرا' اس سال اللہ تعالیٰ نے مجھے اولاد کی صورت میں اپنی رحمت سے نوازا' میری بیٹی کا نام Maaya ہے اور بیسٹ ایکٹر کا ایوارڈ دیپک پروانی نے دیا تھا اور پھر 2013ء میں میرے کئی سیریل بہت کامیاب ہوئے۔ تو اس لحاظ سے میرا تو 2013ء بہت ہی اچھا گزرا اور انجلین ملک کی طرف سے بھی ایوارڈ ملا تھا۔"

2 بچپن بہت اچھا تھا جلدی گزر گیا' مگر نیا سال کبھی نہیں منایا تھا' شاید اتنا سینس نہیں تھا یا پھر اتنا رواج نہیں تھا۔ جبکہ اب نئے سال کا استقبال جوش و خروش کے ساتھ کیا جاتا ہے۔"

3 نیا سال نئے ریزولیشن کے ساتھ آتا ہے۔ کوشش ہوتی ہے کہ گزرے وقت سے سیکھا ہوا تجربہ آنے والے وقت پر آزمایا جائے اور نفسیات تو ہر شخص کی مختلف ہی ہوتی ہے' کچھ کی Progressive اور کچھ کی Aggressive۔"

آغا عشنا شاہ (آرٹسٹ)

1 "2013ء بہت اچھا گزرا' ماشاءاللہ سے کافی کامیابیاں ملیں جو بھی سیریل آن ایئر گیا سب ہی کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔۔۔۔ مثلاً "میرے خوابوں کا دیا' شہریار' اور "رخسار" وغیرہ اور کئی آفرز آئیں تو اس لحاظ سے 2013ء کو میں اپنی کامیابیوں کا سال کہوں گی۔"

2 بچپن کے نئے سال کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ سب بہن بھائی ماں باپ مل کر رہتے تھے تو سال منانے کا بھی مزا آتا تھا مگر جب سے میں کراچی آئی ہوں اپنی فیملی سے دور ہوں تو یہاں دوستوں کے ساتھ ہلا گلا کر لیتی ہوں مگر جیسے ہی نئے سال کے بارہ بجتے ہیں میں سب سے پہلے اپنی اماں کو کال کرتی ہوں خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔"

3 نئے سال کا انسانی زندگی پر انسان کی نفسیات پر بہت اثر ہوتا ہے کیونکہ سارے موسم گزر جاتے ہیں۔ سارے اہم دن گزر جاتے ہیں' ہم ایک سال بڑے ہو جاتے ہیں۔ اتنا کچھ ہو جاتا ہے اور پتا ہی نہیں چلتا کہ ایک سال گزر گیا ہے اور پھر میرے خیال سے لوگ یہ بھی Realaize کرتے ہیں کہ اس سال میں نے جو غلطیاں کیں اب انہیں نہیں دہرانا ہے۔ پھر لوگ پلان بھی کرتے ہیں کہ اس سال یہ یہ کرنا ہے تو نئے سال کی جنوری تو سب کی بہت اچھی گزرتی ہے۔"

شائستہ فرید : (نیوز کاسٹر ڈان نیوز)

1 "2013ء بہت اچھا گزرا اور قابل ذکر بات تو صرف یہی ہے کہ اس میں اپنے' بہت بہت پیار کرنے والے 'محبت کرنے والے اور میرا بہت خیال کرنے والے شوہر کا ساتھ ہے اور اپنے رب کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے اتنا اچھا لائف پارٹنر دیا۔"

2 "بچپن میں ہی زیادہ اہتمام ہوتا تھا۔ نئے سال کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے نیو ایئر کارڈ بناتی تھی اور اپنی دوستوں کو دیتی تھی اور ابو کے ساتھ ہم سب "سی ویو" ضرور جایا کرتے تھے اور اگر وہ انکار کرتے تھے تو خوب شور مچا کر ان کو لے جانے پر مجبور کرتے تھے اور بہت مزے کرتے تھے۔"

3 "یوں تو ہر دن اور ہر پل کی اہمیت ہوتی ہے لیکن

نئے سال کی کچھ اور ہی بات ہے اور پھر نئے سال پہ ہم یہ بھی سوچتے ہیں کہ اس سال جو غلط کام ہوئے۔ جو غلطیاں ہوئیں انہیں درست کرلیں گے اور آنے والے دنوں کو مزید بہتر بنائیں گے' زندگی میں پلاننگ بہت ضروری ہوتی ہے اور ہر کوئی نئے سال کے آغاز پر ہی کچھ نہ کچھ پلاننگ ضرور کرتا ہے اور اس کے مطابق کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

یاسرہ رضوی : (آرٹسٹ)

1 "میرا 2013ء بہت سے واقعات سے بھرپور گزرا' زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے' بہت اچھی پروگریس بھی ہوئی اگر تجزیہ کروں تو گزشتہ سال سے بہتر گزرا یہ سال اور میرے لیے سب سے بڑی اور قابل ذکر بات یہ بھی کہ میرا سیریل "من کے موتی" بہت زیادہ ہٹ گیا اور اس کی وجہ سے بہ حیثیت ایک اداکارہ میرے لیے بہت مددگار ثابت ہوا ہے کہ میں اس فیلڈ میں بہت نمایاں ہوگئی۔"

2 "بچپن میں نیا سال منانے کا میرا اسٹائل وہی تھا جیسا عام طور پر بچوں کا ہوتا ہے۔ کوشش کرتی تھی کہ کوئی نہ کوئی پارٹی ضرور ارینج کروں گھر پر اور دوستوں کو بلا کر ہلا گلا کر کے خوب اچھے طریقے سے سیلیبریٹ کر کے نئے سال کو ویلکم کیا کرتی تھی۔"

3 "نیا سال ایک نئی شروعات دیتا ہے انسان کو لگتا ہے کہ آپ کوئی نیا کام نیا پلان شروع کر رہے ہیں اور یہ

احساسات ہمیشہ ایک سال ختم ہونے پر اور نیا سال شروع ہونے پر ہوتے ہیں۔ نیا اسٹارٹ انسان کو ہر وقت چاہیے ہوتا ہے۔ انسان غلطیاں بھی کرتا ہے حادثات سے بھی گزرتا ہے اور اس بوجھ کو کم کرنے کے لیے اس کے لیے نیا سال بہت اہم ہوتا ہے۔ کیونکہ نئے سال سے انسان بہت سی امیدیں باندھ لیتا ہے۔"

عامر قریشی : (آرٹسٹ)

1 عموماً "13 نمبر کو ان لکی نمبر کہا جاتا ہے اور یہ بات اس طرح سچ ثابت ہوئی کہ یہ نمبر میرے لیے بھی ان لکی ثابت ہوا ہے کچھ کیا بلکہ بڑے بڑے پروجیکٹس آتے آتے رہ گئے کئی آفرز میں نے خود ٹھکرا دیں لیکن اچھی بات یہ ہے کہ پورا سال میں نے اپنے والد کے ساتھ گزارا اور دعا کرتا ہوں کہ آنے والا یہ سال میں اپنے والد کے ساتھ گزاروں اور خدا کرے کہ 2014ء میرے لیے لکی ثابت ہو (آمین)

2 بچپن میں والدین کے دوست اور جاننے والے اپنے بچوں کے ساتھ آجاتے تھے۔ ہلا گلا کرتے کھانا وغیرہ کھا کر ابو گھر کی لائٹس بند کر دیتے تھے اور جیسے ہی

نیا سال شروع ہوتا تھا لائٹیں آن کر دیتے تھے اور پھر ہم سب بچے مل کر "ہیپی نیو ایئر" کا نعرہ لگا کر خوب چیختے چلاتے تھے۔ پھر ابو ہمیں "داتا دربار" لے کر جاتے اور آنے والے سال کے لیے دعائیں مانگتے۔"

3 مسلمانوں کی زندگی میں نیو ایئر کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی دنیا کے لیے ایک دوسرے کو نیا سال وش کر لیتے ہیں۔ اس دن کی بھی وہی اہمیت ہے جو کسی بھی بڑے دن کی چھٹی کی ہوتی ہے۔ "جیسے چاند رات، یا پھر ٹیم کی جیت کی خوشی یعنی کچھ دیر ٹینشن کو بھلا کر خوشی منانے اور ہلا گلا کرنے کا بہانہ۔ کچھ لوگ اسے "بگ ڈیل" بنا لیتے ہیں اور کئی خرافات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جو میری نظر میں غلط ہے۔ میں اب نیا سال گھر پر ہی اپنی فیملی کے ساتھ ہی مناتا ہوں۔"

گلنار جاوید (ایف ایم 93 ریڈیو پاکستان)

1 "2013ء تو اچھا گزرا اور کوئی ایسی بات بھی نہیں ہوئی جو قابل ذکر ہو، البتہ 2014ء ہمارے لیے خاص ہو گا کیونکہ میں اس سال اپنے بیٹے کی شادی کروں گی۔"

2 ہمارے بچپن میں تو نئے سال کو منانے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ سمپل لائف تھی والدین سادا

مزاج، سادگی پسند، کھایا پیا اور پڑھنے چلے گئے گھر آ گئے۔ کچھ پڑھنے پڑھانے بیٹھ گئے نئے سال کی کوئی ایکسائیٹ منٹ نہیں ہوتی تھی۔"

3 میری نظر میں تو کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی اور میرا خیال ہے کہ سارے سال ایک جیسے ہی ہوتے ہیں، حالات اچھے ہوں، خوشحالی ہو تو سارے سال اچھے ہی ہوتے ہیں۔ وہی ایک جیسی راتیں وہی ایک جیسے دن، کچھ نیا نہیں ہوتا۔"

صائمہ اکرم چوہدری : رائٹر

1 کبھی کبھی مجھے گمان ہوتا ہے کہ جیسے وقت کو "پر" لگ گئے ہیں 2013ء کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا، سوچنے بیٹھوں تو سخت حیرت کی بات لگتی ہے۔ پریکٹیکل لائف میں آنے کے بعد مجھے تو واقعی ایسا لگتا ہے جیسے وقت ریت کی طرح ہماری مٹھیوں سے پھسلتا جا رہا ہے زندگی اتنی تیز رفتار ہو گئی ہے کہ کچھ بھی سوچنے کا وقت نہیں۔ یہ سال میری تحریر کے حوالے سے یادگار رہا، الیکٹرونک میڈیا تک میری رسائی ہوئی۔ لیکن جاب، گھر، سوشل لائف اور رائٹنگ کے حوالے سے سال بہت تیزی کے ساتھ گزرا، ستمبر کے پہلے

ہفتے میری گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ یہ لمحات میرے لیے یادگار تو نہیں مگر خوفناک بہت تھے۔ جب میں اسٹیرنگ ہاتھ میں پکڑے بے یقینی سے اپنی گاڑی کی حالت کو دیکھے جا رہی تھی ڈرائیونگ سیٹ سے جب میں باہر نکلی تو میری ٹانگیں باقاعدہ کانپ رہی تھیں اور پھر پورے دس دن میری ہمت نہیں ہو سکی کہ میں دوبارہ ڈرائیو کر سکوں۔ اللہ ایسے لمحات سے ہر کسی کو بچائے۔"

2 تتلیوں، جگنوؤں اور بھنوروں کے پیچھے بھاگتا ہوا بچپن نئے اور پرانے سال کے فلسفے کو زیادہ سمجھنے سے قاصر تھا، اس وقت نئے سال کی بس یہ خوشی ہوتی تھی کہ ہم اگلی کلاس میں چلے جائیں گے، کتابیں، کاپیاں، بیگ ان سب چیزوں کی مہک نئے سال کو بہت دلفریب سا بنا دیتی تھی۔

3 یونیورسٹی لائف تک تو سچ پوچھیں نئے سال کو بہت اچھے طریقے سے سیلی بریٹ کیا جاتا تھا مجھے یاد ہے کہ ذکریا یونیورسٹی ملتان میں عائشہ ہال کے روم نمبر 111 کے دروازے پر کئی رنگارنگ وش کارڈز لگے ہوتے تھے صبح کیمپس میں بھی سردیوں کی دھند میں ٹھٹھرتے ہوئے ایک دوسرے کو "وش" کیا جاتا تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے تو خوشی کا عنصر کم اور سوچیں انسان کو اپنے حصار میں لے لیتی ہیں پھر زندگی کے ایک سال کی کمی کا دکھ افسردہ کرنے لگتا ہے اب تو مجھے باقاعدہ ڈپریشن سا محسوس ہوتا ہے کہ اتنے سال گزر گئے ہیں اور ہم نے اس دنیا میں آ کر کیا کیا؟ اس لیے میرا ذاتی خیال ہے کہ عمر ڈھلنے کے ساتھ ساتھ نیا سال ہر انسان کو اپنا ذاتی محاسبہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔"

ماورا : (آرٹسٹ)

1 "میں تو جب سے اس فیلڈ میں آئی ہوں میرے لیے تو ہر دن ہر لمحہ بہت سی خوشیاں لے کر آتا ہے۔ ایک سال کا کیا ذکر کروں۔ 2013ء کا ہر دن میرے

لیے بہت سی کامیابیاں لے کر آیا ہے میرا ہر ڈرامہ ہٹ گیا۔ آج کل "ہلکی سی خلش" چل رہا ہے جو بہت پسند کیا جا رہا ہے پھر "اک تمنا لاحاصل سی" بہت ہٹ گیا آنے والے سیریلز سے بھی یہی امید ہے۔ تو 2013ء تو اچھا گزرا ہی ہے ان شاء اللہ 2014ء بھی اچھا گزرے گا۔"

2 بچپن ہو یا آج کا دور، کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ بچپن اور نوجوانی کے درمیان بہت تھوڑا فاصلہ ہے تو نیا سال منایا تو کبھی نہیں مگر نئے سال کی ایکسائیٹ منٹ ضرور ہوتی تھی اور ہوتی ہے۔۔۔ کوئی بھی نئی چیز ہو اس کی کشش ہی کچھ اور ہوتی ہے تو بس نئے سال کی خوشی ہوتی تھی نیا عزم نیا حوصلہ مگر کوئی خاص یاد وابستہ نہیں ہے گزرے سالوں سے۔"

3 "نئے سال کی بس اتنی ہی اہمیت ہے کہ ایک نیا سال شروع ہونے والا ہے اور اس نئے سال میں وہ کچھ کرنے کا عزم ہوتا ہے جو گزرے سال میں نہیں کر سکے تھے۔ کچھ عہد کرتے ہیں کچھ اچھے کاموں کو جاری رکھنے کا سوچتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ گھر والوں کے

ساتھ اس دن کو گزارنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اگر اس بار کراچی میں ہوئی تو لازمی نئے سال کے آغاز پر امی کو اسلام آباد فون کروں گی۔"

ابن آس : (رائٹر+جرنلسٹ)

کچھ غم' کچھ خوشیاں دے کر ٹال گیا
جیون کا ایک اور سنہرا سال گیا

1 2013ء میرے لیے بہت اہم رہا۔ میری بڑی بیٹی کالج کی اسٹوڈنٹ بن گئی میری بیوی نے شادی کے سترہ سال بعد میرے مسلسل اصرار پر اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ سے شروع کیا اور کالج میں داخلہ لیا۔ اس سال ایک بار پھر میں نے اپنی آوارہ گردی ترک کر کے ملازمت کو ترجیح دی اور ایک کامیاب پروڈکشن ہاؤس میں بحیثیت content منیجر کے اپائنٹ ہوا پھر کافی عرصہ پہلے لکھا گیا میرا سیریل "کلموہی" شروع ہوا 2013ء میرے لیے اس لیے بھی اہم ہے کہ اس سال میں نے گزشتہ 30 برسوں میں لکھی ہوئی کہانیوں کو پہلی مرتبہ جمع کیا اپنے ادھورے پروجیکٹس کو مکمل کرنا شروع کیا۔ اس سال میں نے اپنا ذاتی گھر خریدنے کا سوچا اور اس کے لیے بڑی سنجیدگی کے ساتھ پیسے جمع کرنے شروع کیے ہیں۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اب میں نے سوچ لیا ہے کہ اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا اور دلجمعی سے کام کروں گا۔"

2 "میرا بچپن بہت غربت میں گزرا' غریب آباد کی جھونپڑیوں میں رہتے تھے ہم۔ اس زمانے میں نیو ایئر کس طرح سیلبریٹ ہوتا تھا یا ہوتا بھی تھا کہ نہیں' نہیں معلوم تھا۔ ہاں اسکول میں جب روزانہ کاپی پر تاریخ لکھتے تھے تو ہماری ٹیچر تاریخ کے گرد سرخ دائرہ بنا دیتی تھیں اس طرح ہمیں معلوم ہو جاتا تھا کہ سال بدل گیا ہے۔ پھر جب کچھ ہوش آنا شروع ہوا تو ہم نیا سال لوگوں کو بے وقوف بنا کر منایا کرتے تھے۔ ہم غریب آباد سے حسین آباد جانے والی ویران سڑک پہ پیپل یا شہتوت کے پتوں کو کاغذ میں اس طرح لپیٹ کر سڑک پر ڈال دیتے تھے کہ جیسے کسی کے "پان" گر گئے ہوں اور جب لوگ اپنی بائیک روک کر وہ پتے پان سمجھ کر اٹھاتے تو ہم سامنے آکر ان کا بہت مذاق بناتے تھے۔ ایک مرتبہ نئے سال پہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ لوکل ٹرین سے ایک ویران اسٹیشن پہ اتر گیا وہ شاید آخری ٹرین تھی۔ ساری رات بھوکا پیاسا اسٹیشن پہ بیٹھا رہا' صبح جب ٹرین آئی تو گھر واپس آیا۔ تب بہت مار پڑی مگر اس مار نے میری شرارتوں کو کم نہیں کیا۔"

3 "نیا سال انسان کی زندگی میں بہت اہم اثرات مرتب کرتا ہے اگر اس کو محسوس کیا جائے ورنہ کسی کے آنے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا خواہ وہ نیا سال ہو' نئی شادی ہو یا پھر نیا دن ہو یا نیا جنم لینے والا انسان ہو۔ نیا سال انسان کو سمجھنے' سوچنے اور احتیاط کرنے کا احساس دلاتا ہے اور خود کو سدھارنے کا موقع فراہم کرتا ہے کہ زندگی کا ایک سال کم ہو گیا ہے اب نئے سال میں وہ سب کچھ کر ڈالو جو گزشتہ برسوں میں سوچتے آئے ہو نیا سال اس احساس کو اجاگر کرتا ہے کہ زندگی میں ترتیب بہت اہم ہے جس طرح کیلنڈر ایک ترتیب کے ساتھ اپنا سفر آگے بڑھاتا ہے اس طرح انسان کو بھی اپنی زندگی ایک خاص ترتیب سے گزارنی چاہیے دراصل نیا سال آپ کی زندگی کو ہی نہیں آپ کی نفسیات کو بھی بدل کر رکھ دیتا ہے۔"

☼ ☼

نازیہ ملک سے ملاقات

شاہین رشید

اب مارننگ شو تو اس قابل نہیں ہوتے کہ انہیں دیکھا جائے البتہ نجی چینل کا چائے ٹائم اس قابل ضرور ہوتا ہے کہ اسے دیکھا جائے اس ایوننگ پروگرام کی میزبان "نازیہ ملک" ہیں۔ آیئے آپ کی ان سے ملاقات کرائیں۔

★ "ہاں جی کیا حال ہیں آپ کے؟"

✻ "جی بالکل ٹھیک ٹھاک۔"

★ "اس فیلڈ میں ایک "آمنہ ملک" بھی ہیں۔ کیا رشتہ ہے آپ کا ان سے؟ بہن ہیں آپ کی؟"

✻ "نہیں جی، بہن تو نہیں ہیں لیکن میری بہت دور کی رشتے دار ہیں بس نام ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے لوگوں کو تھوڑی کنفیوژن ہوتی ہے۔"

★ "ہوں.... آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

✻ "آج کل ماڈلنگ ہو رہی ہے اور بہت سے دیگر کام مثلاً" دو تین بزنس سنبھالتی ہوں ہوسٹنگ کرنا ماڈلنگ کرنا بہت سے کام ایک ساتھ کر رہی ہوں۔"

★ "مثلاً"؟"

✻ "مثلاً" میں فیشن ڈیزائنر بھی ہوں میک اپ آرٹسٹ بھی ہوں۔ تعلیم اگرچہ میں نے بی کام تک ہی حاصل کی ہے۔ مگر میں نے بہت سارے ڈپلومہ کیے ہوئے ہیں یوں سمجھیں کہ ہر فیلڈ میں ڈپلومہ حاصل کیا ہے کیونکہ مجھے سب کچھ سیکھنے کا بہت شوق تھا اور میں ہر کام میں ماہر ہونا چاہتی تھی اور ڈگری لینے کے بہ نسبت ڈپلوما لینا آسان ہے۔"

★ "تو یہ سب ڈپلوماز کام آرہے ہیں آپ کے؟ اور شوبز میں آمد کیسے ہوئی؟"

✻ "بہت کام آرہے ہیں اور شوبز میں آمد بھی ان ہی ڈپلوماز کی بدولت ہے ہوا یہ کہ مجھے فیشن ڈیزائننگ کا شوق تھا اور جب میں نے نیا نیا کام شروع کیا تو انڈس ویژن چینل میں ڈیزائنر کے انٹرویوز وغیرہ بہت ہوتے تھے تو میرا بھی انٹرویو ہوا۔ پھر ہمارے ایک دوست ہیں انہوں نے کہا کہ تم بولتی بہت اچھا ہو اس لیے ہوسٹنگ کی طرف آؤ۔ اس وقت تو زیادہ دھیان نہیں دیا لیکن جب زیادہ آفرز آنے لگیں تو سوچا کہ قسمت آزما ہی لیتے ہیں تو میں نے اس آفر کو قبول کرلیا اور آفرز کو قبول کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں بڑے پیمانے پر کام کر سکتی اور لڑکیوں کو پیسہ دینے سے ویسے ہی لوگ بہت گھبراتے ہیں۔ چنانچہ پھر شوبز میں آئی اور پیسہ بھی کمایا اور ساتھ ساتھ کاروبار بھی کیا۔"

★ "تو ابتدا اس فیلڈ میں کس پروگرام سے ہوئی؟"

✻ "ایک کوکنگ شو سے ابتدا کی تھی۔ ایک آئل اینڈ گھی کمپنی کا پروگرام تھا جو کہ میں نے ایک نجی چینل سے کیا اور شہرت بھی مجھے ایک کوکنگ شو سے ہی ملی جو کہ میں نے ایک اور نجی چینل سے کیا اور اس کا نام "کچن کوئین" تھا۔"

★ "اس سے کمائی کا عمل شروع ہوا؟"

✻ "میری کمائی کا عمل تو خیر بہت پہلے شروع ہو گیا تھا اور بڑے دلچسپ انداز میں ہوا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا کہ میں فیشن ڈیزائنر بھی ہوں تو جب میں نے یہ کام شروع کیا تو اس وقت میں نے نیا نیا کالج جوائن کیا تھا تو اس وقت میں ڈریسز بنا بنا کر مختلف آؤٹ لیٹ پہ رکھواتی تھی تو وہاں سے مجھے اچھے خاصے پیسے مل جایا کرتے تھے۔"

★ "لوگ تو جلدی ترقی کرنے کے لیے شارٹ کٹ بھی استعمال کرتے ہیں.... کبھی خیال آیا کہ کوئی شارٹ کٹ لے لوں؟"

✻ "نہیں.... میں اس چیز کے بہت خلاف ہوں اور شوبز میں تو میں نے خاص طور پر یہ بات دیکھی ہے کہ بہت غلط ذرائع سے لوگ اونچائی پہ پہنچ جاتے ہیں لیکن پھر ان کی شہرت بھی اسی انداز میں ہوتی ہے اور جو محنت کرکے اور سیدھے راستے سے آگے آتے ہیں لوگ نہ صرف ان کی قدر کرتے ہیں بلکہ ان کی مثالیں بھی دیتے ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ جو جتنا جلدی اوپر جانے کی کوشش کرتا ہے پھر وہ گر بھی جاتا ہے۔ کبھی بھی شارٹ کٹ انسان کے لیے بہتر ثابت نہیں ہوا۔"

★ "ملک سے باہر جاکر متاثر ہوتی ہیں؟"

✻ "بہت زیادہ.... کیونکہ اگر وہ لوگ عوام سے ٹیکس وصول کرتے ہیں تو سہولیات بھی بہت دیتے ہیں تحفظ بہت ہے۔ کرائم نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ وہاں کے توچپراسی کی زندگی بھی اتنی ہی اچھی ہوتی ہے جتنی بڑی پوسٹ کے لوگوں کی ہوتی ہے۔"

★ "اتنے ڈھیر سارے کاموں میں اپنے آپ کو الجھایا ہوا ہے۔ کبھی کوئی کام مشکل بھی لگا کہ چھوڑ نہیں ہو رہا تو نہ کروں؟"

✻ "میں نے جن کاموں میں اپنے آپ کو الجھایا ہوا ہے وہ اپنے شوق کی وجہ سے کہ مجھے ان کو کرنے میں مزا آتا ہے اور کوئی کام مشکل لگے تو گھبرا کر چھوڑتی نہیں ہوں بلکہ اس کو چیلنج سمجھ کر پورا کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ آسان کام تو
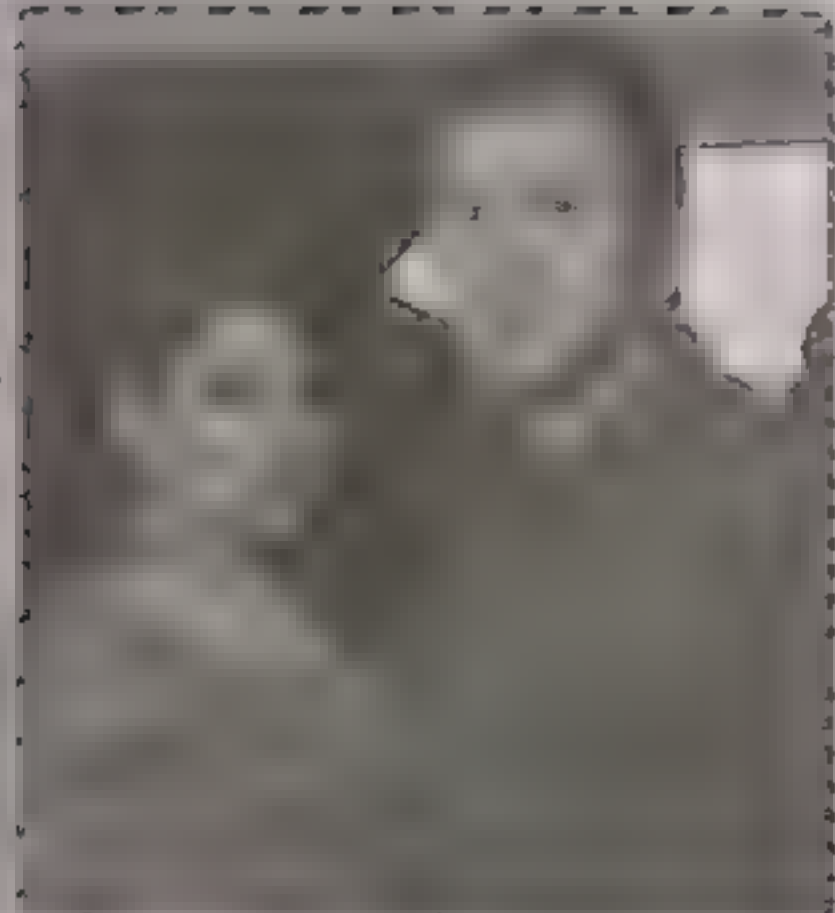
خوشی خوشی کر لیے اور مشکل کو چھوڑ دیا۔ مجھے ڈائیٹ کرنا اچھا لگتا ہے اور ویسے بھی رب پہ مجھ میں بہت اعتقاد ہے اس لیے سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

★ "کچھ حاصل کرنے کے لیے بہت تگ و دو کرنی پڑتی ہے یا آسانی سے سب کچھ مل جاتا ہے؟"

☼ "نہیں مجھے کبھی بھی آسانی سے کچھ نہیں ملا۔۔۔ شاید اللہ تعالیٰ کا خیال ہے کہ میں قدر نہیں کروں گی۔ اس لیے جو کچھ ملا وقت پر ملا یا تھوڑی دیر میں ملا اور میں سمجھتی ہوں کہ اگر وقت سے پہلے کچھ مل جائے تو نہ صرف انسان اس کی قدر نہیں کرتا بلکہ اوور کانفیڈنس بھی ہو جاتا ہے۔"

★ "آپ اداکاری کی سائیڈ پر کیوں نہیں گئیں؟"

☼ "اس کی بھی کچھ وجوہات ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ انڈین ڈراموں کو شروع شروع میں بہت کاپی کیا جا رہا تھا یہ بات مجھے پسند نہیں پھر سین بہت کلوز ہو گئے ہیں بیڈ روم کے سین بلاجھجک ہوتے ہیں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گھومنا یہ سب مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے اور نہ ہی میں ایسا کر سکتی ہوں بس اس لیے مجھے اداکاری کی سائیڈ آنا پسند نہیں ہے۔ ہم نے ساری زندگی پی ٹی وی دیکھا اور جس طرح سے ہماری پرورش ہوئی ہے اس میں ان سب باتوں کو بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔"

★ "تو آپ اور گھر والے ان ڈراموں کو دیکھتے بھی نہیں ہیں؟"

☼ "نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ ڈرامے تو بے شک سب دیکھتے ہیں لیکن جب ہم خود کام کرنا چاہیں گے تو نہ اس کی اجازت ملے گی اور نہ ہی گھر والوں کو یہ بات پسند آئے گی اور میرے شوہر بھی پاکستانی ڈراموں کو سخت ناپسند کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان ڈراموں میں نیا پن کیا ہے۔ تو پھر ان کو دیکھ کر اپنا وقت ضائع کیوں کریں۔"

★ "کمرشلز کے لیے منع نہیں کرتے؟ اور کس ڈائریکٹر اور آرٹسٹ کے ساتھ زیادہ کمرشلز کیے ہیں؟"

☼ "نہیں کمرشل اداکاری سے بہت مختلف چیز ہے اور جہاں تک ڈائریکٹرز کی بات ہے تو میں نے تقریباً سب کے ساتھ ہی کام کیا ہے۔ کوئی بھی ڈائریکٹر ایسا نہیں ہے کہ جس کے ساتھ میں نے کام نہ کیا ہو اور ماشاءاللہ ہمارے یہاں بہت ٹیلنٹ ہے لیکن افسوس اس وقت بہت ہوتا ہے جب انڈین شکلیں دیکھنے کو نظر آتی ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے انڈین ڈائریکٹر بھی ہمارے یہاں ہی آگئے ہیں اس وقت بہت افسوس ہوتا ہے۔"

★ "آپ کا کوئی کمرشل جو لوگوں کو ابھی تک یاد ہو؟"

☼ "ایسے تو بہت ہیں لیکن مجھے یاد ہے کہ جس زمانے میں "پک ٹیل" ہوا کرتا تھا وہ کمرشل بہت زیادہ مقبول عام ہوا تھا ہر ایک کی زبان پر وہی کمرشل ہوا کرتا تھا۔"

★ "ایوننگ پروگرام "چائے ٹائم" کے علاوہ آپ کسی میں نظر نہیں آتیں۔۔۔ کیوں؟"

☼ "اس لیے کہ میرے پاس بالکل بھی ٹائم نہیں ہے پہلے مجھے پیسہ کمانے کا شوق تھا بلکہ یوں کہیں کہ پیسہ میری ضرورت تھی تو میں ہر چینل پہ نظر آرہی ہوتی تھی مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اس لیے میرا دل چاہتا ہے کہ میرا جو شو ہے اس پہ میں سو فیصد دھیان دوں اور اسے اتنا اچھا بنا دوں کہ لوگوں کو اس پروگرام سے عشق ہو جائے کہ واقعی ہم کچھ کام کر رہے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ جو لوگ ڈرامے کر رہے ہوتے ہیں ہوسٹنگ بھی کر رہے ہوتے ہیں اور دیگر کام بھی کر رہے ہوتے ہیں ان کے کام میں آپ کو فرق نظر آجائے گا۔ ان کے پروگرام اور کام کا وہ معیار نہیں ہو گا جو ہونا چاہیے۔ اس لیے اب تو میں یہ سوچتی ہوں کہ بس ایک ہی کام کروں ٹی وی پہ مگر بہت اچھا کروں۔۔۔ اور اس لیے آج کل میری ساری توجہ "چائے ٹائم" پر ہی ہے۔"

★ "ڈھیر سارے جو کوکنگ چینلز ہیں وہ شوق سے دیکھتی ہیں آپ؟"

☼ "بالکل بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔۔۔ اور اب مجھے ایک بات کا بہت افسوس ہے کہ ایک کوکنگ چینل کو ڈرامہ چینل میں کنورٹ کر رہے ہیں تو میں سوچتی ہوں کہ لوگ کتنے ڈرامے دیکھیں گے۔ انہیں کچھ اور بھی دیکھنے کو دیں۔ عوام تو اپنے پسندیدہ ڈرامہ چینل ہی دیکھیں گے وہ اب کسی اور چینل پہ ڈراموں کو ترجیح نہیں کریں گے۔"

★ "کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔۔۔ پھر مزید باتیں کرتے ہیں؟"

☼ "اپنے بارے میں کیا بتاؤں؟۔۔۔ میرا نام سب کو معلوم ہے کہ نازیہ ملک ہے۔ 20 فروری کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ ہائیٹ میری 5 فٹ 3 انچ ہے جبکہ ستارہ Pisces ہے۔ میرے دو بھائی ہیں اور ہم چار بہنیں ہیں اور میں آخری ہوں۔"

★ "شادی ہوئی آپ کی؟"

☼ "جی میرا نکاح ہو چکا ہے اور جب تک آپ کا انٹرویو چھپے گا میرا انٹرویو لگے گا میری رخصتی ہو چکی ہو گی ان شاءاللہ۔"

★ "دھوم دھام سے شادی کرنے کی قائل ہیں؟"

☼ "نہیں بالکل بھی نہیں۔۔۔ مجھے رسمیں بہت اچھی لگتی ہیں مگر میرا دل چاہتا ہے کہ ان میں سادگی کا عنصر نمایاں ہو' میں نے اکثر دیکھا ہے کہ لوگ قرض لے کر بھی شادی دھوم دھام سے کرتے ہیں جو کہ غلط رجحان ہے تو سادگی سے شادی ہونی چاہیے تاکہ دوسروں کے لیے مثال بن سکیں اور میں ایک بات اور بھی کہنا چاہوں گی کہ شادی کے موقع پر لوگ بڑے بڑے گفٹ لے کر آتے ہیں اگر وہ گفٹ کی بجائے نقدی دے دیا کریں تو شادی کرنے والوں کا کچھ خرچ cover ہو جائے گا۔"

★ "تجویز تو اچھی ہے۔ اگر لوگ اس پر عمل کریں تو۔"

☼ "جی ہاں۔۔۔ میں تو کہتی ہوں کہ سب کو عمل کرنا چاہیے۔۔۔ سب کا فائدہ ہو گا اور سب خوش بھی ہوں گے۔"

★ "رخصتی سے پہلے میاں صاحب سے ملنے کی اجازت ہے۔۔۔ کیا کرتے ہیں میاں صاحب؟"

☼ "ارے کیوں نہیں' بالکل اجازت ہے میں تو اپنے سسرال بھی چلی جاتی ہوں۔ میری ساس بہت اچھی ہیں اور کھانے پکانے میں ماہر' ان کے ہاتھ میں بہت لذت ہے۔ جب وہ کوئی اچھا کھانا پکاتی ہیں اور میرے میاں بتا دیں کہ امی نے آج یہ پکایا ہے تو میں بھاگتی ہوں اپنے سسرال کہ امی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھا سکوں ساس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا میری کمزوری ہے اور میاں صاحب کا اپنا بزنس ہے۔"

★ "اپنی ڈائیٹ کا خیال رکھتی ہیں؟"

☼ "جی جی۔۔۔ بالکل رکھتی ہوں۔ کیونکہ ہمیں

اسکرین پہ آنا ہوتا ہے تو میں تو بہت زیادہ ڈائٹنگ کرتی ہوں۔ یہ نہیں کھانا وہ نہیں کھانا گن گن کر سوچ سوچ کر کھا رہی ہوتی ہوں۔"

★ "سیلیبرٹی بن کے کیا محسوس کرتی ہیں؟"

✳ "احساس ہوتا ہے کہ ہم بہت مختلف ہیں کیونکہ ایک آدمی پر ہر کسی کی نظر نہیں پڑتی جبکہ کوئی سیلیبرٹی ہو تو لوگ اسے مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں آپس میں ڈسکس کرتے ہیں ان سے آکر ملتے ہیں آٹوگراف لیتے ہیں تصاویر بنواتے ہیں تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوتا ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے جب میں عام لوگوں میں خاص ہوتی ہوں۔"

★ "خواہش تھی کہ میں عام سے خاص ہو جاؤں؟"

✳ "بالکل تھی اور میں نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے عزت والی شہرت دے اور وہ اس نے مجھے دی الحمد للہ میں بہت خوش ہوں کہ اس نے مجھے بری شہرت نہیں دی۔"

★ "مارننگ شو دیکھتی ہیں۔۔۔ کیسے لگتے ہیں؟"

✳ "ہاں دیکھتی ہوں اور شکر کرتی ہوں کہ انڈیا کے مارننگ شو یا ترکی کے مارننگ شو پیش نہیں کیے جاتے ابھی ہمارے پاس ایک اپروچ ہے کہ لائیو مارننگ شو فرام پاکستان مجھے مارننگ شو بہت اچھے لگتے ہیں خواتین کی تفریح کا بہترین ذریعہ ہیں شادی کی جو Attraction ہوتی ہے وہ مارننگ شو میں نظر آ رہی ہوتی ہے۔ لوگ اور خصوصاً" خواتین ان پروگراموں کو دیکھنا چاہتی ہیں۔"

★ "تہواروں میں کون سے تہوار شوق سے مناتی ہیں؟"

✳ "سب ہی عید بہت اچھی لگتی ہے اور ویلنٹائن ڈے کی تو بات ہی الگ ہے اور لوگوں کے برے خیالات تھے اس دن کے بارے میں تو ایسا کچھ نہیں ہے کہتے ہیں کہ ویلنٹائن نے ناجائز شادیوں پر زور دیا تھا تو ایسا نہیں ہے بلکہ اس نے اس کے خلاف جہاد کیا تھا اور کہا تھا کہ شادی ہونی چاہیے۔"

★ "یہ بھی تو کہا جاتا ہے کہ یہ انگریزوں کا تہوار ہے؟"

✳ "بھئی میں تو کہتی ہوں کہ انگریز اپنی پروڈکٹ کو بیچنے کی خاطر کوئی نہ کوئی تہوار کرواتے رہتے ہیں جیسے مدرز ڈے، فادرز ڈے وغیرہ وغیرہ تو اس میں کوئی ایسی قابل اعتراض بات نہیں ہے کہ یہ دن نہ منایا جائے یہ تو محبت و پیار کا دن ہے ضرور منانا چاہیے۔"

★ "شوٹ کے کام سے فارغ ہو کر جب گھر آتی ہیں تو کیا دل چاہتا ہے جلدی سے سو جاؤں یا کچھ کام کر لوں؟"

✳ "نہیں جلدی سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ویسے بھی میں تو ٹائم ٹیبل کے حساب سے چلتی ہوں۔ اس وقت کھانا ہے اس وقت سونا ہے فلاں وقت یہ کام کرنا ہے ہاں جب گھر آتی ہوں تو تمام کاموں سے فارغ ہو کر نماز ضرور پڑھتی ہوں اور پھر کھانا کھاتی ہوں۔"

★ "آپ کے پسندیدہ چینلز کون سے ہیں؟"

✳ "میں ڈراموں کے چینلز بہت شوق سے دیکھتی ہوں سی این بی سی بہت شوق سے دیکھتی ہوں کیونکہ اس میں تو میرے پروگرام آ رہے ہوتے ہیں اس کے علاوہ کوکنگ چینلز جیسا کہ میں نے بتایا بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔"

★ "موبائل اب اہم ضرورت ہے جب سروس بند ہو تو کیسا لگتا ہے؟"

✳ "اتنا زیادہ فرق نہیں پڑتا کیونکہ فیس بک اور "واٹس اپ" وغیرہ کی سہولت تو ہوتی ہی ہے۔"

★ "سی این بی سی اور سی این جی۔۔۔ ملتے جلتے نام ہیں۔ ایک چینل ہے اور دوسری گیس۔۔۔ لائن میں لگنا کیسا لگتا ہے؟"

✳ "قہقہہ۔ کیا بات ہے جی آپ کی میں نے لائن سے بچنے کے لیے اپنی گاڑی سے سی این جی کٹ نکلوا دی ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے نازیہ ملک سے اجازت چاہی۔

☆ ☆

دل و دھیان کی سیڑھیاں

ادارہ

جنوری کے موسم میں پھول نہیں کھلتے مگر دلوں میں امید کی پنیری ضرور رنگ جاتی ہے کہ شاید کاتب تقدیر نے نئے سال میں ہماری ذاتی و گروہی زندگی کے لیے خوشیوں کا کوٹہ زیادہ رکھا ہو۔ کیا پتا اس سال ہماری انفرادی و اجتماعی الجھنیں کوئی حل پا لیں۔ صرف ہندسے کے بدل جانے سے ہم کیا کیا اچھا نہیں سوچ لیتے کہ شاید اس برس۔

☆ ہمارے حکمران آداب حکمرانی سے واقف ہو جائیں۔

☆ صاحب اختیار اپنے اختیار کے صحیح مصرف سے آگاہ ہو جائے۔

☆ وہ مسیحا نمودار ہو جائے جو انسانیت کی لاعلاج بیماریوں کا شافی علاج کر سکے۔

اس حقیقت سے منحرف ہو کر کہ جب ہمارے اعمال و افعال وہی پرانے والے ہیں تو اس کے نتائج کیسے نئے اور مختلف ہو سکتے ہیں؟ صرف کیلنڈر بدلنے سے تقدیر تو بدلنے سے رہی۔

فریب ابر کرم بھی بڑا سہارا ہے
بلا سے نخل تمنا خزاں رسیدہ سہی

لیکن "نخل خزاں رسیدہ" میں "امید" کے دم سے ہی بہار ہے اور انسان امید کا سہارا لے کر اپنے شب و روز کا آئینہ چمکانے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتا ہے کہ جب مستقبل ماضی کی طرف نگاہ کرے تو روشن ماضی اپنی خیرہ کن روشنی سے اس کی مایوسی کا علاج کر سکے۔

ہجوم فکر و نظر سے دماغ جلتے ہیں
وہ تیرگی ہے کہ ہر سو چراغ جلتے ہیں

کرن نے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے قارئین کے لیے سروے کا اہتمام کیا۔ آیئے دیکھتے ہیں ان سوالات کے کیا جواب دیے ہیں؟

سوالات

1۔ کیا سال کی شروعات میں اپنے اہم کاموں کو پلان کرتی ہیں؟
2۔ صرف ہندسے کے بدل جانے سے زندگی پہ طاری جمود پہ کوئی فرق پڑتا ہے؟ اس بارے میں آپ کی رائے۔
3۔ آگہی کے اس دور میں جب چھوٹی سی خبر بھی سیکنڈوں میں میلوں کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ گزرے سال کی کس عالمی خبر نے آپ کو متاثر کیا اور کیوں؟
4۔ یہ زندگی کا اصول ہے لوگ ملتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں گزرے سال میں کون اپنا جدائی کا غم دے گیا اور کس نے آپ کی زندگی میں شامل ہو کر اس کی رعنائیوں کو آپ پر منکشف کیا؟
5۔ جنوری کے امیدوں بھرے موسم میں آپ کا زندگی سے بھرپور پیغام کس کے لیے اور کیا ہے؟

ڈاکٹر صبیحہ راشد۔۔۔ نارتھ ناظم آباد۔ کراچی

1۔ جی ہاں! لیکن صرف اسی صورت میں جبکہ وہ خاص کام اسی سال کے لیے ہو مثلاً "بچوں کے داخلے (مخصوص عمر میں ہونے کے باعث) یا متوقع شادی بیاہ

کی تیاری یا سفر متوقع ہو تو اس حساب سے پلان کرتے
ہیں باقی رہے نام اللہ کا!
2 ۔ یقیناً "نہیں" ہندسے یقیناً" اہم نہیں" انسان
اہم ہیں' جمود صرف اسی صورت میں ٹوٹتا ہے جب
کوئی خوشی کی خبر ملے یا دل کو چھو لینے والا کوئی احساس یا
خدانخواستہ کوئی مشکل گھڑی (جس میں اپنے پیاروں کا
ساتھ شرط ہے) پیش آجائے ورنہ تو دن و رات کی وہی
صورت ہے۔
بقول شاعر۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے

3 : ملالہ یوسف زئی' یہ لڑکی ابتدا ہی سے دھیان کا
حصہ رہی' لیکن خصوصیت سے اس کا نوبل انعام کے
لیے نامزد ہونا پھر افواہوں کا حصہ بننا' دماغ اپنے آپ کو
کسی فیصلہ پر پہنچنے سے قاصر پاتا ہے۔ اس کے علاوہ
ننھے برطانوی شہزادے کی پیدائش کی خبر اور اس سے
جڑے تمام مناظر توجہ حاصل کر گئے۔
4 : یہ سال ایک ایسا عظیم نقصان کر گیا جس کی
تلافی کسی طور ممکن نہیں' 12 جولائی
2013ء کی شام وہ سایہ سر سے اٹھ گیا جسے باپ
کہتے ہیں' فروری 2013ء میں ان کی تشخیص
ہونے سے لے کر جولائی میں ان کے انتقال تک کا
عرصہ شدید کرب میں گزرا جس کی انگلی پکڑ کر چلنا
سیکھا اسے یوں دوسروں کے سہارے کا محتاج دیکھنا کڑا
امتحان تھا۔ بیچ میں کئی بار ان کی حالت بگڑی' 3 بار
I.C.U میں بھی داخل رہے اور 2 رمضان
بروز جمعہ وہ ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔ دوسرا نقصان
میرے جواں سال جیٹھ سعید بھائی کی جدائی کی صورت
ہوا جو حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث اچانک
ہمیں چھوڑ کر چلے گئے' اللہ تعالیٰ ان دونوں کو جوار
رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)۔ یہ صدمہ ہم
بہن بھائیوں اور والدہ کے ساتھ ساتھ ہمارے خاندان
کے دیگر افراد کو بھی متاثر کر گیا خصوصاً" دادی'
پھوپھیاں اور چچا آج تک اس غم کے زیر اثر ہیں تو
دوسری طرف سسرال میں بھی ساس صاحبہ کے لیے
ایک بڑا نقصان ہے جو کسی صورت پورا نہیں ہو سکتا۔
: نئے سال کی مبارک باد کے ساتھ میرا پیغام اپنے
پیاروں' قارئین بہنوں' دوستوں' اپنے عزیز شوہر'
بچوں خصوصاً" اپنی پیاری بیٹیوں کے لیے ہے کہ یہ
سال ہم سب کے لیے خوشیوں' کامیابیوں کا پیغام
لائے' صحت' تندرستی' تونگری ہم رکاب رہے اور
خصوصاً" اپنے پیارے شہر قائد کے باسیوں کے لیے
کہ یہ سال امن کا پیغام لائے اور خوف و ہراس کے
سائے چھٹ جائیں۔ (آمین)

شمائلہ تاج.... خانپور

(1) جی ہاں میں سال کے شروع میں بہت ساری
چیزیں پلان کرتی ہوں جن میں سے کچھ تو پوری ہو جاتی
ہیں جبکہ کچھ ادھوری رہ جاتی ہیں جن کو پورا کرنے کے
لیے پھر اگلے سال کی پلاننگ میں شامل کر دیتی ہوں۔
(2) سوچا جائے تو صرف ہندسے کے بدل جانے سے
زندگی پر طاری جمود پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا' مگر سوچا
جائے تو فرق پڑتا بھی ہے۔ وہ یوں کہ ہو سکتا ہے کہ جو
کچھ ہمیں چاہیے وہ ہمیں پچھلے سال نہیں ملا اور
اگلے سال یعنی ہندسے کے بدل جانے کے بعد ملے تو
پھر ہمیں فرق تو پڑتا نا؟ اور اس سے زندگی پر طاری جمود
بھی کم ہو گا۔ یعنی اگر ہمیں خوشیاں ملیں گی تو ہندسے
کے بدلنے سے جمود کم ہو گا اور اگر بالفرض ہمیں کوئی
کامیابی' خوشی نہیں ملتی تو پھر جمود ویسا ہی رہے گا اس پر
ہندسے کے بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔
(3) دنیا میں بہت کچھ ہو رہا ہے۔ اچھی خبریں سننے کو
تو کان ہی ترس گئے ہیں۔ زیادہ تر تو بری خبریں ہی سننے کو
ملتی ہیں۔ سچ بتاؤں تو ایک وقت میں میں روزانہ اخبار کا
مطالعہ کرتی تھی مگر اب بالکل چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ
بقول میرے اخبار پڑھنے سے سوائے ٹینشن کے اور
کچھ نہیں ملے گا۔ اس لیے میں خبروں پر اب زیادہ توجہ
نہیں دیتی۔
(4) جی ہاں زندگی کا یہی اصول تو ہے لوگ ملتے ہیں
اور بچھڑ جاتے ہیں۔ جولائی 2013ء کو میرے
تایا ابو کی اچانک وفات ہوئی جو پورے خاندان کے لیے
ایک شاک تھی۔ ان کو اچانک سے کینسر ہو گیا تھا۔
اچانک اس لیے کہا کہ پتا اس وقت چلا جب کچھ نہیں
ہو سکتا تھا۔ میرے تایا خود چونکہ حکیم تھے اور ان
کو اپنی بیماری کا پتا ہی نہ چلا۔ پتا چلا بھی تو بہت دیر
ہو چکی تھی۔ ان کو صرف ٹیسٹ وغیرہ کے لیے رحیم
یار خان لے کر گئے مگر وہاں "شیخ زید اسپتال" والوں
نے یہ کہہ کر ایڈمٹ کر لیا کہ ان کی حالت بہت
خراب ہے۔ پھر ایک ہفتے بعد ہی جمعہ کی نماز کے
وقت ان کی وفات ہوئی۔ اتنا اچانک سب کچھ ہو گیا کہ
کسی کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ ہو گیا۔ اس سے پہلے میں
جنوری کی پانچ تاریخ کو میری دادی کی وفات ہوئی اور
ٹھیک چھ ماہ بعد پانچ جولائی کو میرے تایا کی وفات ہوئی۔
(اللہ دونوں کو جنت میں جگہ دے) آمین۔ کوئی خاص
میری زندگی میں شامل نہیں ہوا۔
(5) جنوری کے امیدوں بھرے خوشگوار موسم میں
میرے محبت بھرے صورت پیغام میری فیملی اور میری سب
دوستوں کے نام ایک شعر کی صورت میں ہے۔

گردش دوراں پر اختیار نہیں ہے مگر
خدا وہ دن نہ لائے کہ پریشان ہو تم

ممتاز بانو.... کراچی

کچھ خوشیاں کچھ آنسو دے کر ٹال گیا
جیون کا اک اور سنہرا سال گیا

1۔ نیا سال شروع ہوتے ہی میری شادی کی سالگرہ
آتی ہے اور میں اسی کو پلان کرتی ہوں کہ اس دفعہ کہاں
جا کر یہ شام گزارنی ہے ویسے اسی نئے سال شروع ہوتا
ہے تو ایک ارادہ باندھتی ہوں اور حمد ہے پھر اپنی اس
عادت پر قائم رہنا چاہتی ہوں اس سال چغلی اور غیبت
بالکل نہیں کروں گی اور اگر کوئی کر رہا ہو تو اسے منع
کروں گی۔ اللہ کامیاب کرے۔
2۔ ہاں ایک ہندسہ بدل جانے سے بہت فرق پڑتا
ہے کیونکہ صفر بذات خود کچھ نہیں' مگر ہندسے سے
بہت فرق پڑتا ہے عمر کا ایک سال کم ہوتا ہے۔
3۔ مجھے تو ہر چھوٹی سے چھوٹی خبر بھی متاثر کرتی
ہے۔ خواہ وہ جو بھی ہو' مگر پچھلے سال ثمینہ اکرم کے بیٹے
کی شہادت کا پڑھ کر میں بہت افسردہ ہوئی مجھے ایسا لگا کہ
میرا کوئی اپنا بچہ..... اللہ انہیں صبر دے۔ عدسی کی خبر سن کر
بہت افسوس ہوا کیونکہ ہمارے ملک میں بہت سے
لوگ فلاحی کام کرتے ہیں وہ بھی کسی صلے کے بغیر' مگر
نوبل پرائز کے لیے نامزد بھی نہ کیے۔ (معافی کے
ساتھ)
4۔ گزرے سال میرے گھر میں ایک اور نواسی کا
اضافہ ہوا اور وہ بالکل میری گڑیا کی کاپی ہے اس کو دیکھ
کر میں اپنے آپ کو بیس سال پہلے کے مقام پر دیکھتی
ہوں اس کی ہنسی اس کا رونا مجھے سب کچھ شروع سال
کی یاد دلاتا ہے چونکہ میں نے اپنے گھریلو مسائل کی
وجہ سے اپنے بچوں کا بچپن انجوائے نہیں کیا مگر اب
سود سمیت وصول کر رہی ہوں۔
5۔ جنوری کے مہینے میں بہت خوشی محسوس کرتی
ہوں کیونکہ ٹھنڈے موسم میں ہر کوئی ٹھنڈا ہوتا ہے نہ لڑائی

شیڈنگ کی ٹینشن اور نہ ہی بجلی کا بل زیادہ آنے کی ٹینشن (اے سی کی وجہ سے) بہنوں سے صرف یہ گزارش ہے کہ زندگی بہت چھوٹی ہے اس میں اپنے آپ کو ایک رول ماڈل بنائیں اپنے بچوں کے لیے اور اپنے ملک کے لیے کیونکہ ہم اچھا سوچیں گے تو ان شاءاللہ اچھا ہی ہوگا۔

سعدیہ نازلی رانا.... کسووال

1۔ کہاں جی؟ کچھ بھی پلان نہیں ہوتا اور اگر ہو بھی تو پلان کے مطابق کچھ نہیں ہوتا۔ ہم تو ایسے ہیں جی کہ سال کے شروع میں پلاننگ ہوتی ہے یہ کرنا ہے وہ کرنا ہے۔ سال کے درمیان میں سر پکڑ کے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہائے یہ کیا کرلیا؟ ہم نے ویسے کرنا تھا اور سال کے آخر میں پھر ان شاءاللہ یہ یہ کام کرنے ہیں۔ گزرے کئی سالوں سے میرے پلان میں شامل ہے کہ بمباسٹک سی کہانی لکھنی ہے جو مجھے عمیرہ احمد، نمرہ اور فرحت اشتیاق کی صف میں شامل کردے۔ (ہاہا) پر "دلی ہنوز دور است"

2۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ زندگی یونہی تمام ہوتی ہے۔ میری زندگی پر تو کم از کم یا کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ہندسے بدل رہے ہیں، کیلنڈر بدل رہے ہیں اور سب سے زیادہ لوگ بدل رہے ہیں، رویے، سوچیں، احساسات سب کچھ بدل رہا ہے۔ بے حسی سی طاری ہے ہر جذبے ہر احساس پر۔ کالج سے پرانے چہرے چلے جاتے ہیں۔ ان کی جگہ نئے چہرے لے لیتے ہیں۔ باقی تو کچھ خاص فرق نہیں پڑتا۔

3۔ بہت خبریں متاثر کرتی ہیں۔ کہیں طوفان، کہیں سیلاب، کہیں آگ اور کہیں زلزلے۔ علمائے دین کا قتل، شیعہ، سنی فسادات، شہر عروساں کے حالات، بھارت کی دھمکیاں، امریکا کی جارحیت، ڈرون حملے، فلسطین کے حالات سب کچھ متاثر کررہا ہے ہمارے ذہنوں کو، ہمارے جسموں کو، ہمارے جذبوں کو۔ ابھی ابھی ہونے والی نیلسن منڈیلا کی موت نے تقریباً ساری دنیا کو متاثر کیا۔ قوم، مذہب اور قبیلے کے امتیازات سے بالا ہو کر انہوں نے ہر ظلم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ایسے ہی لوگ اپنا نام سنہری حروف میں لکھوا کر ابدی زندگی حاصل کرلیتے ہیں۔ افتخار چوہدری ہمارا فخر، ہمارا امتیاز۔ جس نے عدلیہ کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو کنارے پر لگایا۔ سلام افتخار چوہدری صاحب۔

4۔ میں ایک پرائیویٹ کالج میں ٹیچر ہوں۔ گزرے سال میں بہت سی ٹیچرز اپنے پیاروں کو پیاری ہوئیں۔ نزہت، شازیہ، فرحت، نادیہ ان سب دوستوں کی بہت محسوس ہوتی ہے۔ نظام زندگی چلتا رہتا ہے نئے، پرانے لوگوں کی جگہ سنبھالتے رہتے ہیں۔ لیکن جو چلے جاتے ہیں ان کی یاد کی کسک ہمیشہ رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمین) اس سال دو نومبر کو بھائی کی شادی ہوئی۔ عابدہ (بھابی) ہمارے گھر کا فرد بنی۔ بہت اچھا لگا۔ عابدہ بہت اچھی ہے اور بھائی بھی۔ اللہ پاک ان کی زندگی کی ہر راہ گزر کو پھولوں سے بھرا رکھے۔ (آمین)

5۔ جنوری نئے سال، نئی امیدوں، نئی امنگوں کا استعارا ہے۔ جو ہر ایک میں نیا جوش و ولولہ بھر دیتا ہے۔ کچھ لمحوں کے لیے سہی انسان تازہ دم ہو کر پھر سے اچھا سوچنے لگتا ہے۔ میرا پیغام میرے سب ہم وطنوں کے لیے یہی ہے کہ اپنے حصے کی شمع جلاتے جائیں یہ سوچے بغیر کہ میری شمع سے آخر کتنا اندھیرا دور ہوگا۔ ان شاءاللہ جب سب لوگ اپنے فرائض کریں گے اور دوسرے کے حقوق کا خیال رکھیں گے تو پاکستان کا کونا کونا چمک اٹھے گا۔ بقول مارٹن لوتھر کنگ! "آؤ مایوسیوں کے پہاڑ سے امید کا پتھر تراشیں"

اور ایک اور پیغام اپنے جیون ساتھی رانا محمد ... کے نام۔ 15 جنوری کو آپ کی سالگرہ ہے۔ علیان، ارحا، چندہ، جویریہ، اقراء، نعیم اور باقی سب گھر والوں کی طرف سے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ مینی مینی ہیپی ریٹرنز آف دی ڈے۔

باقی آئندہ شمارے میں

میری بھی سنیے

آغا علی عباس

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"آغا علی عباس۔"

2 "پیار کا نام؟"
"سو سو عرف بچپن کا نام تھا۔ اب تو ہر موڈ میں اپنا نام ہی سنائی دیتا ہے۔"

3 "پیدائش کی تاریخ، سال اور جائے پیدائش؟"
"4 دسمبر 1986ء لاہور۔"

4 "میری لمبائی؟"
"6 فٹ 1 انچ۔"

5 "تعلیمی معرکہ؟"
"گریجویشن اور کافی سارے کورسز۔"

6 "میرے خونی رشتے؟"
"میرے دو بھائی اور ایک بہن۔"

7 "شادی؟"
"ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے، ابھی مزید کامیابیاں حاصل کرنی ہیں۔"

8 "اس فیلڈ میں کس کے تعاون سے آیا؟"
"طارق معراج اور رفیق وڑائچ۔"

9 "میری پہچان بنا؟"
"میرا پروگرام "ٹوٹل راؤنڈ اپ" "جناح کے نام" اور دیگر ڈرامے۔"

10 "زندگی کا فلسفہ؟"
"اس نے اکیلا اس دنیا میں بھیجا ہے تو ہمیں کچھ حاصل کرنے کے لیے اکیلے ہی جدوجہد کرنی ہے۔"

11 "اداکاری کے جراثیم کہاں سے آئے؟"
"میرے والد "آغا سکندر" جو اپنے زمانے کے بہت معروف آرٹسٹ تھے۔"

12 "کرائسس میں وقت گزارا؟"
"بالکل گزارا، جب سات سال کا تھا تو والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اپنوں سے دھوکے کھائے۔ تھوڑا عقلمند ہوا تو پھر پڑھائی کے ساتھ ساتھ کمائی بھی کی اور اپنا خرچ خود اٹھایا پڑھائی کا۔"

13 "پہلی آمدنی؟"
"800 روپے جو امی کے ہاتھوں میں دے دی۔"

14 "شوبز سے پہلے آمدنی کے ذرائع؟"
"اسکالر شپ سے پڑھائی اور اپنے سے جونیئرز کو ڈانس اور اداکاری کے ایکشن سکھایا کرتا تھا۔ کیونکہ یہ سب کچھ میں نے سیکھا ہوا تھا۔"

15 "لوگوں کی ایک بات جو بری لگتی ہے؟"
"جب وہ نصیحت کرتے ہیں جن پر انہوں نے خود کبھی عمل ہی نہیں کیا ہوتا۔"

16 "نفرت کرتا ہوں؟"

بقیہ صفحہ نمبر 264

نبیلہ عزیز

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدیحہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں' مدیحہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پر رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدیحہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باذ اقبال ملتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دلاور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

—۳۸—
اڑتیسویں قسط

"اوکے۔۔۔ میں بات کرلیتا ہوں' آپ ان کا خیال رکھیں پلیز۔ اسی مصیبت اور نقصان کے ڈر سے ہی تو میں بار بار ان کے موبائل پہ کال کر رہا تھا' مگر انہوں نے میری کال ہی ریسیو نہیں کی۔ کیونکہ مجھے ملک حق نواز اور ملک اسد اللہ کے عزائم کی خبر ہو چکی تھی۔"

ایس پی کامران مہدی افسوس کا اظہار کرتا وہاں سے ہٹ کے آپریشن تھیٹر کی طرف آیا اور پھر اگلے دس منٹ میں علیزے کا آپریشن اسٹارٹ ہو گیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ اور دعا کرو کہ سب ٹھیک ہو جائے۔" عبداللہ نے اسے سہارا دے کر صوفے پہ بٹھایا۔

"عبداللہ۔۔۔ علیزے کو کچھ ہوا تو پھر کچھ بھی نہیں بچے گا۔ کچھ بھی نہیں یا میں خود کو مار ڈالوں گا یا پھر سب موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ بس علیزے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ میری اور ملک حق نواز کی اس جنگ کی سزا علیزے کو نہیں ملنی چاہیے وہ بے قصور ہے' اسے میں نے سزا نہیں دی تو کوئی کیسے دے سکتا ہے۔ خریت؟ میری زندگی ہے وہ۔۔۔ اسی کی وجہ سے تو جی رہا ہوں میں۔۔۔ ورنہ اس دنیا میں رکھا ہی کیا ہے؟ سب بکواس ہے' سب فضول ہے' صرف وہی دوست ہے اور اسی کی وجہ سے میں ہوں۔" علیزے کی موت کے خیال نے اس کو حقیقتاً جیسے پاگل کر ڈالا تھا۔

اس کے منہ میں جو آرہا تھا وہ بولتا جا رہا تھا۔

لیکن کیا بول رہا ہے' اسے خود احساس ہی نہیں تھا۔

مگر عبداللہ کو اس کے بولنے سے اندازہ ہو چکا تھا کہ اسے علیزے سے کتنی محبت ہے اور اس کی اس محبت میں کتنی شدت ہے۔

کیونکہ اس کی شدت اور اس کی محبت تو اس کے الفاظ سے ہی ظاہر ہو رہی تھی۔ بلکہ اس محبت اور شدت میں تو اس کا رواں رواں تڑپ رہا تھا۔

جس کو سوچ کر اور محسوس کر کے عبداللہ نے بے ساختہ ایک گہری سانس کھینچی تھی اور دوبارہ سے اسے تسلی دینے میں لگ گیا کیونکہ اس وقت اس کو دو تسلی اور سہارے کی ہی ضرورت تھی۔

۞ ۞ ۞
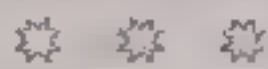
"عبداللہ! اتنی دیر سے کہاں تھے آپ؟ میں اور زری کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھیں۔ زری نے مدحیہ کی برتھ ڈے کا بھی کہا تھا' آپ نے پروگرام بنایا تھا۔"

نگارش عبداللہ کو دیکھتے ہی لائونج سے باہر نکل آئی کیونکہ اس کے خیال میں زری چکی بھی ہے لیکن اسے کیا خبر نہیں تھی کہ زری تو تخت پلکیں موندے لیٹی ہے۔

"بس یار دیر سے ساتھ تھوڑا بزی ہو گیا تھا۔" دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اس لیے دونوں کی آواز اندر تک سنائی دے رہی تھی۔

"کس کے ساتھ! کہاں تھے وہ؟" نگارش چونکی تھی اور زری اس کے نام پہ جیسے سناٹے میں آگئی تھی۔

"اسی اسپتال میں۔" عبداللہ کا انداز بہت دھیما تھا' جس پہ نگارش اب مزید تشویش کا شکار ہوئی۔

"اسی اسپتال میں' مگر کیوں؟ خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت نہیں ہے نگارش! دل آورپہ اسد اللہ بھائی نے قاتلانہ حملہ کروایا ہے اور اس وقت علیزے بھابھی دل آور کے ساتھ تھیں' جس گولی کا نشانہ دل آور کو بننا تھا' اس گولی کا نشانہ علیزے بھابھی بن گئیں اور وہ اس وقت اسی اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہی ہیں۔"

عبداللہ نے نگارش کی سماعتوں پہ بم پھوڑ دیا تھا۔ وہ یہ خبر سن کر ششدر سی رہ گئی تھی اور یہی حال اندر بیڈ پہ پڑی زری کا بھی ہوا تھا۔

"نگارش۔۔۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ دل آور علیزے بھابھی سے محبت کرتا ہے۔ مگر آج علیزے بھابھی کی

تکلیف پہ وہ کس طرح پاگل اور دیوانہ ہو رہا ہے۔ یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مجھے احساس ہو گیا ہے کہ وہ واقعی علیزے بھابھی سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔"

عبداللہ نے نگارش کے سامنے اپنی سوچ کو لفظوں کا پیراہن دیا تھا۔ لیکن اندر بیڈ پہ ویران اور اجڑی زری کے من میں دور دور تک اور بھی سناٹے چھا گئے تھے۔

اور آنکھوں سے دو آنسو بہہ کر اس کی کنپٹیوں میں جذب ہو گئے تھے۔

"محبت" زری کے لب کپکپائے تھے۔

"زری سے کہو وہ دل نور کو اپنی محبت سے آزاد کر دے ہمیشہ کے لیے کیونکہ وہ اس کا نہیں ہے اور نہ ہی بن سکتا ہے۔ اس لیے اسے آزادی بخش دے۔ نکال دے اپنے دل سے۔ بھول جائے اسے بھول جائے۔"

عبداللہ نے زری کے اس معاملے میں پہلی بار زبان کھولی تھی۔ مگر وہ بھی بے بسی اور مایوسی کی انتہا کو چھوتے ہوئے۔

اور عبداللہ کے لہجے اور انداز کی اس بے بسی اور مایوسی کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہوئے زری نے یونہی لیٹے لیٹے ایک گہری سانس خارج کی تھی اور پلکیں کھول دی تھیں۔

"بھائی۔ میں نے دل نور شاہ کو اپنی محبت سے آزاد کر دیا۔ میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ میرا نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسے آزادی بخش دی ہے۔ نکال دیا ہے اسے اپنے دل سے۔ بھول گئی ہوں اسے بھول گئی ہوں سچ مچ بھول گئی ہوں۔" زری نے زیر لب کپکپاتے لہجے اور کپکپاتے ہونٹوں سے کہتے ہوئے اپنے لرزتے کانپتے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔

اور اسے یوں لگا جیسے اس کے دل سے کوئی بہت بڑا بوجھ سرک گیا ہو۔

ہر وقت دل نور شاہ کی محبت سے بھرا رہنے والا دل خالی ہو گیا ہو۔

بالکل ایسے جیسے کوئی خالی برتن ہو۔

اب یہ خالی برتن ٹوٹ جاتا یا سلامت رہتا اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

وہ اسے آزاد کر کے خود بھی آزاد ہو گئی تھی ریلیکس ہو گئی تھی۔ یوں جیسے کوئی مرنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پرسکون ہو جاتا ہے۔

خود تم سے ملنے آئی بھی
اور ہجر بہت پچھتائی بھی
اب جھیلوں کی خاموشی ہے
یہ دوری بھی تنہائی بھی
اب نہیں تھا سیج میں ہار گئی
اس نہیں میں تھی رسوائی بھی

* * *

تحقیق ہو تو روح دو عالم تڑپ اٹھے
اتنا تیرے بغیر پریشان رہا ہوں میں

آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلتے دیکھ کر وہ یکدم ہی کسی تیر کی سی تیزی سے دروازے کے قریب آیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب۔ کیسی ہے وہ؟ وہ۔ وہ زندہ تو ہے نا۔" اس نے ڈاکٹر سے بہت ہی ڈرتے ڈرتے سوال کیا تھا۔

"آپ فی الحال اس سوال کو چھوڑیں اور ان کے لیے بلڈ کا انتظام کریں۔ ان کے لیے بہت زیادہ بلڈ کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر نے اس ڈر کے سوال کو سرے سے نظر انداز کرتے ہوئے علیزے کے لیے ایک اہم ضرورت سے آگاہ کیا تھا اور دل نور اس اہم ضرورت کا سن کر ساکت و صامت سا رہ گیا تھا۔ کیونکہ وہ علیزے کے بلڈ

...تھا۔

"بلڈ۔" اس نے بے حد آہستگی سے دہرایا تھا۔

"جی ہاں۔ بلڈ ہی کہا ہے۔" ڈاکٹر نے بھی دہرا کے جواب دیا تھا۔

"لیکن اس کا گروپ تو او نیگیٹو ہے۔" دل نور کے دماغ سے دھواں نکلنے لگا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ کسی بد حواسی میں پھنس گیا ہو اور اس کا ہاتھ علیزے کے ہاتھ سے چھوٹ رہا ہو۔

"جی ہاں۔ ان کے بلڈ گروپ کی رپورٹ آ چکی ہے۔ اسی لیے ہمارے ساتھ ساتھ اب آپ کو بھی اس کام کے لیے کوشش کرنا ہوگی۔ ورنہ ان کے بچنے کے چانسز بہت کم ہیں۔" ڈاکٹر نے کہتے ہوئے جیسے دل نور کے دل پہ ہتھوڑا مارا تھا۔

"لیکن ڈاکٹر آپ کو پتا ہے کہ نیگیٹو تو بہت۔۔۔؟" اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"ہاں۔ مجھے پتا ہے۔ لیکن آپ ان کی فیملی سے رجوع کریں۔ ہو سکتا ہے کسی نہ کسی کا بلڈ گروپ ضرور میچ کر جائے گا۔" ڈاکٹر نے اسے ایک اور مشورہ دیا تھا۔

"فیملی۔" دل نور کے ذہن میں بڑی حویلی کا نقشہ گھوم گیا تھا لیکن وہاں جانا یا پھر ان لوگوں سے اب کسی اچھے رویے کی یا ہیلپ کی امید رکھنا سراسر فضول تھا۔

"ڈاکٹر صاحب۔ فیملی سے دور ہیں۔" "آپ کی مسز کے پیرنٹس کہاں ہیں؟ انہوں نے اتنی تکلیف اور بے ہوشی کے عالم میں بھی پاپا کو یاد کیا ہے۔ اگر ممکن ہے تو پلیز آپ ان کے فادر کو یہاں بلا لیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے فادر سے ملنا چاہتی ہوں ان کی اس بات پر ذرا جلدی غور کریں۔ میں نے ان کے منہ سے دو تین بار پاپا کا لفظ سنا ہے۔"

ڈاکٹر کی اس نئی افتاد پہ دل نور دم بخود رہ گیا اور اس کے آس پاس ایک عجیب سی سائیں سائیں کی آواز سنائی دینے لگی۔

"مسٹر صاحب! زیادہ سوچنے کا ٹائم نہیں ہے۔ آپ کی وائف کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ آپ نے جو کچھ بھی کرنا ہے پلیز جلدی کریں۔"

ڈاکٹر اسے ڈانٹ کر ٹھیک کر پلٹ گیا۔

"سنیے ڈاکٹر صاحب۔" عبداللہ کی آواز پہ ڈاکٹر کو عجلت کے باوجود رکنا پڑا۔

"میرا دوست اس وقت صدمے کی حالت میں ہے۔ اسے یہ بھی یاد نہیں ہے کہ میرا بلڈ گروپ بھی او نیگیٹو ہی ہے۔" عبداللہ نے ذرا سا مسکرا کے کہا تھا اور دل نور نے بری طرح چونک کر دیکھا تھا۔

اور عبداللہ کی مسکراہٹ پہ اسے یاد آیا تھا کہ ان تینوں نے انگلینڈ میں اپنے بلڈ گروپ چیک کروائے تھے اور تینوں کے گروپ الگ الگ تھے۔ کسی ایک کا بھی ایک دوسرے سے میچ نہیں ہوا تھا۔

"ارے۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے لیکن صرف ایک بیگ سے کام نہیں چلے گا۔ مزید بلڈ کی ضرورت پھر بھی رہے گی۔" ڈاکٹر کو سن کر خوشی ہوئی تھی۔

"آپ جتنی ضرورت ہے لے لیں۔" عبداللہ نے دل نور کی خاطر اپنا آپ حاضر کر دیا۔

"نو سر۔ ہم ایک وقت میں صرف ایک ہی بیگ لے سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے انکار کر دیا۔

"ڈاکٹر پلیز۔" ایک نرس نے آپریشن تھیٹر سے نکلتے ہی ڈاکٹر کو پکارا تھا اور ڈاکٹر ان دونوں کو جلدی کا اشارہ کرتے آپریشن تھیٹر میں گھس گیا تھا۔

"دیکھو دل نور۔ پلیز ہوش سے کام لو۔ ہوش میں آؤ۔ اس طرح بت بنے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اس وقت بھابھی کو تمہاری ضرورت ہے۔ سنبھالو اپنے آپ کو۔ جاؤ جیسے بھی سہی ان کی فیملی سے کانٹیکٹ کرو۔ اس وقت علیزے بھابھی کو ان کی بھی ضرورت ہے پلیز سمجھو یار۔"

دل نور بت بنا کھڑا تھا۔ جب عبداللہ نے اپنے مخصوص مردانہ اسٹائل میں اس کا کندھا تھپکا تھا اور دل نور نے چونکتے ہوئے بڑے ہی پر عزم انداز میں گردن موڑ کر عبداللہ کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"علیزے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں عبداللہ اور اس کی خاطر آج میں وہ کام کروں گا' جو میرا سر بھی کٹ جاتا تو میں نہ کرتا۔" دل آور نے کہتے ہوئے عبداللہ کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا تھا۔

"کیا مطلب؟" عبداللہ کو حیرت ہوئی۔

"مطلب بعد میں پتا چلے گا۔ ابھی میں کہیں جا رہا ہوں۔" دل آور نے ایک پرعزم سی سانس کھینچتے ہوئے کہا اور اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیر کر چہرے کے تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔

"لیکن۔۔۔ تم جا کہاں رہے ہو؟" عبداللہ ایک بار پھر لپک کے اس کے سامنے آگیا۔

"میں آج تم سب کا مقروض ہونے جا رہا ہوں۔ میں بادشاہ سے فقیر ہونے جا رہا ہوں۔ میں آج بھیک مانگنے جا رہا ہوں اب دیکھو کہ ہوتا کیا ہے۔" دل آور اس کا کندھا تھپک کے آگے بڑھ گیا تھا اور عبداللہ پیچھے کھڑا اس کی پشت دیکھتا رہ گیا۔

"سر پلیز۔۔۔ آپ میرے ساتھ آیئے۔" نرس نے قریب آکر عبداللہ کو متوجہ کیا تھا اور عبداللہ سر جھٹک کر نرس کے ہمراہ اسپتال کی لیبارٹری میں آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام ڈھل رہی تھی۔

سب اپنے اپنے کام سے واپس آچکے تھے۔ حویلی میں روزانہ کی طرح آج بھی گہما گہمی زور پکڑ چکی تھی اور کچن میں کھانے کی تیاریاں بھی عروج پہ تھیں۔ بڑی حویلی میں بہت عرصے بعد زندگی کا احساس دوبارہ سے محسوس ہوتا نظر آرہا تھا اور ذر ان سب کو ایک نظر دیکھ کر واپس پلٹ گیا تھا۔

اور ابھی وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر باہر لان میں آیا ہی تھا کہ اس کے پرسکون ہوتے ذہن پہ کوئی اور پتھر آپڑا تھا اور بڑی مشکل سے ٹھہرنے والی سوچ کی لہریں ایک بار پھر منتشر ہوگئی تھیں۔

کیونکہ ان کی حویلی کے گیٹ کے اندر ڈرائیو وے پہ ایک پراڈو آکر رکی تھی اور اس پراڈو سے اترنے والی شخصیت کو دیکھ کر ذر کا جیسے ہلا پرسکون دماغ گھوم گیا تھا۔

"منصور حسین۔۔۔" ذر نے زیر لب دہرایا تھا۔

"یہ۔۔۔ منصور حسین۔" اپنے کسی کام سے باہر نکلتی رجو بھی اپنی جگہ پہ ساکت و صامت سی ہوگئی تھی۔ بلکہ اسے ہوش نہ رہا تو وہیں اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ جیسے انہوں نے کسی آفت کو دیکھ لیا ہو۔ جبکہ وہ کسی کی سمت دیکھے بغیر آگے بڑھتا چلا آرہا تھا۔

لیکن ہر بار یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ ان کے پاس سے گزر جاتا اور وہ لوگ یوں ہی ساکت و صامت سے کھڑے رہتے۔

ذر نے جب اسے اندرونی حصے کی طرف بڑھتے دیکھا تو وہ سب کچھ ذہن سے جھٹک کر بہت تیزی سے اس کے قریب آیا تھا۔

"رک جاؤ منصور حسین۔ تمہارا ایک قدم بھی آگے بڑھنا اچھا نہیں ہوگا۔" ذر نے یکدم اس کے سامنے آکر راستہ روک لیا تھا اور دل آور کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

"دیکھو ذر آفندی۔۔۔ مجھے اپنی موت کا خوف ہوتا تو میں یہاں کبھی نہ آتا۔ لیکن افسوس کہ مجھے علیزے کی موت کا خوف یہاں کھینچ لایا ہے اور اگر علیزے کی موت کے خوف سے میں یہاں آگیا ہوں تو پھر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو ہٹا سکتا ہوں۔ کیونکہ میں اس وقت سر پہ کفن باندھ کے آیا ہوں۔ اس لیے پلیز میرے راستے کی رکاوٹ مت بنو اور مجھے وقار آفندی سے ملنے دو۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے ورنہ علیزے مر جائے گی۔"

دل آور نے بہت ہی دو ٹوک سے انداز میں ذر آفندی کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔۔۔ ذر شاید اس کی

بات سمجھ پایا۔ مجھتا مگر اس کے خون سے رنگے کپڑے دیکھ کر اس کی نظریں پتھرا گئی تھیں۔ یعنی اس کے کپڑے علیزے کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔

مگر یہ ہوا کیسے؟

اور اگر ہوا بھی تھا تو بڑی حویلی کا اس سے کیا تعلق۔

آخری خیال نے آذر کو پھر سے پتھر بنانے کی کوشش کی تھی۔ مگر تب تک وہ آذر کو سائیڈ پہ دھکیل کر خود آگے بڑھ گیا تھا۔

"منصور حسین۔۔۔ رکو' میری بات سنو۔ میں تمہارے کسی نئے ڈرامے یا کسی نئی چال میں آنے والا نہیں ہوں۔ میں تمہیں گولی سے اڑا دوں گا۔" آذر چنگھاڑتا ہوا' دھاڑتا ہوا اس کے پیچھے آیا تھا۔ اتنے میں بڑی حویلی کے کئی افراد شور کی آواز سن چکے تھے اور منصور حسین کو ایک بار پھر اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ مگر وہ سیدھا وقار آفندی کے بیڈ روم میں جا پہنچا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پہ وقار آفندی یکدم غنودگی سے ہڑبڑا گئے اور وارڈ روب بند کرتی آسیہ آفندی بھی بوکھلا گئی تھیں۔

"منصور حسین۔" آسیہ آفندی کی چیخ نکل گئی تھی' جبکہ وقار آفندی کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔

"ش۔۔۔ش۔۔۔ آ۔۔۔ د۔۔۔ شاہ۔۔۔" انہوں نے بمشکل اس کا نام مکمل کیا تھا۔

اور دل آور کے پیچھے اپنا ریوالور لے کر آنے والا آذر وقار آفندی کے منہ سے نکلنے والے اس ٹوٹے پھوٹے سے نام پہ ٹھٹک گیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ میں دل آور شاہ۔ بابر شاہ کا بیٹا اور منصور حسین شاہ کا پوتا زندگی میں ایک بار پھر تمہارے سامنے آ کھڑا ہوا ہوں۔ لیکن وقار آفندی اُس دل آور شاہ میں اور اِس دل آور شاہ میں بہت فرق ہے۔ تب میں تمہارا دشمن تھا اب میں تمہارا داماد ہوں۔

اس وقت میں تم سے انتقام لینے آیا تھا۔ لیکن آج میں تم سے بھیک مانگنے آیا ہوں۔

آج میں شاہ نہیں ہوں' آج میں گداگر ہوں۔

آج میری بیوی کی زندگی کا سوال ہے۔ وہ اس وقت اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہی ہے۔ اس کا بلڈ گروپ او نیگیٹو ہے اور میں اس ایمرجنسی میں کہیں سے بھی یہ گروپ ارینج نہیں کر پا رہا۔ مجھے اس کے لیے بلڈ کی ضرورت ہے۔ مجھے او نیگیٹو کی ضرورت ہے۔"

وہ کہتے ہوئے واقعی بہت بے بس اور شکست خوردہ سا لگ رہا تھا۔

"م۔۔۔ مگر۔۔۔ میری۔۔۔ علیزے کو۔۔۔ ہوا کیا ہے؟" آسیہ آفندی تڑپ کے اس کے سامنے آ گئی تھیں اور دل آور نے وقار آفندی سے نظریں ہٹا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

"ملک شرافت علی کے بیٹے ملک اسد اللہ اور چچا زاد کزن ملک حق نواز نے مجھ پر حملہ کروایا لیکن فائرنگ کے دوران گولی علیزے کو لگ گئی۔ جس سے وہ شدید زخمی ہوئی ہے اور اس کا خون بہت زیادہ بہہ چکا ہے۔ اس لیے ڈاکٹرز بہت زیادہ پریشان بھی ہیں۔ کیونکہ یہ بلڈ کسی بلڈ بینک سے بھی ارینج نہیں ہو رہا۔"

دل آور دھماکے پہ دھماکہ کر رہا تھا اور آسیہ آفندی نے بے ساختہ اپنے منہ پہ دونوں ہاتھ رکھ لیے تھے اور مارے حیرت کے ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"ملک شرافت علی کے بیٹے ملک اسد اللہ اور چچا زاد کزن ملک حق نواز نے؟ یہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔" وہ پاگل ہو جانے کو تھیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اور۔۔۔ وہ کیا کیا انکشاف کر رہا تھا۔ ان سب کے دماغ سمجھنے سے قاصر ہو گئے تھے۔

اور وہاں موجود آذر' دانیال' کومل' جودت' عائشہ آفندی اور ثروت بیگم بھی ہکا بکا سے اس کی صورت دیکھ رہے تھے اور اس کی باتیں نا سمجھی سے سن رہے تھے۔

"مسز آفندی۔۔۔ میرا پورا نام بیرسٹر دل آور شاہ ہے۔ میرے پاس ایک کیس آیا تھا' جس میں ملک حق نواز نے

ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی کی اور اس کے نتیجے میں میں نے اسے جیل بھجوا دیا تھا۔ لیکن اب اسے سزا ہونے والی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں اس کیس سے پیچھے ہٹ جاؤں کیونکہ کل اس کیس کی آخری سماعت ہے۔ اسی لیے میرے انکار پہ ان دونوں نے مشتعل ہو کر مجھ پہ حملہ کروا دیا اور گولیوں کا نشانہ علیزے بن گئی اور میں علیزے کی خاطر آپ لوگوں سے بات کرنے پہ مجبور ہو گیا ہوں۔ پلیز اس وقت میں بہت مجبور ہوں۔ بہت مفلس ہوں۔ مجھے آپ لوگوں کی ہیلپ کی ضرورت ہے۔ میں آپ لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ پلیز خدا کے لیے علیزے کی زندگی بچا لیں۔ وہ بے قصور ہے۔ بے گناہ ہے وہ۔ آپ اسے غلط مت سمجھیں۔ غلط تو میں تھا اور میں اپنی غلطی تسلیم کروں گا۔ سب کے سامنے کروں گا۔ لیکن ابھی نہیں۔۔۔ ابھی وقت بہت کم ہے۔"

دل آور نے کہتے ہوئے سچ مچ ان سب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور وہ سب بے یقینی سی نظروں سے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔

"میرا بلڈ گروپ او نیگیٹو ہے۔ میں بلڈ دینے کے لیے تیار ہوں۔" دانیال وجاہت علی ان سب کو پیچھے ہٹا کر آگے بڑھ آیا تھا اور دل آور کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے وجود میں روح پھونک دی ہو۔

"دانیال۔۔۔" آسیہ آفندی زیر لب دہرا کے رہ گئی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ علیزے کو اس وقت ہماری ضرورت ہے اور ہمیں اس کی ضرورت ضرور پوری کرنی چاہیے۔ کیونکہ وہ اس گھر کی بیٹی ہے اور آپ کے گھر بیٹی کے چاہے داماد آئیں یا وہ' اور خالی ہاتھ نہیں لوٹانا چاہیے۔ یہ بات مجھے ڈیڈ نے سکھائی تھی اور میں آج اس بات پہ ضرور عمل کروں گا۔"

دانیال کے عزم کے سامنے سب کو ہی ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔

"چلو۔۔۔ کہاں چلنا ہے؟" اس نے دل آور کو متوجہ کیا تھا۔

"اسپتال۔۔۔" دل آور نے کافی عجلت سے کہا اور قدم آگے بڑھائے تھے۔

"سنو۔۔۔" عائشہ آفندی کی لرزتی ہوئی آواز پہ دل آور کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔

"جی۔۔۔" وہ ان کے پکارنے سے ہی سمجھ چکا تھا کہ وہ کیا سوال کرنے والی ہیں؟

"تت۔۔۔ تم۔۔۔ زہرہ۔۔۔ بتول۔۔۔ شاہ کے۔۔۔" وہ سوال مکمل نہیں کر پائی تھیں۔

"جی ہاں۔۔۔ میں بابر شاہ کا بیٹا اور زہرہ بتول شاہ کا بھتیجا ہوں۔۔۔ دل آور شاہ۔ وہی دل آور شاہ جو آپ کی محبت کا لقمہ اور آپ کی گود کا مس آج بھی نہیں بھولا' سب یاد ہے' وہ اذیت بھی اسی چیز کی ہے کہ سب یاد ہے' میں جو بھولا نہیں ہوں۔"

وہ دھیرے سے کہتا ان سب پہ ایک طائرانہ سی نظر ڈال کر وقار آفندی کے بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا اور اس کے پیچھے پوری حویلی میں ایک بار پھر اک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ جبکہ دانیال تو اس کے ساتھ ہی اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا لیکن باقی سب بھی رہ نہیں سکے تھے۔

باری باری سبھی اپنی اپنی گاڑیاں نکالتے چلے گئے تھے۔

☆☆☆

عبداللہ بلڈ دینے کے بعد روم سے نکل ہی رہا تھا کہ اتنے میں دل آور بھی وہاں آن پہنچا لیکن اس کے ساتھ دوسری شخصیت کو دیکھ کر عبداللہ ذرا سا جھجکا اور اس نے فوراً ہی اپنے ذہن پہ زور ڈالتے ہوئے سوچا تھا کہ اس شخصیت کو پہلے کہاں دیکھا ہے؟ کیونکہ اس کی شکل و صورت بہت ہی مانوس سی لگ رہی تھی۔

"یہ میرا دوست ہے ملک عبداللہ۔" دل آور نے عبداللہ کا تعارف کروایا۔

لیکن دانیال بری طرح چونک گیا تھا۔ اسے شدید ترین حیرت کا دھچکا لگا تھا۔

"اور عبداللہ یہ علیزے کا کزن۔۔۔" دل آور نے دانیال کا تعارف کروانا چاہا تھا۔

مگر دانیال نے اسے روک دیا تھا۔

"ٹھہریے! میں اپنا تعارف خود کرواتا ہوں۔" اس نے دل آور کو کچھ بولنے سے باز رکھا۔

"اور میں علیزے کا کزن ہوں ملک دانیال وجاہت علی۔ علیزے میری پھوپھی زاد اور ماموں زاد کزن ہے اور میں اس وقت علیزے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں کیونکہ علیزے کا اور میرا بلڈ گروپ سیم ہی ہے۔" دانیال نے کہتے ہوئے عبداللہ کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ جبکہ عبداللہ ہکا بکا اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

"گروپ تو میرا اور علیزے کا بھی سیم ہی ہے یعنی ہم لوگ اجنبی نہیں' ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں' ایک ہی گھر کے فرد ہیں اور ایک ہی نسل اور خاندان کا خون ہیں۔ نہ علیزے غیر ہے نہ تم غیر ہو تو پھر یہ ہاتھ کیوں بڑھا رہے ہو گلے ملو یار۔ یہ کندھا یہ سینہ حاضر ہے تمہارے لیے۔"

عبداللہ نے کہتے ہوئے بازو پھیلا دیے تھے اور دانیال کو اس کے گلے لگنا ہی پڑا کیونکہ اس کے انداز میں بڑی چاہ تھی' بڑا مان تھا۔

"یار! اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہوگی کہ آج علیزے نے ہم لوگوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔" عبداللہ دانیال سے مل کر بے انتہا خوش ہوا تھا اور خوش تو دانیال بھی ہوا مگر اس کے ذہن پہ ماضی کا غبار بھی حاوی تھا جو رفتہ رفتہ ہی چھٹ سکتا تھا۔

"دانیال! میری علیزے کہاں ہے؟" دل آور کے ساتھ آسیہ آفندی بھی گرتی پڑتی وہاں آ پہنچی تھیں اور دانیال بے ساختہ ان کی طرف پلٹا تھا۔

"تائی امی! ان سے ملیں' یہ عبداللہ ہیں۔ عبداللہ بھائی آپ کے بڑے بھائی کے صاحبزادے۔" دانیال نے اپنے کندھے سے کندھا ملائے کھڑے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"عبداللہ۔" آسیہ آفندی نے حیرت سے دل آور کی طرف دیکھا تھا کہ وہ تو کہہ رہا تھا ملک اسد اللہ نے اس پہ حملہ کروایا ہے تو پھر عبداللہ یہاں کیسے؟

"جی ہاں یہ عبداللہ ہے۔ میرا دوست' اور میرا بھائی۔ ملک شرافت علی اور ملک اسد اللہ سے بالکل مختلف۔" دل آور نے خود اس کا تعارف کروایا تھا اور آسیہ آفندی کے اعصاب قدرے ریلیکس ہو گئے۔

"السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟" عبداللہ نے ذرا سا آگے بڑھ کے انہیں سلام کیا اور آسیہ آفندی نے بے ساختہ بھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے گلے سے لگا لیا۔

"سر مسز علیزے شاہ کی کنڈیشن آؤٹ آف کنٹرول ہوتی جا رہی ہے ڈاکٹر صاحب نے آپ کو آئی سی یو میں بلایا ہے۔" نرس تقریباً بھاگتی ہوئی دل آور کے قریب آئی تھی اور دل آور کے چہرے کی ہوائیاں اڑ گئی تھیں وہ بے ساختہ سب کو پیچھے ہٹا کر آئی سی یو کی طرف بھاگا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی بھاگے چلے آئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"مدی! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ سو کر اٹھی ہی تھی کہ اپنے سیل پہ جیزی کا میسج دیکھ کر حیران پریشان رہ گئی اور فوراً سے بھی پیشتر اس کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

دوسری طرف بھی فوراً ہی کال ریسیو ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم!" مدیحہ جو دوسری طرف سے جیزی کے اسی پرانے اسٹائل اور ہیلو ہائے کی توقع کر رہی تھی جیزی کے منہ سے بڑے تحمل سے بہ آواز سلام سن کر بے ساختہ ہی چونکی تھی۔

"وعلیکم السلام! جیزی کہاں تھے تم؟ اتنے مہینے ہو گئے ہیں تمہاری کہیں سے کوئی خبر ہی نہیں مل رہی تم نے کوئی کانٹیکٹ ہی نہیں کیا؟ کہاں چلے گئے تھے آخر؟" مدیحہ سلام کا جواب دینے کے فوراً بعد ہی شروع ہو گئی تھی۔

"میں مر گیا تھا۔" جیزی نے اب بھی کافی سکون سے ہی جواب سے نوازا تھا۔

"مر گئے! کیا مطلب؟ تم ابھی تک پاکستان میں ہی تھے؟" مدیحہ کو سن کر شاک لگا تھا۔

"ہاں! میں پاکستان میں ہی تھا' جب میں پاکستان سے کچھ حاصل کرنے کے لیے آیا تھا تو حاصل کیے بغیر کیسے جا سکتا تھا؟" اس کی لینگویج انگلش سے اردو میں ڈھل چکی تھی۔ اور مدیحہ کو مزید حیرت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

"واٹ ڈو یو مین جیزی؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔" مدیحہ کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔ وہ اس کی بات کا مفہوم نہیں سمجھ پائی تھی۔

"میں جو کہہ رہا ہوں' تمہیں سب پتا چل جائے گا بس ایک بار تم مجھ سے ملو تو سہی۔"

جیزی ملنے پہ زور دے رہا تھا اور مدیحہ چند ثانیے کے لیے چپ سی ہو گئی۔ پھر ذرا توقف سے گویا ہوئی۔

"جیزی۔ ملنا تو میں بھی چاہتی ہوں تم سے' یہ بتا دو کہ ملو گے کہاں؟"

مدیحہ کافی سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"وہیں۔ اسی ہوٹل میں۔" جیزی بھی حد درجہ سنجیدہ لگ رہا تھا۔ مدیحہ کو بے چینی تو ہوئی لیکن پھر اپنا تجسس دبا گئی۔

"اوکے۔ ایک گھنٹے بعد میں تمہیں وہیں ملتی ہوں۔" مدیحہ نے کال بند کرنا چاہی۔

"اللہ حافظ۔" جیزی نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور مدیحہ اپنے موبائل کو دیکھتی رہ گئی۔

"اللہ حافظ۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی تھی۔ لیکن ایک حتمی نتیجہ پھر بھی اخذ نہیں کر سکی کیونکہ وہ بار بار چونک رہی تھی' ٹھٹک رہی تھی مگر اپنے خیالات پہ یقین کی مہر نہیں لگا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات گزر چکی تھی' صبح کا سورج اپنی کرنیں پوری طرح سے پھیلا چکا تھا۔

علیزے کے گھر والے اس کے ہوش میں آنے کے انتظار میں پوری رات آنکھوں میں بسر کر چکے تھے۔ لیکن وہ تھی کہ ہنوز بے ہوش پڑی تھی اور ڈاکٹرز ابھی بھی اس کی زندگی سے مایوس نظر آتے تھے اور دل آور مسلسل سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"دل آور۔ ناشتا کر لو۔ پلیز۔ تم نے کل صبح سے کچھ نہیں کھایا۔" عبداللہ نے قریب آ کر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کروں گا ناشتا بھی۔ ناشتا کیے بغیر مر نہیں جاؤں گا۔ علیزے زندہ ہے تو سمجھو کہ دل آور شاہ بھی زندہ ہے۔" وہ عبداللہ کو تسلی دے کر آگے بڑھا مگر عبداللہ کی آواز نے اسے روک دیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" عبداللہ کھٹک گیا تھا۔

"گھر۔" اس نے بے حد آہستگی سے جواب دیا تھا۔

"گھر۔ مگر کیوں؟" عبداللہ کو حیرت ہوئی۔

"کیونکہ میں نے کورٹ جانا ہے۔" اس کا لہجہ انتہائی سرد و سپاٹ سا ہو رہا تھا۔ عبداللہ کے اعصاب جھنجھنا اٹھے اس نے یکدم کرنٹ کھا کے دل آور کی طرف دیکھا تھا۔

"کورٹ۔ مگر دل آور۔ تمہاری اپنی زندگی کو بھی خطرہ ہے۔ یہ کیا کرنے جا رہے ہو تم۔" عبداللہ کو اس کی طرف سے فکر ہوئی تھی لیکن دل آور کو اپنی کوئی فکر نہیں تھی۔

"میرا جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا ہے' اب مجھے ان کی طرف سے کوئی ڈر' کوئی خوف نہیں ہے' میں نے انصاف کی یہ جنگ لڑنی ہے اور ہر حال میں لڑنی ہے۔ اس کے لیے چاہے کچھ بھی ہو جائے مجھے پروا نہیں ہے۔" وہ کہہ کر ہسپتال کے اس پرائیویٹ روم سے باہر نکل گیا اور عبداللہ کے ساتھ ساتھ آذر' دانیال' عائشہ آفندی اور آسیہ آفندی سب دیکھتے رہ گئے تھے۔ لیکن دل آور کو خود بھی پتا نہیں تھا کہ ایس پی کامران مہدی اور انسپکٹر شہناز نے

"اور لوگوں کے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے میرا نام اس لیے محمد جہاں زیب رکھا ہے کہ جیزی کہنے والوں کو کوئی پرابلم نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود میں یہی چاہتا ہوں کہ سب مجھے محمد جہاں زیب کہہ کر ہی مخاطب کریں۔ جیزی میں کچھ نہیں رکھا لیکن محمد میں بہت کچھ ہے۔ بہت میٹھا نام ہے یہ۔ صرف نام لینے سے ہی منہ میں لذت آجاتی ہے۔ اک مٹھاس سی ہے اس نام میں۔"

وہ بہت عقیدت اور بہت محبت سے اپنی فیلنگز بیان کر رہا تھا اور مدیحہ محض سر جھکائے رہ گئی تھی۔

"خیر۔ اب بولو۔ کیا کہنے والی تھیں تم؟ میں نے تمہاری بات ٹوک دی۔"

اس نے مدیحہ کو دوبارہ سے بات کرنے پہ اکسایا تھا۔

"محمد جہاں زیب میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ مجھے خوشی ہوئی ہے اور بہت زیادہ ہوئی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ افسوس بھی ہو رہا ہے کہ یہ کام اللہ نے میرے نصیب میں نہیں لکھا اور اس لڑکی پہ رشک آرہا ہے جس کے نصیب میں اللہ نے بہت نیک کام کی سعادت لکھ دی۔

اور میری نظر میں وہ لڑکی بہت ہی خوش نصیب ہے محمد جہاں زیب اور اللہ اسے ہمیشہ خوش نصیب ہی رکھے، آمین۔" مدیحہ نے صدق دل سے دعا کی تھی اور اپنے دل سے اک بوجھ سا ہٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"وہ خوش نصیب ہی نہیں بہت اچھی بھی ہے۔ اتنی اچھی کہ اللہ تعالیٰ سے پہلی دعا اسی کے لیے کی ہے اسی کو مانگا ہے اور مجھے اللہ پہ بھروسا ہے، پورا بھروسا کہ وہ میری پہلی دعا کبھی بھی رد نہیں کرے گا۔" محمد جہاں زیب کے لہجے میں ایک بھرپور یقین تھا اور مدیحہ اس کے یقین پہ چپ رہ گئی تھی۔

پھر ذرا توقف سے کچھ خیال آنے پہ اس نے آہستگی سے محمد جہاں زیب کو مخاطب کیا۔ "کیا نام پوچھ سکتی ہوں اس خوش نصیب کا؟" اس نے کسی اور ہی خیال کے تحت پوچھا تھا۔

"ہوں... کیوں نہیں... فاطمہ نام ہے اس کا... فاطمہ بدر..." محمد جہاں زیب اس کا نام لیتے ہوئے بھی جیسے خوش ہو رہا تھا سرشار ہو رہا تھا۔

"ماشاء اللہ... بہت پیارا نام ہے... بہت خوب صورت بھی۔" مدیحہ نے تعریف کی سراہا تھا اور وہ اس کے سراہنے پہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

"تھینک یو...!" اس نے باقاعدہ شکریہ بھی ادا کیا۔ وہ بھی یوں جیسے مدیحہ نے اس کی تعریف کی ہو یا اسے سراہا ہو۔

"شکریے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں البتہ اسے اس چیز کی ضرور، ضرورت ہے، یہ اس کی امانت ہے۔ تم اسے دے دو۔" مدیحہ نے اپنے بیگ سے وہ مخملی سی ڈبیا نکال کر محمد جہاں زیب کی طرف بڑھا دی تھی اور اس نے بے ساختہ مدیحہ کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

"نہیں محمد جہاں زیب! تم یہ مت سمجھو کہ میں نے یہ رنگ واپس کرنے کا فیصلہ ابھی کیا ہے، حالانکہ تم نے جب مجھے یہ رنگ دی تھی تو تم نے کہا تھا کہ تم جب واپس لوٹاؤ گی تو میں تم سے وجہ نہیں پوچھوں گا لیکن تمہارے بغیر پوچھے بھی میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ میں یہ رنگ اس لیے لوٹا رہی ہوں کہ مجھے اس سے کئی گنا زیادہ قیمتی ہیرا مل گیا ہے... بلکہ مجھے اس کو قیمتی نہیں انمول کہنا چاہیے جس کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے، جو میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے، سب سے الگ ہے، میں اسے کھونا نہیں چاہتی... اس سارے قصے کے بعد میں اس نتیجے پہ ضرور پہنچی ہوں کہ انسان کسی سے کم نہیں ہوتا، کبھی کبھی کسی دکان پہ کھوٹا کہہ کر واپس لوٹا دیا جاتا ہے اور کبھی کسی دکان پر کھرا سمجھ کر رکھ لیا جاتا ہے۔ بس فرق یہ ہوتا ہے کہ کھوٹے اور کھرے کی پہچان کرنے والی نظر کتنی اہم ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں کھوٹا کہہ کر واپس لوٹا دیا اور فاطمہ بدر نے تمہیں کھرا سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیا۔

شاید یہی ہے کہ اسے تم جیسے سکے کا انتظار تھا اور مجھے عدیل عمر جیسے سکے کی تلاش تھی اور زندگی کے اس موڑ پہ

دونوں کا انتظار اور دونوں کی تلاش ختم ہوگئی ہے۔ وہ اپنے سکے کو پاکر خوش ہوگی اور میں اپنے سکے کو حاصل کرکے خوش ہوں اور میں شکر گزار ہوں اس رب کی جس نے کسی کو بھی مایوس نہیں کیا اور کسی کے دل پہ کوئی بوجھ نہیں رہنے دیا۔" مدیحہ کی آواز بھرا گئی تھی اور محمد جہاں زیب نے آہستگی سے سر جھکا لیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان دونوں میں مزید کوئی بات چیت ہوتی اتنے میں دروازے پہ دستک ہوئی تھی اور محمد جہاں زیب دستک کے انداز سے ہی پہچان گیا تھا کہ دستک دینے والا کون ہے...؟

"فاطمہ...!" اس نے بے ساختہ اس کا نام لیا تھا اور ایک لڑکی دروازہ دھکیل کر اندر آگئی تھی۔

"اسلام علیکم...!" فاطمہ نے اندر آتے ہی سلام کیا اور محمد جہاں زیب کے ساتھ ساتھ مدیحہ بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی تھی۔

"وعلیکم السلام...!" ان دونوں نے تقریباً" بیک وقت ہی اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔

"مدیحہ... کیسی ہیں آپ؟" فاطمہ نے ڈائریکٹ مدیحہ کو ہی مخاطب کیا تھا اور ایک پل کے لیے مدیحہ کو خوشگوار سی حیرانی ہوئی کہ فاطمہ اس کو غائبانہ تعارف سے ہی پہچان گئی ہے۔

لیکن پھر محمد جہاں زیب کے چہرے پہ مسکراہٹ دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ اس نے یقیناً" فاطمہ کو بھی بتا رکھا ہوگا مدیحہ آنے والی ہے۔

"اللہ کا شکر ہے... میں بالکل ٹھیک ہوں آپ سنائیں؟ آپ کیسی ہیں؟"

"ادھر بھی اللہ کا کرم ہے... احسان ہے اس پاک ذات کا۔" فاطمہ مسکرائی تھی۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی شوق ہوا تھا کہ میں فاطمہ بدر نامی لڑکی کو دیکھ سکوں اور اسے مبارک باد دے کر اس کے ایک نیک کام پہ اسے پورے دل سے سراہوں اور دیکھ لیں اللہ نے بیٹھے بیٹھے ہی میرا یہ شوق یہ خواہش پوری کردی ہے اور سچ پوچھیں تو آپ کو دیکھ کر اور آپ سے مل کر واقعی بہت خوشی ہوئی ہے اللہ آپ کو بھی ہمیشہ خوش رکھے اور مزید نیکیوں کی توفیق عطا فرمائے... آمین۔"

مدیحہ نے بہت اچھے طریقے سے اپنی فیلنگز کا اظہار کیا تھا جس پہ فاطمہ بھی بہت خوش ہوئی تھی اور تھوڑی دیر بات چیت کے بعد ان دونوں سے اجازت چاہی تھی...

"ارے... اتنی جلدی کیوں جا رہی ہیں آپ؟ ابھی بیٹھیں... میں تو محمد جہاں زیب کو یہ گڈ نیوز دینے کے لیے آئی تھی کہ میرے مما پپا ہماری شادی کے لیے مان گئے ہیں اور انہوں نے آج اسے ملنے کے لیے بلایا ہے ہمارے گھر پہ ہے۔ اس لیے میں اسے شام کھانے پہ انوائیٹ کرنے کے لیے آئی ہوں..." فاطمہ نے مدیحہ کو روکنے کے ساتھ ساتھ محمد جہاں زیب کو ایک نئی اطلاع دی تھی جسے سن کر محمد جہاں زیب تو خوش ہوا ہی تھا لیکن مدیحہ بھی اس اطلاع پہ بے پناہ خوش ہوئی تھی۔

"ارے واہ... پھر تو بہت بہت مبارک ہو آپ دونوں کو..." مدیحہ نے کھل کے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"نو...! صرف مبارک ہی نہیں چاہیے گی... تمہیں اس سارے سلسلے میں میرا ساتھ دینا ہوگا... میری شادی میں میری مدد کرنا ہوگی ورنہ میں تو کچھ بھی نہیں کر سکوں گا..."

محمد جہاں زیب نے مدیحہ سے اس کی مدد چاہی تھی اور مدیحہ نے اس کام کے لیے فوراً" ہامی بھرلی۔ "مجھے منظور ہے تمہاری شادی کی تمام تیاری اور تمام ذمہ داری میری لیکن ابھی اس وقت مجھے اجازت چاہیے آپ لوگ بیٹھیں... بات کریں... اور انجوائے کریں... گڈ بائے۔" مدیحہ ان سے اجازت لے کر محمد جہاں زیب کے روم سے نکل آئی تھی۔

نجانے کیوں اسے اس وقت عدیل سے ملنے کی جلدی ہو رہی تھی۔

لیکن اندر سے وہ محمد جہاں زیب اور فاطمہ کے لیے بھی بہت خوش تھی...

اسے حقیقتاً" شلوار قمیص اور دوپٹے میں ملبوس انتہائی سادہ سے انداز والی فاطمہ بہت پسند آئی تھی۔ مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہی انتہائی سادہ سی نظر آنے والی فاطمہ کبھی بہت ہی ماڈرن اور فیشن ایبل لڑکی ہوا کرتی تھی۔ مگر

"اب تو مجھے خود بھی نہیں پتا کہ کتنا پیار کرتا ہوں اس سے؟ لیکن اتنا احساس ہو رہا ہے کہ جتنا تم سے کرتا ہوں، اس سے بھی کئی گنا زیادہ پیار علیزے سے کرتا ہوں۔"

دل آور نے اعتراف کیا تھا اور نبیل نے قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے اسے گلے سے لگایا اور عبداللہ نے ان دونوں کے کندھے تھپکے تھے۔

"یعنی علیزے بھابھی کو میرا رقیب بنا دیا ہے تم نے؟" نبیل مصنوعی خفگی سے بولا تھا۔

"یہی سمجھو۔" دل آور نے کندھے اچکائے تھے۔

"ویسے یار۔۔۔! تمہارے سسرال والے بہت عجیب سے لگے ہیں مجھے۔۔۔ کسی کا بھی موڈ سیدھا نہیں ہے ایک دوسرے سے بھی خفا خفا سے لگ رہے ہیں۔۔۔ یہ کن لوگوں میں شادی کر لی ہے تم نے؟"

نبیل نے بہت ہی رازدارانہ انداز اپناتے ہوئے دل آور سے سوال کیا تھا جبکہ دوسری طرف عبداللہ نے گلا کھنکھارتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس کی سسرال کے بارے میں ذرا انڈر کنٹرول رہ کر بات کرنا کیونکہ اس کی سسرال میری پھوپھی کا گھر ہے۔ علیزے کوئی غیر نہیں میری کزن ہے۔ پھوپھی زاد بہن ہے میری اور میرے چچا سکندر وجاہت علی کی فیملی بھی ساتھ ہی ہے۔"

عبداللہ نے نبیل پر اک بم گرایا تھا اور نبیل اپنی جگہ پہ حیران رہ گیا۔

"تم۔۔۔ یہ سب پہلے بتا نہیں سکتے تھے؟" اسے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا تھا۔

"بس یار۔۔۔ یہ اور کچھ نہیں۔۔۔ قسمت کا چکر ہے۔" عبداللہ نے کندھے اچکائے تھے۔

"یہ پہلے پتا نہیں تھا اس چکر کا۔۔۔؟" نبیل کی حیرانی ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"نہیں! بس آج ایک دوسرے سے تعارف ہوا ہے تو پتا چلا ہے۔ یہ شاید پہلے بھی وقار آفندی کا یا بڑی حویلی کا نام سے ہم تو میں پہچان جاتا مگر ہمارے درمیان بھی اس ٹاپک پہ بات ہی نہیں ہوئی تو پھر پتا کیسے چل سکتا تھا؟"

"تو اب وہ لوگ کیسے مان گئے؟ اس نے تو علیزے بھابھی سے لو میرج کی تھی نا۔۔۔؟"

نبیل مارے حیرت کے سوال پہ سوال کیے جا رہا تھا۔

"علیزے کو بلڈ کی ضرورت تھی اس لیے دل آور کو ان کی فیملی کے پاس جانا پڑا۔"

اس کے سارے سوالوں کے جواب عبداللہ دے رہا تھا اور دل آور چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

"اوہ۔۔۔! تو یہ ماجرا ہے؟" اب نبیل کے کچھ پلے پڑا تھا اور وہ سر اثبات میں ہلانے لگا جبکہ دل آور عبداللہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"تھینک یو یار۔۔۔! تھینک یو ویری مچ۔۔۔ آج تم نے علیزے کو بلڈ ڈونیٹ کر کے مجھے اپنا مقروض کر لیا ہے۔ تمہارے اس خون کا بدلہ میں زندگی بھر نہیں اتار سکتا۔۔۔"

اس نے عبداللہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔

"نہیں یار۔۔۔! میرا تم پہ کوئی قرض نہیں ہے اور نہ ہی کوئی احسان ہے تم پہ بلکہ آج علیزے کو بلڈ ڈونیٹ کر کے میں نے تم پہ ثابت کر دیا ہے کہ علیزے میری بہن ہے۔ میرے لیے زری کی طرح ہی ہے اور اس کے ساتھ میرا پہلے بھی خون کا رشتہ تھا اور اب بھی خون کا ہی رشتہ ہے۔

بس تم اب یہی سمجھنا کہ تمہاری شادی میری بہن سے ہوئی ہے۔ جس کا تم نے ہمیشہ بہت خیال رکھنا ہے اور بہت محبت کرنی ہے اس سے۔" اتنا عبداللہ نے دل آور کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور نبیل قسمت کے اس کھیل پہ حیرت سے دیکھتا رہ گیا تھا۔

"تم بہت اچھے ہو عبداللہ۔۔۔ میری سوچ سے بھی زیادہ اور میری دوستی سے بھی بڑھ کے۔۔۔" دل آور نے بے ساختہ اپنے گلے سے لگایا تھا۔

"جب تم سے دوستی ہوئی تھی تو کہا تھا نا کہ اس دوستی سے بڑھ کے کبھی کچھ بھی نہیں ہو گا۔۔۔؟ تو دیکھ لو تم نے

تو اس دوستی سے بڑھ کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔" عبداللہ نے اس کو اپنے مضبوط بازوؤں میں بھینچتے ہوئے اس کے کندھے پہ تھپکی دی اور پھر تینوں ہی مسکرا دیے تھے۔

اتنے میں نرس دوبارہ اندر آئی اور ان تینوں کو روم سے باہر بھیج دیا اور اس کے ساتھ ہی علیزے کو لا کر روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔

"علیزے۔۔۔!" آسیہ آفندی کی آواز پہ علیزے نے بے ساختہ چونک کر دیکھا لیکن ان کے ساتھ ساتھ باقی سب کو دیکھ کر علیزے کی آنکھیں پھیل سی گئی تھیں۔

"مما آپ؟" اس کے ہونٹ کپکپائے تھے۔

"ہاں میری جان۔۔۔ میں تمہاری مما۔۔۔" انہوں نے آگے بڑھ کے علیزے کا ماتھا چومتے ہوئے اسے اپنی آغوش میں چھپا لیا تھا۔

"زری۔۔۔ دانیال بھائی! ماشاء پھوپھو! اسرار انکل۔۔۔ آپ سب۔۔۔"

علیزے کی آواز کانپ رہی تھی۔ وہ سب سے مل کر خوش ہو رہی تھی، سرشار ہو رہی تھی اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اسے تو جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی۔ لیکن ایک کمی پہ آ کر وہ بے ساختہ تھم سی گئی تھی۔

"پاپا۔۔۔؟" اس نے ماں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"بیٹا۔۔۔! ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ وہ کہتے ہیں علیزے جلدی سے ٹھیک ہو جائے پھر تم لوگ اسے لانا۔" آسیہ آفندی نے اس کے بال سنوارتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں مما! پاپا۔۔۔" علیزے کی آواز بھرا گئی تھی۔

"ارے نہیں بیٹا روتا نہیں ہے۔۔۔ بس اب جلدی سے ٹھیک ہونا ہے پھر تمہارے پاپا بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔" وہ اسے بہلا رہی تھیں تسلیاں دے رہی تھیں لیکن علیزے کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ وہ وقار آفندی کے لیے مضطرب ہو رہی تھی۔

"دانیال بھائی۔۔۔! آپ تو بتائیں پاپا کہاں ہیں؟ وہ کیوں نہیں آئے؟" علیزے نے قریب کھڑے دانیال کو مخاطب کیا تھا۔

"پاپا کی طبیعت خراب ہے علیزے! وہ یہاں نہیں آ سکتے لیکن بہت جلد ہم تمہیں ان کے پاس لے جائیں گے۔۔۔" دانیال نے بھی اسے تسلی دی اور اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"پرامس۔۔۔" اس نے عہد لیا۔

"او کے پرامس۔۔۔!" دانیال کو وعدہ کرنا ہی پڑا تھا۔

"ثروت آنٹی کہاں ہیں۔۔۔؟ کومل آپی، حرمت آپی اور جوت بھائی بھی نہیں آئے۔۔۔ زین بھی نہیں ملا مجھ سے اور میرے عون اور عدید کہاں ہیں مما۔۔۔؟" علیزے بڑے اشتیاق و بے قرار سے لہجے میں پوچھ رہی تھی اور تقریباً سبھی کا ہی پوچھا تھا۔

وہ علیزے کی اس بے ساختگی اور اس اجنبیت پہ دل آور کا تھوڑی دیر پہلے خوشی کے لیے دھڑکنے والا دل بری طرح اداس ہوا تھا اور ایک دم سے جیسے بجھ کے رہ گیا تھا۔

یوں وہ اس کمرے میں ہونے کے باوجود بھی علیزے کو کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

شاید اس لیے کہ آج اسے سب اپنے نظر آ رہے تھے اور ان سب اپنوں میں وہ اپنے آپ کو بہت اپنے کو بھول گئی تھی یا شاید جان بوجھ کر نظر انداز کر گئی تھی۔

دل آور کا دل ٹوٹ گیا تھا۔۔۔ محبت اور شادی کا مان کرچی کرچی کر گیا تھا۔

"علیزے کی ذرا سی بے رخی اور ذرا سی بے پروائی بھی برداشت نہیں کر پا رہا تھا، سہہ نہیں سکتا تھا اسی لیے تو فوراً کمرے سے باہر نکل گیا اور اب کمرے میں یا علیزے تھی۔۔۔ یا پھر علیزے کے اپنے تھے۔۔۔ اور بس۔۔۔!

(باقی آئندہ)

✲ ✲

میمونہ صدف

"او شکر ہے،، ہم اپنے گھر آئے ہوم سویٹ ہوم۔" عاشر کی نیکر اوپر چڑھاتے ہوئے میں نے اپنے آٹھ سالہ بیٹی کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو میں پھر سے خالہ رضوانہ کے گھر پہنچ گئی جہاں ان کی نو بیاہتا بیٹی ماریہ میکے رہنے آئی ہوئی تھی۔

جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے تھے اس کی شادی کو اور میاں سے جھگڑ کر میکے چلی آئی تھی۔ وجہ.... گاڑی کا مطالبہ۔ جہاں سے بھی ہو اس کا میاں گاڑی خرید کے لائے تب ہی وہ واپس جائے گی ورنہ نہیں۔ خالہ اسے سمجھا بجھا کر تھک گئی تھیں مگر وہ تھی کہ سمجھ کے نہ دے رہی تھی۔ میرا تو یونہی خالہ کی طرف گھڑی دو گھڑی ہی جانا ہوا تھا ورنہ دراصل میں تو بچوں کی گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے امی کے گھر یا ماں رہنے گئی ہوئی تھی۔ خالہ نے تنگ آکر مدد طلب نظروں سے میری جانب دیکھا کہ میں ہی اب اسے سمجھاؤں۔ ماریہ خالہ کی دوسرے نمبر والی بیٹی تھی۔ قبول صورت ہونے کی وجہ سے خالہ کو اس کے جوڑ کا کوئی بہت اعلیٰ رشتہ نہ مل سکا تھا۔ اٹھائیس سال میں خالہ نے اسے عامر سے بیاہا جو ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھا۔ تنخواہ معقول ہی تھی جتنا آج کل کے زمانے میں ایک پرائیویٹ اسکول ٹیچر کی ہو سکتی ہے مگر وہ گھر کا واحد کفیل تھا اور ابھی اسے دو بہنوں کو بیاہنا بھی تھا اور ایک چھوٹا بھائی بھی زیر تعلیم تھا۔ خالہ نے جس ناز و نعم سے بیٹیوں کو پالا تھا اور جس طرح انہیں ہر ضروریات زندگی مہیا کر رکھی تھیں اب ماریہ کے لیے اس کم آمدنی کے گھر میں محدود وسائل اور سامحدود ضروریات کے ساتھ صبر و شکر سے گزارہ کرنا ناممکن تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی اپنا کما رہی تھی مگر گھر کے خرچے اس قدر تھے کہ دو لوگوں کی مناسب سی تنخواہ اس مہنگائی کے دور میں پوری نہ پڑتی تھی۔

"ماریہ! یہ اتنی سی بات پر تم لڑ جھگڑ کر میکے آکر بیٹھ گئی ہو۔ گاڑی نہیں ہے تو کیا ہوا بائیک تو ہے نا۔ وکل وین کے دھکے تو نہیں کھانے پڑتے نا تمہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں اسے سمجھایا۔

"باجی اتنی لگژری لائف سے نکل کر ایک ایسے گھر میں زندگی بسر کرنا آسان نہیں ہوتا جہاں بنیادی ضروریات بھی میسر نہ ہوں۔ امی نے بہت غلط کیا ہے میری شادی یہاں کر کے۔" میں سمجھ سکتی تھی اس کی کنڈیشن اور وہ کسی حد تک حق بجانب بھی تھی مگر وہ یہ بات نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ گھر آہستہ آہستہ مسلسل قربانیوں سے ہی بنا کرتے ہیں۔

"میری بہن تمہاری بات ٹھیک ہے بالکل مگر تم یہ دیکھو کہ کتنے رشتے آئے اور بات نہ بن سکی۔ سب تمہارے سامنے ہی تھا کوئی ڈھکی چھپی بات تو ہے نہیں۔ بس یہاں قسمت تھی تمہاری۔ اصل چیز شرافت اور تعلیم ہوتی ہے ماشاء اللہ سے عامر پڑھا لکھا، سمجھ دار اور سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ کمپیٹنٹ اور سیلف میڈ ہے اتنا۔ تیزی سے ترقی کرے گا۔ ہاں یہ ہے کہ تھوڑا ٹائم لگے گا مگر ایک وقت آئے گا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے دھیمے انداز میں اسے سمجھانا چاہا تھا مگر اس وقت وہ بھری بیٹھی تھی شاید ہی وہ میری بات کو تحمل سے سن پاتی اور وہی ہوا تھا وہ پھٹ پڑی۔

"کتنا ٹائم لگے گا؟ اپنے شادی کے شروع کے دن بند وہ سسر کے لیے کما رہے۔ اپنی ضروریات کا گلا گھونٹ رہے محض اس لیے کہ گھر میں جوان نندیں اور چھوٹا دیور ہے۔ میں ساری زندگی اپنے میاں کے ساتھ مل کر اپنی ساس کے بچے پالتی رہوں گی کیا؟ کیا فائدہ ایسی ترقی کا جب پیسہ ہوگا تو اولاد کے ہی کام آئے گا خود تو ساری زندگی میری ترس ترس کر گزر جانی ہے۔"

بات کے اختتام تک اس نے رونا شروع کر دیا اور میں تاسف سے اس لڑکی کو دیکھنے لگی۔ کیا کہتی؟ کیسے کہتی؟

"ماریہ۔ اس گھر میں بھی تو تمہاری بہنیں ہیں۔ بھائی ہے وہ تمہاری آنکھوں میں کبھی نہیں کھٹکے اور نندیں دیور کھٹکنے لگے ہیں۔"

"ہاں کھٹکنے لگے ہیں کیونکہ اپنے بہن بھائیوں کو میں نے یوں اپنی کمائی سے پالا نہیں تھا میں جو کماؤں۔ میرا شوہر جو کمائے وہ ان پر لگا دیں۔ ہم کل کو
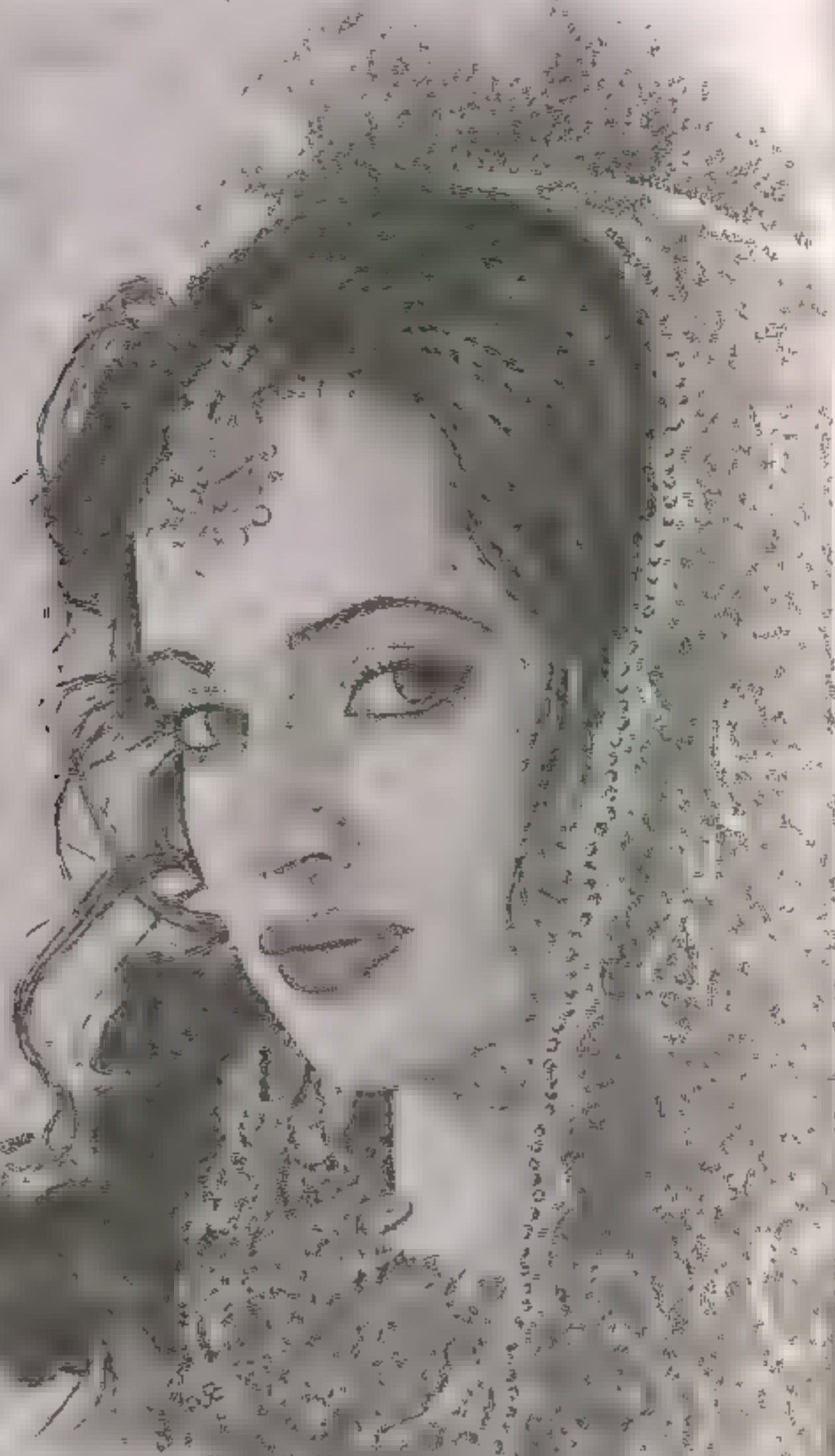
ہمارا کیا فیوچر ہے؟ ہمارے بچوں کا کیا فیوچر ہے؟" وہ دھواں دھار روتے ہوئے چلا رہی تھی۔ میں نے گہرا سانس بھرتے ہوئے اسے دیکھا اور پھر سامنے دھرے روم فریج سے پانی نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"پانی پی لو شاباش۔" پانی کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے اس نے چند گھونٹ بھرے اور دوسرے ہاتھ سے آنسو پونچھنے لگی۔ میں پندرہ منٹ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ اب وہ قدرے بہتر حالت میں ہے اور شاید اب کے وہ کچھ سمجھ سکے گی تو میں نے پھر سے بولنا شروع کیا۔

"میری بہن۔ کوئی لڑکی بھی اپنی خوب صورتی، ذہانت اور کسی دوسری قابلیت کے بل بوتے پر اپنے سسرال میں وہ جگہ نہیں بنا سکتی جو خدمت سے پا سکتی ہے۔ تمہارا خاوند صرف تمہارا خاوند تو نہیں ہے نا اس کے اور بھی رشتے ہیں۔ وہ کسی کا بھائی، کسی کا بیٹا ہے، وہ کسی کا ماموں، کسی کا بھتیجا بھانجا ہے۔ شادی ہو جانے سے اس کے وہ تمام رشتے ختم نہیں ہو گئے۔ تمہارے اس گھر میں جانے سے پہلے بھی وہ گھر چل رہا تھا۔ تمہارے اس گھر میں جانے سے ان کے گھر کے طور طریقے، روایات تبدیل نہیں ہوں گی۔ تمہیں خود کو ان کے مطابق ڈھالنا ہو گا۔ ہاں اگر کوئی بھی تبدیلی لانا چاہو تو آہستہ آہستہ صبر سے، نرمی سے لاؤ۔ جہاں تک تم اپنے سسرال کے رشتوں کی بات کر رہی ہو تو یار تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ شوہر کی شکل میں تمہاری ساس نے تمہیں کتنا زبردست تحفہ دیا ہے۔ جو شخص تمہارے لیے آج خوشی اور سکون کا باعث ہے آج جس مقام پر ہے تمہاری ساس کی بدولت ہے۔ اس عورت نے اپنا پلا پلایا بیٹا تمہارے حوالے کیا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اب اس شخص پر اس کا حق نہیں ہے۔ ہر رشتے کو اس کے اصل مقام پر رکھنا سیکھو۔ مسئلہ ہی سارا یہ ہوتا ہے کہ ہم ان رشتوں کو قبول نہیں کر پاتے۔ تم یہ کیوں سوچ رہی ہو کہ یہ کام میرے شوہر کا ہے گھر چلانا میرا نہیں، میری بہن کبھی یہ مت سوچنا کہ فلاں کام میرے شوہر کا ہے میرا نہیں۔

بیوی ہونے کی حیثیت سے تم جس طرح سے بھی ممکن ہے اپنے شوہر کو سپورٹ کرو۔" اب کی بار وہ مشتعل نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ خاموشی سے میری بات سنتے وقتاً "فوقتاً" پانی کا گھونٹ بھر لیتی تھی۔

"میرے لیے اتنی تنگی میں گزارا کرنا بہت مشکل ہے۔ یہاں امی ابو کے گھر تو ہر چیز وافر مقدار میں موجود تھی۔ کھلا کھانا پینا تھا۔ ہر ضرورت پوری ہوتی تھی۔ ہر طرح کی سہولت موجود تھی۔ میں کیسے اب اس زندگی سے نکل کر اس زندگی کا خود کو عادی بناؤں؟" اس نے جیسے بڑی بے بسی سے استفسار کیا تھا۔

"میری جان! اب ماں باپ کا گھر پیچھے رہ گیا ہے۔ اپنے گھر کا کبھی اپنے ماں باپ کے گھر سے مقابلہ مت کرنا۔ جو لڑکی کمپیئر کرتی ہے وہ کبھی آسودہ نہیں رہ سکتی۔ یہ گھر جو تمہارے ماں باپ کا ہے یہ تیس چالیس سال میں بنا ہے اور تمہارا گھر نیا بننے جا رہا ہے۔ تمہارے گھر کا اور تمہاری ماں کے گھر کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ ہر نیا بننے والا گھر تھوڑے سے شروع ہوتا ہے اور لڑکی کو اس تھوڑے میں خوش رہنا ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔" اس کا ہاتھ تھام کر میں نے تھپتھپایا تھا۔

"آپ یہ سب آسانی سے کہہ سکتی ہیں کیونکہ سب جانتے ہیں کہ آپ ہمیشہ سے اپنے گھر میں بڑی سکھی رہی ہیں۔" اف! کیا تیر چلا دیا تھا ظالم نے۔ میں پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مسکرانے پر مجبور ہو گئی۔

"جو بات نرمی اور پیار سے بن سکتی ہے وہ کبھی ہٹ دھرمی اور مقابلے بازی سے نہیں بن سکتی۔ اپنے اندر تحمل اور برداشت پیدا کرو اور اپنے رشتوں کو بھی ان دو ہتھیاروں سے نبھاؤ گی تو ہی اپنا گھر بنا پاؤ گی۔" وہ بس میری شکل دیکھ کر رہ گئی۔ میں اسے اپنی نو سال کی داستان نہیں سنا سکتی تھی۔ بھلا عورت کی قربانی کے بنا کبھی گھر بنا ہے؟ شاید اسے بات سمجھ آ گئی تھی۔ بہرحال میں اسے اتنا ہی سمجھا سکتی تھی۔ خالہ کے گھر سے نکلتے ہوئے میں نے انہیں بھی چند تاکید کی

تھیں۔ جب والدین بہت اچھے "ماں باپ" بننے کے بے اور دکو، خاص کر بیٹیوں کو ہر آسائش، ہر سہولت دیتے ہیں تو انہیں ماں باپ کو اولاد کو "کم" میں بھی رہنے کی تسلی بھی دینا چاہیے۔

ملتان سے لوٹنے سے پہلے ہی خالہ نے مجھے فون کر کے بتایا تھا کہ ماریہ خود سے واپس گھر چلی گئی ہے۔ مجھے خوشی تھی اور میں دعا گو تھی کہ وہ اپنا گھر اور اپنے مسائل خود سے بخوشی سنبھال پائے۔ جب لڑکیوں نے گھر بسانے ہی ہوتے ہیں تو کیوں نہ اچھے طریقے سے بسائے جائیں۔ میری بچی کے "ہوم۔ سویٹ ہوم" سے مجھے سب کچھ یاد آ گیا کہ کس طرح میں نے اس "مکان" کو "گھر" بنایا تھا۔

☼ ☼ ☼
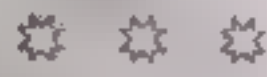
شادی کے بعد ہفتہ اس طرح گزرا۔ دعوتیں، گھومنا پھرنا، میکے کے چکر اور پھر ہفتے بعد جب اسید نے جاب پر جانا شروع کیا تو میں نے بھی کھیر پکا کر کچن سنبھالنے کا عندیہ دے دیا۔ شادی کے شروع میں تو ساس ماں سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ ہی معلوم پڑتا ہے کہ "ساس" ساس ہی ہوتی ہے اپنی سگی ماں نہیں ہوتی۔ میرے شوہر گھر کے اکلوتے بیٹے تھے جن کی دو ہی بہنیں تھیں اور دونوں ہی شادی شدہ۔ گھر میں بس میں اور امی یعنی کہ میری ساس ہی رہ گئی تھیں۔

اسید تو صبح سویرے نکل جاتے تھے پیچھے پورا دن ہم ایک دوسرے کے رحم و کرم پر ہوتے تھے۔ انہوں نے کیا میرے رحم و کرم پر ہونا تھا میں ہی ان کے رحم و کرم پر تھی۔ ایک نو عمر اور نا تجربہ کار لڑکی جو آنکھوں میں بہت سے خواب لیے اپنے اتنے ڈھیر سارے رشتوں کو پیچھے چھوڑ کر نئے رشتے بنانے اس گھر میں آتی ہے، انکلوں کے پیار محبت اور تعاون کی متقاضی ہوتی ہے۔ گھر کے بڑوں کا فرض ہوتا ہے کہ اسے نئے گھر کے طور طریقے سمجھائیں اور اسے ان طور طریقوں میں ڈھالنے کے لیے کچھ وقت کچھ مارجن تو دیں۔ نجانے

ہم آنے والی سے یہ کیوں امید لگا بیٹھتے ہیں کہ وہ آتے ہی خود کو پہلے دن سے ہی ہمارے مطابق ڈھال لے گی۔ عادات اور طبیعتوں کو بدلنے میں تھوڑا وقت لگتا ہے اور رشتہ کوئی بھی ہو دوسرے کو کچھ وقت کچھ رعایت تو دینا ہی چاہیے۔ یہیں ہم سے غلطی ہوتی ہے۔ جب میں نے کچن سنبھالا تو میں کھانا بنانے سے قبل امی سے پوچھتی ضرور تھی کہ میں یہ پکانے لگی ہوں مجھے بتا دیں کہ آپ کس طریقے سے پکاتی ہیں۔ امی کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا۔

"پکا لو پھر کھا کے ہی بتاؤں گی کہ ٹھیک ہے یا نہیں۔" انہیں اس جملے کی بجائے یہ کہنا چاہیے تھا کہ "پکا لو پھر میں کھا کر ایک ہی بار عزت افزائی کروں گی۔" کھانے کے بعد وہ اسید کے سامنے ہی ایک ایک چیز میں کیڑے نکالتی تھیں۔

میں، ارفع سلیم جو اپنے خاندان میں بہت اچھی کک مشہور تھی مسرال میں آ کر یہی لگا کہ میں تو کھانا پکانے کی الف، ب بھی نہیں جانتی۔ میکے میں دعوتوں پر جن پکوانوں پر دل کھول کر داد وصول کرتے سیروں خون بڑھتا تھا وہی خون سسرال میں آ کر جل گیا۔ کتنے سال تو مجھے یہ ہی جاننے میں لگے کہ میری ساس دراصل کیسا کھانا پسند کرتی ہیں۔ جس دن میری نندوں نے آنا ہوتا تھا اس دن میرا ایک پاؤں کچن میں ہوتا اور دوسرا گھر کے باقی کام نبٹانے میں۔ پھرکی کی طرح گھومنے کے باوجود تعریف کا ایک لفظ بھی سننے کو نہ ملتا تھا۔ مگر میں نے ہر موقع پر صبر کا دامن کبھی نہیں چھوڑا تھا۔

جب میری شادی ہونے جا رہی تھی تو شادی سے دو ہفتے قبل ہی میں ہما آپا کی طرف گئی تھی ان سے ملنے، ہما آپا سے میں نے قرآن کی تفسیر پڑھی تھی۔ انہوں نے مجھے بٹھا کر بہت تفصیل سے سمجھایا جو ایک ایک بات میں نے پلو سے باندھ لی اور شاید ان ہی باتوں پر عمل کرنے سے ہی میں نے سسرال میں اپنی جگہ بنائی تھی۔ آپا نے مجھے گلے لگا کر مبارک باد دی اور میرا ہاتھ محبت سے تھام کر بولا

"ارفع شادی خوشی سے کہیں زیادہ بڑی ذمہ داری کا کام ہوتا ہے۔ اب تمہارا اپنا گھر تمہاری پہچان ہوگا اور میاں بیوی کے اس رشتے میں کوئی تیسرا سانجھی نہیں ہوتا۔ تمہارا ہر عمل تمہارے نئے بننے والے رشتوں میں نیا پن پیدا کرے گا۔ یہ محض تمہارا نہیں بلکہ تمہارے ماں باپ کی تربیت کا بھی امتحان ہے۔ سب رشتوں کی قدر کروگی تو جواباً "قدر پاؤگی۔ تمہاری شادی ایک عام لڑکی کی شادی نہیں ہے۔ ایک قرآن کو پڑھ کر سمجھنے والی لڑکی کی شادی ہے جو عام شادی سے مختلف ہوتی ہے۔ ہر قدم پر اللہ سے صبر مانگنا جب بھی کوئی مشکل ہے۔ بہت سی مسنون دعائیں تمہیں یاد ہیں انہیں پڑھتی رہا کرنا۔" بہت بڑی بات کردی تھی آپا نے۔ جو سننے میں جتنی بڑی تھی عمل کرنے میں اس سے کہیں زیادہ بھاری تھی۔ ساری زندگی قرآن کی تفسیر' اسلامی احکامات پڑھتی رہی اب انہیں اپلائی کرنا تھا مجھے وہ بھی اپنے سسرالی رشتوں پر۔ اسلام میں الگ سے سسرالی رشتوں کے کوئی حقوق بیان نہیں کیے گئے جس کا مطلب واضح ہے کہ جو حقوق خونی یا رضاعی رشتوں کے ہیں وہی سسرالی رشتوں کے ہیں۔ پھر چاہے "ساس" ساس ہی رہے ماں نہ بن پائے' نندیں بہنوں کی جگہ نہ لے پائیں' مگر حقوق تو ان کے وہی تھے جو میری سگی ماں اور بہنوں کے تھے۔

شادی سے قبل ذمہ داری کم تھی اور اب دوہری ذمہ داری آن پڑی تھی۔ میں نے خود کو یہ ذہن نشین کرا دیا تھا کہ ارفع سلیم سسرال میں بھی تجھے میکے کی طرح کسی بات کو دل سے نہیں لگانا۔ جیسے میکے میں امی' بہن بھائیوں سے ہلکی پھلکی نوک جھوک' طعنے تشنوں کے بعد دل پھر سے ان رشتوں کے لیے صاف ہو جاتا تھا وہی رویہ تجھے تیرے اس نئے گھر میں بھی روا رکھنا ہوگا۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی اور راستہ بھی تو نہ تھا۔ مجھے اسی گھر میں ان ہی رشتوں کے ساتھ رہنا تھا۔ میاں کو خوش رکھنے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ میں ان کے گھر والوں کو خوش رکھوں اور کبھی ان کے گھر والوں کی برائی ان سے نہ کروں مگر ابتدا میں مجھے

اس کا احساس ہی نہ ہوا۔ کم عمر تھی لہٰذا اس سنی سنائی بات کے مطابق میاں سے دل ہلکا کرنے بیٹھ گئی کہ شوہر کی صورت میں ہمیں ایک قریبی دوست ملتا ہے جس سے ہم سارے راز و نیاز کر سکتے ہیں۔ بعد میں احساس ہوا کہ شوہر "شوہر" ہی ہوتا ہے۔

اس روز بھی ہوا کچھ یوں کہ فاطمہ باجی اپنے چھوٹے بیٹے عمر اور بڑی بیٹی ہانیہ کے ہمراہ رہنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ فاطمہ باجی میری بڑی نند تھیں اور یہیں اس شہر میں مقیم تھیں پھر بھی مہینے میں ایک بار ضرور میکے رہنے کے لیے آیا کرتی تھیں۔ خود وہ کم بہت کھاتے پیتے گھر میں نہیں بیاہی گئی تھیں مگر میکے آنے پر وہ وی آئی پی پروٹوکول چاہتی تھیں۔ ان کے بچوں کو دو وقت دودھ پینا ہوتا' کھانے میں چکن کی ایک ڈش لازمی ہونا چاہیے۔ شام کی چائے پر بھی خصوصی انتظام ہونا ضروری تھا اور میٹھے میں ان کو ہر کھانے کے بعد آئس کریم چاہیے ہوتی تھی۔ پورے ماہ کا بجٹ ہل کر رہ جاتا جب بھی وہ رہنے کے لیے آتیں جب اسید پوچھتے تو امی تو انجان بن جاتیں اور میں مجرم بنی کٹہرے میں کھڑی ہوتی کہ مہینے کے اختتام سے قبل ہی دی گئی رقم ختم کیسے ہوگئی؟

اس دن بھی باجی کی فرمائش تھی کہ چکن کڑاہی' شامی کباب اور سلاد کے علاوہ بھی کوئی ڈش بنادوں اور خواہ کھانا دوپہر کا ہو یا رات کا کولڈ ڈرنک ہونا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر کھانا اندر اترنا مشکل ہے۔ اس وقت تو جیسے تیسے میں نے کھانے کا اہتمام ان کی خواہش کے مطابق کردیا' مگر جب رات میں بھی میں نے دوپہر کا بچا سالن ہی رکھا تو ان کا اتنا بڑا منہ سوج کر کپا ہو گیا۔

"ارفع ہم کون سا آئے دن رہنے کے لیے آجاتے ہیں جو تم نے اتنی کنجوسی کا مظاہرہ کیا ہے۔ دو وقت کی ہماری روٹی بھی تم پر اس قدر بھاری ہے۔ کیا ہو جاتا جو تم رات میں الگ سے کچھ بنا دیتیں؟" ان کے الفاظ اور لہجے کی کاٹ پر نجانے کیوں میں خود کو خاموش نہیں رکھ پائی۔

"باجی مہینے کا آخر ہے اور ہاتھ ذرا تنگ ہے ورنہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ ملتا۔" میں نے بڑی بردباری سے جواب دیا۔

"بس امی جی سن لیں۔ اب ہمارے بھائی کی کمائی بہو ہم پر تنگ کردی گئی ہے۔ ہاں بھئی اب گھر کی مالکن یہ جو ٹھہریں۔" مگر پھر جو امی نے بولنا شروع کیا تو وہ گونگے بہرے بن کر بیٹھے رہے۔ مگر اسید کے گھورنے پر میں خاموش رہ گئی۔ رات کمرے میں آتے ہی اسید اچانک مجھ پر الٹ پڑے۔

"تمہیں کیا ہے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ وہ تین دن کے لیے تو وہ آئی ہیں کیا ہوجاتا جو تم ذرا دل کھول کر خرچ کردیتیں۔" میں نے بھی تہیہ کرلیا کہ کم از کم اسید کے سامنے تو میں دل کا غبار نکال سکتی تھی اور آج میں نکال کر رہوں گی۔

"تو میں نے غلط تو نہیں کیا نا ۔۔۔ مہینہ ختم ہونے والا ہے اور پیسے بھی۔ ابھی دن زیادہ رہتے ہیں اور پیسے سب بعد میں آپ اور امی نے مجھے ہی سنانا ہے کہ میں شاہ خرچ ہوں۔ باجی کو بھی تو سوچنا چاہیے کہ کیا فرق پڑ جاتا جو میں نے ایک وقت کا کھانا دوسرے وقت میں چلا دیا۔ کل تو تازہ بنادوں گی نا۔ خود وہ اپنے گھر میں بھی تو ایک ٹائم پر ہی کھانا بناتی ہیں اور رات کے سالن کے ساتھ ساتھ اگلی صبح ناشتے میں بھی پیش کرتی ہیں۔" حالانکہ میں نے بڑی نرمی سے ساری بات کی تھی مگر اسید کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"وہ آپ کی بہن ہیں۔ ان سے ڈھکا چھپا تو نہیں کہ آپ کی کمائی کتنی ہے۔ انہیں بھی تو کچھ کمپرومائز کرنا چاہیے۔"

"میری بہن اس گھر میں آکر جو فرمائش کرے اسے پورا کرنا میرا فرض ہے۔ میں تمہارے بھائیوں کی طرح نہیں ہوں جو بہن کو بیاہ کر سمجھتے ہیں کہ گویا دفنا ہی دیا ہے۔" مجھے کرنٹ لگا۔ بھلا اس سارے مسئلے میں میرے بھائی کہاں سے آگئے تھے۔ بات اس گھر کی' ہمارے بجٹ کی ہو رہی تھی اور اب۔

"میرے بھائیوں کا یہاں کیا ذکر بھلا؟"

"کیوں تمہارے بھائیوں کا ذکر کیوں نہ ہو؟ جب تم میری بہنوں پر بولوگی تو میں بھی تمہارے بہن بھائیوں کو بیچ میں لاؤں گا۔" آستینوں کو کہنیوں تک فولڈ کرتے ہوئے وہ دوبدو بولے تو مجھے بھی تھوڑا سا غصہ آگیا۔

"میں اپنے بھائیوں کی ذمہ داری نہیں ہوں اب' آپ کی ذمہ داری ہوں بالکل اسی طرح سے جیسے آپ کی بہنیں اب آپ کی نہیں' اپنے شوہروں کی ذمہ داری ہیں۔" غصہ تو مجھے بہت آیا تھا پھر بھی میں نے خود لڑکیوں کے لیے اپنے گھر والوں کے خلاف کچھ بھی سننا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میرے لیے بھی تھا۔

"میری بہنیں اب بھی اس گھر پر پورا حق رکھتی ہیں جیسے شادی سے پہلے ان کا حق تھا۔ سمجھیں تم؟ میں اب تمہاری وجہ سے اپنی بہنوں اور ماں سے زبان درازی نہیں کرسکتا۔" میں کچھ بولنے ہی لگی تھی کہ جب میرے اندر کے انسان نے مجھے جھنجھوڑا کہ ارفع یہ تم کیا کررہی ہو؟ زبان درازی وہ بھی شوہر سے؟ اور ایسے وقت میں شیطان کتنا خوش ہوگا کہ اس نے میاں بیوی کے درمیان فساد پیدا کرکے انہیں لڑوا دیا اور ہم کسی کی وجہ سے کیوں جھگڑ رہے ہیں۔

یکدم میں خاموش ہوگئی۔ میں عام لڑکی نہیں تھی' میں تو قرآن پڑھی ہوئی لڑکی تھی میرے عمل میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے تھا عام لڑکی سے۔ میرے انداز و اطوار میں جاہل اور نافرمان بیویوں کے اوصاف نہیں ہونا چاہیے تھے۔ مجھے تو فرماں بردار بیوی بننا تھا۔ کسی دوسرے کی وجہ سے زندگی میں پہلی بار ہمارا جھگڑا ہوا تھا جس کا مجھے دکھ تھا۔ جب اسید سونے کے لیے بستر پر لیٹے تو میں نے ان سے اپنی غلطی اور بدتمیزی کی معافی مانگ لی۔ لاڈ سے پیار سے انہیں منالیا اور وہ فوراً "مان کر پہلے کی طرح نارمل ہوگئے۔ جیسے ہمارے درمیان کچھ ہوا ہی نہ تھا مرد کی سائیکالوجی بالکل ایک بچے کی سی ہوتی ہے۔ باہر سے جتنے بھی سخت ہوں اندر سے معصوم ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہوجاتے ہیں۔ لاڈ سے پیار سے مان جاتے ہیں۔

انہیں بچوں کی طرح ٹریٹ کرنا ہی سب سے بہترین فارمولہ ہے۔

اس دن کے بعد سے میں نے خود کو سمجھا لیا کہ آئندہ کبھی اسید کے گھر والوں پر میں کچھ نہیں بولوں گی کیونکہ جواباً" پھر مجھے میرے گھر والوں کے متعلق بھی سننا پڑے گا جو شاید میں برداشت نہ کر سکوں۔ شوہر جیون ساتھی تو ہوتا ہے مگر "دوست" نہیں ہوتا۔ ہر بات اس کے سامنے کہنے والی اور کرنے والی نہیں ہوتی۔ اس کے بعد سے میں نے عادت بنالی تھی کہ جہاں ان کے اور میرے خیالات میں اختلاف ہوتا میں محض "مسکرا" دیتی۔ ایک بھرپور مسکراہٹ اور وہ خود سمجھ جاتے کہ میں کیوں مسکرا رہی ہوں؟ مردوں کی انا فطری ہوتی ہے جسے عورت تبدیل نہیں کر سکتی اور جو عورت اسے تبدیل کرنا چاہے وہ نقصان اٹھاتی ہے۔ شوہر اپنی بے عزتی کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں اور پھر بات بات پر بیوی کو اذیت دیتے ہیں۔ اس دن کے بعد کبھی ہماری بحث نہیں ہوئی نہ ہی کوئی جھگڑا ہوا... وجہ؟ میرا سب سے بہترین ہتھیار "صبر" اور "خاموشی"

ہما آپا سمجھایا کرتی تھیں کہ اللہ سے صبر کی توفیق مانگنا چاہیے اور اس ضمن میں وہ حدیث سناتی تھیں کہ "جو شخص صبر کرنے کی کوشش کرے گا' اللہ تعالیٰ اس کو صبر بخشے گا اور صبر سے زیادہ بہتر اور بہت سی بھلائیوں کو سمیٹنے والی بخشش اور کوئی نہیں۔" میں ہر نماز کے بعد بہت دل سے تکرار اور اصرار کے ساتھ اللہ سے دعا کرتی تھی۔

"اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمیں ثابت قدمی عطا فرمادے۔" جب امی اور باجیاں کبھی طعنے دیتیں یا صلواتیں سنانے پر آتیں تو میں دل ہی دل میں بار بار یہ دعا پڑھتی جاتی "اے اللہ! مجھے میری اس مصیبت پر اجر عطا فرما اور اس کا بہتر عوض دے۔" مگر میں نے کبھی مڑ کر جواب نہ دیا۔ جواب دیتی تو میرا اپنا گھر ہی خراب ہوتا۔ جب دل بہت بھر آتا تو میں ہما آپا کو فون کر کے دل ہلکا کر لیتی تھی۔ وہ مجھے ایک ہی بات سمجھاتی تھیں کہ...

"ارفع یہ رشتہ اللہ کے نام پر جڑا ہے۔ اللہ کے کلمات پڑھ کر دو اجنبی لوگ یکجا ہوئے ہیں۔ جہاں تمہاری انا آنے لگے وہاں اپنی ذات کو پیچھے کر کے اللہ کی محبت کو آگے رکھو کیونکہ اللہ پاک کو میاں بیوی کا یہ رشتہ بے حد پسند ہے خطبہ نکاح میں چار مرتبہ تقویٰ کا ذکر آتا ہے تاکہ اس رشتے میں اللہ سے ڈرا جائے۔ پس تم بھی اللہ سے ڈرتی رہو۔"

جب میں اللہ کی خاطر برداشت کرتی تو دل کا بوجھ بھی کم ہو جاتا۔ مگر کبھی میں نے اپنے میکے جا کر ایک لفظ بھی اپنے شوہر یا سسرال کے خلاف نہ کہا تھا۔ میرے سب گھر والوں پر یہیں تاثر تھا کہ میں بہت خوش اور مطمئن ہوں اور میرے گھر میں کبھی کسی قسم کا کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوا حالانکہ آئے دن امی اسید کے کان بھرتیں اور جب وہ یہ کام نہیں کرتی تھیں تو باجیاں آ کر کر دیتیں ۔ اسید کبھی ان کے سامنے تو مجھے کچھ نہیں کہتے تھے' مگر اکیلے میں ضرور مجھ پر برستے تھے۔ میں خاموشی سے یا تو سنتی رہتی یا مناسب الفاظ میں وضاحت کر دیتی اور آخری حل ایک ہی ہوتا کہ میں معذرت کر کے بات ختم کر دیتی انا مرتی اور گھر بچ جاتا۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ ہم میں کمیونیکیشن گیپ ہے تب ہی ہمارے درمیان فاصلے کم نہیں ہوتے۔

منال کی پیدائش کے بعد حالات اور پیچیدہ ہوتے گئے۔ اتنی بہت ساری ذمہ داریوں کے ساتھ اب ایک بچی کی ذمہ داری بھی مجھ پر آن پڑی تھی۔ جب میں اس کو سنبھالنے جاتی تو گھر کے کام پڑے رہ جاتے اور گھر کے کام نبٹانے لگتی تو میری بچی اگنور ہونے لگتی۔ میری ساس نے کبھی اتنا بھی نہ کہا کہ میں اگر کاموں میں مصروف ہوں تو دادی ہونے کے ناتے ہی اسے سنبھال لیں کہ اس کی ماں مصروف ہے۔ میری بچی روتی بلکتی رہتی اور میں کبھی اسے سنبھالتی تو کبھی گھر کو۔ میں نے اسید سے ایک بار بولا بھی تھا کہ گھر کے کام کاج کے لیے چند گھنٹوں کے لیے تو کوئی ملازمہ رکھ لیں جو گھر کی

صفائی ستھرائی تو کر جایا کرے مگر اسید نے صاف کہہ دیا کہ

"امی کو ہرگز کسی ملازمہ سے گھر کا کام کروانا پسند نہیں آئے گا۔ وہ ساری زندگی خود گھر سنبھالتی رہی ہیں لہٰذا تمہیں بھی گھر خود سنبھالنا ہو گا ارفع۔" اور میں بس خاموش ہو گئی۔ میری ساس زندگی کے جس حصے میں تھیں وہ جسمانی اور جذباتی طور پر کمزور ہو چکی تھیں۔ ان کے لیے اس عمر میں خود کو بدلنا انتہائی مشکل تھا۔ لہٰذا قربانی مجھے ہی دینا تھی۔ مجھے ہی حالات کو "جیسے ہیں" کی بنیاد پر قبول کرنا تھا۔ اللہ نے جس چیز میں قربانی زیادہ رکھی ہے اس میں اجر بھی زیادہ رکھا ہے۔ اللہ کے لیے اپنے گھر کے لیے میں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ قربانی دے رہی تھی۔

منال کے بعد تو اسید اور میرے درمیان مجھے اور بھی فاصلے محسوس ہونے لگے تھے کیونکہ پہلے جو وقت میرا' میرے میاں کے لیے مختص تھا اس میں اب ہماری بیٹی بھی شامل حال تھی۔ میں اکثر اس کمی کو شدت سے محسوس کرتی مگر میرے بس میں کچھ نہیں تھا۔ شوہروں کو بھی تو بیویوں کی ساری ذمہ داریوں کو نظر رکھ کر سوچنا چاہیے۔ میں نافرمان بیوی تو نہیں تھی' نہ ہی پھوہڑ تھی۔ میاں کے لیے بن سنگھار بھی کرتی تھی مگر پھر بھی مجھے لگتا کہ ہمارے درمیان کچھ ایسا تھا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ اسید پریشان رہنے لگے ہیں یا شاید وہ مجھ سے بے زار ہو گئے تھے۔ میرا کوئی دکھ سکھ کا ساتھی نہ تھا سوائے اللہ کے...

انسان اپنے مسائل کی گٹھڑی کو کھول کر حل کرنے بیٹھے بھی تو ناکام رہتا ہے کیونکہ ہونا تو وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ اسی لیے میں اپنے مسائل کے اس انبار کو جو میں نے ایک گٹھڑی میں باندھ رکھے تھے' اللہ کے سپرد کر آئی کہ وہ خود ہی حل کر کے میرے لیے آسانیاں پیدا کرے گا۔ اس سے زیادہ بھلا میرے اختیار میں تھا بھی کیا جو میں کرتی؟ میں اسید سے ایک آدھ بار پوچھ بھی چکی تھی کہ انہیں کوئی پریشانی ہے تو مجھ سے کہیں مگر وہ کہتے ہی نہ تھے۔ نجانے وہ کسی پر اعتماد نہیں کرتے تھے یا ابھی انہیں مجھ پر اعتبار کرنے کے لیے مزید وقت درکار تھا۔

تین سالوں میں بہت کم ہی میرا میکے جانا ہوا تھا۔ میرے بہن بھائی مذاق سے مجھے چھیڑتے تھے کہ یہ شادی کے بعد کچھ اپنے میاں اور سسرال کو پیاری ہو گئی ہے۔ انہوں نے اسے اس طرح قابو کیا ہے کہ یہ ہمیں بھول ہی گئی ہے... میں دکھ سے سوچتی کہ جن ذمہ داریوں میں مجھے باندھ دیا گیا ہے اگر مجھے انہیں ایمانداری اور خلوص سے نبھانا ہے تو مجھے میرے ان پیارے رشتوں کی طرف پیچھے مڑ مڑ کر نہیں دیکھنا ہے۔ جب بھی امی سے ملتی وہ میرا چہرہ کرید کرید کر سوال کرتیں۔

"تم اپنے گھر میں خوش تو رہ رہی ہو نا ارفع؟" اور میں بھرپور انداز سے مسکرا دیتی تو امی آسودہ ہو جاتیں۔

"امی میں اس گھر میں رہ رہی ہوں خوش ہوں کہ نہیں وہ میں نہیں جانتی۔" میں دل ہی دل میں سوچ کر رہ جاتی۔ اچھی بیٹیوں کو اچھی اداکاری بھی آنا چاہیے اور میں اچھی اداکارہ بن گئی تھی تب ہی میری ماں جو مجھے اور میری ادا کو جان جاتی تھیں' کبھی نہیں جان سکیں کہ میں اپنے گھر میں کن حالوں میں ہوں؟ ساس نندیں تو سب کی ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ میرا تو شوہر بھی جیسے میرا نہیں تھا مگر مجھے اسی کے ساتھ رہنا تھا۔ صبر سے ہی سہی شکر سے نہ سہی۔

ایک دن یونہی دل چاہا کہ میں ڈائری لکھوں... اپنے دل کی ساری باتیں قلم کے ذریعے کاغذ پر اتار دوں۔ ڈائری تو نہیں البتہ میں نے چند کاغذ لے کر ان پر وہ سب لکھا جو میں چاہتے ہوئے بھی اسید سے کبھی کہہ نہیں پائی تھی۔ ان کے لیے میرا پیار' میری فکر' اس گھر کے لیے میرا اپنائیت کا جذبہ اور ہمارے رشتے کی اہمیت۔ سب کچھ میں نے چند کاغذوں پر لکھ کر جیسے دل کا سارا بوجھ ہلکا کر لیا تھا۔ میں نے اپنی شادی شدہ زندگی کے کسی مسئلے کو ان تین سالوں میں کبھی اپنی ماں یا بہنوں سے شیئر نہیں کیا تھا۔ ہاں کبھی کبھار میں ہما آپا

سے ضرور ڈسکس کرتی تھی مگر اس میں بھی کبھی رمید سے متعلق یا کبھی ان کی شخصیت کے کمزور پہلو کو آپ کے سامنے بیان نہیں کیا تھا۔ وہ میرے شوہر تھے جیسے بھی تھے اور میں کسی کے سامنے بھی ان کی ذات کی کوئی بھی کمزوری نہیں لانا چاہتی تھی۔ میرے پاس اللہ کی ذات ہی تھی جس سے میں سب بانٹتی تھی۔

چند دن بعد ہی اسید نے شام کے وقت مجھے کمرے میں بلایا۔ ان کا انداز کچھ اجنبی سا تھا۔ میں جب کمرے میں گئی تو ان کے ہاتھوں میں کاغذ کے چند ٹکڑے تھے۔ میں سمجھ نہ سکی کہ انہوں نے مجھے کیوں بلایا ہے۔

"ارفع یہ سب کیا ہے؟" انہوں نے میرے سامنے جب وہ کاغذ کیے تو اپنی ہی لکھائی پہچان کر مجھے چند سیکنڈ لگے تھے یہ سمجھنے میں کہ یہ وہی کاغذ تھے جو میں نے دل کا غبار اتارنے کے لیے لکھے تھے۔ میں کیا وضاحت دیتی؟ سو خاموش کھڑی رہی۔ البتہ اسید کی خاموشی مجھے بری طرح کھل رہی تھی۔ انہیں تو عادت تھی مجھ پر غصہ کرنے کی مگر اس روز وہ خاموش تھے۔

"ارفع تم جاننا چاہتی ہو نا کہ میں آج کل پریشان کیوں ہوں؟" وہ سر جھکائے کھڑے تھے اور میں ان کے جھکے سر اور پریشان حال کو دیکھ رہی تھی۔

"میری جاب ختم ہو رہی ہے اگلے ماہ سے۔" میں جیسا کھڑی تھی وہیں کھڑی ہی رہ گئی۔

"فیکٹری خسارے میں جا رہی ہے شاید اگلے ماہ تک بند کردی جائے۔ مجھے نہیں اور نوکری ڈھونڈنا ہے اور یہ گھر بھی خالی کرنا ہوگا ہمیں۔" ہماری بری خبریں ایک ایک کرکے سنا رہے تھے۔ یہ کیا ہونے جا رہا تھا؟ اتنے عرصے تک انہوں نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی اور اب۔ اب کیا ہوگا یہی سوال میرے ذہن میں اللہ اللہ کر چیخ رہا تھا۔ مگر مجھے حوصلہ کرنا تھا اور اپنے شوہر کی ہمت بندھانا تھی ایک بیوی کو یہی تو کرنا ہے۔

"اللہ سب بہتر کرے گا۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے۔" میں نے حد درجے خود کو پرسکون رکھا۔ وہ محویت سے مجھے تک رہے تھے جیسے کہنا چاہتے ہوں کہ تم کس قسم کی عورت ہو۔ گھر کی چھت چھنتے جا رہی ہے میری نوکری چھوٹنے جا رہی ہے مسائل کے انبار منہ کھولے کھڑے ہیں۔

"میں کل سے ہی چوک والے اسکول کو جوائن کرلیتی ہوں۔ اس روز بھی ان کی پرنسپل مجھ سے کہہ رہی تھیں نوکری کا۔ وہاں جگہ ہے سائنس ٹیچر کی۔" میں نے وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ کرلیا تھا کہ مجھے اب اپنے شوہر کی اس مشکل میں اپنی ہمت سے بڑھ کر ساتھ دینا ہے۔ اچھی بیویاں تو وہ ہوتی ہیں جو شوہر کی تنگدستی میں بھی اس کا ساتھ نبھاتی ہیں، دلجوئی کرتی ہیں۔ شوہر صرف تب تک اچھا نہیں ہونا چاہیے جب تک وہ بیوی کو کھلا پلا رہا ہے بلکہ وہ تب بھی اچھا ہونا چاہیے جب اس کے پاس کھلانے کو کچھ نہ ہو۔ بلکہ برے وقت میں تو اسے بیوی کے ساتھ کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

"تم نوکری کرو گی۔" وہ متحیر کھڑے پوچھ رہے تھے۔

"کیوں میں نوکری کیوں نہیں کرسکتی۔ دنیا کی آدھی سے زیادہ عورتیں نوکریاں کرتی ہیں۔"

"گھر کیسے سنبھالو گی پھر؟"

"دنیا کی آدھی سے زیادہ عورتیں جو نوکریاں کرتی ہیں وہ گھر بھی سنبھالتی ہیں۔" میں ہنوز پرسکون ہو کر بولی۔ ایسا نہیں تھا کہ میں پریشان نہیں تھی مگر اتنے عرصے میں مجھے خود کو پریشانی کے باوجود کمپوز کرنا آگیا تھا۔ میں پریشان ہوتی ضرور تھی مگر پریشان دکھتی نہیں تھی۔

"مگر۔" میں جانتی تھی ان کی غیرت یہ گوارہ نہیں کر رہی ہے کہ ان کی بیوی کمانے باہر جائے تب ہی وہ تذبذب کا شکار ہیں۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔ میں پڑھی لکھی ہوں اور ایسی تعلیم کا کیا فائدہ جو انسان کے برے وقت میں کام نہ آسکے۔ میں آپ کے سکھ کی نہیں، دکھ کی بھی ساتھی ہوں اسید۔ مجھے اس مشکل وقت میں آپ اپنا ساتھ نبھانے سے روک نہیں سکتے۔" بڑے مان سے میں نے ان کے بازو پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے نرمی سے کہا تو جیسے وہ میرے ممنون سے ہو گئے مگر بولے کچھ بھی نہیں۔ اللہ نے شوہر کو بڑائی دی ہے اور اس کی فطرت میں بھی بڑائی رکھی ہے۔ جب عورت اس کی بڑائی چھیننا چاہتی ہے تو وہ اللہ کی حدود سے تجاوز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے گناہ کی مرتکب ہوتی ہے اور میں اسید سے ان کی بڑائی کو ہرگز چھیننا نہیں چاہتی تھی۔ ان کی انا اور ذات کا تکبر مجھے اسی طرح عزیز تھا جیسے خود کا بلکہ خود سے کہیں زیادہ تب ہی اپنی انا اور تکبر کو میں نے تین برسوں میں بار بار دبایا تھا مگر ان کے تکبر اور انا کو میں نے زندہ رکھا۔ یہ قربانی کیا کم تھی؟

اگلے روز سے میں نے اپنی اتنی ذمہ داریوں میں ایک اور کا اضافہ کرلیا۔ گھر، بچی اور اب اسکول کی نوکری۔ اگلا مہینہ چڑھتے ہی اسید کی نوکری ختم ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیں گھر بھی چھوڑنا پڑا جو ہمیں فیکٹری کی طرف سے ہی ملا ہوا تھا۔ ہم نے کرایہ کا بہت چھوٹا سا گھر لے لیا اور میری نوکری اور کچھ جمع جتھا تھا۔ جس کے بل بوتے پر گھر چل رہا تھا۔ امی نے اتنی فیور کی تھی۔ میرے پیچھے وہ منی کو سنبھال لیتی تھیں۔ مگر گھر کے سارے کام میں خود ہی اسکول سے آکر کرتی تھی۔ خیر میرے لیے اتنا بھی بہت تھا کہ میری بچی سنبھل رہی تھی۔ جس رب نے رزق دیا تھا وہ اب بھی دے رہا تھا۔ ایک وسیلے سے نہ سہی دوسرے سے سہی۔ پھر بھی اس سے کیا شکوہ کرنا؟ ایک در بند ہوا تھا تو کہیں اور سے کھل ہی جاتا تھا۔ برے وقت کے بعد ہی اچھا وقت بھی آنا تھا۔ میرے صبر کا امتحان تھا اور مجھے سب اچھے سے کامیابی سے پاس کرنا تھا۔

چھ ماہ تک میں اسی طرح نوکری کرتی رہی اور چھ ماہ تک ہی اسید بے روزگار رہے۔ ساتویں ماہ جس دن انہیں نوکری مل گئی وہ بے حد خوش تھے اور میں ان سے کہیں زیادہ خوش تھی۔ وہ ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ لیے گھر میں داخل ہوئے اور میرے منہ میں مٹھائی ڈالتے ہوئے مسکرا کر بولے۔

"اب تم نوکری نہیں کرو گی ارفع۔ تم میری ذمہ داری ہو تمہارا خرچ پورا کرنا میرے ذمے ہے۔ تم نے میرے برے دنوں میں میرا ساتھ دیا مگر اب ان شاء اللہ میرے برے دن ختم ہونے کو ہیں۔ اگلے ماہ سے نوکری چھوڑ دینا۔" خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شادی کے چار سال بعد میرے شوہر نے مجھے اپنی ذمہ داری تو قبول کیا اور میرے لیے یہی بہت تھا۔

نئی نوکری پہلے سے کہیں زیادہ بہتر تھی اور تنخواہ کے ساتھ دیگر مراعات بھی ملی تھیں۔ آہستہ آہستہ حالات بدلنے لگے۔ وہ چھوٹا سا کرائے کا گھر بدل کر ہم نے ایک اچھے اور بہتر علاقے میں بڑا گھر کرائے پر لے لیا۔ نجانے اب امی یا باجیوں نے پہلے کی طرح طعنے دینا اور لعن طعن کرنا چھوڑ دیا تھا یا میں ہی اتنی سخت جان ہوگئی تھی کہ مجھے محسوس نہیں ہوتا تھا۔

ہر عورت کی طرح میرا بھی خواب تھا۔ اپنے گھر میں اپنے طریقے سے سجاؤں۔ کرائے کا ہی سہی مگر تھا تو وہ میرا گھر ہی نا۔ بڑا اور خوبصورت مگر امی سے کون اجازت لیتا۔ اما آپا کہتی تھیں کہ "دوسروں کا احساس کرنے سے رشتوں میں مضبوطی آتی ہے مگر جو احساس کریں وہ اللہ کے لیے کریں۔" میں اپنی ساس کا ہر طرح سے خیال کرتی تھی مگر ہمارے رشتے میں وہ مضبوطی نہ آسکی جیسے میں چاہتی تھی۔ اللہ رشتوں کو جوڑنے کا حکم دیتے ہیں اور میں نے ہر طرح سے اس رشتے کو جوڑے رکھنے کی ان چار سالوں میں سعی کی تھی۔ صلے کے طور پر ان سے کبھی کچھ نہیں چاہا تھا مگر تھی تو انسان ہی نا پتھر نہیں تھی میں۔ شادی کے بعد خود کو بدلنا ہوتا ہے، پتھر تو نہیں ہونا ہوتا۔ کبھی کبھی یونہی دل کرتا کہ وہ ماں کی طرح مجھے گلے سے لگالیں۔ میری امی اتنے دور دوسرے شہر تھیں۔ بہت من کرتا جب ان سے ملنے کا ان کے گلے لگنے کا تو میں اپنی ساس کے پاس آکر بیٹھ جاتی۔ ان سے ادھر ادھر کی چھوٹی موٹی باتیں کرتی مگر ان کے مزاج میں بےزاری سی محسوس کرکے میں ہمیشہ اپنے کمرے میں لوٹ جاتی۔

ان ہی دنوں میں دوسری بار ماں بننے جا رہی تھی جب میں نے امی کے رویے میں کچھ تبدیلی محسوس کی۔ وہ پہلے کی نسبت میرا کافی خیال رکھنے لگی تھیں۔

اس تبدیلی پر میں حیران تو تھی مگر مجھے یہ تبدیلی بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ باتوں باتوں میں وہ جتا جاتیں کہ انہیں پوتا چاہیے۔ بھلا اولاد دینا نہ دینا میرے ہاتھ کہاں تھا؟ میں تو ایک وسیلہ تھی اللہ کی طرف سے دینا تو اس نے تھا۔ میں اللہ سے نیک اولاد کی دعا کرتی تھی خواہ بیٹا ہو یا بیٹی۔ اور پھر جب عاشر میری گود میں آیا تو اس کی دادی تو خوشی سے پھولے نہ سماتی تھیں اور میں اپنے بیٹے کو گود میں لیے اللہ سے دعا کر رہی تھی۔

"میرے رب! میرے اس بیٹے کو ایسا نہ بنانا کہ یہ کسی کی بیٹی کو روند دے۔ نہ مجھے ایسی ساس بنانا جو کسی لڑکی کے صبر کا امتحان لے کر نہ تھکے۔ نہ میری بیٹی کو ایسی نند بنانا کہ وہ اپنی بھابھی کی زندگی دوبھر کردے۔"

امی نے عاشر کو میری گود سے لے لیا۔ میں کتنی دیر پھر یہی سوچتی رہی کہ اپنی ذات کو اس گھر میں آکر میں نے اپنی ساس' اپنی نندوں اور شوہر کے مطابق خود کو بدلا۔ اب ساری زندگی اس ڈھب پر گزار کر بڑھاپے میں کیا مجھے خود کو اپنی بہو کے مطابق بھی بدلنا ہوگا؟ میرا دل لرز گیا۔ میں کیا کبھی دوبارہ سے خود کو بدلوں گی؟ دوبارہ سے اتنی عمر میں خود کو بدلنا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ یہی سب میری ساس کے ساتھ بھی ہوا ہوگا۔ ہر گھر کی یہی کہانی ہوتی ہے جو نسل در نسل چلتی جاتی ہے۔ آنے والی کو ہی نئے گھر کے مکینوں کے مطابق ڈھلنا ہوتا ہے' خود کو بدلنا ہوتا ہے۔ یہی شاید قانون فطرت ہے۔

اس روز کے بعد مجھے کبھی امی سے کوئی شکوہ نہیں ہوا۔ جب میں نے خود کو اپنی ساس کی جگہ رکھ کر سوچا تو مجھے وہ سب ناممکن لگا جس کی امید میں ان سے کرتی تھی۔ گھر کے حالات مالی طور پر بدل گئے۔ میری فیملی مکمل ہو گئی تھی۔ بس اب ایک خواہش تھی اپنا گھر خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔

عاشر کو سلا کر میں منال کو اسٹوری سنا رہی تھی جب اسید ٹی وی آف کرتے ہوئے سونے کی تیاری کرنے لگے۔

"سنیں۔" میں نے انہیں مخاطب کیا اس سے قبل کہ وہ سو جاتے میں ان سے بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ ہمہ تن گوش تھے۔

"کیا ہم کبھی اپنا گھر لے پائیں گے؟" دل میں دبی خواہش کو میں نے ان کے سامنے بیان کر دیا۔

"تمہیں کہاں سے اپنا گھر لینے کی خواہش پیدا ہو گئی ہے؟" وہ ہولے سے مسکرا دیے۔

"اپنے گھر کی خواہش تو ہر عورت کے دل میں ہوتی ہے۔" منال اب غنودگی میں تھی اور میں اسے تھپک رہی تھی۔

"اس کے لیے بہت پیسہ چاہیے ہوتا ہے تم نہیں جانتیں۔" انہوں نے جیسے میری سوچ کو بچکانہ قرار دے کر ہنسی میں اڑا دیا۔

"میں سب جانتی ہوں۔ آپ بتائیں کیا کبھی ہم اپنا گھر لے سکیں گے؟ چھوٹا سا عام سا گھر جو ہمارا ہو۔ میرا اور آپ کا۔" اب کی بار وہ بغور مجھے دیکھ کر صرف اتنا ہی کہہ کر رخ بدل کر سو گئے کہ "جیسے اللہ کو منظور ہوا۔" اس رات بہت دیر تک میں گھر کے متعلق ہی سوچتی رہی۔ میں شادی کے شروع دنوں سے ہی کمیٹیاں ڈال کر پیسے جوڑنے کی عادی تھی۔ اس پیسے میں سے کچھ میں زکوۃ ادا کرنے میں لگاتی باقی بچا کر رکھ لیتی۔ اب تک لاکھوں جوڑ لیے تھے۔ لاکھوں کی مالیت کا زیور بھی تھا میرے پاس اور ابا کی وفات کے بعد بھائیوں نے جائیداد میں سے بھی میرا حصہ دیا تھا۔ پھر سیونگ تو اسید کی بھی تھی ہی اور اپنی کمپنی سے وہ لون بھی لے سکتے تھے۔ اس سب کو ملا کر بہت بڑا نہیں تو عام سا گھر ایک عام سے علاقے میں تو آہی سکتا تھا۔ کتنے گھنٹوں جوڑ توڑ کرتے کرتے میں سو گئی۔

☆ ☆ ☆

شادی کے سات سال گزرنے کے بعد جب میں نے اپنے گھر میں قدم رکھا تو میری جو کیفیات تھیں وہ ناقابل بیان تھیں۔ میرا اپنا گھر' چھوٹا سا معمولی سا مگر میرا اپنا گھر۔ گھر کے دروازے پر کھڑی میری آنکھیں اشک بار تھیں۔ امی نے میرے کندھے پر ہاتھ دھرا تو

میں جذباتی ہو کر ان سے لپٹ گئی۔ امی مجھے گلے لگائے خود بھی رو رہی تھیں۔ یہ گھر ان کے بیٹے کا تھا، ان کا اپنا تھا۔ جو گھر انہیں ان کے شوہر سے نہ مل سکا، بیٹے نے دیا تھا۔ میں اندازہ نہیں کر پا رہی تھی کہ شوہر سے ملنے والے گھر کی خوشی زیادہ ہوتی ہے یا بیٹے سے۔ بہرحال وہ گھر ہم سب کا تھا۔

"اس گھر پر سب سے زیادہ حق آپ کا ہے امی۔" روتے ہوئے میں نے ان سے گلے لگے ہوئے ہی کہا۔

"نہیں بیٹا اس گھر پر سب سے زیادہ حق تمہارا ہے۔ تم نے اپنی مرضی اس پر لگا کر اسے حاصل کیا ہے۔" امی نے آج مجھے گلے سے لگا کر پیار دیا تھا۔ سات سالوں میں مجھے اس روز اپنے شوہر کی ماں یعنی کہ اپنی ساس مجھے اپنی ماں سے لگی تھیں۔

جب میری خواہش کے اظہار کے چند ماہ بعد مجھے اسید نے بتایا کہ وہ پلاٹ دیکھ رہے ہیں اور رقم کا بندوبست کرنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔ پہلے پلاٹ خریدیں گے اس کے بعد رفتہ رفتہ گھر بنائیں گے تب میں نے اصرار کیا تھا کہ وہ بنا بنایا گھر خریدیں۔

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو یکدم اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا ممکن نہیں ہے۔" وہ جو مجھے سمجھانا چاہ رہے تھے وہ سب میں سمجھ رہی تھی مگر جو میں انہیں سمجھانا چاہ رہی تھی وہ سب وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

"پیسے کا بندوبست ہو جائے گا مگر ہم ڈائریکٹ گھر خریدیں گے۔" میں بضد تھی۔

"کہاں سے ہو گا اتنے لاکھوں کا بندوبست؟"

"میرے پاس لاکھوں کی سیونگ ہے اور پراپرٹی کا بھی کچھ شیئر ہے اور جو کمی ہوئی میں اپنا زیور بیچ دوں گی۔" اسید یکدم چونکے تھے۔

"زیور! نہیں نہیں زیور نہیں بیچنا۔" نفی میں سر ہلاتے انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

"کیوں زیور کیوں نہیں بیچا جا سکتا بھئی؟ اتنا لاکھوں کا زیور بھلا میں نے کیا کرنا ہے۔ کبھی استعمال کیا ہی نہیں میں نے الٹا زکوٰۃ دینا پڑتی ہے۔ وبال جان ہی ہے اتنا زیور۔" مگر وہ کسی طور مان کر نہ دے رہے تھے۔

"آخر حرج کیا ہے اس میں؟" مجھے کبھی یہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ لوگ زیور بیچنے کو معیوب کیوں سمجھتے ہیں؟ جو مال زیر تصرف ہی نہ ہو وہ کس کام کا؟

"بس میں تمہارا زیور بیچ کر گھر نہیں خرید سکتا۔" جیسے شرمسار سے ہو کر نظریں چرا گئے۔ میں اپنا زیور پیش کر کے انہیں نیچا نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ ان کی انا کو ضرب نہیں لگانا چاہتی تھی۔

"زیور بعد میں بن جائے گا مگر گھر بعد میں نہیں بن سکے گا۔" میں نے بڑی لجاجت اور نرم خوئی سے انہیں سمجھانا چاہا۔

"آپ خود بعد میں مجھے زیور دے دیجیے گا مگر ابھی مجھ سے یہ زیور اور پیسہ لے جائیں۔ زیور میرا خواب نہیں ہے گھر میرا خواب ہے۔"

"تمہارا خواب میں پورا کروں گا مگر اس طرح نہیں۔" وہ جیسے بے بسی سے گویا ہوئے تھے۔

"اسید وہ گھر محض آپ کا نہیں ہمارا ہو گا۔ آپ اپنی سیونگز لگائیں اور میں اپنی سیونگز۔ پھر جو پیسہ اوپر چاہیے ہو گا وہ میں زیور سے پورا کروں گی۔ اسی دن کے لیے تو عورتیں ایک ایک پیسہ جمع کرتی ہیں۔ یہ سب پیسہ میرے کس کام کا ہے بھلا اگر یہ سب میرے گھر کے لیے کام نہیں آ سکتا۔" میں اپنے شوہر کے وجود کا موڑ ہر مقام پر ان کا ساتھ دینا چاہتی تھی۔ اب کی بار انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ معلوم نہیں اس وقت وہ قائل ہوئے تھے کہ مصلحتاً خاموش ہوئے تھے مگر کچھ دنوں بعد انہوں نے خود سے ہی مجھے ایک گھر دیکھنے کے لیے ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ گھر بہت سادہ تھا مگر جتنی ہماری حیثیت تھی اس میں یہی اور یہی گھر مل سکتا تھا۔ مگر میں اس پر بھی خوش تھی۔

ایک لمبی کاغذی کارروائی کے بعد ہم نے وہ گھر خرید لیا۔ امی نے مجھے از خود اس گھر کو اپنی پسند اپنی مرضی سے سجانے کا کہا تو میں امی سے لپٹ گئی۔ میرے کہے بغیر انہوں نے مجھے اپنی خواہش پوری کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ میرا گھر پیارا گھر میں نے اپنی پسند سے سجایا تھا۔

✿ ✿ ✿

وقت اور حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے مگر بدلنے میں عرصہ لگتا ہے۔ میرے حالات بھی بہتر ہو ہی گئے تھے آٹھ سال بعد ہی سہی۔ آٹھ سال بعد شادی کی سالگرہ پر اسید از خود مجھے اور بچوں کو کھانا کھلانے باہر لے گئے تھے۔ آٹھ سال بعد اسید کے منہ سے میں نے وہ سب سنا جو میں شادی کے فوراً بعد ہی سننا چاہتی تھی۔

"جب تم ہوا رفع اگر کبھی مجھ سے کوئی پوچھے کہ اچھی بیوی میں کیا خصوصیات ہوتی ہیں تو میرا جواب کیا ہو گا؟" اس روز کھانے کے بعد ہم قریبی پارک میں چلے گئے تھے جہاں دونوں بچے جھولے جھولنے میں لگ گئے اور ہم قریبی گھاس کے قطعے پر بیٹھ گئے۔

"میں اس کو کہوں گا کہ وہ تمہارے کردار کو بغور دیکھے تو اسے اس کے سوال کا جواب مل جائے گا۔" مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسید وہ سب کہہ رہے تھے۔

"میری کوئی بہت بڑی نیکی ہو گی جس کے بدلے تم مجھے انعام میں دی گئی ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ میری فرماں برداری کے عوض امی کی دعاؤں کے نتیجے میں مجھے ایک فرماں بردار بیوی ملی ہے۔" آٹھ سال کے بعد ان دو جملوں نے ہی ہر اس جملے کو بیچ کر ڈالا تھا جو اگر وہ مجھ سے آٹھ سال میں بول بھی دیتے تو اس روز مجھے فرق نہ پڑتا۔ میری ہر قربانی، ہر صبر کا بدلہ اللہ نے دنیا میں ان دو خوب صورت جملوں کے عوض تو مجھے دے ہی ڈالا تھا کہ میں اپنے شوہر کی تابعدار بیوی تھی۔ آٹھ سال بعد ہی سہی مگر ملا تو۔

آج جب مناہل نے ہوم سویٹ ہوم کہا تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ مناہل اور عاشر کو لباس تبدیل کرا کے میں ان کے کمرے میں سلا آئی تھی۔ امی ان دونوں کے بغیر سو نہیں سکتی تھیں۔ کمرے میں آئی تو اسید سو گئے تھے۔ میں بھی سونے کی تیاری کرنے لگی۔ بس سونے سے قبل یوں ہی موبائل نکال کر چیک کیا تو ماریہ کا میسج آیا ہوا تھا۔

"باجی جب بھی مشکل ہو گی میں آپ کو فون کروں گی۔" اس لمحے مجھے لگا کہ میں ہما آپا بن گئی ہوں۔ جیسے ایک دن ارفع سلیم کو عقل دی اس کا گھر بنانے میں بہت وقت لگتا ہے۔ کسی اور گھر میں پھر سے وہی کہانی شروع ہونے جا رہی تھی اور اس گھر کو مکان سے گھر بننے میں نجانے کتنے سال لگیں گے کون جانے؟ مگر کبھی نہ کبھی مکان گھر بن ہی جاتا ہے۔ ایک عورت کے لیے۔ بس کچھ وقت اور بہت سی قربانی چاہیے ہوتی ہے۔ بڑا صبر آزما اور تکلیف دہ عمل ہے۔

ہاں ایک جملہ ہر لڑکی کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہر رشتے میں نرمی چاہیے ہوتی ہے۔ نرمی سے ذہین اور محبت سے ہی گھر بنا کرتے ہیں۔ رشتے قائم رہتے ہیں۔ ان میں مضبوطی آتی ہے۔ ایک بار زبان سے کسی نے پوچھا کہ ان بتیس دانتوں کے درمیان تم کیسے رہتی ہو تو زبان نے جواب دیا۔

"اپنی نرمی سے۔" یہی انسان کی زندگی کے لیے سبق ہے خاص کر ان لڑکیوں کے لیے جو نیا گھر بنانے جاتی ہیں۔

"اب میں سو جاؤں بہت تھک گئی ہوں سفر کی وجہ سے اور رات بھی گزرتی جا رہی ہے۔ کل سے پھر اپنے گھر کی سب ذمہ داریاں نبھانی ہیں۔ اپنے پیارے شوہر کو آفس اور بچوں کو اسکول بھیجنے کے بعد مجھے گھر کے سارے کام کر کے امی کے ہمراہ بازار جانا ہے اپنے گھر کی بہت سی چیزیں لینے کیونکہ یہ گھر ان کا اور میرا ہے صرف میرا نہیں۔ یہ گھر ہم سب کا ہے۔ یہ گھر میرا پیارا گھر، نائس ہوم سویٹ ہوم۔

✿ ✿

سعدیہ عزیز

وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا وہ کسی فلم کا ہیرو تھا نہ ہیرو جیسا لیکن پھر بھی اس کی نظر اس حسن جہاں سوز سے کترا کے گزر ہی نہیں رہی تھی۔

وہ سگنل پر کھڑا تھا اور وہ اس سگنل پر پھول بیچ رہی تھی۔

یکدم ایک جیپ آکر رکی تھی' تین لڑکے جن کا چہرہ اپنے ماں باپ کی کمائی سے تمتماتا جوانی کے جوش سے بھرا ہوا تھا وہ اس لڑکی کو آوازے کسنے لگے' اس کے رگ و پے میں غصہ ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا ایک لڑکے نے لڑکی کی کلائی تھام لی۔

اس کی ہرنی جیسی آنکھیں اپنی مدد کے لیے سڑک پر کھڑے رولز میں انسان ڈھونڈ رہی تھیں۔

"چلو ڈرائیور سگنل کھل چکا ہے۔" ایک تیز آواز اسے ہوش و خرد میں لے آئی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

لیکن جب دو بجے وہ اپنے بستر پر لیٹا تو اس کے دماغ میں وہ ہی لڑکی کسی پرانی یاد کی طرح بکھرتی چلی گئی۔

"پتا نہیں ان لڑکوں نے اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہوگا۔" وہ خود سے تصویریں بنا بنا کر بگاڑ رہا تھا پھر دوسرا دن خوش قسمتی سے آف تھا تو وہ جان کر رات کو وہاں چلا گیا' وہ پول سے ٹیک لگائے کھڑی تھی' اپنی دنیا میں مگن اپنے اردگرد سے بے نیاز۔

"تم پھول بیچتی ہو۔" حیرت بھری آنکھیں اس پر جم گئی تھیں۔

"تمہیں کیا لگتا ہے میں یہاں ٹہلنے کھڑی ہوں یا نظارہ بازی کرنے۔"

"تم مجھے غلط مت سمجھو میں تمہاری خیریت پوچھنے آیا تھا۔" اب حیرت کے ساتھ تشویش بھی تھی۔ "میں تمہیں جانتی ہوں' تم بلاوجہ فری ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"تم مجھے نہیں جانتیں لیکن کل جب میں جا رہا تھا یہاں سے تو کچھ لڑکوں نے تمہیں تنگ کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"تو۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"تو یہ انہوں نے تمہیں زیادہ تنگ تو نہیں کیا۔"

اس نے طنزیہ ہنسی سے اسے شرمندہ کر دیا۔

"جن کے پاس دولت ہوتی ہے وہ صرف لطف لینا جانتے ہیں انسانوں سے چیزوں سے موسموں سے انہیں ان کے درد تکلیف کا احساس کبھی نہیں ستاتا۔"

اس نے اپنا ہاتھ دوپٹے میں چھپانا چاہا مگر اس کی کلائی جگہ جگہ سے مضروب تھی۔

اس کے دوپٹے سے ایک کی شرٹ کا پھٹا ہوا حصہ جسے سینے کی کوشش کی گئی تھی کسی طور نہیں چھپ رہا تھا۔

"کل انہوں نے پھول خریدنے کی کوشش کی تھی یا خوشبو۔"

"تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے' خدائی ٹھیکیدار ہو' یا مجھے دکھ دینے والے۔" وہ گھبرانے لگی تھی۔

تبھی اس نے والٹ سے پیسے نکالے "یہ رکھ لو۔ کچھ کپڑے خرید لینا' جسم اور روح دونوں کو ڈھانک کر رکھنے میں ہی بھلائی ہے ورنہ لوگ اپنی اپنی طلب

کے حساب سے اپنی خواہشوں کا سارا بوجھ تمہارے کاندھوں پر ڈالتے چلے جائیں گے اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا' تمہاری روح کب کہاں کیسے چوری ہو گئی۔" وہ حیرت زدہ سی اسے دیکھ رہی تھی۔ "کون ہو تم؟"

"انسان اور انسانیت پر سب سے زیادہ یقین رکھنے والا کیونکہ میں نے تم سے زیادہ زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔"

"تمہیں مجھ سے کیا دلچسپی ہے۔" لڑکی نے اسے طنز سے دیکھا اور پھر بہلانے والے انداز میں مسکرائی "آخر تم بھی تو ایک مرد ہو نا تمہیں بھی کوئی میٹھی کھٹی سی ضرورت ہی کھینچ کر لائی ہے نا۔"

وہ مسکرا دیا' مگر اس کی مسکراہٹ میں تنبیہہ تھی' پھر یک دم وہ نرمی سے بولا "محنت کرنے والے ہاتھ بھیک مانگنے لگیں تو دل مرجاتا ہے ان کا' اور ایک بار دل مرجائے نا تو کچھ نہیں رہتا۔"

وہ نظریں چرانے لگی تو اس کا ہولے سے کندھا ہلا کر بولا۔

"ادھر دیکھ میری طرف۔" لڑکی نے نظریں اٹھائیں تو ایک طویل اطمینان کی گہری سانس چھوڑ کے بولا۔ "حیا ابھی تیری آنکھ میں بکل ڈالے بیٹھی ہے اسے گھر بدر مت کر' حیا نہ رہے تو دنیا رہتی ہے نہ دین پھر اللہ سائیں کہتا ہے جا میں نے تجھے چھوڑ دیا جو مرضی آئے کر جہاں مرضی آئے اٹھ جہاں مرضی آئے بیٹھ میں تجھ سے حساب لوں گا نہ کبھی کتاب کا ڈر دوں گا بس پھر ایک واری ہی ملیں گے' روز محشر میں وہیں ہو گا حساب بھی کتاب بھی۔"

لڑکی کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"تجھے اتنی فکر کیوں ہے میری۔" غصہ واضح تھا مگر آنسو آنکھ میں اٹکے ہوئے تھے۔

اس نے ہولے سے کندھے اچکائے تھے "پتا نہیں میرا تیرا رشتہ کیا ہے مگر میرا دل ڈرتا ہے تیرے لیے کہ نادانی میں تو اپنا کوئی بڑا نقصان نہ کر لے۔"

"میں کوئی ننھی کاکی نہیں دس جماعتیں پڑھی ہوں جانتی ہوں خوب اپنا اچھا برا تو نہ میرے لیے ہلکان ہو اور یہ رکھ اپنے نوٹ پھر جب انسانیت کا بھوت اترے گا تو ان نوٹوں کے بدلے چکانے میری دہلیز پر کھڑا ہو گا مجھے نہیں پالنی یہ رحم مروت ہمدردی کی ناہنجار اولادیں کچھ نہیں رکھا آج کے زمانے میں ان لفظوں میں۔"

"بڑی بڑی باتیں کرتی ہے پھر ڈرتی کیوں ہے اگر کوئی تیرا ہاتھ پکڑے تو' اوپر سے مشغل لگائی ہے کیا۔" اسے مانو غصہ ہی تو آ گیا تھا مگر اس نے نوٹ واپس لینے کے بجائے زمین پر پھینک دیے تھے۔

"چل جا' میں بلاوجہ تیرے لیے ساری رات پریشان رہا' تجھے تو شاید چوری کرنے کی پرانی عادت ہے۔"

وہ کہہ کر رکا نہیں تھا' وہ اسے جاتا دیکھتی رہی تھی' اس نے سایہ معدوم ہونے پر زمین سے نوٹ اٹھائے اور محفوظ کر لیے کہ کسی نے اس کا کندھا دبوچ لیا تھا۔

"کیا کہہ رہا تھا یہ تجھ سے' بڑی جان پہچان لگ رہی تھی تیری اس سے۔"

لڑکی نے اپنے سامنے کھڑے بوڑھے وجود کو نفرت سے دیکھا تھا۔

"ابا کیا واقعی میں تیری سگی بیٹی ہوں' تیری اپنی اولاد۔"

"ہاں تو کیا تجھے گھورے پر سے اٹھایا تھا' بکی کمانے کی لت نہیں مجھے' چل جلدی سے وہ پیسے نکال جو وہ تجھے دے کر گیا ہے۔"

"میرے پاس کوئی پیسے نہیں تیرے اندر کتنی لالچ ہے ابا تیرا کشکول کبھی بھرتا ہی نہیں ہے جتنا اندر ڈالو اور اور کی رٹ لگائے رکھتا ہے تو ایسا کیوں ہے رے ابا۔"

"بس جیسا ہوں گزارا کر ورنہ اپنا ٹھکانہ کر لے میری چھت کے نیچے سوتی ہے میرا دیا کھاتی ہے اور مجھے ذلیل کرتی ہے۔" بوڑھے نے کلائی زور سے موڑی تھی۔ اس میں جان نہیں تھی مگر لڑکی کے اندر ڈر اور خوف تھا جس نے اس سختی سے آدمی کو بازپرس میں جتا دیا تھا۔ "چل جلدی سے پیسے ڈھیلے کر۔ تو جانتی ہے میں کتنا ظالم آدمی ہوں۔" لڑکی کی آنکھوں میں آنسو اور تکلیف سے آواز گھٹ رہی تھی "اچھا چھوڑ تو دیتی ہوں نا۔"

اس نے ہاتھ چھوڑا تو دوپٹے کے نیچے ہاتھ ڈال کر اس نے سب سے محفوظ جگہ چھپائے پیسے نکال کر اس بوڑھے کی ہتھیلی پر رکھ دیے تھے۔ بوڑھے کی آنکھوں کی چمک دو گنی تھی۔ "تو شہزادے تو بہت بھلی ہو کے ہے بوڑھے باپ کا جتنا خیال رکھے گی دیکھ جنت تجھ سے اتنی قریب آتی جائے گی۔"

"آخ تھو جنت اور میرے قریب تیرے جیسے دوزخی باپ کے ہوتے مجھے جنت کا سایہ تک نہیں ملنا ابا مگر میں کیا کروں بڑی مجبور ہوں۔"

وہ وہیں الیکٹرک پول سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی دوپٹہ سر سے ڈھلک گیا تھا مگر اس کے آنسو نہیں رکے تھے۔

"ہاں تجھے اور کوئی مرد نہیں ملا تھا جسے تو میرا باپ بنا سکتی۔" وہ بڑبڑا رہی تھی تبھی ایک گاڑی آ کر رکی تھی۔

"چلنا ہے تجھے۔" اس نے سنا ہی نہیں گاڑی میں بیٹھا مرد کئی بار بولا "چل دفع کر پاگل چرسی لگتی ہے بہت غربت ہے کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گی۔" دوسرے مرد نے کندھے پر ہاتھ مار کر ارادہ کینسل کر دیا' پھر کئی گاڑیاں رکیں مگر وہ ویسی ہی بیٹھی رہی پھر پتا نہیں کب اٹھی کب اپنے گھر گئی اسے اس کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"شمشیر آج کل تم کچھ ڈسٹرب سے لگ رہے ہو' سب ٹھیک تو ہے؟" اس نے سر اٹھا کر اپنے باس کو دیکھا خوبرو' خوب صورت' نیک نفس انسان جس کی شمشیر کی نظر میں بہت قدر تھی۔ "نہیں سر' بس کچھ دنوں سے نیند پوری نہیں ہو رہی ہے اس لیے۔"

"نیند پوری نہیں ہو رہی ہے کیوں؟" سوچتی نظروں سے شمشیر کی طرف دیکھا اور پھر شرمندہ نظر آنے لگا۔ "اف سوری یہ گڈی بھی نا' اسے پتا نہیں رات کی تقریبات میں کیا مزا آتا ہے میں اور اس کی ممی اسے سمجھا سمجھا کے تھک گئے ہیں مگر کوئی اثر نہیں شاید یہی وجہ ہے کہ تمہاری نیند پوری نہیں ہوتی کتنی مرتبہ کہا ہے میں نے گڈی کو کہ ڈے کے لیے الگ ڈرائیور رکھ لو' نائٹ کے لیے کوئی الگ مگر وہ تمہارے علاوہ کسی اور ڈرائیور سے مینٹس فکشن فیل ہی نہیں کرتی ہے۔"

"مینٹس فکشن۔" شمشیر کے بدن کا سارا رواں کھڑا ہو گیا۔

"میں اس بارے میں آپ سے بات کرنے ہی والا تھا۔"

"ہاں ہاں بولو میں سن رہا ہوں۔" اس نے بات کرنے کے لیے حرکت دی مگر اس وقت باس کی بیٹی گڈی سامنے آن کھڑی ہوئی کیوٹکس لگے ناخنوں کی نمائش کرتی' لپ اسٹک کو بار بار ہونٹوں سے دبا دیتی'
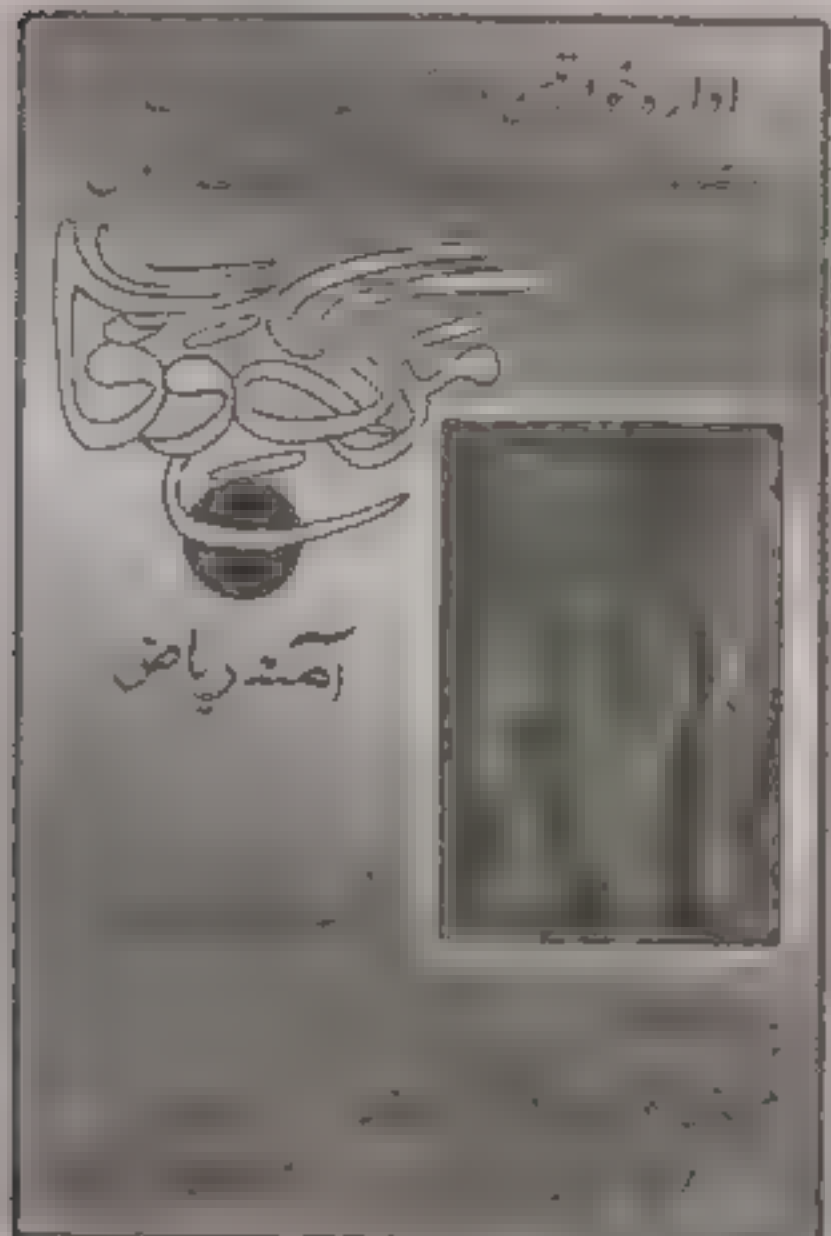
باس نے کمر موڑلی تھی اور شمشیر نے اس لڑکی کو دیکھا تو جو ابھی پچھلے سال ہی اٹھارہ برس کی ہوئی تھی اور اب تک ہر قسم کا نشہ استعمال کرنے کی اتھارٹی بنی ہوئی تھی۔

"او کے پاپا ہم شارق کے فارم ہاؤس جارہے ہیں سارے دوست دو دن تک وہیں رہیں گے سنڈے کی رات کو لوٹیں گے یا پھر منڈے کی دوپہر اور پلیز موم سے کہیے گا ڈسٹرب نہ کرنے بیٹھ جائیں مجھے وہاں۔"

باس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی تھی گڈی آگے چلی گئی تھی جب باس نے اس کا کاندھا تھام کر لجاجت سے کہا تھا۔

"پلیز شمشیر سیو مائی گرل شی از سو اِنوسینٹ۔"

اس نے ہلکا سا سر ہلایا تھا اور حیران رہ گیا تھا گڈی فرنٹ سائیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہاتھ ہلا ہلا کر ایکسائٹمنٹ میں اپنی طرف بلارہی تھی۔

وہ فرنٹ ڈور پر ہاتھ رکھے مدھم لہجے میں بولا تھا۔

"گڈی صاحبہ آپ کو ایک ڈرائیور کے برابر بیٹھنا زیب نہیں دیتا آپ مالکن ہیں پچھلی سیٹ پر بیٹھیں ورنہ آپ کے دوست آپ کے بارے میں اچھی رائے نہیں قائم کریں گے۔"

"آئی ڈونٹ کیئر۔" چھوٹا سا آئینہ نکال کر وہ اپنے میک اپ کو اور زیادہ گہرا کررہی تھی۔

وہ اسے دیکھ رہا تھا تبھی وہ عادتاً غصے میں چیخی تھی

"تمہیں کیا مسئلہ ہے آخر میری گاڑی ہے میں جہاں چاہوں بیٹھوں' تم کون ہوتے ہو مجھے مشورہ دینے والے' میں فیصلے اپنے ماں باپ کے نہیں مانتی اور تم اٹھ کر آگئے ہو مجھے ریموٹ کرنے' تمہیں نوکری کرنی ہے یا پاپا سے کہہ کر نکلوادوں۔"

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آن بیٹھا اور اس کے باس کی پرانی کہی بات نئی ہو کر اس کے کانوں میں گونجنے لگی "میری بیٹی گڈی بہت موڈی بہت ریفلیکشنسٹ اور غصے کی ذرا تیز ہے تمہارے آنے سے پہلے 40 ڈرائیور ٹرائل پر آچکے ہیں مگر یہ بہت کم کسی کو رکنے دیتی ہے سب سے زیادہ دیر جو ڈرائیور رکا اس کا دورانیہ تین دن اور پندرہ گھنٹے تھا۔

"آپ بے فکر رہیں سر میں گڈی صاحبہ کے معیار پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ گاڑی بہت طریقے سے چلاتا تھا اس نے شہرہ چپہ چپہ دیکھ رکھا تھا اپنی بے وری کے زمانے میں' یہی وجہ تھی اسے نوکری ملنا کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن ضمانت پر آکر بات رک جاتی تھی کوئی اس بے نام شخص کی ضمانت نہیں دینا چاہتا تھا یہاں بھی وہ حادثاتی طور پر آیا تھا۔ اس دن بھی وہ بہت بھوکا تھا' تین دن سے وہ اپنے پیٹ کو اس کی بھوک سے مکرنے پر مجبور کررہا تھا کہ ایک جگہ رش دیکھ کر رک گیا' لوگوں کی بھیڑ چیرتا ہوا آگے بڑھا تو بڑھتا چلا گیا کوئی مخیر شخص لوگوں میں لنچ بکس بانٹ رہا تھا۔

معدے نے کہا مجھے بھوک لگی ہے۔

عزت نفس نے کہا اتنے کڑیل جوان ہو کر بھیک کا کھانا کھاؤ گے' ہضم کرو گے معدے نے کہا بری حالت ہے میری اس وقت اس کے اندر پتھر بھی ڈالو گے تو ہضم کرجاؤں گا' ساری دنیا جیسے اس کی نظروں سے فیڈ آؤٹ ہوگئی ایک دن میں کھڑا لنچ باکس بانٹتا ہاتھ اس کے سوا دنیا اس کے لیے کچھ نہیں تھی' جب بہت اچانک بریک چرچرانے کی آواز آئی سب کی نظر کھانے پر تھی اس نے مڑ کر دیکھا ایک گاڑی بے قابو ہو کر سڑک پر لگے پول سے ٹکرائی تھی' کسی نے توجہ نہیں دی ٹریفک کنٹرول کرتے سپاہی نے بھی بس فون کرنے پر اکتفا کیا' وہ بھاگ کر گاڑی کی طرف آیا لوگ رک رہے تھے مگر پولیس کیس کہہ کر نکلتے جارہے تھے۔

"اس کا خون بہہ رہا ہے' اگر اس کو وقت پر اسپتال نہ پہنچایا گیا تو یہ مرجائے گا۔" "تو مرے' نشے میں گاڑی چلانے سے یہی ہوتا ہے۔" کسی نے لقمہ دیا۔

"نہیں بھئی ہمدردی بڑی مہنگی پڑجاتی ہے کون تھانے کے چکر لگائے۔" ایک اور آواز۔

"تیرا دل پھٹ رہا ہے تو تو لے جا اپنے کندھے پر ڈال کر حلیہ دیکھا ہے' کبھی گاڑی کی شکل بھی دیکھی ہے۔" تیسرا فقرہ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس شخص کو برابر والی سیٹ پر منتقل کرکے سیٹ بیلٹ سے کور کرکے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اس نے چابی اگنیشن میں گھمائی تو لوگ شور مچانے لگے۔

"چور چور ارے پکڑو بھاگو گاڑی چرانے کی دن دہاڑے واردات۔" مگر وہ رکا نہیں قریبی اسپتال پہنچ کر اس نے بے ہوش شخص کے موبائل میں محفوظ wife کے نمبر پر کال کی کچھ ہی دیر میں اس کے گھر والے اسپتال پہنچ گئے "اس شخص نے ایکسیڈنٹ کیا ہے۔"

سب اس پر چڑھ دوڑے تھے تب ڈاکٹر نے آکر اس کا بچاؤ کیا۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں بیگم شہنی افضل' یہ شخص تو آپ کے شوہر کو بروقت اسپتال لے کر آیا ہے اگر آج یہ نہ ہوتا تو مسٹر افضل کو پڑنے والا دل کا دورہ ان کی زندگی کو ختم کرچکا ہوتا۔ آپ جانتی ہیں نا پہلا دورہ کتنا شدید ہوتا ہے۔"

تب پہلی بار اس نے 14 سال کی گڈی کو دیکھا تھا اپنے باپ کے لیے ڈری سہمی سی وہ بچی۔

"میرے پاپا بچ جائیں گے نا سر۔"

تب اس نے اس بچی کے جھکے سر کو ٹھوڑی سے سہارا دے کر اونچا کیا اور یقین سے بولا۔

"جس کی آپ جیسی پیاری بیٹی ہو اس کے پاپا کو کچھ نہیں ہوسکتا۔ آپ دعا کرو وہ اللہ ہر ——— بلا کو ٹال دیتا ہے۔"

"آپ کا نام کیا ہے سر؟" بڑی بڑی غلافی آنکھیں سوالیہ ہوگئی تھیں۔

"شمشیر۔"

"یہ نام... عجیب سا نہیں؟ کیا آپ سکھ ہیں؟"

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"نہیں تو الحمدللہ میں مسلمان ہوں سب کی ہاں' جس شخص نے مجھے کچرے کے ڈھیر سے پہلی بار اٹھایا وہ سکھ تھا۔ دو سال اس نے میری پرورش کی مگر پھر ایک حادثے میں وہ شخص چل بسا تو میری منہ بولی ماں نے اپنے گھر والوں کے دباؤ میں آکر مجھے یتیم خانے میں
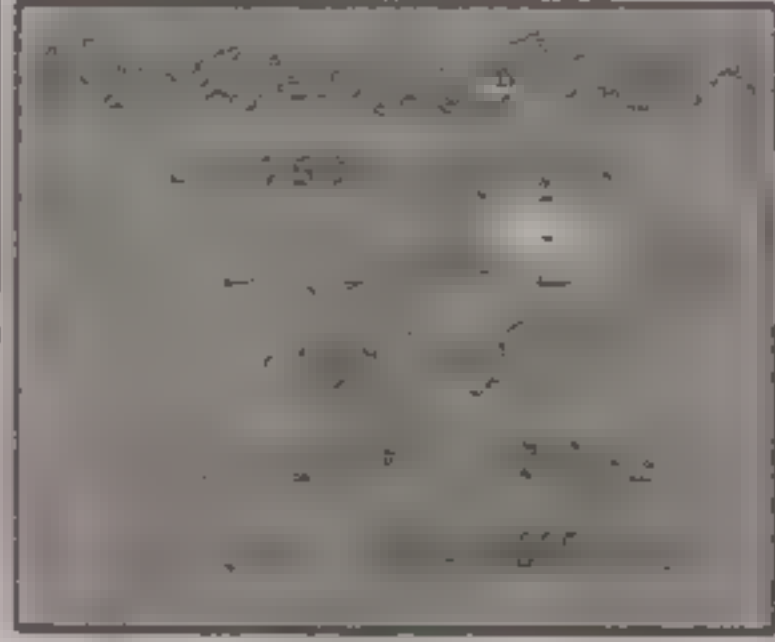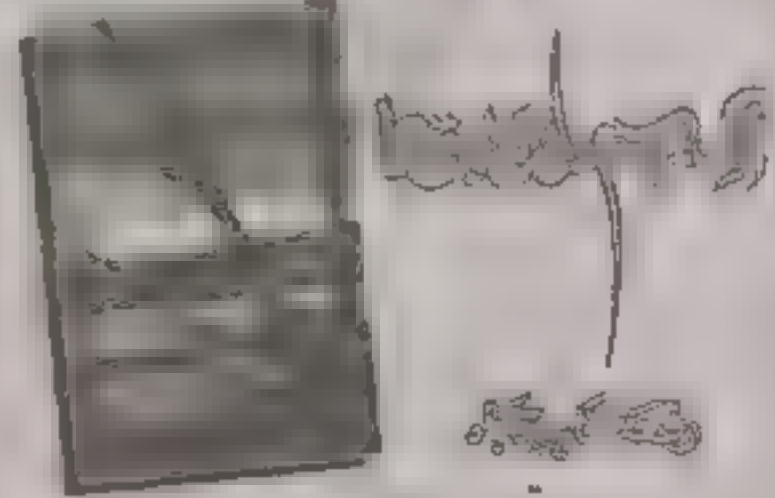
ڈال دیا' اس نے ہی وہاں کی میٹرن کو بتایا تھا کہ وہ خود سکھ ہے مگر یہ بچہ کسی مسلے کا ہے' اس کے گلے میں آیت الکرسی کا ہار ملا تھا۔"

"کتنی فلمی سی اسٹوری ہے شمشیر مجھے تو یقین نہیں آتا اصلی میں بھی ماں باپ اپنی اولاد کو کچرے کے ڈھیر پر ڈال سکتے ہیں' کیسے ڈالتے ہیں اور کیوں۔"

"بھوک۔" وہ صرف بھوک کہہ کر چپ ہو گیا تھا اور دل نے چپکے سے کہا تھا' زندگی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو بھوک ہی ہے جو مرکز کے طور پر بیچ میں پڑی ہے' دولت کی بھوک' نفس کی بھوک' شہرت کی بھوک' پیٹ کی بھوک' چاروں طرف بھوک ہی کا ڈنکا بجتا ہے سورماؤں کی طرح بھوک نام پکارتی جاتی ہے اور انسان آ آکر اس میدان میں کٹتے مرتے فاتح اور مفتوح بنتے جاتے ہیں بس اصل فاتح وہ ہوتا ہے جو اس بھوک کے سامنے سے اپنا ایمان' نفس بچا کر واپس لے آتا ہے۔

گاڑی اب بھی سبک رفتاری سے چل رہی تھی' اور اس کی سوچیں بھی' تبھی برابر بیٹھی گڈی نے اپنا پرس کھول کر چاکلیٹ باہر نکالی تھی وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہی تھی گھورتی تھی' شمشیر جب اس طرح چپ ہو جاتا تھا وہ تب اسی طرح اس سے ڈر جایا کرتی۔

"شمس۔" بہت لاڈ میں کہتی تھی۔

شمشیر نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"مجھے پتا ہے شمس تم مجھ سے بہت خفا ہو گئے ہو' تمہیں غصہ آرہا ہے نا اس وقت۔"

"نہیں تو گڈی صاحبہ میں آپ کا شوفر ہوں میری مجال کہ میں آپ سے خفا ہوں یا خدانخواستہ غصہ کروں' یہ حق آپ کی ملازمت میں آنے کے بعد میں نے استعمال کرنے چھوڑ دیے۔"

"پلیز شمس مجھے شرمندہ مت کرو' یہ چاکلیٹ کھاؤ تم نے کہا تھا نا جب غصہ آئے یا دل غمگین ہو تو کوئی میٹھی چیز کھالو' ایک دم سے کول ہو جاؤ گی۔" وہ مسکرایا۔

"آپ کو میری باتیں یاد رہتی ہیں گڈی صاحبہ۔"

"پلیز شمس تم مجھے گڈی مت کہا کرو میرا نام لیا کرو علینہ افضل علی۔ پتا نہیں یہ دادیاں' نانیاں کیا کیا الٹا پلٹا پیار کے نام پر رکھ دیتی ہیں مجھے گڈی کہلوانا بالکل پسند نہیں۔"

"دادیاں نانیاں تو آپ کے گزرنے والے کسی کل میں تھیں' تبھی آج اتنا روشن اتنا خوش گوار ہے گڈی صاحبہ' محبتوں کے رشتے بہت قیمتی ہوتے ہیں' اکیلے پن میں بہت یاد آتے ہیں۔"

گڈی نے زبردستی چاکلیٹ اس کے منہ میں ڈال کر خود سگریٹ سلگایا اس کی مہک بتا رہی تھی وہ نشیلا سگریٹ ہے۔

"شمس تمہیں اکیلے پن میں کبھی کوئی یاد آتا ہے۔"

"ہاں آتا ہے یاد' مجھے اپنی جنم دینے والی ماں بہت یاد آتی ہے پتا نہیں اس کی کیا مجبوری تھی جو اس نے مجھے اپنی گود سے نکال کر کچرے کے ڈھیر پر ڈال دیا۔"

"ربش یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے تمہاری عمر ایسے رشتوں کو یاد کرنے کی نہیں' تم کسی شوخ چنچل لڑکی کو یاد کرو اس سے ملنے والی خوشی کو سوچو۔"

"گڈی صاحبہ آپ کو اتنی سی عمر میں اتنی بڑی بڑی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔" گڈی کی لال ڈورا آنکھیں اس پر آجمیں۔ "او کے میں نہیں کرتی۔ تم کرو تمہارا تجربہ مجھ سے زیادہ ہو گا' وہ ڈیول کہتی ہے تمہارا ڈرائیور کسی ماچومین سے کم نہیں لگتا تمہیں تو کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" شمشیر کی سانسیں تیز چلنے لگیں اور چہرہ تمتمانے لگا۔ ایک ڈھابے پر اس نے گاڑی روک دی تھی۔

"کیوں روک دی ہے گاڑی؟ وہاں سب پہنچ گئے ہیں مجھے وقت پر جانا ہے۔" شمشیر نے اسے لیموں پانی لا کر دیا۔

"بہت گرمی ہے پی لیں اسے۔"

اس نے منہ بنا کر اسٹرا سے بوتل پینی شروع کر دی تھی۔

بوتل پیتے ہی اس کا سر بھاری ہونے لگا "شمشیر تم نے یہ کیا پلا دیا ہے میرا سر چکرا رہا ہے مجھے لگتا ہے وامٹ ہو جائے گی۔"

شمشیر گاڑی میں بیٹھ چکا تھا "نہیں ہو گی وامٹ' آپ آنکھیں بند کر کے خود کو پرسکون کر لیں آپ کو نیند آجائے گی۔"

اس نے واقعی شیڈ آگے کر کے سیٹ کو پیچھے کر کے خود کو ریلیکس کر لیا۔ "شمشیر پلیز سیو مائی گڈی شی از انوسینٹ۔"

اس نے گہری نظروں سے گڈی کو دیکھا وہ اس کے لیے آج بھی وہی چودہ سال کی معصوم سی بچی تھی جس کے اندر جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر سر اٹھانے لگا تھا یہ عمر تجربے کرنے ٹھوکر کھانے گرنے پھر کوئی نئی غلطی کا تھرل کرنے کی عمر تھی لیکن وہ شمشیر کو جس طرح اپنے ساتھ لگائے رکھتی تھی' یہی ان لمحوں رہتا اسے ان غلطیوں کے خم نہ جھٹکنے سے بچائے رکھتا تھا' وہ آدھی پگلی لڑکی تھی غصے میں ہوتی تو جم کے بدتمیزی کرتی غصہ اتر جاتا تو باس کی بیٹی ہونے کے باوجود معافی مانگتی' اس کی کتنی فرینڈ شپ شمشیر کی کارستانی سے بگڑی تھیں اس کی ایک اچھی یا بری عادت یہ بھی تھی کہ وہ خود شمشیر کو کچھ بھی کہہ ڈالتی لیکن اگر کوئی باہر کا شخص شمشیر کی کوئی شکایت کرتا تو وہ ہتھے سے اکھڑ جاتی اسی پر الٹ پڑتی اس کا نمبر اپنے موبائل سے ڈیلیٹ کر دیتی' اور اس کی یہ کمزوری شمشیر بھی جانتا تھا یہی وجہ تھی اس کی حفاظت کے لیے وہ کوئی بھی قدم بے دھڑک اٹھا لیتا تھا۔

فارم ہاؤس کا وسیع و عریض گیٹ سامنے تھا۔

واچ مین نے ریموٹ سے دروازہ کھول دیا تھا شمشیر گاڑی بے دھڑک اندر لیتا چلا گیا۔ اس نے گاڑی پارک کی گڈی کی طرف کا دروازہ کھولا اور اس کی پشت ہوتے ہی اپنے بغلی ہولسٹر میں گن کی موجودگی کو محسوس کر کے اطمینان سے مسکرایا وہ گڈی کی حفاظت کے لیے پوری طرح لیس ہو کر آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آخر تجھے مجھ سے جلن کیا ہے۔" کھانا کھاتے ابا نے شہناز کو گھورا اور خالی گلاس اسے کھینچ مارا۔

"تیری شکل۔ تو بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔"

اس نے ماتھا سہلایا اور آنسو بہاتے پھر سے دوبدو پر اتر آئی۔

"یہ میرا قصور ہے کہ میری شکل میری ماں پر چلی گئی۔ کرموں جلی خود چلی گئی اور مجھے چھوڑ گئی تیرے جیسے بدلحاظ جانور قسم کے باپ کے پاس۔"

"تو چلی جا تو بھی' میں تیرے کرم کی کھا رہا ہوں نہ تیرے نصیب کی' تو چلی جائے گی تب بھی اپنا گزارا کر سکتا ہوں کوئی بھی مجھ بوڑھے کو کھانا کھلا ہی دے گا' بھلے ٹھڈے مار کر کھلائے یا دو میٹھے بول بول کر۔"

"تیرا دل کتنا سخت ہے ابا تجھے اپنا نشہ مجھ سے بھی زیادہ عزیز ہے۔"

اس نے نشے والی بیڑی سلگائی تھی اور گہرا سانس کھینچ کر ہچکولے کھاتی آواز میں بولا تھا۔ "مجھے میرا نشہ واقعی تجھ سے زیادہ عزیز ہے کیوں کہ میرا نشہ صرف میرے ساتھ وفادار ہے تیری طرح بدذات نہیں۔"

"بس کر دے ابا بیٹی کے لیے ایسی زبان ادا کرتے تجھے شرم نہیں آتی۔" ابا نے گھور کے دیکھا۔

"تجھے آتی ہے اپنے باپ کو بدلحاظ اور جانور کہتے ہوئے۔" اسے جھنجلاہٹ کے باوجود غصہ آنے کے بجائے ہنسی آگئی تھی' وہ زمین سے اٹھ کر اس کے پیروں کے پاس آن بیٹھی تھی۔

"تیرے اندر بہت چھوٹا سا معصوم بچہ چھپا بیٹھا ہے تو برا انسان نہیں ہے ابا' بس چڑچڑا اور انتقام میں ایسا ہوتا جا رہا ہے' مگر یہ تو سوچ تیرے انتقام سے تجھے فائدہ کیا ہے اور مجھے فائدہ کیا ہے۔"

"بس رہنے دے یہ میٹھی میٹھی گولیوں جیسی باتیں نہ کر' بچپن میں بڑی کھائی ہیں شروع میں زبان میں میٹھی اور آخر میں کڑوی۔"

"مجھے پتا ہے ابا تو بھی کڑوا ہو چکا ہے میں بھی' دیکھ بڑے بڑے ملک بھی تو آپس میں چپ خاموشی کا معاہدہ کرتے ہیں تو اور میں تو ان ممالک سے حد درجہ غریب ہیں' ہمیں تو اس معاہدے کی زیادہ ضرورت

ہے۔"

"واہ میں کیوں کروں کوئی معاہدہ، میں کوئی تیرا نوکر ہوں۔"

"ابا اللہ نہ کرے تو میرا نوکر ہو۔ میں ایک فیصلہ کرنا چاہتی ہوں بس تو میرا ساتھ دے دے تو اچھا لگے گا مجھے۔"

"کیسا فیصلہ پہلے پوری بات بتا! مجھے تجھ پر ذرا اعتبار نہیں مجھے دھوکے میں رکھ کر ساری ملائی خود کھا جائے گی اور میں بڑھا ٹھنڈا منہ تکتا رہ جاؤں گا' نا بھئی نا' میں نہیں مانتا ایسی کوئی بات۔" اس نے ابا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور مدھم بولی۔ "مجھے پتا ہے تو اتنا ظالم اور سفاک کیوں ہے تجھے ڈر ہے اپنے جاتے ہر لمحے کا ڈر بے آسرا رہ جانے کا ڈر اور یہ ڈر میری ماں نے تیرے دل میں کسی صلیب کی طرح گاڑا ہے۔ اس نے بے وفائی کر کے تجھے دلی طور پر اپاہج بنا دیا ہے۔ دس برس میں اپنی زندگی کے وہ شاہانہ دس برس کبھی نہیں بھلا سکتی ابا جو تو نے ان تھک محنت کرتے ہوئے حق حلال کی کمائی سے میری زندگی میں شامل کیے' میں نے تجھ سے زیادہ میٹھا بولتے کسی مرد کو نہیں سنا۔"

ابا کا منہ کھلا رہ گیا تھا دھندلی آنکھوں میں پتا نہیں کتنے برسوں کا رکا کھارا پانی جمع ہونے لگا۔ اس نے بیڑی کچی زمین پر پھینک دی۔ شہناز نے ابا کے بکھرے بال سیدھے کیے اور اس لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے پھر بولی تھی۔ "اگر تیرا بیٹا ہوتا تو وہ تیرے لیے کما کے لاتا۔ تجھے بٹھا کر کھلاتا پھر شاید تو اتنا کڑوا نہ ہوتا پھر شاید تو میرا گھر بسانے کا سوچتا' ٹوٹا پھوٹا جہیز کے نام پر کچھ بھی جمع کرتا اور مجھے کسی کے ساتھ بھی رخصت کر کے اپنے گھر کی غربت پر شکر بجا لاتا۔ میں جانتی ہوں میں نے تجھ سے زیادہ صبر کرنے' برداشت کرنے شکر کرنے والا انسان آج تک نہیں دیکھا۔"

ابا کی آنکھ کی کوروں میں جمع ہونے والا پانی ٹپ ٹپ اب اس کے رخسار پر بہنے لگا' دل میں آنسوؤں کے کھارے جو کلر لگا رہا تھا اس میں اس کی میٹھی آواز اور میٹھے بول جیسے گفتہ چشم کھوج نکال رہے تھے۔

"ابا میں تجھ سے لڑتی رہوں تو مجھ سے لڑتا رہے ہم اس لڑائی میں کیا حاصل کر رہے ہیں تجھے پتا ہے نا لوگ ہم پر کیسے ہنستے ہیں ہماری ضد بحث پر قہقہہ لگاتے ہیں۔"

"کیا کروں میں۔ بتا پھر کیا کروں میں؟ میں بھی تھک گیا ہوں ایسی جانوروں والی زندگی جیتے جیتے' کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے میں خود بھی مر جاؤں تجھے بھی مار دوں۔"

پہلا مربوط خطاب اس نے اپنے باپ کے منہ سے سنا تھا۔

اس نے ابا کی پیشانی کو بوسہ دیا "ہم گناہ گار نہیں پھر ہم حرام موت کیوں مریں۔ ابا میں چاہتی ہوں میں تیرا بیٹا بن کر تیری خدمت کروں میں کوئی عزت والی نوکری کرنا چاہتی ہوں۔"

ابا نے کسی روبوٹ کی طرح دوپٹے سے ڈھکے اس کے سر پر ہاتھ رکھا وہ بس روئے جا رہا تھا اپنے جذبات کو لفظوں میں پرونے کے قابل نہیں تھا' مگر شہناز جانتی تھی برسوں پرانی اس کی ابا کے ساتھ لڑی جانے والی جنگ میں سیز فائر ہو چکا تھا۔

اس نے کھانے کے برتن اٹھائے اور اپنی دوست کے گھر چلی گئی۔ جس نے بنگلے میں کھانا پکانے' برتن دھونے کی نوکری دلانے کی بات کی تھی۔

یہ اس کی نوکری کے ایک ہفتے بعد کی بات تھی جب کچن اور انتظامیہ کے اراکین کو ہال کمرے میں جمع ہونے کے لیے کہا گیا تھا۔

"تم آج شام کام ختم کر کے شارق کے فارم ہاؤس چلے جاؤ اس کی وہاں کوئی فیلوز گیٹ ٹوگیدر ہے۔"

"مگر صاحب میں ابا کو بتا کر نہیں آئی ہوں۔" وہ منمنائی تھی۔

"تمہارے ابا کو پتا نہیں کام تو کام ہے دیر سویر تو ہوتی رہتی ہے۔"

"مگر میں رات باہر نہیں رکتی۔" شارق نے اس لڑکی کا عکس سامنے لگے آئینے میں دیکھا تھا۔

"تمہیں کس نے کہا ہے تم ملازمہ بنائے جانے کے لیے پیدا ہوئی ہو' ارے تم تو جدھر نگاہ کرو وہی دل چاکری کرنے کے لیے تیار۔"

"کچھ کہا تم نے۔" باپ نے بیٹے کو دیکھا اور وہ باپ کی بجائے اسی سے مخاطب ہوا۔

"کوئی ایشو نہیں تم اپنے ابا کو بتانے بلکہ ان سے اجازت لینے جا سکتی ہو اگر وہ انکار کر دیں تو بھی تمہاری نوکری پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی تھی پھر ابا سے اجازت لینا کون سا مشکل تھا شام کے سات بجے تھے جب ان کی لینڈ کروزر پورے آٹھ ملازمین کو لے کر فارم ہاؤس کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

پرانی ملازمائیں پارٹی کی شان بیان کر رہی تھیں اور شہناز اپنے سر سے ڈھلک جانے والے آنچل کو سر پر رکھ رہی تھی کسی کی آواز اس میں گونج رہی تھی۔ "حیا ابھی تیری آنکھ میں بکل ڈالے بیٹھی ہے اسے کھربدر مت کر حیا نہ رہے تو دنیا رہتی ہے نہ دین پھر اللہ سائیں کہتا ہے جا میں نے تجھے چھوڑ دیا' جو مرضی آئے کر جہاں مرضی آئے اٹھ جہاں مرضی آئے بیٹھ میں تجھ سے حساب لوں گا نہ کبھی کتاب کا ڈر دوں گا بس پھر ایک واری ہی ملیں گے روز محشر وہیں ہو گا حساب بھی کتاب بھی۔"

"تجھے اتنی فکر کیوں ہے میری۔"

"پتا نہیں تیرا میرا رشتہ کیا ہے' مگر میرا دل ڈرتا ہے تیرے لیے کہ تو نادانی میں اپنا کوئی بڑا نقصان نہ کر لے۔"

لینڈ کروزر رک چکی تھی وہ سج سج اتری۔

"یہ تو لگتا ہے کہیں کی شہزادی ہے۔" دوسری ملازمہ نے کھلکھلاتے ہوئے کہا اور کھڑکی میں کھڑے شارق کی ساری توجہ اسی کی طرف مرکوز رہی ایک پراسرار مسکراہٹ اس کے پورے وجود پر مستی کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ وہ ہلکے ہلکے کھڑکی کے شیشے کو بجا رہا تھا جذباتی اضطراب بھی نمایاں تھا مگر آنکھوں کی شوخی حد درجہ سوا تھی۔

☆ ☆ ☆
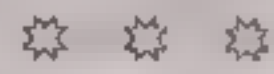
شمشیر کا روم گڈی کے برابر والا تھا اور شارق نے اس بات پر حد درجہ احتجاج بھی کیا تھا۔ "ملازم ہے سرونٹ کوارٹرز میں رہنا چاہیے۔" مگر گڈی کے آگے ایک نہیں چلی۔

"وہ ملازم نہیں ہے ہمارے گھر کا ایک فرد ہے جو پروٹوکول مجھے ملے گا وہی اسے۔"

"ہاں وہی احسان مندی کا شاخسانہ۔ جانتی ہوں میں اس نے تمہارے پاپا کی جان بچائی تھی نا۔" اس کی دوست نے بلاوجہ طنز کیا اور وہ چڑ گئی۔

"ہاں بچائی تھی جان تو۔ تمہیں کیا اعتراض ہے اس پر۔"

دوسری آواز اس کے قریب آ گئی۔

"کہیں جو میں سوچ رہی ہوں علینہ وہ سچ تو نہیں۔"

"کیا سوچ رہی ہو؟" اس نے تھوک نگلا۔

اور دوسری آواز شوخ ہو گئی "یہی کہ وہ شوفر سے بڑھ کر بھی تمہارا کچھ بن گیا ہے۔ ایسی گھسی پٹی کہانیاں سن سن کر دیکھ دیکھ کر بڑی ہوئی ہوں بس اس لیے اگر یہ سچ ہے تو بات اور ہے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے انشا۔" وہ غصے میں آ گئی تھی کیونکہ وہ اس کی بات اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ پہلی آواز نے ادا سے ہاتھ پکڑ کر شوخی دکھائی تھی۔

"ہم تمہارے رنگ میں بھنگ نہیں ڈالنے والے بس اپنے ماچو مین کو ہم سے تھوڑا سا بانٹ لو' دوستوں میں مل بانٹ کر کھانا کچھ اتنا برا نہیں۔" گڈی کا چہرہ بلش کر گیا تھا وہ غصے میں باہر نکلی تھی۔ شمشیر بالکونی سے لگے گارڈن میں لگے درختوں میں پتا نہیں کیا ڈھونڈ رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے شمس لوگ تمہارے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں۔"

شمشیر نے سنجیدگی سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لوگ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔"

گڈی نے اس کا کندھا دبوچا تھا پھر ٹھہر ٹھہر کر بولی

تھی۔

"وہ سمجھتے ہیں کہ تم میرے شوفر ہی نہیں بلکہ میرے سب۔"

شمشیر نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"ہمارا بھلے کوئی رشتہ نہیں لیکن میں آپ کے منہ سے کوئی نازیبا بات سننے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔" وہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔ گڈی ہونق کھڑی رہ گئی۔ تب ہی کسی نے اس کی کمر پر دھپ لگائی تھی۔

"ہم نے تو تجھے ایک دل پشوری کا ذریعہ بنایا تھا تجھے اعتراض ہے تو ہمیں موقع دے تاکہ تیرے شمشیر زدم شیر سب گھاس کھانے لگیں گے۔"

"ایشا! پلیز بیہیو یور سیلف...."

ایشا نے برا سا منہ بنایا۔ گڈی چلی گئی تھی۔ ایشا غصے میں پھنکاری تھی۔

"ہونہہ بڑی پارسا بنتی ہے۔ جانتی ہوں اس کے آباؤ اجداد کو' اتنا ماچومین قسم کا مرد اس کے گھر میں ہو اور یہ ستی ساوتری بنی رہے گی۔ میں بھی دیکھتی ہوں یہ اس کا شمشیر کتنے پانی میں ہے۔"

کسی نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

"تجھے نہیں پتا وہ شمشیر کے لیے کتنی بچی ہے۔ وہ ساری دنیا کے خلاف سن سکتی ہے مگر اس پر آنکھ بند کر کے یقین رکھتی ہے۔"

"اس کا یقین میں اپنے پیروں تلے روندوں گی۔" ایشا نے غصے سے کہا تھا۔ وہ ان کے جھرمٹ سے دور بیٹھا تھا۔ آج باربی کیو نائٹ تھی۔ سارے کچن کے لوگ تکے' ریشمی کباب وغیرہ بنانے میں مصروف تھے ایک طرف کڑاہ میں پراٹھے تلے جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ شمشیر اس پارٹی کا حصہ نہیں تھا۔

ملازمین باتوں کے ساتھ ساتھ کھانے کی تیاری میں بھی مصروف تھے کہ شارق اسی وقت کھانے کی تفصیل لینے آیا تھا۔ جب شہناز کے آنچل کو آگ لگی۔

شارق نے اس کا آنچل سر سے کھینچ کر زمین پر ڈال اور جوتے سے آگ بجھانے لگا۔ شہناز سمٹ کر بیٹھی اپنی بے پردگی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ گڈی نے گھاس پر پڑے اس کے دوپٹے کو اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ شہناز کی آنکھوں میں آنسو تھے اور شارق نے اسے دیکھ کر سیٹی بجائی تھی۔

"واؤ تم تو اتنی خوب صورت ہو بلاوجہ کیا دقیانوسیت اپنائے ہوئے ہو۔"

گڈی نے شارق کی حرکت کو بہت ناپسندیدگی سے دیکھا اسے اچانک بہت ماہ پہلے کا واقعہ یاد آگیا تھا۔ جب وہ کچن میں اپنے لیے کافی بنانے گئی تھی اور اس کا دوپٹہ چولہے کے برنر پر جا پڑا تھا۔ شمشیر اسی وقت اس کے نیر سے کپڑے لایا تھا۔ اسے اپنے دوپٹے کے جلنے کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ شمشیر ہی شاپرز پھینک کر اندر آیا اور اس کے جلتے دوپٹے کی آگ کو ہاتھوں سے بجھایا۔ گڈی نے اس پر غصہ کیا۔ تب وہ مسکرا کے بولا تھا۔ "دوپٹا ہمارے لیے عزت کا سمبل ہے۔ میں اسے پیروں سے کیسے پامال کرتا' تھوڑے سے ہاتھ ہی تو جلے ہیں ہم لوگ تو دوپٹے کی آن پر اپنی جان قربان کر دینے والے لوگ ہیں جی۔"

وہ ہنس پڑی تھی۔ اسے یہ لاجک نہیں سمجھ آئی تھی۔ کیونکہ وہ اگر کبھی دوپٹا پہنتی یا اسکارف لیتی تو وہ بھی فیشن کی اک ادا سمجھ کر اتنی گہرائی میں باتوں کو سمجھنے کی اس کی عمر نہیں تھی۔ لیکن اس منظر میں سے شمشیر کی بات زیادہ واضح سمجھ آگئی تھی۔

وہ لڑکی دوپٹا اوڑھ کر پھر سے کام میں لگ گئی تھی اور ایشا شارق کے کندھے پر ہاتھ مار کر خباثت سے ہنسی۔

"عجیب بے وقوفانہ اسٹائل مار رہی تھی۔ جیسے کہیں کی شہزادی ہو۔ ان غریب گھروں میں تھوڑے سے پیسوں کے لیے بڑے بڑے معاملات کیسے ایڈجسٹ ہوتے ہیں' مجھے معلوم ہے۔ اس طرح کی ادا دکھا کر اپنا اپروچ اماؤنٹ بڑھانا چاہتی ہے۔"

گڈی نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر اس کی باتوں کا سارا غصہ فضا میں تحلیل کیا۔ یہ ساری باتیں نارمل باتیں تھیں۔ ان کی گیدرنگ میں مگر آج جانے کیوں اسے کیوں برا لگ رہا تھا۔ شارق کھانا کھا کر اٹھ گیا۔ وہ لڑکی بھی غائب تھی۔ ایشا کو پھر موقع مل گیا۔

"تم نے دیکھا سارے علم ٹھنڈے پڑ گئے۔ ہاہاہا عزت مائی فٹ۔" گڈی نے گھبرا کے دیکھا مگر اس کے قریب کوئی نہیں تھا۔ تب ہی اجمل اس کے بہت قریب آگیا تھا۔

"تم آج بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔"

"صرف کمپلی منٹ ہے یا کوئی خاص مقصد۔" وہ صد درجہ منہ پھٹ واقع ہوئی تھی اجمل پزل ہو گیا۔ "کچھ وقت تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔"

"تو گزارو' میں بیٹھی ہوئی ہوں۔" اس نے اعصاب ڈھیلے چھوڑے اور اجمل نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "یہاں نہیں اکیلے میں کچھ وقت تم نہیں جانتی ہو' عرصہ تین سال سے تم میں انٹرسٹ رکھتا ہوں۔"

"کس حوالے سے؟ فلرٹ کرنا ہے' ٹائم پاس یا شادی۔"

"تم ضرورت سے زیادہ سچ بولتی ہو' مجھے کبھی کبھی تم سے ڈر لگتا ہے۔"

"حالانکہ تمہارا میرے ساتھ ایسا کوئی ناتا نہیں کہ تمہیں میرے سچ بولنے یا مجھے تمہارے جھوٹ بولنے سے کوئی فرق پڑتا ہو۔"

"سگریٹ پیو گی' مجھے معلوم ہے تم چین اسموکر ہو۔"

"ہاں۔ مگر میں اپنے سارے شوق اپنے خرچ پر پورے کرتی ہوں۔"

"اور میں نے سنا ہے اگر دوست کوئی فرمائش کر دے تو نہ کہنے کی گنجائش نہیں۔" گڈی نے سگریٹ کیس سے سگریٹ اٹھا لیا اجمل نے لائٹر سے آگ دکھائی اور سگریٹ کے ختم ہونے سے پہلے وہ مکمل طور پر نشے کی آغوش میں تھی۔

ایشا اجمل کے سر پر کھڑی تھی۔ "اس قابل مت چھوڑنا کہ یہ پھر کبھی ہمارے سامنے سر اٹھا کر کوئی آرگومنٹ کر سکے۔ اسے اذیت کے اس مقام پر پہنچا دو کہ اس کے باپ کی ساری دولت بھی مل کر اس کی روح کے گھاؤ کو بھر نہ سکے۔" اجمل کے چہرے پر خباثت ہی خباثت تھی۔

☼ ☼ ☼

شمشیر اکیلا بیٹھا شاعری کی کتاب پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر توجہ بھٹک بھٹک کر منتشر ہو رہی تھی تب ہی وہ بے زار ہو کر کمرے سے باہر نکلا اس کے کانوں میں شارق کے کمرے سے کسی کی بہت مدھم آواز ٹکرائی تھی۔ آواز اتنی خوب صورت تھی کہ وہ کوریڈور میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے قدم اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ جب کسی کی نسوانی خوف زدہ آواز سنی تھی۔

"آپ ہوش میں نہیں لگتے ہیں مجھے جانے دیجیے۔"

"تم نہیں جانتی میں نے کیسے کیسے نہیں منایا اپنے دل کو مگر یہ تمہارے قرب کی خیرات لیے بغیر سکون نہیں پا سکتا۔" شمشیر صرف نظر کر کے گزرنے والا تھا۔ جب دروازہ کھول کر ایک ہونق وجود اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ شمشیر کے تن بدن میں اس وجود کو دیکھ کر آگ لگ گئی تھی۔ شارق نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پھر کمرے میں کھینچ لیا اور وہ بند دروازے پر شوز کی ٹو مار کر تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر گیا۔ "میں غلط سمجھا تھا' میں ہی غلط سمجھا تھا۔ اسے زیادہ دولت کمانی ہے آسان طریقے سے۔ میں سمجھتا رہا اس کے وجود میں اس کی روح بہت پاک مصفا پانیوں میں غسل کرتی ہے۔ حیا اس کے کردار کا حوالہ ہے مگر میں غلط تھا۔ وہ صرف خوب صورت جسم ہے صرف خوب صورت جسم۔"

وہ نیچے آیا گڈی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ سب کے کمرے بند تھے۔ جب اس کی توجہ چیخ و پکار نے کھینچ لی۔

بجلی کی تیزی سے ایک خیال کوندا' اس نے دروازے کو اپنے کندھے سے توڑنا شروع کر دیا اور بالآخر کھول دیا۔ گڈی ڈری سہمی صوفے کے پیچھے بیٹھی تھی اور اجمل کی حالت دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس ذہنی اذیت سے گزری ہے۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے روم میں داخل ہونے کی۔"

اس نے اس کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ گڈی کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

"میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔ شارق کا دوست ہوں۔ میرے باڈی گارڈ تمہیں گولی مار کر یہیں فارم ہاؤس میں دفنا دیں گے تو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا تم کہاں گئے۔" اس نے شمشیر کا کالر کھینچ کر اپنے تئیں حاکمیت ظاہر کی تھی مگر شمشیر کے لیے ایسے لمحے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اس نے بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال کر اس کی طرف تان دی۔ "اگر میں تمہیں یہاں گولی مار دوں تو مجھے سزائے موت ملے گی یا عمر قید اور تم جانتے ہو میں مرنے سے نہیں ڈرتا ہوں۔" اس کی آنکھیں آگ اگل رہی تھیں۔ شمشیر نے اپنا کوٹ گڈی کو پہنا دیا۔

"آپ نے پھر ڈرگس لی تھیں۔ میں نے کتنی مرتبہ کہا ہے یہ ڈرگس انسان سے اس کا دماغ، اس کی عزت نفس سب چھین لیتی ہے۔"

"میں نے نہیں لی یہ اجمل نے عام سگریٹ میں ڈال کر دی ہے۔" وہ شرمندہ تھی۔ شکر تھا کہ وہ ڈرگس کی عادی تھی اس لیے کچھ لمحے کے لیے اس کے دماغ نے غوطہ تو لگایا مگر سب کچھ طوفان میں بہہ جانے سے پہلے اس کا ہوش و خرد لوٹ آیا۔ اس کی چال میں نشے کی وجہ سے لڑکھڑاہٹ تھی اور چہرے پر پشیمانی۔

شمشیر نے شارق کے روم کی کھڑکی کی طرف دیکھا اور اسی وقت ایک ساعت میں جھماکا ہوا۔ وہ کچھ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ ایک وجود فرانس کی قد آدم کھڑکی سے باہر آن گرا۔ گڈی پاگلوں کی طرح چیخی تھی۔

"شہناز ہے یہ شہناز۔ شمشیر شہناز مر گئی۔"

شمشیر بھاگ کر اس کے قریب پہنچا۔ "میں نے تم سے کہا بھی مجھے بچالو مگر تم نے۔۔۔" یہ جیسے اس کی سماعت میں زہر کی طرح پھیل گئے تھے۔

گڈی اب بھی شہناز کے پاس بیٹھی بس چیخے جا رہی تھی۔ "آپ میں سے کوئی فرسٹ ایڈ دے سکتا ہے اسے۔" شمشیر نے ملتجی لہجے میں کہا تھا۔

ایک لڑکی اتنے سارے لوگوں میں سے باہر آئی۔ یہ سب میڈیکل اسٹوڈنٹ تھے۔ لڑکی اسے فرسٹ ایڈ دینے لگی اور باقی سب لوگ اس سرپرائزنگ نائٹ کو برباد کرنے والوں کو ناپسندیدگی سے دیکھ رہے تھے۔

"یہ بچ سکتی ہے اگر ہم اسے ٹھیک وقت پر اسپتال لے جا سکے۔" شمشیر کا دماغ سن تھا مگر پھر بھی وہ بہت تیزی سے گاڑی نکال کر لایا۔

گڈی اس کے برابر بیٹھی۔ وہ خود زیادہ بہتر حالت میں نہیں تھی اور وہ لڑکی اپنے پارٹنر کے تمام تر غصے کے باوجود اس کی گاڑی میں آن بیٹھی تھی۔ شہناز کو سنبھالے ہوئے اس کی ہارٹ بیٹ کو مسلسل چیک کر رہی تھی۔ ایک گھنٹے کا راستہ آدھے گھنٹے میں طے کر کے جب وہ اسپتال پہنچے تو گڈی اور شمشیر کو یقین تھا وہ لڑکی مر چکی ہوگی اور ڈاکٹر بس اس کی موت پر اسٹیمپ لگانے کی کارروائی پوری کریں گے۔ تینوں انتظار گاہ میں بیٹھے تھے مگر گڈی نشے کی وجہ سے تقریباً غنودگی میں تھی۔

سامنے بیٹھی لڑکی مترنم مگر قدرے دکھی لہجے میں بولی۔

"بہت پیاری لڑکی تھی شہناز، شارق کے گھر میں کچن کے کاموں کے لیے اپائنٹ کی گئی مگر شارق اس معاملے میں جانور ہے۔" "وہ اس کے کمرے میں تھی۔ گانا سنا رہی تھی۔" "شمشیر نے پتا نہیں اس لڑکی سے گلہ کیا یا شہناز سے۔ وہ دل گیری سے مزید بولی۔

"ہاں اس کی آواز بہت پیاری ہے۔ میں اکثر اس کے گھر اس کی سسٹر سے ملنے جاتی رہتی ہوں۔ شارق کی بہن نو عمری سے پیرالائز ہے۔ شہناز کو میں کئی بار ملی ہوں وہیں اسے گاتے سنا ہے۔ شارق کی بہن کو میوزک بہت پسند ہے، ڈانس کی بہت شوقین تھی مگر ایک کار ایکسیڈنٹ کی وجہ سے اس کے سارے شوق اور خواب ادھورے رہ گئے۔ بس میری غلطی کہ باتوں باتوں میں میں نے اس کی گائیکی کا ذکر چھیڑ دیا۔ تم تو جانتے ہو یہ غریب لوگ اپنی نوکری کو بچانے کے لیے کیسے کیسے کمپرومائزز نہیں کرتے شاید اس نے بھی یہی سوچا گانا سنانے میں کیا ایشو ہے۔ مگر شارق کو میوزک سے کبھی دلچسپی نہیں رہی اسے صرف۔۔۔"

"پلیز۔" وہ کہہ کر مڑ گیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ لیکن شہناز جیسے اس کے برابر کھڑی تھی۔

"میں نے تم سے کہا بھی مجھے بچالو، لیکن تم۔۔۔" اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا۔ "شارق بہت شارپ ہے۔ وہ اس سچویشن سے نکلنے کے لیے جھوٹی سچی کہانی ضرور گھڑے گا۔ سب سوال پوچھیں گے، ایک تماشا بن جائے گا۔"

شمشیر نے اس کی طرف دیکھا۔ "اگر اس نے ان دونوں میں سے کسی کو تماشا بنانے کی کوشش کی تو میں ان سے اچھا تماشا گر ہوں، کافی پڑھے لکھے لوگوں سے دعا سلام ہے ان میں صحافی بھی ہیں بخیے ادھیڑ کر رکھ دیں گے شارق اور اجمل کے۔"

"تم اپنے اپئی ٹیوٹ سے صرف شوفر نہیں لگتے تم علینہ کے گھر کیا کر رہے ہو؟"

"آپ بھی تو ان جیسے مزاج کی نہیں لگتیں۔ پھر ان کے گروپ میں کیا کر رہی ہیں؟" اتنا سوال کیا لڑکی کی آنکھوں نے رنگوں کو چھوا تھا۔

"میں اظفر سے محبت کرتی ہوں۔"

"محبت! ہمیشہ ایک بات یاد رکھیے گا، لی جو واقعی آپ سے محبت کرتا ہے نا۔ وہ کبھی آپ کو اپنے دوستوں میں لے جا کر نہیں چھوڑ دیتا۔ وہ کبھی ایک باقاعدہ اور شرعی رشتہ سے پہلے آپ کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھتا چہ جائیکہ وہ آپ کی قربت کا تمنائی بن جائے۔ حیا عورت اور مرد دونوں کے کردار کا سنگھار ہے۔ ایک بار قدم ڈگمگایا پھر ساری زندگی پستی میں گزر جاتی ہے۔"

لڑکی نے اس کی طرف گہری نظر سے دیکھا "تم صرف شوفر نہیں ہو۔"

شمشیر نے اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر کہا۔

"شوفری میرا پیشہ ہے، میرے کردار کا ایک حصہ سو میں سے صرف ایک حصہ، میں انسانیت پر ہر چیز سے بڑھ کر یقین رکھنے والا اور یہ حوالہ میں کسی طور نہیں بھولنا چاہتا۔"

لڑکی نے بیگ سنبھالا تھا اور اس نے مدھم لہجے میں کہا تھا۔

"میری باتوں پر ایک بار سوچیے گا ضرور، انسان اپنے دوستوں سے اپنی کیریکٹر سے پہچانا جاتا ہے۔"

وہ سر ہلا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ شمشیر نے گڈی کی طرف دیکھا تھا اور اس کے باس کے جملے اس کے دماغ میں گردش کرنے لگے۔

"پلیز شمشیر سیو مائی گرل شی از انوسینٹ۔"

"پتا نہیں گڈی مجھے تم پر غصہ کیوں نہیں آتا۔" وہ اس کی کرسی کے برابر آ کر بیٹھ گیا اس کے ماتھے پر آئے ہوئے شیگی کٹ بال ہٹائے۔ بہت نرمی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اگر اجمل تھوڑا سا اور مس بی ہیو کرتا تو آج وہ میرے ہاتھ سے واقعی قتل ہو جاتا۔" اس نے میری گڈی پر بری نظر ڈالی۔" تب ہی آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا تھا۔

"ہم نے آپریشن کر دیا ہے آپ دعا کریں۔ انہیں جلد ہوش آجائے ویسے بہت لکی ہیں وہ ورنہ اس کنڈیشن کا متاثرہ ایٹ دی اسپاٹ ایکس پائر ہو جاتا ہے۔"

"غریب کی اولاد ہے سخت جان تو ہوگی نا۔" وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ شیشے کے پار اس کے دیکھنے کا انداز ہی بدل گیا تھا ہونٹوں کی مسکراہٹ آنکھوں کی چمک۔

"شہنی ویک اپ۔" ہولے سے اس کے عکس کو چھوا اور کرسی پر واپس آ کر بیٹھ گیا، وہ اب اپنے باس کو فون کر کے تفصیل بتا رہا تھا۔

"جی سر وہ ان کی ملازمہ بے دھیانی میں کھڑکی سے نیچے آن گری اس لیے جی ۔۔۔ میم صاب میرے ساتھ اسپتال میں ہیں۔ آپ کہیں تو میں انہیں گھر چھوڑنے آجاؤں ویسے گڈی صاحبہ کا یہاں رکنے کا دل ہے۔"

افضل علی بیٹی کی ضد سے واقف تھے سو فوراً اجازت دیتے ہوئے کہا۔ "اوکے اگر وہ رکنا چاہتی ہیں تو رہنے دو' زبردستی آ بھی گئیں تو موڈ آف رہے گا ان کا۔"

"اوکے میم صاحب کو ان کے متعلق کچھ نہ بتائیے گا آپ تو جانتے ہیں گڈی صاحبہ اور ان کے درمیان ہمیشہ کلیش اور آرگومنٹ رہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ فون رکھ چکے تھے۔

شمشیر کبھی گڈی کو دیکھتا کبھی آئی سی یو کے گلاس ڈور سے شہناز کو' پھر صبح صادق کا وقت تھا جب گڈی نے ایک دم چیخنا شروع کر دیا۔ "شہناز مر گئی شمس شہناز مر گئی۔" وہ بھاگ کر گڈی کے پاس آیا تھا' کندھوں سے تھام کر جھنجوڑ کر بولا۔

"نہیں مری شہناز آپ اٹھ کر دیکھیں وہ رہی۔ ڈاکٹر کہتے ہیں بہت لکی ہے پیشنٹ۔"

گڈی نے خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھا اپنے وجود پر اس کا کوٹ دیکھ کر اسے سوئی جاگی کیفیت میں رات کی باتیں یاد آنے لگیں اس کا چہرہ بلش کر گیا آنکھوں میں شرمندگی ہی شرمندگی تھی۔

"میں بہت بری ہوں شمس۔"

شمشیر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

"نہیں آپ بس تھوڑی سی ناسمجھ ہیں گڈی صاحبہ ورنہ آپ کا دل بہت اچھا ہے افضل صاحب کی طرح۔"

"نہیں ہے اچھا میرا دل ہم جھوٹ کہتے ہو' میرے دکھ کو کم کرنا چاہتے ہو۔"

"غلطی اور گناہ میں فرق ہوتا ہے' آپ نے غلطی کی شارق جیسے فرینڈ بنا کر لیکن وہ اللہ آپ کی بھلائی چاہتا تھا۔ تب ہی سارے چہرے ایک ساتھ بے نقاب کر دیے اور آپ گناہ سے بچ گئیں۔"

"میں ڈر رہی ہوں میں نے آج تک نماز نہیں پڑھی۔ مجھے اللہ کبھی یاد نہیں آیا۔" شمشیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ "آپ نے سوچا یہ سوچ دل میں پیدا ہونا بھی بہت خوش آئند بات ہے۔ یہ سوچ دراصل میں صرف ان دلوں میں پیدا ہوتی ہے جنہیں اللہ چاہتا ہے وہ بندہ اسے یاد کرے صبح شام دن رات ایک ایک پل۔ رہی نماز تو اپنی عمر کا کیلکولیشن کریں اوسط عمر 45 بھی رکھ لی جائے تو آپ کے پاس واپسی کے لیے غلطی کو سدھارنے کا ایک طویل وقت ہے گڈی صاحبہ۔"

"اور اگر میں کل مر جاؤں میری اوسط عمر پینتالیس سال بھی نہ ہو تو۔" شمشیر گہری مسکراہٹ سے دیکھا۔

"ہمارے عمل کی عمر ہماری اوسط عمر سے بھاری ہوتی ہے۔ اللہ سائیں بہت مہربان ہے۔ بہت تھوڑے پر راضی ہو جاتا ہے۔ واپسی کے قدم گن کر کبھی اجر نہیں دیتا۔ بس محبت میں پلٹ آنے والے کا دل دیکھتا ہے اور جھولی بھر کر لوٹاتا ہے' آگے بڑھ کر راستے صاف کرواتا ہے بھٹکا ہوا لوٹ رہا ہے تو کہیں ٹھوکر' کنکر' کانٹا نہ لگ جائے۔"

"اور جن کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا جن کے واپسی کے راستے کانٹوں سے پتھروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ وہ۔ ان کے لیے کیا کہو گے تم۔"

"وہ لوگ پھر عام نہیں ہوتے جنہیں اللہ مشکل سے پاس آنے دیتا ہے۔ وہ لوگ اس کے خاص ہوتے ہیں جنہیں وہ نکھارتا ہے' دکھ شکایت دے کر آزماتا ہے ان کی محبت کو کتنی سچی کتنی پکی اور کتنی خالص ہے اور جب وہ اس کسوٹی پر پورا اتر جاتے ہیں تو بانہیں پھیلا کر انہیں سینے سے لگا لیتا ہے۔ انہیں ہزاروں میں سے چن کر ایک رتن کی طرح الگ رکھتا ہے۔ وہ سب میں ہو کر بھی سب سے الگ دکھرے اور بہترین انسان ہوتے ہیں۔"

"جیسے۔ جیسے تم ہو شمس۔؟"

شمشیر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔

"گڈی صاحبہ میں ان لوگوں میں سے کیسے ہو سکتا ہوں۔ میں تو عام انسانوں سے بھی عام ہوں میں تو انسانیت کا خادم ہوں اور بس' اگر میں کسی پر مہربانی کرتا ہوں تو یہ مہربانی میں کسی پر نہیں کرتا خود اپنی روح پر کرتا ہوں مجھے اپنی روح کا وہ عہد یاد رہتا ہے جو اس مالک کل کے سامنے ہم سب کی روحوں نے کیا تھا۔ بھولنا آسان یاد رکھنا مشکل' سزا دینا آسان مہربانی کرنا مشکل اور بس قدرتی طور پر مجھے مشکل کام کرنے کی عادت ہے۔"

"تمہاری ساری عادتیں ایک مہربان انسان جیسی ہیں' مجھے یقین ہے تم ضرور جنت میں جاؤ گے۔"

"اللہ آپ کی زبان میرے حق میں مبارک کرے گڈی صاحبہ۔" وہ مڑ کر نرس کی نقل و حرکت دیکھنے لگا تھا۔ کیا ہم مریضہ سے مل سکتے ہیں۔

"آپ مریضہ کے ریلیٹیو ہیں۔"

"جی ہاں شی از مائی فیانسی۔"

"اوہو۔ ٹھیک ہے آپ مل سکتے ہیں۔ لیکن دو منٹ کے لیے' ویسے بھی وہ ابھی بے ہوش ہے۔" شمشیر نے سر ہلایا تھا۔

"پھپھی کے سٹی اسکین کی رپورٹ ٹھیک آئی تھی میم۔"

"ہاں ہاں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے' حیرت انگیز طور پر ورنہ اتنی اونچائی سے گر کر کسی کو میں نے تو آج تک بچتے نہیں دیکھا۔"

"وہ بھپھنی ہے میم' اسے اللہ نے بہت حوصلہ اور ہمت دی ہے۔ ہم غریب لوگوں کے پاس حوصلہ اور ہمت ہی تو ہوتی ہے۔ جس سے ہم طوفانوں کے رخ موڑ دیتے ہیں۔" نرس جا چکی تھی اور وہ خود سے بول رہا تھا۔

"میں نے اللہ سے تمہیں مانگا تھا کہ میری زندگی کو سنوارنے والے ہاتھ زندگی میں زندگی بھر دینے والا لہجہ بخشے' شہناز کو میرے لیے پلٹا دے اور اس نے میری دعا رد نہیں کی وہ بہت مہربان ہے۔"

گڈی اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کے بارے میں اندازے لگا رہی تھی۔ تب ہی اٹھ کر اس کے قریب آ گئی تھی۔ "شمس' پھپھنی ٹھیک ہو جائے تو ہم بہت دھوم دھام سے اس کی شادی تم سے کر دیں گے۔"

شمشیر نے گلاس ڈور پش کیا تھا۔ وہ دوائیوں کے زیر اثر گہری نیند میں تھی۔

وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا اسٹاف اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ پر ہولے سے ہاتھ رکھا اور بہت محبت سے بولا۔ "زندگی تمہارے لیے منتظر ہے اور ان منتظر لوگوں میں ایک میرا بھی شمار ہے۔ اگر تمہاری جاگتی آنکھوں نے میرے وجود کو اپنا کہہ کر گلے سے لگا لیا تو میں سمجھوں گا میری خستہ محبت نے منزل کا پتا پایا۔ لیکن اگر تمہاری جاگتی آنکھوں میں میرے لیے اجنبیت ہوئی تو میں جس خاموشی سے تمہاری زندگی میں آیا اسی خاموشی سے چلا جاؤں گا۔"

وہ اس کے ہاتھ کو تھپک کر واپس لوٹ گیا تھا۔ پھر شام کو اسے ہوش آیا تھا اس نے اپنے باپ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ شمشیر جب پتا پوچھتا اس کے گھر تک پہنچا وہ خوف زدہ سا اپنے بستر پر بیٹھا تھا۔

"کیا آپ بیمار ہیں؟"

"تم کون ہو؟" اس نے الٹا شمشیر سے سوال کیا۔

"آپ کی بیٹی کی خبر لایا ہوں۔"

بوڑھے کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "کیا میری بیٹی مر گئی۔" شمشیر مسکرایا۔

"آپ کے لیے خبر کا مطلب صرف موت ہی کیوں ہے بابا جی۔" بوڑھا بے چارگی سے بولا۔ "اس لیے کہ ہمارے گھروں تک بس ایسی ہی خبریں آتی ہیں۔ موت کی خبر' عزت کے لٹ جانے کی خبر' جھگڑے میں پولیس آنے کے بعد تھانہ کچہری کی خبر' خوشی کی خبر تو بہت کم آتی ہے ان راستوں پر۔"

شمشیر نے بوڑھے کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"مگر آج ایک خوشی کی خبر ہے آپ کے لیے' کسی نے آپ کی بیٹی کی عزت کو سستا سمجھا مگر آپ کی بیٹی نے اپنی جان کی قیمت پر اس کی حفاظت کی۔ وہ شدید زخمی ہو گئی ہے۔ لیکن اس کی زندگی خطرے سے باہر ہے۔" بوڑھے کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"وہ میری بیٹی ہے' اس نے ثابت کر دیا کہ وہ میری بیٹی ہے۔" شمشیر کو اس کے چہرے کی خوشی سے

تسکین مل رہی تھی۔

"کیا آپ چل سکتے ہیں۔" اس نے بوڑھے کے بستر پر پیروں کو سمیٹے بیٹھے دیکھ کر اک خیال آنے پر سوال کیا۔

"میں چل سکتا ہوں مگر شہناز کی مشکلیں آسان کرنے کے لیے میں نے خود کو سمجھایا ہوا ہے کہ میں چل نہیں سکتا۔ کیونکہ میں چلتا ہوں تو میرا رخ جوئے کی جگہ، نشے بازوں کا جھرمٹ ہوتا ہے۔ میں اپنی وجہ سے اپنی بیٹی کی عزت تار تار نہیں ہونے دے سکتا۔"

"آپ نے نشہ ایک دم سے چھوڑ دیا۔ کیسے؟" شمشیر واقعی حیران تھا۔ "شہناز کی توجہ محبت کے لیے۔ میں نے نشہ اور یہ کڑواہٹ اس کی ماں کی بے وفائی کی ضد میں اپنایا تھا۔ سو اپنی بیٹی کے حق میں، میں اپنے آپ سے ہار گیا اور مجھے اس ہار سے سکون ملتا ہے۔"

"وہ آپ سے بہت محبت کرتی ہے۔"

"پہلے صرف لگتا تھا، لیکن اب مجھے یقین آگیا کہ وہ میری بیٹی ہے۔ اس نے دولت کو ٹھوکر مار کر عزت کو اپنایا ہمارا خاموش معاہدہ ہوا تھا۔ میں نے اپنی بیوی کے زہر بھرے فیصلے پر اسے سزائے موت دے دی تھی۔" بوڑھے نے بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"تم مجھے دیکھے دیکھے لگتے ہو مگر یاد نہیں آرہا میں تم سے کہاں ملا ہوں۔" وہ مسکرا کے ان کے پیر نیچے لٹکا کر نرمی سے بولا۔

"آپ چلنا تو نہیں بھولے ہیں نا کہیں ضد میں بالکل ہی چوپٹ ہوگئے ہوں۔"

بوڑھے نے چپل میں پیر گھسائے تھے۔

"دیکھ لو، پورا بار اٹھاتے ہیں میرے پاؤں، میرے جسم میں پہلے سے بڑی طاقت آگئی ہے۔ اپنے سارے کام خود کرتا ہوں۔" وہ منہ دھوئے بنا جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ تب بوڑھے نے پھر اسے دیکھا۔ اب مجھے یاد آیا تم وہی ہو نا جس نے شہناز کو پہلی بار رقم دی تھی۔ ایسی رقم کہ اس کی زندگی بدل گئی تھی۔ اسے پہلی بار حرام میں سے حلال کو الگ کرنے کا ہنر آیا۔ کیا تم جادوگر ہو۔" وہ ہنس پڑا تھا۔

"نہیں بابا میں جادوگر نہیں، بس ہر شخص کے ساتھ نیک نیت رہتا ہوں۔ اس لیے اللہ میرے کاموں میں آسانیاں ڈالتا ہے اور جو کہیں مشکل ہو تو وہ بھی اس لیے ٹالتا ہے کہ میرا رابطہ اس سے منقطع نہ ہو جائے میں اسے یاد کرتا رہوں۔"

"بہت ہی نیک کمائی ہو کسی کی۔" بوڑھے کی آنکھوں میں ایسا فخر در آیا جیسے شمشیر سے تعلق ہونا بھی کوئی کمال کی بات ہو۔

اس نے گاڑی کو یوٹرن دیا اور پھر مسکرا کے بولا۔

"نشہ چھوڑنا آسان کام تو نہیں، تمہیں درد نہیں ہوتا تھا۔"

"بہت ہوتا تھا مگر جب شہناز نے مجھے اسپتال میں بھرتی کروایا تو بولی "ابا جیسے میں تجھ سے محبت کرتی ہوں، تو مجھ سے ویسی محبت نہ کر۔ مگر بس محبت کر جتنی بھرما شے بھر میں خوش ہو کر دنیا کے سامنے سر فخر سے بلند کروں گی۔ میرا باپ۔ جو مر گیا تھا۔ وہ زندہ ہو کر میری پشت پر آن کھڑا ہوا ہے۔" میں بس روتا رہا۔ اس کے ہاتھ تھام کر وہ میری بیٹی تھی۔ مگر مجھے لگا وہ ایک دم سے میری ماں بن گئی ہے۔ میں جب بدن کو بل دے دے کر چیختا تو وہ پتا نہیں کیا کیا پڑھ کر مجھ پر پھونکتی اور پھر ایک دن میں سو رہا تھا جب اچانک مجھے لگا، میری اماں میرے سرہانے کھڑی ہیں اور سورہ رحمان کی بس ایک آیت میرے کانوں میں پھیلتی جارہی ہے۔ "احسان کا بدلہ احسان کے سوا کیا ہے؟ تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟" تب مجھے لگا میرے درد پر کسی نے ٹھنڈے میٹھے پانی کی بارش کردی ہے۔ شہنی کی محبت کا احسان کا بدلہ محبت کے سوا کیا تھا بس پھر دل پکا کرلیا۔"

وہ اسپتال کے سامنے گاڑی روک چکا تھا اور لفٹ کے ذریعے بابا کو لے کر اوپر پہنچا۔ بابا اسے اس حالت میں دیکھ کر رو پڑا تھا۔

وہ اس طرح بے آواز گریہ کررہا تھا کہ شمشیر کو لگا وہ ابھی کے ابھی مرجائے گا۔ تب ہی وہ قریب آیا تھا۔ اس نے بوڑھے کو اپنے چوڑے سینے سے لگالیا۔

"وہ زندہ ہے اور ڈاکٹر کہتے ہیں وہ خطرے سے باہر ہے۔ رہی تھوڑی بہت جسمانی خامی تو تمہاری بیٹی کے اندر اس قدر خوب صورتی ہے اس عیب کو کوئی بھی نظر انداز کردے گا۔"

بوڑھا اس کے سینے سے الگ ہوا تھا۔ اب اس نے شمشیر کے دونوں ہاتھ پکڑ کے رونا شروع کردیے تھے۔ تب ہی گڈی آگے بڑھ گئی تھی۔ "مت رویئے بابا جی، آپ کی بیٹی سے ہمارے شمشیر صاحب شادی کریں گے۔ میں خود ان دونوں کا بیاہ کرواؤں گی۔" شمشیر نے حیرت سے دیکھا۔ گڈی اس بوڑھے کے دل میں کیسے اتر گئی تھی۔

تو گیا اس کا دل الہام سمیٹنے لگا تھا۔ مٹی، سونا بننے لگی تھی۔

وہ مسکرا دیا اور اس نے بوڑھے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"گڈی صاحب سچ کہہ رہی ہیں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا بابا جی۔"

بوڑھے کے جسم کو لگا کسی طوفان نے چھوڑ دیا رخ کر کسی اور طرف نکل گیا۔ "میں اپنی عارضی بیٹی تکیفوں میں جتنا کڑھتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا زندگی کبھی بھی کہیں سے بھی بدل سکتی ہے۔ نئے راستے پر چل سکتی ہے۔ میں گئے قدموں کو سانپ کی لکیر کی طرح پیٹتا رہا۔ اپنے آپ کو کوستا رہا کہ گھر سے بھاگی ہوئی ماں کی بیٹی کو کون بیاہنے آئے گا۔ اسی سوچ سے سفاک ہوگیا۔ اسے اپنی بیوی کے غلط فیصلے کی طرح میں نے بھی ایک غلط راستہ دکھایا۔ مگر میری بیٹی کی قسمت اچھی تھی کہ اس کی زندگی میں تم آگئے۔" وہ شکر سے رو رہا تھا۔ شمشیر نے اسے دلاسا دیا اور زندگی ایک امید دے کر آگے بڑھ گئی تھی۔ پھر دوسرا دن تھا جب اچانک ایک چینل نے یہ خبر بریک کردی تھی۔

شارق کے والد ایک مشہور بزنس مین تھے۔ ایسی خبر تو ہاٹ کیک کی طرح میڈیا میں اٹھی تھی۔ لوگ شہناز کا پوائنٹ آف ویو لینا چاہتے تھے مگر شمشیر نے اسے ہر ذہنی اذیت سے بچالیا۔ ایک قربانی کا بکرا مل گیا تھا جو شارق کا ایک لوئر مڈل کلاس کا دوست تھا۔ اس نے میڈیا کے سامنے اپنی اس حرکت کی معافی مانگی اور دوسرے ہاتھ سے شارق کے پپا کی ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے اچھے گھر اور گاڑی کی ڈیل سائن کرلی تھی۔

شمشیر کی مسکراہٹ بہت زہریلی تھی۔ اسے وہ لڑکی پھر شارق کی گیدرنگ میں نظر آئی۔ تب اس نے ایسے ہی خیر سگالی کے لیے سلام دعا کا ارادہ باندھا مگر اس لڑکی نے اسے قطعی اگنور کردیا تھا۔ "اگر بدنامی لڑکی کا حصہ ہے تو وہ مدتوں نسلوں تک اس کا بوجھ اس بدنامی کا طوق گلے میں ڈالے پھرتی ہے۔ مگر انسان معاف کرتے ہیں نہ خود اس کا ضمیر لیکن اگر غلطی مرد سے ہو تو لوگ دو چار سال میں اسے بھول جاتے ہیں۔ اگر لوگ اس کے خلاف بولتے بھی ہیں تو اس کے پیٹھ پیچھے، پھر وہ چند جملوں کی بدنامی رہ جاتی اور چند جملے آہستہ آہستہ مٹتے مٹتے نیک نامی کی کمائی میں کب کیسے ڈھل جاتے ہیں پتا بھی نہیں چلتا۔" شمشیر نے ہواؤں کو مخاطب کیا تھا مگر پیغام اس لڑکی تک ضرور پہنچا تھا جسے وہ کسی بلکہ ہر آفت سے بچالینا چاہتا تھا۔ وہ اس لڑکی کا نام بھی نہیں جانتا تھا، بس اسے اس نیکی کی وجہ سے جانتا تھا۔ جس نیکی نے اس کی شہناز کی زندگی کو بچالیا تھا۔ وہ تو بس احسان کا بدلہ احسان سے دینا چاہتا تھا۔ لیکن وہ لڑکی صورت سے بے وقوف نہ لگتے ہوئے بھی دلی طور پر بالکل پاگل تھی ہوس کو محبت سمجھتی تھی۔ جانور کو انسان سمجھ کر اپنی زندگی کے بہترین سال اس کے ساتھ ضائع کرنا چاہتی تھی۔

شمشیر۔ اس میڈیا ٹرائل سے باہر آگیا تھا۔ معاملہ دب گیا تھا۔ شارق کا دوست بیل پر رہا ہوگیا تھا اور ایک بہت اچھی زندگی کے مزے لوٹ رہا تھا۔ نہ ماں نے صدمے سے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی تربیت کی دہائی دی تھی، نہ باپ نے اعلا طبقہ میں دوستی گانٹھنے پر کوئی سرزنش کی تھی۔ سب نے ایک دوسرے سے خاموش معاہدہ کرلیا تھا۔ ہاں صرف شارق تھا جس نے

قسم کھائی تھی کہ وہ اس بے عزتی کو سود سمیت گڈی کے کھاتے میں ضرور ڈالے گا۔ شمشیر۔ گڈی کا ترپ کا پتا ہے۔ گڈی کہیں پھنسے گی تو شمشیر خود بخود اس جال میں پھنستا چلا جائے گا۔ اجمل بھی اپنی خوب صورت نائٹ برباد کرنے کے لیے شمشیر کی جان کو رو رہا تھا۔ انشا' للی' سمیرہ بھی بل کھا رہی تھیں کہ اتنے اچھے پروگرام کو شمشیر نے کتنی آسانی سے سبوتاژ کردیا تھا۔

اور ان باتوں سے بالکل الگ۔ شمشیر علی تھا اپنی چھوٹی سی دنیا میں مگن۔ اب وہ اکثر شہناز کے گھر جانے لگا تھا۔ گڈی نے شہناز اور شمشیر کی شادی کی بات طے کروا دی تھی۔ شمشیر شہناز کا پورا دھیان رکھ رہا تھا۔ اس کے لیے پھل' دوائیں' ہر چیز کا خیال جس طرح رکھ رہا تھا' راحت اللہ اس سے بہت خوش تھا مگر خوشی کے ساتھ ساتھ ایک دکھ بھی اس کی آنکھوں میں تیرنے لگا تھا۔

شمشیر نے پہلے تو سوچا وہ خود بتا دے گا پھر اس نے ابا کو منہ دھوتے جا پکڑا۔

"دکھ ہے کوئی؟"

ابا نے چہرے پر چھپاکے مارے۔

"نہیں مجھے کیا دکھ' اتنے اچھے آدمی سے اس کا بیاہ ہونے جا رہا ہے۔"

شمشیر نے ٹوک دیا۔

"پھر ابا مجھے کیوں لگتا ہے تیری آنکھوں میں کوئی دکھ آہستہ آہستہ کالی رات کی طرح پھیلتا جا رہا ہے۔"

"اتنے عرصے کا ساتھ ہے۔ اکیلا رہ جاؤں گا بالکل۔۔۔ کیسے زندگی گزرے گی۔ کہیں پھر سے نشہ کرنے بیٹھ گیا تو شہناز کو کتنا رولا پڑے گا۔ کتنا من کلسے گا اس کا۔"

شمشیر نے کندھوں سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھایا تھا پھر مدھم لہجہ میں بولا۔

"جب تک یہ ساتھ اللہ نے ایک دوجے کے ساتھ لکھا ہے' اس رب کائنات کی قسم ابا میں تمہیں تمہاری بیٹی سے کبھی جدا نہیں ہونے دوں گا۔ اکیلا ہوں' اگر گھر بار والا ہوتا تو بھی جیسے شہناز میری ذمہ داری ہے ویسے تم میری ذمہ داری ہو۔ ہم شادی کے بعد بھی ساتھ رہیں گے اور اگر نہ بھی رہتے تو میں یقین سے کہتا ہوں تم اپنی بیٹی سے اتنی محبت کرتے ہو کہ مر تو سکتے ہو پھر سے اس زہر کو اپنے اندر نہیں اتار سکتے۔ سچ کہتا ہوں میں نے ایسے لوگ بہت کم دیکھے ہیں جنہوں نے اتنا عرصہ نشہ کرنے کے بعد اتنی مستقل مزاجی سے اسے چھوڑ بھی دیا۔" راحت اللہ نے شمشیر کے کندھے پر دھپ لگائی تھی۔ "دونوں کیسے مجھ بوڑھے کے جذبات سے کھیلتے ہو وہ کہتی ہے میں نے تجھ جیسا صبر کرنے والا باپ نہیں دیکھا' تجھ سے زیادہ محبت کرنے والا انسان نہیں دیکھا اور اب تو کہتا ہے مجھ جیسا برداشت والا انسان نہیں دیکھا۔"

شمشیر علی کا قہقہہ اتنا جاندار تھا کہ شہناز بھی اسٹک کے سہارے آنگن میں آگئی۔ شمشیر نے بھاگ کر اسے سہارا دیا۔

"مجھے آواز دے لی ہوتی' میں خود لے آتا تمہیں۔" شہناز نے ۔۔۔ اسے دیکھا تھا۔

"بس کرو' کوئی میرا نوکر مرے شہر میں ہے کہ میں آجاتا' لے جاتا' اتنی بھی عادتیں نہ بگاڑو میری کہ پھر خود ہی سر پر ہاتھ رکھ کر رو دوں۔ بیوی ہے کہ میڈم۔"

ابا دونوں کو دیکھ کے اندر جا چکا تھا۔ سو وہ آسانی سے بے جھجک ہو کر بول پا رہی تھی۔ شمشیر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔

"بیوی بنو میڈم بنو کچھ بھی بنو سب حالتوں میں قبول ہو۔"

"سوچ لو بہت بڑا دعوا کر رہے ہو۔" شہناز ہنسی تھی۔

اور شمشیر نے اس کے گرد بانہیں حمائل کردی تھیں۔

"دعوا کبھی نہیں کرتا میں عمل پر یقین رکھتا ہوں۔ شینی میرے دل نے تم سے اسی دن نکاح کرلیا تھا جس دن تم نے اپنی عزت کے لیے اپنی جان کو داؤ پر لگا دیا تھا۔"

شہناز کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"کیوں کرتے ہو اتنی محبت مجھ سے' دیکھ بھی رہے ہو کہ جاہل ہوگئی ہوں۔ آپریشن کے باوجود عام لڑکی کی طرح تمہارے ساتھ تیز دوڑ سکوں گی نہ ہی۔۔۔"

شمشیر نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر شوخی سے کہا۔

"میں نے تم سے شادی کرنی ہے اولمپک گیمز میں دوڑیں نہیں لگوانیں' گھرداری تم بہت اچھے سے کرسکتی ہو اور مجھے اتنے طویل عرصے سے تمہاری جیسی گھردار عورت کی ہی تلاش تھی۔"

"ٹرکی۔۔۔" اس نے گھورا' کندھے پر چٹکی بھی کاٹی اور شمشیر کا قہقہہ۔

"توبہ ہے' میں تو تمہیں تھوڑی سی مختلف لڑکی سمجھا تھا' تم بھی عام عورتوں کی طرح ایج کانشس ہو' کمال ہے یار۔"

شہناز ہنسنے لگی پھر تینوں نے مل کر رات کا کھانا کھایا تھا اور شمشیر گیارہ بجے اٹھ گیا تھا اپنے کوارٹر کی طرف جا رہا تھا۔ جب افضل علی نے اسے پکارا وہ کچھ پریشان لگ رہے تھے۔

"جی سر۔۔۔ فرمایئے۔۔۔" وہ مودبانہ کھڑا تھا۔ جب افضل علی نے اس سے سوال کیا اور یہ سوال بہت اچانک تھا۔

"اس پارٹی میں حقیقت میں کیا ہوا تھا شمشیر۔۔۔" شمشیر کے رگ و پے میں خون بہت تیزی سے بہنے لگا۔

"کچھ خاص نہیں ہاں لیکن آج آپ یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں۔" وہ باتوں کو گھمانے کا بہت ماہر تھا۔

"پتا نہیں جب سے گڈی اس پارٹی سے آئی ہے تب سے بہت بدل گئی ہے۔ بڑے بڑے اسکارف لینے لگی ہے' اسلامک سینٹر جوائن کرلیا ہے۔ کل رات میں اٹھا تو اس کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ میں نے ناک کرنے کے لیے اس کے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ تم یقین کرسکتے ہو وہ نفل پڑھ رہی تھی۔ اس کی لائبریری میں بکس کی رینج بدل گئی ہے۔ وہ پوری کی پوری بدل گئی ہے۔ اس کی ماما کہتی ہیں ہمیں کسی سائیکاٹرسٹ سے رجوع کرنا چاہیے۔ وہ نارمل نہیں ہے اس نے کوئی اسٹریس لے لیا ہے۔ کسی نے اسے جنت جہنم کا ڈراوا اور لالچ دے کر اپنی طرف کھینچ لیا ہے انہیں لگتا ہے وہ کسی ٹیررسٹ گروپ سے لنک اپ تو نہیں ہوگئی ہے۔" شمشیر کی آنکھوں کی مسکراہٹ بہت پیاری تھی۔

"آپ کو کیا وہ ایب نارمل لگتی ہے۔" افضل علی نے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے وہ اس روپ میں زیادہ نارمل لگنے لگی ہے۔ اسے پہلے میرا خیال نہیں ہوتا تھا۔ میں کہاں ہوں' کہاں نہیں' لیکن اب وہ میسج پر کال پر میرے دن رات کا خیال رکھنے لگی ہے۔ وہ میرا انتظار کرنے لگی ہے اس کی وجہ سے میں گھر جلدی آنے لگا ہوں۔ اس کا لہجہ نرم ہوگیا ہے۔ مگر اس کی ماما کو لگتا ہے۔"

"آپ کو اپنی گڈی کے لیے مضبوط حصار بننا چاہیے۔ وہ جس بدلاؤ سے گزر رہی ہے۔ وہ اپنا احتساب کرکے اپنے عمل کی سمت کا تعین کررہی ہے۔ آپ کی تنقید اور اس کو ایب نارمل ثابت کیے جانے پر اس راستے سے مڑ بھی سکتی ہے۔ ایسے کہ پھر آپ کوشش کے باوجود اسے اس طرف نہیں لا سکیں گے۔ اچھی اور نیک اولاد صدقہ جاریہ ہوتی ہے افضل صاحب۔"

"شمشیر کیا تم اسے صرف تھوڑا نارمل رہنا سکھا سکتے ہیں۔ دنیا اور دین دونوں ساتھ ساتھ لے کر چلنے کا ہی حکم ہے ہمارے دین میں۔"

ملتجی لہجے پر اس نے آہستگی سے سر ہلایا۔ وہ اب اس کے ساتھ اسلامک سینٹر جانے لگا تھا۔ اس پر چیک رکھتا تھا۔

وہ ایک گندھی ہوئی مٹی کی طرح تھی۔ ایک غلط ٹچ اسے ہمیشہ کے لیے غلط گھڑ سکتا تھا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی اور وہ کتابیں سلیکٹ کرنے میں اس کی مدد کررہا تھا۔ اب اس میں شدت پسندی کے عناصر کم ہوگئے تھے۔ وہ دنیا اور دین کو ساتھ لے کر چل رہی تھی اس کی توجہ کی یکسوئی اس کی تعلیم میں بھی اس کی

مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ زندگی آرام سے چل رہی تھی کہ اچانک بزنس کمیونٹی میں انتخابات کی بات چھڑ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

مسٹر افضل علی' بہت منجھے ہوئے بزنس مین تھے لیکن یہ سیاست۔۔۔

"کیا کروں؟" افضل علی نے بیوی کی بجائے گڑی سے مشورہ مانگا تھا اور اس نے نرمی سے کہا۔

"اگر آپ کو لگتا ہے آپ اس طرح کچھ بہتر کام کرسکتے ہیں تو اس معرکے میں ضرور اتریں لیکن اگر یہ صرف کٹھ پتلی ہے تو مجھے آپ اس روپ میں زیادہ اچھے لگتے ہیں بابا۔"

"مجھے لگتا ہے میں کچھ بہتر کرسکتا ہوں۔"

"تو جائیے منوا لیجیے خود کو۔"

"میں خود کو نہیں منوانا چاہتا۔ میں چھوٹے کاروباری افراد کے لیے بہتر مواقع لانا چاہتا ہوں۔"

"گڑ بابا۔۔۔" وہ دل سے مسکرائی۔ کمیونٹی کا اپنا انتخاب تھا۔ آسانی سے طے پا گیا تھا اور پہلی تقریب میں شمشیر سمیت گڑی کی آنکھیں بھی کھلی رہ گئی تھیں۔ جب اس کے بابا کے قریبی لوگوں میں شارق' اجمل اور اظفر کے والد کھڑے تھے۔

"گڑی صاحبہ! بابس ڈپ ہو گئے ہیں۔"

گڑی نے خوف سے دیکھا۔ "اب ہم کیا کرسکتے ہیں؟"

شمشیر خاموش کھڑا رہ گیا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر چند ماہ گزرے تھے اس کی شادی بھی طے تھی اور افضل علی بزنس کمیونٹی کی طرف سے عام انتخابات میں کھڑے ہو گئے تھے۔ گڑی نے جھگڑا کیا تھا۔

"آپ ان چکروں میں نہ پڑیں بابا بہت جواب دہی ہوتی ہے۔ کسی ایک کے حق میں بھی کوتاہی ہوئی تو سوال جواب الگ مسزا الگ۔"

وہ ایک دم سے ست پڑ گئے تھے۔ لیکن یہ اثر زیادہ دیر تک نہیں رہا تھا۔ انہوں نے کاغذات نامزدگی جمع کروا دیے تھے۔ شمشیر ان کی ہر کنویسنگ میں شوفر اور باڈی گارڈ کی حیثیت سے شرکت کرتا تھا۔ ہاؤ ہو کی باتیں' جام و جم کے قصے' شمشیر خاموش' مگر فکرمند رہتا۔ اجمل کے باپ نے اس کی فکرمندی کو غور سے دیکھا اور تمسخر سے کہا۔

"تم تو ایسے ہراساں رہتے ہو جیسے تمہارے باس کسی جنگ و جدال میں شریک ہو رہے ہیں۔"

"جنگ و جدال سے کم نہیں ہے سیاست سر' ہر ہر لمحے خود سے لڑنا پڑتا ہے۔ خود کو صحیح و غلط میں سے نکال کر غیر جانبدار رکھنا آسان نہیں۔ بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔ بھول چوک میرا سوہنا رب معاف کردے تو بھی مصلحت' دوست داریاں' بندے کو اس مقام تک لے جاتے ہیں۔ لاکھ سر مارو منتیں ڈالوں' معافیاں مانگو بڑی مشکل ہوتی ہے۔ سربراہان کا حساب کتاب عام بندوں سے زیادہ کڑا سخت اور یک و تنہا ہوگا۔ ایویں نہیں میرے رب نے اسے مشکل کاموں میں مشکل ترین کام کہا ہے۔ عام بندے رہنے میں رحمت' معافی آسان ہے۔"

اجمل کے باپ نے برا سا منہ بنایا اور شارق نے پوچھا۔

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے آج تک سیاست میں حصہ نہیں لیا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں شارق صاحب' مجھے فرقہ بندی ہرگز پسند نہیں نہ ہی سیاست میں نہ مذہب میں' میں انسانیت اور اخلاقیات کا حامی ہوں جو ہو جہاں ہو بلا فرقہ و نسل اس کی خدمت کرنے کا قائل ہوں۔"

"میں بھی یہی کرتا ہوں' لیکن میری اس خدائی خدمت گاری میں زیادہ تر لڑکیاں ہوتی ہیں' کیا تم بھی ایسا کرتے ہو۔" شمشیر نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور شارق استہزا اسے ہنستا ہوا اندر چلا گیا۔ پھر سب ہی کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ افضل علی بہت گھائل حالت میں گاڑی سے ملے۔ گڑی کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ وہ

اسپتال میں تھے' ہوش میں تھے مگر انہوں نے چپ سادھ لی تھی۔

"یہ شمشیر کا سیل فون سوئچ آف کیوں آرہا ہے؟ وہ بابا کے ساتھ تھا۔ گاڑی میں صرف بابا ملے' وہ کیوں نہیں۔" اب کی بار شہناز کی آنکھوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔

"انہوں نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ میں سمجھی وہ کہیں اور بزی ہوں گے۔ اسی لیے غصہ ہو رہی تھی۔ بڑے صاحب کے حادثے کی خبر شمشیر نے کیوں نہ دی بیگم صاحبہ' نہ بتائیں تو مجھے تو پتا نہیں چلتا۔"

"وہ پتا نہیں کس پرابلم میں ہے۔ ہمیں پولیس میں رپورٹ کروانی چاہیے۔" گڑی نے قدم دروازے کی طرف بڑھائے تھے کہ یکدم افضل علی کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔

"رکو۔۔۔ مت جاؤ تھانے اپنی ہی جگ ہنسائی ہوتی ہے وہاں۔" گڑی بجلی کی تیزی سے مڑی تھی۔

"ہوا کیا ہے بابا؟" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ شہناز نے دل گرفتگی سے دیوار سے ٹیک لگالی۔ پتا نہیں کون سا سچ تھا جس کا اب اظہار ہونے والا تھا۔

"اس نے پیسوں کے لیے یہ سب کیا۔ بزنس کمیونٹی کے پرسنل اکاؤنٹ سے میرے جعلی دستخط سے کروڑوں روپے نکلوائے اور غائب ہو گیا۔" گڑی کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا "یہ سچ نہیں ہے۔"

شہناز کے دل اور گڑی کی زبان نے ایک ساتھ کہا مگر دونوں کے اندر یقین سے کہیں زیادہ بے یقینی تھی۔

"نا صرف یہ بلکہ اظفر کی ہونے والی فیانسی کے ساتھ بھی نازیبا حرکت کی اس کی اتنی ساری غلط تصویریں اظفر نے مجھے دکھائیں تو میں شرمندگی سے گڑ گیا۔ اس نے گڑی کی طرف سے رانگ کال کرکے اسے بلایا اور یہ سب کیا۔ میں نے جب دونوں معاملات پر اس سے بازپرس کی تو وہ مجھ سے جھگڑنے لگا۔ کہتا تھا تم کیا سمجھتے مجھے میں کوئی فرشتہ ہوں' مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے' مجھے اچھی زندگی نہیں جینی ہے کیا۔ میں نے کہا پیسے کے لیے یہ سب سمجھ آتا ہے۔ مگر اس معصوم بچی کا کیا قصور تھا۔ اس کی زندگی کیوں خراب کی۔" تو استہزا اسے ہنس کر بولا۔

"دل آگیا تھا میرا جانتا تھا میری پہنچ تک نہیں آسکتی' اس لیے اپنی پہنچ تک لانے کے لیے یہ سب کرنا پڑا۔ جب کوئی نہیں پوچھے گا تو میرا پرپوزل بہترین لگے گا اسے۔ میں نے شہناز کا کہا کہ اس سے نکاح کی بات کیوں کی تو بے دیدہ ہو کر بولا۔ نیکی کمانے کے لیے وعدہ کرلیا تھا نکاح کا بے چاری کو ویسے کون پوچھ رہا تھا۔ میں نے کون سی اس کی زندگی برباد کردی۔ میں نہ ہوتا تو بھی اس نے ایسے ہی سر پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنا تھا اور اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھے بیٹھے بوڑھے ہو کر مر جانا تھا۔ ابھی اس کے پاس زندگی گزارنے کے لیے کھٹی میٹھی یادیں تو ہیں۔"

شہناز دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھتی چلی گئی اس کی گھٹی گھٹی چیخیں سن کر گڑی بھاگ کر اس تک آئی تھی۔

"جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے شمی۔ اگر یہ سب اس بدمعاش کے ساتھ آدھی زندگی گزار کر تمہیں ملتا تو۔۔۔" شہناز روئے جارہی تھی اور افضل علی کا دل کٹ رہا تھا۔

"مجھے تو وہ شروع سے بدمعاش لگتا تھا۔ عجیب سی آنکھیں تھیں۔ ایکسرے کرتی ہوئی۔ بس تم باپ بیٹی ہی مرے تھے۔" بیگم افضل علی صدمے کے ٹرانس سے نکلیں تو ان کا یہ پہلا مربوط جملہ تھا اور گڑی نے کہا۔

"اتنی بڑی رقم کی بھرپائی کہاں سے ہوگی بابا لوگ باتیں بنائیں گے۔ ہماری نسلوں سے قائم عزت۔۔۔"

افضل علی خاموشی سے رو رہے تھے اور کچھ بول نہیں رہے تھے۔ دوسری صبح ایک ہنگامہ لیے کھڑی تھی۔ سارا اسکینڈل اخبار میں آگیا تھا شمشیر دونوں خبروں میں ہائی لائٹ تھا ساری بزنس کمیونٹی افضل علی سے

ہمدردی جتا رہی تھی۔ انہیں مورل سپورٹ کر رہی تھی۔ انہوں نے ایم این اے کی سیٹ سے دستبردار ہونے کی کوشش کی تھی۔ مگر سب نے انہیں اس فیصلے سے روک دیا تھا۔ گڈی کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ شمشیر نے شہناز اور صبا کی زندگی برباد کر کے رکھ دی تھی۔

☼ ☼ ☼

اخبار سامنے پڑا تھا اور شارق، عظمت امام، اجمل سراج، سراج احمد، اظفر منہاس اور مسٹر منہاس زیدی صم بکم بیٹھے تھے۔

"یہ خبر اخبار تک کس نے پہنچائی۔"

"پتا نہیں میں کوشش کے باوجود سورس نہیں جان پایا ہوں جو بھی ہے بہت کائیاں ہے۔" منہاس زیدی کے ہونٹ ہلے۔

عظمت امام نے پھر منہاس زیدی کو دیکھا

"صبا صدور کا اب کیا بنے گا؟"

"ناٹ مائی ہیڈک۔" منہاس زیدی کا سرد جواب تھا۔ اجمل سراج کی مسکراہٹ پورے چہرے پر پھیل گئی۔

"کیوں بڈی، وہ تو تمہاری فیانسی ہے۔ تم بھی کچھ نہیں کرو گے اس کے لیے۔"

اظفر منہاس نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"میں پہلے ہی کہتا تھا یہ سب آسان نہیں ہے۔"

سامنے ٹیبل پر تصویریں پڑی تھیں جس میں شمشیر اور گڈی بہت واضح تھے۔ ساتھ ہی اخبار۔ مگر اس میں کریکٹر بدل گیا تھا۔ اس میں شمشیر کے ساتھ صبا صدور مسکرا رہی تھی۔

"لوگ سوال پوچھیں گے، ہم کس کس کو ایکسپلین کرتے پھریں گے۔ ہمیں نہیں کرنی اپنے بیٹے کی شادی صبا صدور جیسی لڑکی سے جس کی رال ایک شوفر پر ٹپک گئی، ہاؤ ٹو چیپ شوکنڈ۔" ایک عورت اندر داخل ہوئی۔

"کول شاہینہ کول ہم واقعی صبا صدور سے اظفر کی شادی نہیں کریں گے۔ آج وہ پھر ڈرائیور کے ہاتھ منگنی کی دی گئی ہر چیز، ہر گفٹ واپس بھجوا دیں گے۔" عورت جسے شاہینہ کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ کمرے سے باہر لوٹ گئی۔

"کہا بھی تھا خواتین کی کٹی پارٹی مت ہونے دینا۔ بچا بھی تم سب اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ نکل پڑے ہو۔" عظمت امام نے روکھائی سے کہا۔ "یہ عورتیں جب اپنی من مانی پر اتر آئیں تو کوئی روک سکتا ہے انہیں۔ ناشتا تک نہیں کرنے دیا ہے للی نے مجھے ٹیبل پر ہی اخبار دیکھا ہے اور اجمل کے ساتھ یہاں تمہارے گھر بھیج دیا۔" سراج احمد نے بھی تلخ لہجے میں جواب دیا۔

مگر بہرحال میٹنگ بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو گئی۔ سب کے منہ اترے ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

صبح کا اخبار سامنے پڑا تھا اور صبا صدور کی آنکھیں رو، رو کر سرخ ہو گئی تھیں۔ اس کا پورا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"ایک ڈرائیور صبا، صرف ایک ڈرائیور۔" اخبار کی جھلک دیکھ کر سعیدہ خاتون نے کاٹ دار لہجے میں پوچھا یا پتا نہیں بتایا اور صدور بخشی تھے۔ کیتلی پلیٹ، کپ جو ہاتھ میں آیا فرش پر مارتے چلے گئے۔

"دیکھ لیا آزادی کا نتیجہ، میں نہ کہتا تھا ہمارے رہن سہن میں اور اس کے دوستوں کے رہن سہن میں فرق ہے۔ میں نے پورے گاؤں والی سرکار سے لڑ جھگڑ کر اس کے لیے تعلیم کے دروازے کھولے کہ کل میری نسل کی لڑکیاں بھی شکریہ خانم، ارفع کریم بن سکیں۔ مگر اس کی تعلیم یہ رنگ لائے گی میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ جی چاہتا ہے میں اس کا ہاتھ پکڑوں اور گاؤں میں اس کے دادا، تایا اور سارے چچاؤں کے سامنے اسے لے جا کر ڈال دوں اور ہاتھ جوڑ کے کہوں، آپ سچ کہتے تھے۔ میں ہی بیٹی کی محبت میں بہک گیا تھا۔ اب آپ کا جو فیصلہ، جان سے مارو زندہ دفن کرو کتوں کے آگے ڈال دو میں اف نہیں کروں گا۔"

"ایسے نہ بولیں صدور، ایسے نہ بولیں، میری بیٹی ایسی نہیں، ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ شیریں حامد کہہ رہی تھی، آج کل فیک تصویروں کا بہت زور ہے، ضرور یہ کسی اور کی تصویریں ہیں۔ میری بیٹی ایسی نہیں۔"

صدور بخشی نے ناامیدی سے بیوی کی طرف دیکھا اور چلا دیے۔ "صبا صدور بخشی میرے سامنے آ کر بات کرو، کمرے میں منہ چھپا کر بیٹھ جانے سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ تم زیب ہوئی ہو تو بے فکر رہو، میں اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا افضل علی کی۔"

صبا صدور پورے کمرے میں دوپٹا ڈھونڈ رہی تھی مگر دوپٹا کہاں تھا۔

"تمہارے ابا بلا رہے ہیں تمہیں۔" سعیدہ خاتون نے رکھائی سے کہا اور وہ ہونق ہو کر ایک لمحے کو ٹھہری اور دوسرے لمحے میلے میں گم بچی کی طرح رونے لگی۔

"اماں مجھے میرا دوپٹا نہیں مل رہا۔ ابا کے سامنے ننگے سر کیسے جاؤں۔" سعیدہ خاتون نے شوکڈ انداز میں بیٹی کو دیکھا۔ دوپٹا بیڈ پر سامنے پڑا تھا اور وہ کہہ رہی تھی اسے دوپٹا نہیں مل رہا۔ کیا وہ اس حادثے سے سائیکی ہو گئی ہے؟ وہ تیزی سے اندر آئیں۔ دوپٹا اٹھا کر خود اس کے سر پر رکھا اور وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے صدور بخشی کے سامنے کھڑی تھی۔

"اتنی دیر کیوں لگ گئی۔ کیا ابھی بھی کوئی حجت باقی تھی۔" صدور بخشی کا لہجہ بلند تھا۔

"ابا وہ میرا دوپٹا نہیں مل رہا تھا۔ ننگے سر آپ کے سامنے کیسے آتی۔"

"تمہیں لگتا ہے تم اس دوپٹے سے اپنے ننگے سر کو چھپا لو گی۔" وہ گاؤں کے کھرے لہجے میں کھری بات بول کر چپ اسے دیکھنے لگے۔

"پتا نہیں ابا میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا، پتا نہیں۔" وہ واقعی سائیکی لگ رہی تھی۔ سعیدہ خاتون نے صدور بخشی کا بازو پکڑ کر بیٹی کی طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے نئی نظر سے دیکھا جیسے مجرم کو ملزم بنا کر آزاد کرنے کی ٹھان لی ہے۔

"یہ تصویریں ٹھیک ہیں کیا۔" صبا صدور کا جھکا سر اوپر اٹھا۔

"بولو یہ فیک تصویریں ہیں۔"

"نہیں ابا۔" وہ مختصر جملہ کہہ کر سمندروں رونے بیٹھ گئی۔ وہیں قالین پر اس کے قدموں نے اس کے وجود کا بوجھ نہیں برداشت کیا تھا۔ وہ جس طرح گھٹنوں میں سر ڈال کر بے چارگی سے رونے بیٹھ گئی تھی۔ صدور بخشی کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ یہ ان کی بیٹی کبھی کسی مشکل سے نہیں گھبرائی ہمیشہ ہر سال اس نے اپنا امتحان اچھے نمبرز سے پاس کیا۔ یہ وہ ڈ میں بین الاقوامی طور پر اپنا ملک کا نام رجسٹر کروا چکی ہے۔ اسے اس کے سینئرز سیمینارز میں خصوصی دعوت پر بلاتے تھے۔ مگر اس وقت یہ لڑکی کتنی مجبور کلاچار سی ہوئی تھی۔ جیسے ساری دنیا نے اس کی پشت پر سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ لیکن کیا وہ بھی ساری دنیا جیسے بن سکتے تھے۔

اس کی ہلکی سی تکلیف پر وہ ساری رات جاگ کر گزارتے تھے تو اس وقت ان کا دل اتنا سخت کیوں ہو گیا۔ وہ وہیں بیٹھ گئے تھے۔ اس کے پاس آتی باتی مارکے "تیرے بابا ہیں نا، مت گھبرا، پتا نہیں میرا دل کیوں کہتا ہے، میری اتنی بڑی غلطی نہیں، جتنی ساری دنیا مل کر تجھے سزا دے رہی ہے۔"

اس نے چہرہ اونچا کیا، خالی بے جان آنکھیں۔

"نہیں ابا میری غلطی تھوڑی نہیں، قتل ایک آدمی کرے یا دس مل کر، سزا تو سب کو ایک ملنی چاہیے نا۔" صدور بخشی نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

"سب مجرم، مگر سب سے بڑا مجرم منصوبہ بندی کرنے والا ہوتا ہے۔ کیا تم منصوبہ ساز تھیں۔" وہ فوراً بات کی تہ تک جا پہنچے تھے۔ "نہیں تو اب ابا میں تو مس گائیڈ ہوئی، مجھے تو محبت نے ٹریپ کیا۔ مگر میں برملا کہتی ہوں میں بے قصور نہیں۔"

سعیدہ خاتون اس کے آنسو صاف کرنے لگی تھیں۔ تب ہی ملازم تین افراد کے ہمراہ بہت سارا

سامان لے کر ڈائننگ ٹیبل پر رکھ رہا تھا۔ "سر یہ مسٹر اظفر منہاس کے گھر سے آیا ہے۔ شوفر کے ہاتھ بھجوایا ہے۔"

صبا صدور کی آنکھیں جل تھل ہو گئی تھیں۔

"بدنامی کو کون گلے سے لگاتا ہے۔ اپنے گھر بلاتا ہے۔ مگر میری بچی میرا گھر ہمیشہ تمہاری پناہ گاہ ہے۔ ساری دنیا بھی تجھے چھوڑ دے تو بھی سعیدہ اور میں تیری پشت پر کھڑے رہیں گے۔"

"گاؤں والوں کا ردعمل صدور۔" سعیدہ خاتون بھی رو رہی تھیں۔

"صدور بخش کم حوصلہ آدمی نہیں' میری بیٹی سے غلطی ہو سکتی ہے گناہ نہیں' اتنا یقین ہے مجھے اپنے خون پر اور اپنی بیٹی کے حق یا خلاف فیصلہ دینے کا اختیار صرف مجھے ہے۔ رہی میری ریپوٹیشن تو میں ایسی مصنوعی عزت کو لات مارتا ہوں۔ جو جھوٹے لفظوں' جھوٹے اور نیک رشتوں سے بندھی ہوئی ہے۔ سچا بندھن پکا رشتہ اللہ کا ہے۔ اللہ کے بعد ماں' باپ کا' جو اولاد کی ہر غلطی کو نتھار کر پاک کر کے پہلی ہی سی محبت سے گلے لگا سکتے ہیں' میں اللہ کے فیصلے کا منتظر ہوں۔"

"نہیں ابا فیصلہ مت مانگیں' میرے حق میں رحم مانگیں ابا رحم۔" وہ رونے لگی تھی' پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

تب ہی اس کا موبائل بجا تھا۔ اس نے نمبر دیکھ کر چیل کی طرح فون اٹھایا تھا۔

"کیوں' کیا تم نے میرے ساتھ ایسا۔" وہ پوری قوت سے چیخی تھی۔ دوسری طرف بہت نرمی سے کہا گیا۔

"میں نے جو کیا اپنی وفاداری اپنے فرض کے تحت کیا۔ رہا آپ کی بدنامی تو اظفر منہاس سے چھٹکارا مل جانا ہی آپ کی عزت کی بحالی کی پہلی سیڑھی ہے مس صدور۔"

"میری عزت کی بحالی اور وہ بھی تم کرو گے' تم سمجھتے کیا ہو خود کو' جاہل گنوار' پاگل آدمی۔ میں نے جب بھی تمہیں کہیں دیکھا' تمہیں قتل ضرور کروں گی۔"

"مردہ شخص کو قتل کرنا بے حرمتی ہے اور آپ مستقبل کی ڈاکٹر ہیں۔ آپ سے مجھے یہ توقع نہیں' مگر ایک بات سن لیں فیضان برا آدمی نہیں' آپ کو پتھر جمع کرنے کا اتنا شوق ہے کہ ہیرے کب کہاں پھسل کر آپ کی زندگی سے نکل گئے' آپ کو پتا بھی نہیں چلا۔"

"فیضان۔ فیضان کون؟"

"فیضان مرتضیٰ۔ آج کل پاکستان آیا ہوا ہے۔ اس نے بھی یہ خبر پڑھی تو تصویریں دیکھیں اور برملا کہا۔ صبا صدور ایسی نہیں ضرور کسی نے اسے ٹریپ کیا ہے۔ پلیز آپ اس کا یہ یقین کبھی مت توڑیے گا۔"

لائن بے جان تھی اور صبا صدور سوچ رہی تھی یہ فیضان مرتضیٰ کون ہے۔

"تم مجھے کسی فیری ٹیل کی پری لگتی ہو' اتنا تقدس ہے تمہارے چہرے پر کہ نگاہ اٹھا کے تمہیں دیکھنا گناہ لگتا ہے۔" یکدم ایک جملہ ری کال ہوا تھا۔ "فیضان مرتضیٰ۔" اس کے لب کانپے اور وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ "لوگ کہتے ہیں پردوں میں چھپاؤ' یہ کرو' وہ کرو' مگر میں کہتا ہوں آپ کے چہرے میں خود اتنا تقدس ہونا چاہیے کہ کوئی نگاہ غلطی سے تو اٹھ جائے مگر اشتہا سے دوسری بار آپ کا طواف نہ کرے۔"

"مرد کی مینٹلٹی ایسی نہیں وہ ہر پردے کے پیچھے بھی جھانکنا چاہتا ہے۔ ہر دریچے سے تنگی آنکھ کے چار طرف چکر بھی کاٹنا چاہتا ہے تم کن چکروں میں پڑے ہو ——— کس زمانے کے آدمی تم ہو۔"

"اسی زمانے کا آدمی ہوں مادام بس آپ ہماری گہرائی میں کبھی اتریں نہیں۔"

"میرا فوکس صرف تعلیم ہے۔" اس نے برملا کہا۔ پھر پتا نہیں کب' کیسے اظفر منہاس نے اس کا فوکس چینج کر دیا تھا۔

"جب تم ڈاکٹریٹ پوری کر لوگی' میں اب تب ہی تم سے ملنے آؤں گا۔" ایک اور یقین کمرے میں دبے قدموں بھرنے لگا تھا۔ اس وقت اس کا خیال تھا۔ وہ گند

پک دے کر اس سے فلرٹ کر رہا ہے کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔

"میں اسپیشلائزیشن کے لیے تمہیں بیاہ کر انگلینڈ لے جاؤں گا۔"

ایک اور وعدہ آنکھ مل کر جاگ اٹھا۔

"لڑکیوں کو بے وقوف بنانے کے لیے مرد ایسا ہی ٹریپ کا پتا چلتے ہیں۔ شادی کا وعدہ کرنے والوں پر لڑکیاں برملا آمنا صدقنا کر لیتی ہیں۔" مگر فیضان مرتضیٰ اپنی بات کا پکا تھا۔

"میں مسلمان ہوں' اپنے وعدے یاد رکھتا ہوں۔ وعدے پورے کرتا ہوں۔ اس لیے وعدے کم کرتا ہوں۔ میرے نبی کا فرمان ہے جو جھوٹا ہے' وعدہ خلاف ہے وہ ہم میں سے نہیں اور میں ذرا سے مزے کے لیے ان کے امتی ہونے کا گولڈن ٹکٹ کبھی مس نہیں کر سکتا۔"

"فیضان مرتضیٰ۔" وہ کارپٹ پر بیٹھ کر رو رہی تھی اور قسمت مسکرا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر آج بھی وہی تقدس اور معصومیت تھی جس کا اصل قدردان گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں کہتا تھا کسی پر اتنا اندھا یقین نہ کریں' مگر آپ نے سنا۔" شارق غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ سمیرا رو رہی تھی۔

"وہ کہتا تھا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبت۔ وہ کہتا تھا وہ مجھ سے 8 سال سے محبت کرتا ہے۔ جب وہ مجھے کالج چھوڑنے جایا کرتا تھا۔ میں نے اس کی بات پر یقین کیا۔ پھر آج صبح جب آپ سب گھر میں نہیں تھے' وہ جوس لے کر آیا۔ میں نے پی لیا۔ ڈیڈ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔" وہ دونوں باہر آ گئے تھے۔

"کیا کرو گے اس بدنامی کا۔" نور نے شوہر کی طرف دیکھا۔

"اپنی اولاد ہے' مار بھی نہیں سکتا مگر اسے یہاں رکھا تو ساری کمیونٹی میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ سمیرا جھوٹ بول رہی ہے۔ تم نے ڈاکٹرنی کے کمنٹ سنے تھے نا۔ تم خود بھی سمجھ دار ہو' جان سکتی ہو اس غلطی کی حد۔ سب کچھ ایک دن میں نہیں ہوتا' پتا نہیں وہ کب سے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک رہا تھا۔ ہمارے ہی گھر میں ہماری ہی عزت سے کھیل رہا تھا اور تمہاری بیٹی سمجھتی رہی وہ زندگی میں محبت کا روزن کھول کر ٹھنڈی سانس لے رہی ہے۔ کاش یہ مر جاتی' اس حادثے میں پتا نہیں کیوں زندہ رہ گئی ہے۔"

"ایسا نہ کہیں' وہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔" نور رونے لگی تھیں۔

"تم کل ہی اپنے بھانجے کے پاس انگلینڈ لے کر جاؤ۔ کچھ ہو سکتا ہے تو کرو ورنہ وہیں کسی چائلڈ ہوم میں اس ذلت کو جمع کروا کے آ جانا۔" وہ صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔

"میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ میں اتنا نیک ہوں' پانچ وقت نماز پڑھتا ہوں' اتنا لیتا دیتا ہوں پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟" شارق دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور ارد گرد شور مچا ہوا تھا۔

"زندگی میں کمزور عمل کر کے انسان اس عمل پر اکڑتا کیوں ہے؟ کیوں بھول جاتا ہے کنکر کے جواب میں تقدیر پتھر اور پتھر کے جواب میں اینٹ کیوں نہیں مارے گی۔ تیرا باپ نیک نہیں ہے۔ نیک بننے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے اوپر غرور کرتا ہے۔ تب ہی اس کے ہاں تجھ جیسی اولاد پیدا ہوئی۔ تو کیا سمجھتا ہے جو وقت گزر گیا۔ تیرے آج پر گواہ نہیں بنے گا۔ بھول ہے تیری' وہ گواہ بھی ہے' منصف بھی اس کا انصاف آسانی سے جان نہیں چھوڑتا۔ یہ چند ہزار کے لیے تو مجھے ذلیل کرتا ہے۔ یہ میری بھی سزا ہے۔ میں جو اس رب سے نہیں مانگتی میں جو اپنے زور بازو پر یقین نہیں کرتی اور تیرے جیسے امیرزادوں کے سامنے سر جھکا لیتی ہوں۔ ہم سب جہنمی ہی ہیں۔ تو میری بیٹی اور تیرا باپ مال حرام ہو تو حلال اولاد بھی حرام بن جاتی ہے۔ جیسے

تیرے باپ کی بنی جیسے میری اولاد بنی مگر یاد رکھ دھوکہ اور گناہ لوٹ کر ضرور آتے ہیں۔" وہ وہیں بیٹھ گیا تھا۔

"صبا صدور کا کیا ہوگا۔" کتنی تضحیک تھی اس کے لہجے میں صبا صدور کے لیے مگر اب سمیرا کی وجہ سے وہ کتنی پستی میں جا گرا تھا۔ اسے کئی چہرے امید بھری آنکھیں لٹے پٹے وجود یاد آئے تھے۔ کاش اس کی مٹی نہ گوندھی جاتی وہ مٹی میں ملا ہوا مٹی کا ذرہ رہتا۔ وہ چہرہ چھپا کر رو رہا تھا۔

شہناز کا چہرہ اس کی آنکھوں میں کوند گیا تھا۔ شہناز واحد لڑکی تھی جو اس کی دسترس سے سلامت نکلی تھی اور اس نے اس غم میں جی بھر کے ڈرنک کی تھی۔ ایک ہفتے تک حسن کی رنگینیوں میں گم رہا گھر نہیں آیا۔

اب وہ گھر میں بیٹھا تھا۔ مگر لگتا تھا سڑک پر بیٹھا ہے اور اس کے تن کے سارے کپڑے کوئی چھین کر لے گیا تھا اتنی ذلت اتنی ملامت۔

"مت رو سب ٹھیک ہو جائے گا تیری ماں کل جا رہی ہے انگلینڈ کسی کو کچھ نہیں پتا چلے گا۔" عظمت امام نے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھا اور فون ملانے لگے پھر ان کا چنگھاڑتا لہجہ "ڈھونڈو اس مردود کو اگر انڈر ورلڈ کی مدد کی ضرورت ہے تو بھی لے بس اسے زندہ میرے سامنے لا کر ڈال ورنہ اپنی شکل مت دکھانا۔ میں اس کے ٹکڑے اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتا ہوں۔ میں اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا ہوں۔ محبت کرے گا میری بیٹی سے محبت کرے گا۔"

وہ چیختے ہوئے باہر چلے گئے تھے اور شارق امام نے ماں کو دیکھ کر کہا تھا۔

"منع کریں ڈیڈ کو کچھ نہیں ہوگا سب ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔ جب سزا گناہوں کی ہو نا تو ہاتھ کرنے والے کو اللہ خود راستہ دیتا ہے بچاتا ہے۔ وہ نہیں مرے گا مام ہو سکتا ہے کبھی کسی اور جرم میں پکڑا جائے مگر سمیرا کے جرم میں نہیں پکڑا جائے گا۔ کیونکہ مجھے سود سمیت سزا سنائی گئی ہے۔ بہتری اسی میں ہے کہ خاموشی سے سزا کاٹی جائے۔ جتنا واویلا اور شور کیا اتنی جگ ہنسائی ہونی ہے اپنی۔" ماں بیٹے کی باتوں کو حیرت اور صدمے سے سن رہی تھیں۔ شارق کے دماغ پر اثر ہو گیا صدمہ بھی تو بہت بڑا ہے۔ معصوم اور لاچار بہن کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ۔ وہ شوہر کے سامنے رو پڑیں۔

"شارق سے کہو دبئی چلا جائے شکر کرو تمہاری بیٹی نیشنلٹی ہولڈر ہے۔ ورنہ اس کا ویزا ملنا اور اتنی جلدی جانا آسان نہ ہوتا۔ 5 دن ہیں تمہارے پاس پیکنگ کر لو میں فارملٹیز پوری کروا لیتا ہوں۔ اپنے بھانجے کے ساتھ رہنا چاہو تو وہاں رہ سکتی ہو نہیں تو کوئی گھر رینٹ پر لے لینا۔ مگر یاد رکھو جب واپس آؤ تو یہ بدنامی ساتھ نہیں ہونی چاہیے۔"

وہ سر ہلا کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

شہناز کی دنیا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیر ہو گئی تھی۔ وہ ہر کام کسی روبوٹ کی طرح کر رہی تھی۔ گھنٹوں سوچوں میں گم "اس کا لہجہ ایسا تو نہیں تھا فریب دینے والا بندہ تو آنکھ کی پتلی پہ ناچتے فریب سے پہچانا جاتا ہے۔ مگر اس کے لفظ جھوٹے تھے سانس کا لہجہ پھر میرا ہاتھ خالی کیوں رہ گیا۔" وہ اکیلی ہوتی تو اپنا خالی ہاتھ چھپا کر بیٹھی رہتی ابا سامنے ہوتا تو خود کو کمپوز کر لیتی مگر آج ابا نے بالکل اچانک چھاپہ مارا تھا۔ وہ دوپٹا منہ پر ڈالے رو رہی تھی۔ اتنی مدھم آواز میں کہ کمرے کی تنہائی بھی ابا کے پیروں سے یک دم جاگ کر شہناز کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"لے تو رو کیوں رہی ہے۔" تنہائی نے چپکے سے اس کے پاس آکر سوال کیا۔ ابا نے سنا نہ شہناز نے مگر ابا وہیں بیٹی کے پاس بیٹھ گیا۔

"کیوں روتی ہے اتنا؟ تیرے اندر کون سا سمندر رکھ گیا ہے وہ کہ اس کی یادوں کے پیروں کو دھو دھلا کر اپنے آنسوؤں سے اس کا وضو کروا کر بھی تیری نماز نیت سب قضا ہوئی جا رہی ہیں۔"

"پتا نہیں ابا میرے اندر کوئی بیٹھ گیا ہے کبھی وہ سوگ مناتا ہے کبھی میں رونے لگتی ہوں کبھی کبھی تو مجھے پتا بھی نہیں چلتا کہ میں رونے لگتی ہوں۔ گڑیا بی بی بھاگی آتی ہیں شہنی نہ رو میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔ میں انہیں دیکھتی رہ جاتی ہوں اور میرے اندر کوئی کہتا ہے۔

"اور رو شہنی اور رو۔ گڑیا بی بی بہت اچھی ہیں۔"

اس نے وقفہ لیا پھر مردہ لہجے میں زندگی بھرنے کو بولی۔

"اچھا تو شمشیر بھی تھا ابا پتا نہیں کیا ہوا ہے اس کے ساتھ کیا مجبوری پڑی ہے اس پر۔"

"تو بھول کیوں نہیں جاتی اس کمینے کو۔"

اس نے ابا کے چہرے پر نگاہ ٹکا کر پوچھا۔

"تو بھولا اماں کو۔" ابا نظر چرانے لگا اور وہ مدھم لہجے میں بولی تھی۔

"اماں کی ساری تلخی ساری نفرت ساری بے وفائی کے باوجود تو آج تک پورا کا پورا اس کا ہے ابا پھر میں بھی تو تیری بیٹی ہوں محبت میں پاگل میرے پاس تو میرے شمشیر کی محبت بھری باتیں ہیں یادیں ہیں سب کچھ ہے ابا۔"

"یادوں کے سہارے زندگی نہیں گزرتی وہ ملہ سے خود کو گھن لگا رکھا ہے۔ گڑیا بی بی کہہ رہی تھیں وہ تیرا بیاہ اسی دن کرنا چاہتی ہیں جس دن طے ہوا تھا۔"

شہناز نے کرنٹ لگنے کے سے انداز میں ابا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا پھر بے چارگی سے بولی۔

"منت کرا ابا تجھے حق ہے جیسا چاہے فیصلہ کر جس کے ساتھ بھیج مگر میرے دل کی بھی تو سن نا۔ تو میرا باپ ہی نہیں میری ماں بھی ہے۔ رحم کھا مجھ پر میرا بیاہ ہو گیا اس کے ساتھ۔" ابا یکدم کھڑا ہو گیا پشت موڑ کر باہر نکل آیا پھر صحن میں اکڑوں بیٹھ کر یوں رویا جیسے شہناز کا دل نہیں اجڑا شہناز آج کے آج ابھی کے ابھی مر گئی ہو۔

شہناز کے کانوں میں ابا کی آواز کاری زخم کی طرح لگ رہی تھی مگر وہ پھر سے لیٹ گئی تھی اس نے چھت کو دیکھا تھا پھر بڑبڑائی تھی۔

"میرا دل تجھے دکھ دینے کو نہیں کرتا ابا یہ سوچ میرے دل نے شمشیر سے نکاح کر لیا ہے میری محبت اس کے خیال کے ساتھ بیاہی گئی ہے اتنی سادگی سے لٹتے آنسوؤں کے ساتھ کوئی اور ہوا ہو گا رخصت نہ دل کو خبر ہوئی نہ دنیا کو نہ ہی اس ظالم شمشیر کو۔"

دوپٹہ اس کے چہرے پر پھر آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

گڑیا سامنے بیٹھی تھی افضل علی اس کے سامنے ڈاکومنٹس رکھ رہے تھے وہ دستخط کرتی جا رہی تھی کام مکمل ہو گیا وکیل فائل لے گیا تو افضل علی نے گڑیا کو گلے سے لگا لیا تھا۔

"آپ بہت سمجھدار بیٹی ہو میں اس وقت واقعی بہت آکورڈ فیل کر رہا ہوں۔"

"تو تو پاپا ایسا کچھ بھی نہیں جیسے آپ کا سب کچھ میرا ہے ویسے میرا سب کچھ آپ کا۔"

"گڑیا اگر یہ پراپرٹی آپ مجھے ٹرانسفر نہ کرتیں تو میں وہ رقم کسی طور جمع نہ کرا سکتا جو شمشیر نے بزنس کی بزنس کمیونٹی میرے اس اقدام سے بہت خوش ہے۔"

"مجھے بس اس بات کی خوشی ہے کہ پردادا اور دادا جان کی بنی ہوئی عزت پر کوئی حرف نہ آیا۔"

"بہت بڑی قیمت دینی پڑی ہے مجھے اس کی۔" وہ ڈپریس ہو گئے تھے۔

ثانیہ افضل خوشی سے ان کے پاس آکر بیٹھ گئیں

"آپ کے اس اقدام سے سیاست میں آپ ایک دم سے بوسٹ کر گئے ہیں لوگ آپ کی ایمانداری اور کردار کو ضرب المثل کے طور پر پیش کر رہے ہیں میرا دل کہتا ہے آپ الیکشن جیت جائیں گے۔"

"مگر میرے لیے میری عزت واپس لے لینا زیادہ اہم ہے ورنہ شاید میں خودکشی کر لیتا۔"

"اللہ نہ کرے پریشانیوں کے آگے کوئی یوں ہار مانتا ہے۔" ثانیہ افضل نے لاڈ سے کندھے سے سر ٹکایا اور شہناز کام کرتے کرتے شمشیر علی کو سوچنے لگی۔

"اللہ سائیں حفاظت کرنا اس کی اسے نہیں پتا وہ جس سے اپنی مرضی سے ناتا توڑ گیا ہے وہ آج بھی

اسے اپنی دعاؤں میں یاد رکھتی ہے' اپنے لیے کچھ مانگے نہ مانگے اس کے لیے سردی کی دھوپ' بہار کے دن' گرمی کی شامیں مانگا کرتی ہے۔"

وہ کچن میں تھی جب افضل علی کچن میں چلے آئے۔

"تمہارا ابھی پھر شمشیر سے رابطہ ہوا؟"

وہ خوف زدہ نظر آنے لگی۔ "آپ اسے جیل میں بند کروائیں گے صاحب۔"

"تمہیں کس نے کہا یہ؟" وہ حیران ہوئے تھے۔

"کل بیگم صاحبہ شاہینہ صاحبہ سے کہہ رہی تھیں کہ اب افضل صاحب خیر سے الیکشن جیت جائیں گے تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ ایم این اے کی پاور بہت ہوتی ہے شمشیر پاتال میں بھی چھپا ہو گا تو بھی افضل صاحب اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔ پھر صبا بی بی کی بے عزتی کے بدلے میں پہلے اسے جیل بھیجیں گے پھر پھانسی چڑھا دیں گے۔" افضل علی نے پیشانی پر ہاتھ مارا تھا۔

"اف یہ عورتوں کی عقل' ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے"۔ لمحے بھر کو رکے پھر نرمی سے بولے۔ "تم ان باتوں میں مت آؤ شمی بیٹا ایسا کچھ نہیں کرنے والا میں لیکن اگر شمشیر تم سے رابطہ کرے تو پلیز مجھے ضرور بتانا۔ ایک چیز اس کی امانت ہے میرے پاس اور میں کمزور انسان کب تک اس کی امانت کی حفاظت کروں گا۔"

"کیسی امانت صاحب شمشیر نے تو کبھی مجھے نہیں بتایا۔"

"یہ ہم مردوں کی آپس کی بات ہے' تم بس جب رابطہ کرے وہ مجھے ضرور بتانا میں خود اس کا پتا لگاؤں گا۔"

"جی صاحب۔" وہ کچن سے باہر نکلے اپنے کمرے میں گئے تو ثانیہ کو تیار ہوتے دیکھ کر حیران ہونے لگے۔

"کہیں جا رہی ہو کیا؟"

"کیا مطلب رات کو تو بتایا تھا آج شام میں ہم دونوں نے منہاس اور شاہینہ کے ہاں ڈنر پر جانا ہے۔"

"مگر مجھے ایسا کچھ یاد نہیں۔ آپ نے مجھے یہ بات ابھی اور اسی وقت بتائی ہے' ہے نا" ثانیہ اٹھ کر قریب آگئیں پھر لگاوٹ سے شانہ چھو کر بولیں۔

"مجھے خود چار بجے شاہینہ کا فون آیا تھا۔ میں تو منع کر رہی تھی مگر اس نے کچھ اتنی اپنائیت سے دعوت دی کہ میں انکار نہ کر سکی۔"

"آپ کو معلوم ہے وہ جلدی جلدی آپ کو اس طرح دعوتیں کیوں دے رہی ہیں؟"

"پتا ہے مگر اتنا تو چلتا ہے پروٹوکول کا نشہ بھی الگ ہی ہوتا ہے۔" افضل صاحب نے سر جھکایا تھا پھر ثانیہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولے تھے۔

"ایک بات کہوں مانیں گی آپ۔"

ثانیہ نے نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "کب آپ کی نہیں مانی جو آج اجازت لینے کا خیال آیا۔" محبت بھرا شکوہ' افضل علی نے انہیں خود سے اور قریب کر لیا تھا پھر مزید نرمی سے بولے "بے قصور ہے شمناز اسے ڈراوے نہ دیا کریں اسے خوفزدہ مت کیا کریں آپ جانتی ہیں وہ شمشیر سے کتنی محبت کرتی ہے۔"

"شمناز نے آپ سے میری شکایت لگائی" یکدم غصے کا اظہار لہجہ میں اور لفظوں میں ظاہر ہونے لگا تھا۔ انہوں نے نفی میں سر ہلایا "نہیں وہ بے چاری اس حالت میں کب ہے کہ شکایت لگائے یا گلہ کرے زندگی کا بس ڈر کر پوچھ رہی تھی کہ میں ایم این اے بن کر اس کے شمشیر کو کہیں جیل میں یا پھانسی پر تو نہیں چڑھا دوں گا۔"

"دھیان رکھوں گی۔" نرمی سے ان کے کندھے کو چھو کر کہا۔

اور افضل علی ڈنر کے لیے تیار ہونے چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

صبا صدور سامنے بیٹھی تھی کسی سائیکو کیس کی طرح اور فیضان مصطفیٰ اسے دیکھے جا رہا تھا۔ "کسی کو پسند کرنا بری بات نہیں اور جب وہ تمہارا منگیتر تھا تو صنف نازک کا مارجن تمہیں دیا جانا چاہیے لڑکی بہت جلد خوابوں کا ریشم سلجھانے لگتی ہے' خواب بننے لگتی ہے مگر میں تم سے کوئی گلہ شکوہ نہیں کرنے آیا کہ میرے ہوتے ہوئے کوئی اور تمہاری زندگی میں داخل کیوں ہوا۔ شاید میں نے ہی اپنی بات بہت غیر سنجیدگی سے کی تھی۔"

"میں آپ کے قابل نہیں ہوں فیضان ترس اور رحم کی زندگی سے بہتر میں سمجھوں گی کہ زندگی کی شاہراہ پر اکیلی چلتی چلی جاؤں' عزت نفس مجھے میرے پاپا سے وراثت میں ملی ہے' میں بھٹک گئی تھی مگر ساری دنیا کے سامنے میرے بابا نے جب کہا' کوئی کچھ بھی کہے صبا صدور آج بھی میرا غرور ہے تو میں نے اسی لمحے سوچ لیا تھا مجھے اب صرف اپنے بابا کا غرور بن کر جینا ہے سطحی محبت میری منزل نہیں۔"

"کیا میری محبت سطحی لگتی ہے آپ کو صبا؟"

اس نے آنسو بھری آنکھوں سے فیضان مصطفیٰ کو دیکھا "نہیں فیض آپ بہت بلند اخلاق بلند کردار انسان ہیں' آپ ویسے ہیں جیسا میں نے ہمیشہ اپنے جیون ساتھی کا تصور کیا ہے' آپ کے ساتھ کوئی بھی لڑکی سج کے خوش رہے گی مگر میرے دامن پر بدنامی کے وہ چھینٹے ہیں کہ میں چاہوں بھی تو آپ کو پانے کا خواب نہیں دیکھنا چاہوں گی۔"

"اتنی فضول باتیں آپ کیسے سوچ لیتی ہیں' ادھر دیکھیے آپ کوئی فیصلہ نہیں۔۔۔ میرے لیے محبت کا انسپریشن ہیں آپ کی وجہ سے میں دیار غیر میں بھی ان راہوں سے بچا ہوں جن راہوں پر نفس بے لگام گھوڑے کی طرح دوڑاتا ہے' اوپر میرا اللہ تھا اور نیچے آپ کے ساتھ کا حسین خواب دونوں رشتوں نے مجھے باصفا رکھا آپ سے غلطی ہوئی گناہ نہیں اگر خدانخواستہ گناہ بھی ہوتا تو میری محبت آپ کو مصفا و پاک کر کے قبول کر لیتی میں بس یہ دیکھتا آپ کی نظروں میں میرے لیے کتنا اپنا پن سچ اور خلوص ہے۔ ہم تو خلوص کے بندے ہیں اپنے قول کو نبھا دیتے ہیں۔"

وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"مگر یہ میری سوچ ہے' آپ پر کوئی پریشر نہیں ہے اگر آپ کو میں قبول نہیں ہوں تو میں جبر نہیں کروں گا لیکن میرے دل کی خواہش ہے کہ میں آپ کے ساتھ دور تک چلوں دیر تک چلوں۔"

"میری بدنامی! آپ کی فیملی مجھے قبول کر سکتی ہے لے سے نہیں۔ کوئی نہیں چاہتا اس کی بہو جہیز میں بدنامی سمیت کے لے کر آئے۔"

"آپ کو کیا لگتا ہے میں خود سے اتنا اچھا تعمیر ہو سکتا تھا اگر میری بنیاد ڈالنے والے ہاتھ اور ذہن نا پختہ ہوتے۔ میرے پاپا میری ماما' انہوں نے کانٹوں سے تاج بنانا سیکھا ہے' تبھی مجھے یہ ہنر کسی حد تک منتقل ہوا ہے۔ مجھے آپ کے ساتھ کا ہر پہلو عزیز تر ہے صبا صدور۔۔۔"

صبا صدور رونے لگی بے آواز خاموش اور دوسری طرف صدور بخش تھے انہوں نے انویسٹی گیشن شروع کروا دی تھی باقاعدہ طور پر تصویروں کا جائزہ لیا جا رہا تھا 5 دن بعد تصویروں کے ساتھ گورنمنٹ کے ٹیک کے ساتھ رپورٹ آئی تصویریں فیک تھیں صبا صدور تھی نہ شمشیر۔ دونوں کے جسموں پر صرف ان کے چہرے چپکائے گئے تھے۔ صدور بخش نے نوٹ پڑھا اور فوراً اپنے وکیل کو بلوانے اور مسٹر افضل علی کے خلاف ہتک عزت کا دعوا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

فیضان مصطفیٰ نے انہیں روک لیا تھا آپ معلوم تو کروائیں پرنٹ میڈیا کو یہ تصویریں جاری کہاں سے ہوئی ہیں؟" صدور بخش کسی چابی سے چلنے والے کھلونے کی طرح رک گئے۔ ہائی لیول پر رابطے ہوئے تو پتا چلا یہ تصویریں شارق امام' عظمت امام کی طرف سے یوٹیوب پر ڈاؤن لوڈ کی گئیں ان کے اپنے گھر کے کمپیوٹر سے کیس درج ہو گیا تھا۔ شارق امام سر جھکائے کھڑا تھا اور عظمت امام پاگلوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ پہلے خبر سن کر وہ سکتے میں آ گئے تھے وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کوئی گیم ان پر بھی الٹ سکتا ہے مگر ایسا ہو گیا تھا۔ انہوں نے سارا الزام مفرور شوفر پر ڈال دیا تھا۔ اب شوفر کو انڈر ورلڈ اور پولیس مل کر ڈھونڈ رہی تھی۔

"کچھ بھی نہیں ہو گا یہ ساری سزاؤں کا سلسلہ بالکل

اسٹیبلشمنٹ میرا نہیں ہے نہیں بھاگ سکتے پاپا ہم اپنے اعمال کی دلدل میں پھنس گئے ہیں جتنا ہاتھ پیر ماریں گے اتنا اندر اترتے جائیں گے۔"

عظمت امام کبھی بیٹے کو دیکھتے کبھی سامنے بیٹھے ڈی آئی جی کو۔

"آپ کے بیٹے کی باتیں؟ سچ ہیں یا دماغی۔۔۔"

"دماغی خلل ہے سر فرسٹریشن میں ایڈیکشن زیادہ کرلی ہے تب سے ایسی بہکی بہکی باتیں کررہا ہے۔"

ڈی آئی جی نے افسوس سے شارق عظمت کو دیکھا

"آج کا نوجوان فرسٹریٹ بہت ہے جتنا اس میں پوٹینشل ہے جب وہ اس کو کام میں نہیں لا پاتا تو فرسٹریٹ ہو کر ایڈکٹ بن جاتا ہے یا مجرم۔۔۔ مگر بہرحال آپ اس کا دھیان رکھیں اس طرح کے اسٹیٹمنٹ نا صرف اس کے لیے بلکہ آپ کے لیے بھی خطرناک ہو جائیں گے۔" عظمت امام اپیل پر چھوٹ کر گھر آگئے تھے۔

گڈی خبر پڑھ کر بھاگی گئی۔

"تمہارا شمشیر بری۔۔۔ کردیا قانون نے۔"

"مگر صاحب تو کہتے تھے اس نے صباجی کے ساتھ بہت برا کیا ہے۔" ہنستا۔۔۔ چہرہ یک دم گہری سوچ میں گم ہو گیا وہ آدھے راستے سے پلٹ گئی تھی۔ افضل علی اسٹڈی روم میں نہیں تھے مگر وہ اندر داخل ہو گئی تھی۔

اس نے ایسے ہی درازیں کھولنی شروع کردی تھیں اسے پتا نہیں کس چیز کی تلاش تھی اور پھر بالکل غیر متوقع اسے وہ چیز مل گئی جس کا شائبہ اس کے دماغ میں تو تھا مگر نظر کو اس قدر جلدی اپنی کھوج سے بغل گیر ہونے کی توقع نہیں تھی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ لفافہ نکالا میز پر رکھا کسی نے چیل کی طرح اسے اٹھالیا تھا۔

"نو مائی گڈی یہ آپ کے لیے نہیں ہے۔۔۔"

"مگر میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔"

سامنے افضل علی تھے گومگو کیفیت میں کھڑے۔

☆ ☆ ☆

"آخر تو کبھی تو تھکتا بھی ہے۔۔۔" کام کرتے اس کے ہاتھ رک گئے۔

"تھکن جمود کا نام ہے اور میں مرنے سے پہلے اس کا شکار نہیں ہو سکتا۔" چلچلاتی دھوپ میں لال بھبھوکا اس کے چہرے کو دیکھ کر پہلے مزدور نے تاسف سے کہا۔

"تیرا چہرہ مزدوروں والا نہیں۔۔۔ تو تو بابو صاحب ہے۔" جواب دینے والا ہنس پڑا۔

"مزدوروں کے چہرے پر کوئی خاص بات ہوتی ہے کیا جو مجھ میں نہیں ہے۔" وہی مزدور سر ہلا کر مسکرایا۔

"میرا ابا کہتا ہے ہم مزدوروں کے چہرے پر مظلومیت اور تھکن کسی اشتہار کی طرح چسپاں ہوتی ہے ہمارا تو پیدا ہونے والا بچہ تک بے چارہ سا لگتا ہے۔ کبھی کبھی ترس آتا ہے اسے دنیا میں لایا ہی کیوں گیا ہم اپنی جیسی زندگی جینے کے لیے نہ سر پہ چھت نہ پیر کے نیچے زمین۔۔۔" وہ کھانے کے وقفے میں بیٹھ گیا تھا۔

"اللہ کہتا ہے شکر کرو میں تمہیں برکت دوں گا، ہم شکوے کرتے ہیں اور اپنی زندگی خود عذاب کر لیتے ہیں۔ مچھلی کا بچہ جب پیدا ہوتا ہے، اسے ناسازگار حالات میں اپنی ہی صنف کی منہ کھولتی موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن وہ ان حالات میں جی کر زیادہ مضبوط طاقتور ہو جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے وہ اپنا ایک الگ گروہ، اپنی ایک الگ دنیا بناتا ہے۔ ہم انسان ہو کر بس پچھتا کر اپنی زندگی کی اینٹ پر اینٹ رکھتے ہوئے اپنی عمر کی کمائی ختم کر دیتے ہیں اور ایک دن شکوے کرتے کرتے مرجاتے ہیں مزدور کا بیٹا مزدور ہی مرے یہ ضروری نہیں۔"

مزدور ہنسنے لگا۔

"وہ ہی ایک چینل کا نعرہ لکھنے پڑھنے پر یقین کی بات مگر ہم لوگ جو اپنے پیٹ کا ایندھن نہیں بھر سکتے ہم کیسے اپنی نسل کو پڑھائیں۔"

"کیوں نہیں پڑھا سکتے؟ آج کل چین اقتصادی طور پر

کستان کے مزدور سے لے کر تندور پر روٹی لگا کر اپنے اخراجات پورے کرنے اور اعلا تعلیم حاصل کرنے والے لوگوں کی پذیرائی سے بھرا پڑا ہے۔ مگر وہی بات ہم کس طرح جینے کو اہمیت دیتے ہیں اصل محور و مرکز یہ بات ہے۔"

"تم مجھے بہت پڑھے لکھے لگتے ہو کسی شو کے اینکر پرسن تو نہیں۔۔۔"

وہ اور زور سے ہنسا۔

"نہیں میں ایک مزدور ہوں اور راستے کی رکاوٹوں کو اپنے عزم سے دور کرنے پر اندھا یقین رکھتا ہوں، میرا اللہ صرف میری نماز نہیں میرا اللہ میرے سونے جاگنے کھانے پینے ہر چیز میں ایک دوست کی طرح ساتھ رہتا ہے۔ میں جہاں تھکنے لگتا ہوں وہی ہولے جی کر کہتا ہے "ہار گئے مجھ پر یقین بس اتنا سا تھا" میں ایک دم پھر سے سیدھا ہو کر کھڑا ہو جاتا ہوں اور خود سے کہتا ہوں جو میرے دن رات کی نگہبانی ایسے کرتا ہے جیسے کوئی ماں اپنی اولاد کی نگہبانی کرتی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے وہ مجھے میرے دکھ درد تکلیف میں تنہا چھوڑ دے وہ مجھے دے کر آزماتا ہے مجھ سے لے کر آزماتا ہے مجھے کچھ بھی نہ دے خالی ہاتھ رکھے تب بھی میرا ایمان اس کے رحم اس کے کرم سے منکر نہیں ہو سکتا۔"

مزدور نے پلکیں جھپک کر اسے دیکھا تھا "تیری باتیں بڑی لو بھی پر دل کو لگتی ہیں مگر میں ان باتوں سے کتنا بھی رجھ جاؤں تھوڑی دیر کو اثر رہتا ہے پھر وہی خالی برتن جیسا دل چھنکنے لگتا ہے بے سوادی سا بے مزا سا۔"

اس نے کھانے کی بریک ختم ہونے کی سیٹی سنی اور پھر سے اس کی تگاری سیمنٹ سے بھرنے لگا "ایک اچھا مزدور وہی ہوتا ہے جو بار بار تگاری بھر بھر کر سیمنٹ ڈالتا جائے اس کے ہاتھ شل ہو جائیں تب بھی اجرت ملنے کی خوشی پر وہ محنت جاری رکھے، پھر تا بار بار تگاری ڈالتے چلے جانے پر بھی تیرا دل یقین سے خالی رہ سکتا ہے۔"

مزدور چلا گیا تھا، مگر پھر لوٹ آیا تھا۔

"تو سیمنٹ کی بات کررہا تھا یقین کہاں سے آگیا۔"

"سیمنٹ، بجری کرش سے مل کر ایک مضبوط چھت بنتی ہے کہ نہیں۔"

"ہاں بنتی ہے۔۔۔" وہ پھر سے تگاری بھرنے لگا۔

"تو بالکل اسی طرح، باربار یقین جہاں ٹھوکر کھائے وہاں پھر سے اپنی زندگی کی کوئی ایسی بات یاد کر جب ساری دنیا تجھے چھوڑ چکی تھی مگر اس نے کسی نہ کسی سبب کسی اپنے بندے کے ذریعے تیرا ہاتھ تھام کر تجھے اس موقعے سے نکال لیا ہو مگر تو نے اللہ کی ذات کی بجائے اسے اپنی تدبیر سمجھ کر اپنی پیٹھ تھپتھپائی ہو؟"

"ہاں بہت دفعہ ہوا ہے ایسا۔۔۔"

"مگر آج سے الگ راستہ چن کر دیکھ، میں نے ایک جگہ پڑھا تھا اگر گرم پانی کی مچھلی کو ٹھنڈے پانی میں ڈالو تو وہ مرجاتی ہے مگر یہ عمل نسل در نسل دہراتے جاؤ تو ایک وقت آتا ہے جینز سے ڈی این اے اپنا کوڈ بدل کر نئی میموری فیڈ کر دیتا ہے اور اگلی کوئی نسل اسی مچھلی کو برف پر پھدکتا دیکھتی ہے۔ پھر ہم انسان ہو کر کیوں نہیں بدل سکتے، ہم بدلنے سے سمت چینج کرنے سے گھبراتے کیوں ہیں؟ ایک نسل دوسری نسل کی کاربن کاپی بن کر ان کے ہی انداز میں رو دھو کر مرجانے کو ہی سب کچھ کیوں سمجھتی ہے؟ لوگ مرجاتے ہیں مگر نہ نظریہ مرتا ہے نہ یقین مرتا ہے نہ اللہ کی اپنے بندوں سے نظر کرم کا رشتہ ٹوٹتا ہے۔"

مزدور کام کرتا جاتا اسے چھیڑ چھیڑ کے سوال پوچھتا جاتا یہاں تک کہ پانچ بج گئے کام روک دیا گیا۔ اس مزدور نے اپنے کپڑے بدلے نہا دھو کر اذان کی آواز پر لبیک کہتا آگے بڑھتا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

گڈی کے سامنے تصویریں بکھری ہوئی تھیں اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

"اتنا بڑا جھوٹ پاپا اتنا بڑا جھوٹ۔۔۔"

افضل علی سر جھکائے کھڑے تھے اور گڈی باہر نکل

گئی تھی۔
"میں بتاتی ہوں آخر سمجھتا کیا ہے شمس خود کو۔"
غصہ اس کے وجود کے ہر موئے تن سے جھلک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

فیضان مصطفیٰ نے صبا صدور سے ایک سادہ سی تقریب میں نکاح کرلیا تھا' صبا صدور کی شادی کی خبر ——— اخبارات میں صدور تجشی نے نمایاں جگہ پر چھپوائی تھی پھر نکاح کے بعد وہ پہلی بار اکیلے بیٹھے تھے جب صبا صدور نے دکھ سے کہا تھا۔
"تصویریں ٹھیک تھیں مگر اس حد تک نیک نہیں تھیں جیسی ثابت ہوئیں کیا آپ نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا تھا؟"
فیضان مصطفیٰ نے نفی میں سر ہلایا اور ایک لفافہ سامنے رکھا تھا' صبا صدور نے تصویریں اور نگیٹیوز دیکھے اور پھر سے رونے لگی تھی 'میں نے اور اظفر نے مل کر شمس اور گنڈی کو بدنام کرنا چاہا تھا۔ میں اظفر کے ٹرانس میں تھی۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی اگر میں نے اس کام میں اس کا ساتھ نہیں دیا تو وہ مجھے چھوڑ دے گا۔ میرا سانس رکتا تھا یہ سوچ کر ہی کہ زندگی ہو مگر اس میں اظفر منہاس نہ ہو——— میرا دل کہتا تھا میں جو کر رہی ہوں غلط ہے مگر اظفر منہاس کی حکم دیتی آنکھوں کے آگے میرا دماغ "صم" "بکم" ہو جاتا تھا۔ اظفر منہاس قد کاٹھ میں شمشیر جیسا تھا اور ———"
"بس کرو میں یہ سب جانتا ہوں۔ جس نے یہ مجھے بھیجا ہے اس نے لفافے کے ساتھ کال کرکے کہا تھا۔ صبا بی بی اتنی باعزت اتنی پاک باز ہیں کہ جو بھی انہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنائے گا اس کی زندگی سنور جائے گی ۔ صبا بی بی اندھیرے میں چمکتی ہوئی روشنی کی کرن ہیں اور اس کی اہمیت وہ جان سکتا ہے جو گھپ اندھیرے میں قید کردیا گیا ہو———"
صبا صدور اور زور زور سے رونے لگی۔
"شمس تم کیا تھے اور میں تمہیں کیا سمجھی۔"

فیضان مصطفیٰ اس کا شانہ تھپک رہا تھا۔
"جتنا رونا ہے اب رو لو رخصتی کے بعد اگر یہ نخرے گرائے نا تو روز مما سے ڈانٹ پڑنی ہے مجھے۔ تمہیں نہیں پتا انہیں بیٹیوں کا کتنا شوق ہے اور اس سے بڑھ کر بیٹی کے لاڈ اٹھانے کا مکمل شوق موجود ہے۔" صبا صدور ہلکا سا مسکرائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے غلط کیا مگر مجھے وفاداری میں ایسا کرنا پڑا' ایک بار کسی کا نمک کھالو تو نمک حلالی فرض اور حکم بن جاتی ہے مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا کہ میرے صاحب افضل علی کی عزت سرعام نیلام ہو جانے کو ہے ایک لمحے کو میرا دماغ ماؤف ہو گیا جب شارق کے شوفر کو میں نے اظفر منہاس کے شوفر سے بات کرتے سنا۔ یہ چائے خانہ ہم ملازمین کی پسندیدہ جگہ تھی یہیں میری ملاقات پہلی بار اکبر سے ہوئی' میں نے اسے نظروں میں رکھ لیا پھر ایک جگہ دیکھ کر اس کو پیسہ کا لالچ دیا مگر وہ پیسے کے لیے حریص نہیں بنا تھا اور وہ غریب ہو کر پیسے کے لیے کیوں حریص نہیں ہوا میں جانتا تھا سو میں نے اس کے چند فوٹو گراف اس کے سامنے لا رکھے یہ سمیرا اور اس کے چند ناقابل فراموش لمحات کی کہانی بیان کرتی تصویریں تھیں۔
وہ پیلا پڑ گیا پھر اسے ریموٹ کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں نے فیک فوٹو گراف یوٹیوب پر ڈاؤن لوڈ کروائے اور اخبارات کی سائٹ پر بھجوائے ان کی چال چلنے سے پہلے میں داؤ کھیل گیا تھا مگر میں صبا صدور کا برا نہیں چاہتا تھا تبھی میں نے ساری فوٹو گراف مکمل فیک بنوائی تھیں اس کے لیے مجھے گنڈی صاحب کے اکاؤنٹ سے پیسے بھی نکلوانے پڑے ۔ بیلنس شیٹ دیکھ کر گنڈی صاحب چیخی بھی تھیں اتنی بڑی رقم کہاں گئی مگر وہ دوسرے گھنٹے میں یہ بات بھول گئی تھیں اپنے لاابالی پن کو اس کا مجرم ٹھہرا کر انہوں نے خود کو ریلیکس کرلیا مگر میں نے اس وفاداری میں جو جو کیا غلط تھا۔ سمیرا کی زندگی کو کسی پاپارازی فوٹو گرافر

کی طرح کیش کرنا غلط تھا' صبا صدور جیسی پاکباز لڑکی کی غلطی کو گناہ بنا کر پیش کرنا غلط تھا گنڈی صاحبہ کے اکاؤنٹ سے پیسہ نکلوانا کسی کرپٹ انسان کی طرح یہ بھی غلط تھا اور غلطی جب گناہ بن کر زندگی کو لگ جائے پرانے سارے اعمال کو کھا جائے تو اس کا کفارہ ضروری ہوتا ہے۔
اور میری یہ تکلیف وہ زندگی کفارہ ہی تو ہے میں کتنے ماہ سے شمناز سے دور ہوں اپنے آپ سے دور ہوں' میں اب اپنا چہرہ نہیں دیکھتا کیونکہ جب میں اپنا چہرہ دیکھتا ہوں مجھے شمنی کی آنکھیں یاد آجاتی ہیں استغراق سے لودیتی ہوئی بے خود آنکھیں جس عشق سے وہ مجھے دیکھتی تھی' آج تک زندگی میں کسی نے مجھے ایسا نہیں دیکھا——— ہائے میرا محبت کا شہر میری شمنی کی ادھوری محبت کی کہانی———"
وہ گھٹنوں پر سر جھکائے سوچتے سوچتے ٹھنڈے فرش پر لیٹ گیا۔
"سرد ہوائیں بہت ظالم ہوتی ہیں آپ سے کسی اور کا عکس بن کر ٹکراتی ہیں پھر دیر تک آپ کے افسردہ چہرے پر ہنستی ہیں———"
"میں نے سنا تھا' جب ہم گناہ کرتے ہیں تو ہمیں وہ رب تکلیف دکھ کے ذریعے اس گناہ کے اثرات سے پاک کرتا ہے۔ ہمارا معاملہ اچھا ہو ہمارے اعمال اچھے نہ ہوں تو وہ ہمیں دکھ بیماری دے کر نکھارتا ہے تاکہ ہم اس مقام کے قابل ہو کر اس مقام تک پہنچیں میں اپنے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے میرے گناہ کی سزا دنیا میں دے کر میرے اعمال کو بہتر کیا۔ میں شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے راندہ درگاہ نہیں کیا میں شکر گزار ہوں کہ اس نے اپنا دامن مجھ سے نہیں چھڑایا۔ مجھے زیادہ سہولت' زیادہ آزادی اور شخصی غرور میں نہیں لتھڑنے دیا' میں شکر گزار ہوں کہ وہ آج بھی میرا ہے میری ساری کوتاہیوں کمیوں نالائقیوں کے باوجود' وہ آج بھی میرا ہے———"
رات کا پتا نہیں کون سا پہر تھا جب وہ پھر سے اٹھا اور سجدہ گزار ہو کر شکر کر رہا تھا اور شکر گزار بندوں سے

معافی نعمت بہت دور نہیں ہوتیں....

☼ ☼ ☼

گڈی پاگلوں کی طرح اسپتال میں بھاگی پھر رہی تھی آج بہت اچانک اس کے اشتہار کا جواب آیا تھا۔ کسی نے فون کرکے کہا تھا اس کا مطلوبہ شخص اسے یہاں مزدوری کرتا ہوا مل سکتا ہے مگر جب وہ شہناز کے ساتھ وہاں پہنچی تو پتا چلا وہ آج آیا ہی نہیں وہ مزدور سے اس کے کرائے کے گھر کا پتا لے کر وہاں گئی تو ایک دل ہلا دینے والی خبر اس کی منتظر تھی۔ اس پرانی عمارت کی پرانی وائرنگ میں شارٹ سرکٹ کی باعث آگ لگ گئی آگ پھیلنے پر سب جاگے اور ایک شخص ان سب کو اپنی جان پر کھیل کر بچاتا رہا۔

"وہ شمس ہے....." اس کے دل نے بے ساختہ کہا اور اب وہ اس اسپتال میں کھڑی تھی کاؤنٹر سے کچھ نہیں پتا چل رہا تھا تب ایک ڈاکٹر سے معلوم ہوا۔

"جی' جی وہ یہاں لایا گیا مگر دوسروں کی جان بچانے کے چکر میں اس کی اپنی جان چلی گئی بہت بہادر آدمی تھا بہت ہی بہادر آدمی....."

"ہم اسے دیکھ سکتے ہیں....."

"دیکھ لیجیے مگر آپ اس کا چہرہ نہیں پہچان سکتے' بری طرح جھلس گیا ہے لوگ کہتے ہیں شمس تھا وہ....."

"ہاں وہ شمس تھا.... سورج ہماری زندگی کا سورج۔"

لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جا رہا تھا۔

شہناز بت کی طرح کھڑی تھی اور گڈی شاید وہاں نہیں تھی۔ ایک شخص جسے آپ نے زندہ دیکھا ہو اپنے سامنے چلتے پھرتے اس شخص کو مردہ دیکھنا کس قدر اذیت ناک ہے.....

لاش باہر آچکی تھی۔ شہناز کو چکر آگیا' گڈی جو کپکپاتے ہاتھوں سے اس کے چہرے پر ڈلی ہوئی چادر ہٹا رہی تھی وہ گھبرا کر پلٹی۔

میل نرس نے شہناز کو سنبھالنے میں اس کی مدد کی تھی۔

افضل علی' ثانیہ' صبا صدور' فیضان مصطفیٰ بھاگے چلے آئے تھے۔

افضل علی لاش کو ایمبولینس میں رکھوا رہے تھے جب کسی نے ان کا کندھا تھاما تھا۔

"کیا ہوا افضل صاحب کون چلا گیا ہے....." افضل علی نے کرنٹ کی رفتار سے مڑ کے دیکھا شمشیر لمبا چوڑا صحت مند ان کے سامنے کھڑا تھا۔ بس اس کا داہنا ہاتھ زخمی تھا۔

"تم زندہ ہو....."

"جی' میں آج مزدوری پہ جا رہا تھا تو بس سے گر گیا فریکچر ہو گیا تھا تو یہاں اسپتال آیا آپ کس کے لیے....."

"گڈی گڈی....." افضل علی اپنی ساری بردباری چھوڑ کر جوشیلے بچے کی طرح چیخ رہے تھے.... گڈی گھبرا کر آئی اور پاگلوں کی طرح شمشیر کے گلے سے جھول گئی تھی "تم زندہ ہو شمشیر تم زندہ ہو....."

افضل علی اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کر رہے تھے وہ سکتے کی کیفیت میں کھڑا تھا کیا وہ اتنا اہم ہو سکتا تھا کسی کے لیے۔

"میں انسانیت پر یقین رکھتا ہوں' دین اور سیاست میں گروہ بندی کا قائل نہیں میں ثواب کے لیے نیکی نہیں کرتا' میں بس اپنے رب کو راضی کرنے کے لیے اچھائی کرنے کا قائل ہوں وہ چاہے اس کا اجر دے یا ایسے ہی رد کردے' میرا دل اپنے رب کی محبت سے بھرتا جاتا ہے میں پہلے سے زیادہ اچھائی کروں گا' پھر کروں گا' پھر کروں گا یہاں تک کہ وہ آگے بڑھ کر مجھے اپنے دربار میں بیٹھنے والوں کی سب سے آخری صف میں جگہ دینے پر مجبور ہو جائے گا وہ جب سب کو نگاہ کرم سے دیکھے گا تو سب سے آخری صف میں مجھ پر بھی اس کی نگاہ کرم کی کرنیں گریں گی' میرا دل بھی مصفا ہو جائے گا۔ میں کبھی ہار نہیں مانوں گا' معافی اور شکر کرتا رہوں گا کبھی تو اس کا دل پسیجے گا وہ مسکرا کے مجھے دیکھے گا اور کمال محبت سے کہے گا' تیری بار بار کی دستک سے جا میں نے تجھ پر اپنے ساتوں در کھول دیے جا معاف کیا جا فلاح دی تجھے...."

"تم ایف 11 میں نہیں رہتے تھے۔"

"رہتا تھا مگر ایک ہفتہ پہلے میں نے اپنا کمرہ بدل لیا' ایک بہت بے چارہ سا شخص ملا تھا' چائے خانے میں شمس الدین نام تھا اس کا' گاؤں سے ابھی ابھی یہاں کمائی کے لیے آیا تھا' اس کو رہائش کی سخت ضرورت تھی تو میں نے اپنا کمرہ اس سے بدل لیا تھا اس کی رہائش اس کے کام کی جگہ سے بہت دور تھی وہ وقت پر نہیں پہنچ پاتا اور اگر وہ وقت پر نہیں پہنچتا تو اس کی نوکری چھن جاتی وہ ٹرائل بیس پر تھا اس لیے میں نے سوچا...." وہ کہتے کہتے رکا اور اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"تو کیا....."

افضل علی نے اس کا کاندھا تھپکا۔

"ہاں' شمس الدین جل بسا لوگوں کو اس جلی ہوئی عمارت سے نکالتے نکالتے خود جھلس کے شہید ہو گیا۔"

"انا للہ وانا الیہ راجعون...." اس نے زیر لب دہرایا۔

افضل علی لاش کو اس کے گاؤں بھجوانے کے انتظامات میں لگ گئے اور وہ گڈی کے ساتھ اسپتال میں شہناز کے پاس آگیا۔

شہناز خاموش لیٹی آسمان کو تک رہی تھی۔

وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا مگر اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"شہنی..... اس نے اسے پکارا ایک نہیں کئی بار تب اس کی پتلی میں حرکت ہوئی۔ اس کی آنکھیں شمشیر کے چہرے پر آکر ٹک گئیں اور پھر اس کا سمندر رونا..... صبا صدور گڈی سب پریشان ہو گئے تھے۔

شمشیر ہلکا سا مسکرایا۔

"زندہ ہوں پورا مکمل' کیوں رو رہی ہو....."

"کیوں گئے مجھے چھوڑ کر' کیوں گئے تھے...." وہ آس پاس کا لحاظ کیے بغیر اس سے جھگڑ رہی تھی' ذہنی طور پر وہ اتنی ہی ڈسٹرب تھی۔

"اگر چھوڑ کے نہیں جاتا تو یہ کیسے پتا چلتا تم مجھے کتنا پیار کرتی ہو....."

"بہت ظالم ہو' بہت گندے...." وہ اس کے کندھوں پر مکے مار رہی تھی۔

"ساری پٹائی آج ہی کر لو گی یا کچھ بعد کے لیے بچا کے بھی رکھو گی...." شمشیر نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ گاڑی میں بیٹھنے والے تھے جب صبا صدور نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

"میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں لیکن میرا دل چاہتا ہے میں تمہیں بھائی کہہ کر پکاروں....."

"کیا اس قابل ہوں میں...." شمشیر کی آنکھیں بھیگنا شروع ہو گئی تھیں۔

یہ رشتے یہ سب کچھ.... وہ اکیلا کھڑا تھا مگر اس رب نے کہاں کہاں سے اسے کتنے سارے دھڑکتے دلوں کے درمیان لا کھڑا کیا تھا۔

"آپ اگر مجھے بھائی کہیں گی تو میری عزت اور بڑھ جائے گی صبا صاحبہ....."

"میں ہمیشہ تمہیں یاد رکھوں گی شمس بھیا' اپنی ہر دعا میں یاد رکھوں گی۔"

وہ مسکرانے لگا کچھ نہیں بولا اور کبھی کبھی کہنا بولنا ضروری بھی کہاں ہوتا ہے۔ اس کے دل کے لیے یہ اجر کم نہیں تھا کہ وہ اکیلا تھا مگر اب بہت سے دل اس کے لیے اور صرف اس کے لیے دھڑک رہے تھے۔

یہ اجر کم نہیں تھا ساری عمر کو کافی تھا بلکہ بہت کافی تھا۔

☼ ☼

ماڈل :	ایشا خان
میک اپ :	روز بیوٹی پارلر
[illegible] :	موسیٰ رضا

حیا مجتبیٰ

مسکراتی جوڑی
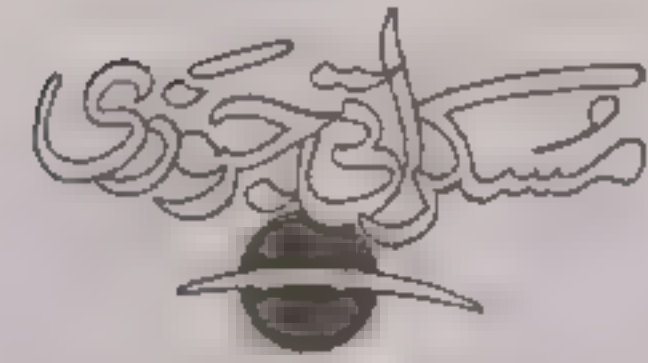
We wish you a marry xmas
We wish you a marry xmas
And a happy new year -

اسٹیج پہ کھڑے ننھے منے بچے ہاتھوں میں روشن قندیلیں پکڑے لہک لہک کر گائے جا رہے تھے اور ہال میں بیٹھے سب ہی نفوس مدھم آواز میں ان ننھے فرشتوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ سوائے ایک وجود کے امرحہ عافین جو صرف محویت سے ان معصوم چہروں کو تکے جا رہی تھی اور اس کی تمام تر توجہ ان کی دلکش آواز پہ تھی۔

امرحہ کی بھابھی کی فرینڈ کے گھر پہ یہ کرسمس پارٹی دی گئی تھی اور ننھی لیزا نے اپنی بھی بیسٹ فرینڈز کو بلایا تھا۔ بھابی کے شدید اصرار پہ وہ بھی اس کے ساتھ اس پارٹی میں شریک ہوئی تھی اور اب اسے اپنے فیصلے پہ خوشی تھی۔ وہ یہاں بے حد انجوائے کر رہی تھی۔

"ہیلو ایوری باڈی۔" تبھی ہال میں سانتا کی آواز گونجی اور سبھی نے پرجوش تالیاں بجائیں۔

"میری طرف سے آپ سب کو کرسمس اور نئے سال کی مبارک باد۔" شستہ انگریزی میں کہتے ہوئے وہ ذرا سا جھکے تو بچوں کی تالیوں سے وہ ہال نما کمرہ دوبارہ گونج اٹھا۔

"آپ کے لیے ڈھیروں دلی دعاؤں کے ساتھ میں لایا ہوں سب کے لیے کچھ خوب صورت تحفے بچوں میرے پاس آؤ۔" انہوں نے اپنے کندھے سے لٹکایا ہوا بڑا سا تھیلا اتارا اور بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ بچے بھاگم بھاگ ان کے پاس پہنچے اور اپنے تحائف وصولنے لگے۔

"لوگ تو بس کرسمس، نئے سال یا تہواروں میں ہی روشنیاں ڈھونڈتے ہیں۔ میری روشنی تو تم ہو امرحہ۔ تم میرے ساتھ ہو تو میرا ہر دن نئے سال جیسا پرامید، پرنور اور پرمسرت ہے۔" کسی نے جیسے سرگوشی کی تھی اور گم سم بیٹھی امرحہ چونک گئی۔ وہ اپنی نشست پہ ہی تھی۔ ساتھ بیٹھے سبھی بچے اسٹیج پہ سانتا سے تحفے وصول کر رہے تھے۔ نجانے اسے یہ سوجھی، وہ دھیرے سے اٹھ کر سانتا کے پاس چلی آئی۔

"سانتا! کیا میرے لیے آپ کے پاس کچھ ہے؟"

اس نے بنا کچھ سوچے سمجھے ہی اپنا دایاں ہاتھ آگے کیا۔ سانتا نے حیرانی سے تنگ اور کوٹ پہنے اس نرم و نازک گلابی سی لڑکی کو دیکھا۔ پھر مسکراتے ہوئے بیگ سے کچھ نکال کر اس کی ہتھیلی پہ دھر دیا۔

امرحہ نے دیکھا وہ خوب صورت سی کرسمس گلوب بال تھی جس میں سنہرے بالوں والی خوب صورت سی پری چمکتے ستاروں کے درمیان جیسے اڑ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جادوئی چھڑی تھی۔

"میری دعا ہے پرنسس کہ آپ ہمیشہ خوش رہو۔" سانتا نے انگریزی میں کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔

"stay blessed" سانتا نے جاتے جاتے دوبارہ اسے مخاطب کیا۔ پارٹی ختم ہو چکی تھی اور گھر واپس آتے آتے آدھی رات ہو چکی تھی۔ وہ تھک بھی بہت گئی تھی۔ سو آتے ہی بستر پہ ڈھے گئی۔ سخت تھکن کے باوجود بھی اسے نیند نہیں آئی۔ وہ یونہی تکیے میں سر دیے اپنا ماضی سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"بیٹا میں نے کبھی تم دونوں پہ کوئی روک ٹوک نہیں کی۔ علقمہ نے بھی اپنی زندگی کا فیصلہ جب خود کیا تو میں نے مکمل طور پہ اس کا ساتھ دیا۔ اس کے باوجود بھی کہ میں جانتا تھا کہ وہ کم عقل اور ضدی ہے اور تم تو میری سمجھ دار بیٹی ہو مجھے تمہاری پسند پہ پورا بھروسہ ہے۔ اگر تمہیں کوئی پسند ہے تو..."

بابا نے پیار سے اس کے ریشمی بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اور آپ جانتے ہیں بابا کہ مجھے آپ پہ بھروسہ ہے اپنی ذات سے بھی بڑھ کر۔ آپ میرے لیے جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔" اس نے ہمیشہ کی طرح سعادت مندی سے جواب دیا بابا مسکرا دیے۔

"میرے دوست کا بیٹا ہے۔ امریکہ میں رہنے کے

باوجود ان کا طرز زندگی بالکل ویسا ہی سادہ ہے جیسا ہمارا۔ ساری فیملی مل جل کر رہتی ہے۔ انہوں نے جیسے ہی مجھے اپنے بیٹے کے لیے کہا تو یقین مانو میں نے دل سے دعا کی کہ تمہیں کوئی اور پسند نہ ہو۔ یقین مانو امرحہ اتنا اچھا اور سمجھ دار لڑکا ہے کہ تم بھی اپنے باپ کی پسند پہ اس اش کر اٹھو گی۔" انہوں نے ذرا جھکتے ہوئے مذاقاً" کہا تو وہ بھی کھلکھلا پڑی۔

"میں نے کہا نا بابا جو آپ مناسب سمجھیں۔ میں نے پہلے بھی کبھی آپ کی بات ٹالی ہے۔" اس نے بابا کا ہاتھ تھاما۔

"تھینک یو بیٹا۔۔۔ تھینک یو سو مچ۔ تو کیا میں انہیں ہاں کہہ دوں؟" انہوں نے استفسار کیا۔

"بابا۔۔۔" وہ کھنی پلکیں جھکا گئی۔

"اوکے۔۔۔ اوکے اب ذرا بابا کو مزے دار کافی بنا کے پلاؤ۔" انہوں نے فوراً" بات بدلی۔

"جی۔۔۔ صرف دو منٹ۔" اس نے چٹکی بجائی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ جمال احمد نے سکون سے آنکھیں موند لیں۔

علقہ اور امرحہ واقعی تھیں تو سگی بہنیں لیکن دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ امی کی وفات کے بعد بابا نے ان دونوں کو بے حد لاڈ پیار سے پالا تھا۔ اس بے جا لاڈ پیار نے جہاں علقہ کی شخصیت پہ منفی اثر ڈالا تھا وہیں امرحہ پہ بے حد مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ علقہ بے حد چڑچڑی اور ضدی تو امرحہ بے حد سگھڑ اور سلجھی ہوئی طبیعت کی مالک تھی۔ ہر وقت زندگی کو انجوائے کرنا اس کی فطرت تھی۔ نیویارک جیسے مغربی تہذیب کے شہر میں رہتے ہوئے بھی وہ مکمل طور پہ مشرقی لڑکی تھی۔

علقہ نے اپنی پسند کی شادی کی تھی اور چند ہی دنوں بعد شوہر کے ساتھ الگ گھر شفٹ ہو گئی۔ ظفر اور ثنا کی پیدائش کے بعد وہ مزید چڑچڑی ہو گئی۔ امرحہ تو اظہر بھائی کے حوصلے کی داد دیتی جو علقہ کی بدلحاظی مکمل طور پہ برداشت کر لیتے۔

بابا نے نہایت سادگی سے اس کے نکاح اور رخصتی کی تقریب منعقد کی تھی اور وہ امرحہ جمال سے امرحہ عافین بن کر ہمیشہ کے لیے اپنے نئے گھر سدھار گئی۔ عافین کو پا کر واقعی وہ تہہ دل سے اللہ اور بابا کی ممنون ہوئی تھی۔ بابا تو جیسے اس کی رخصتی کے انتظار میں تھے۔

شادی کے صرف ایک ماہ بعد ایک جان لیوا ہارٹ اٹیک نے ہمیشہ کے لیے ان کو ان کے بابا سے جدا کر دیا۔ امرحہ پہ تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ عافین کی محبت اور ہمدردی نے ٹوٹی پھوٹی امرحہ کو بہت جلد سنبھال لیا اور وہ جلد ہی زندگی کی رونقوں میں پھر سے مگن ہو گئی۔

آج بہت دنوں بعد علقہ اس سے ملنے اس کے گھر آئی تھی۔ وہ کچن میں برتن دھو رہی تھی جب اس کی بڑی دیورانی نے اسے آ کر بتایا۔

"تمہارے کمرے میں بٹھایا ہے جاؤ تم باتیں کرو۔ برتن میں دھو لوں گی۔" لبوں پہ دھیمی سی مسکان سجائے لائبہ نے اس کے ہاتھوں سے برتن لیتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں بھئی آپ رہنے دیں۔ میں ابھی آ کر دھو لوں گی۔ آپ ویسے بھی صبح سب کا ناشتا تیار کرتے کرتے تھک جاتی ہیں۔" اسے شرمندگی نے گھیرا۔

"پگلی، اپنوں کا کام کرتے ہوئے تھکن کہاں ہوتی ہے۔ تم جاؤ شاباش۔" انہوں نے آرام سے اسے باہر دھکیلا۔ تو وہ بھی سرہلاتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی۔

"السلام علیکم آپی۔" تنقیدی نظروں سے اس کے سراپے کا جائزہ لیتی ہوئی علقہ نے اس کے سلام کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

"پتا ہے امرحہ کیا، کبھی کبھی مجھے لگتا ہے تمہاری شادی نہیں ہوئی بلکہ نوکری لگ گئی ہے اس گھر میں۔" تلخ سا لہجہ امرحہ کا دل دھڑکا گیا۔ اس نے تیزی سے دروازہ بند کیا۔

"کیا ہو گیا ہے آپی آپ کو۔ آہستہ بولیں اگر کسی نے سن لیا تو۔"

"ہاں تو سن لے میری بلا سے۔ انہیں بھی تو پتا چلے

کہ تم لاوارث نہیں ہو کہ وہ یوں تم سے بیگار لیتے پھریں۔" علقہ تڑخی۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں آپی۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ لائبہ بھابی تو اتنی اچھی ہیں کہ زبردستی ہی کوئی کام چھیننا پڑتا ہے ان سے یہاں سب مل جل کر کام کرتے ہیں۔"

"مجھے نہ بتاؤ امرحہ، میں جانتی ہوں تمہاری سمجھوتے والی طبیعت کو اور سے میں کہتی ہوں یہی وقت ہوتا ہے میاں کو ہاتھ میں کرنے کا۔ ساس سسر ہیں باقی دونوں بھائی بھی ذمہ داریوں میں جکڑے ہیں۔ مگر تم دونوں کی تو ابھی نئی نئی شادی ہے۔ تم دونوں کیوں ان کی ذمہ داریوں کے بوجھ بانٹتے پھرو۔ ابھی سے عافین کے کانوں میں الگ گھر کی بات ڈال دو۔" انہوں نے اس کے قریب آتے ہوئے سرگوشی کی۔

"مگر کیوں آپا؟ ویسے بھی آپ جانتی ہیں میں کاموں سے نہیں بھاگتی۔ بابا کے گھر بھی تو میں سارے کام ہی کیا کرتی تھی۔" اس نے سختی سے انکار کیا۔

"بابا کی خدمت ہمارا فرض تھی مگر ان کے نوکر کیوں بنیں ہم۔" وہ بگڑیں۔

"پلیز آپی کوئی اور بات کریں۔ بچے کیوں نہیں لائیں۔ آپ ہمیشہ اکیلی آ جاتی ہیں۔ اظہر بھائی بھی کبھی نہیں آتے ہمارے گھر۔" امرحہ نے بات بدلی تو علقہ بڑبڑاتے ہوئے منہ بنا گئی۔

☆ ☆ ☆

"آنٹی واک پہ چلیں۔" امرحہ اپنے ماضی میں گم بیٹھی تھی کہ ثناء کی تیز آواز نے اسے چونکا دیا۔

"اس موسم میں؟" اس نے گلاس ونڈو کے اس پار نرم روئی جیسے برف پڑتی دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں، مزا آئے گا۔ بس تھوڑی دور جا کر واپس آ جائیں گے۔"

اسے خوامخواہ ہی عافین یاد آنے لگا۔ وہ بھی یونہی برف کا دیوانہ تھا۔

"چلیں نا آنٹی۔" ثناء نے اس کے شانے کو ہلایا۔

"ہاں۔۔۔ چلو۔" وہ چونک کے سیدھی ہوئی۔ ثنا اور خود کو اچھی طرح اوور کوٹ میں محفوظ کر کے وہ اس کا ہاتھ تھامے باہر نکل آئی۔

سامنے کہیں کہیں گھروں کے سامنے بنے شیڈز کے نیچے کھڑے کچھ لوگ برف باری سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ ثناء کے ساتھ دھیرے دھیرے قدم بڑھانے لگی۔

"آنٹی چلیں سوپ پیتے ہیں۔" ثناء کی نگاہ گلی کی نکڑ پہ بنے چھوٹے سے کیفے پہ پڑی تھی۔ وہ فوراً" بضد ہوئی۔ کھوئی کھوئی سی امرحہ نے اس کی بات مانتے ہوئے اس طرف قدم بڑھا دیے تھے۔

"آپ سوپ نہیں پئیں گی؟" امرحہ نے اپنے لیے کافی منگوائی تو ثناء افسردہ سی ہوئی۔

"میں تھک گئی ہوں نا اس لیے۔" اس نے اس کے خوب صورت گلابی گال پہ چٹکی کاٹی۔ تو وہ آرام سے سوپ پینے لگی۔ امرحہ نے بھی اپنا کافی کا مگ اٹھا لیا۔

تبھی اس کی نگاہ گلاس وال کے اس پار والے منظر پہ پڑی تھی۔ جہاں ایک کپل خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ ان کے قہقہے بھلے ہی وہ سن نہ پا رہی تھی۔ مگر واضح طور پر ان کی گونج اسے سنائی دے رہی تھی۔ ان کی خوشی اسے دل سے محسوس ہو رہی تھی۔

"امرحہ، برف اٹھاؤ نا یار۔" تبھی کوئی شناسا آواز گونجی اور امرحہ جیسے کھونے لگی۔ کتنے ہی منظر پلکوں تلے واضح ہوتے گئے۔

"امرحہ پلیز اٹھاؤ نا یار نہیں ہے اتنی سردی۔" عافین نے کوئی تیسری مرتبہ اسے برف اٹھانے کے لیے آواز دی تھی۔

"نہ بابا، مجھے تو سردی لگتی ہے۔" اس نے بھی ایک بار پھر صاف جواب دیا۔ عافین مایوس ہو کر اس کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں برف کے گولے تھے۔ سردی سے اس کا خوب صورت سفید چہرہ لال ہو رہا تھا۔ منہ سے دھواں نکل رہا تھا۔ مگر وہ یہ بات جانتا ہی نہیں تھا کہ اسے سردی لگتی ہے۔

"کتنی حسرت تھی مجھے کہ جب میری شادی ہوگی تو میں بیوی کے ساتھ برف میں کھیلا کروں گا۔ میں بال بنا کر اسے ماروں گا اور وہ بدلے میں مجھے۔ مگر تم نے ساری حسرت پہ پانی ہی پھیر دیا۔" اس نے بچوں کی طرح مایوسی سے وہ دونوں برف کے گولے دور اچھال دیے۔ اس کی اس قدر معصوم حرکت پہ امرحہ خوب دل کھول کے ہنسی۔

"جتنے بھی منہ بنالو مجھ سے یہ امید کبھی مت رکھنا اوکے۔" امرحہ نے اسے ہری جھنڈی دکھائی۔

"کتنی سخت دل ہو تم لوگ تو اپنے محبوب کے لیے جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔" عافین نے برا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" امرحہ نے اچھا کو لمبا کر کے کہا۔

"جی۔" عافین نے بھی اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

"مثلاً" کوئی ایک مثال بتادو تو مانوں۔" وہ شریر ہوئی۔

"مابدولت۔" عافین نے فرضی کالر جھاڑے۔ امرحہ قہقہہ لگا گئی۔

"آزمالو۔" عافین چڑ گیا۔

"چلو اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ آزمالیں گے کبھی۔" امرحہ نے اسے ننھے بچوں کی طرح پچکارا۔

"اچھا اب چلو ایک بار کو۔ ہاری کھیں ہو میرے ساتھ۔" وہ پھر دیوانہ ہوا۔ امرحہ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"اف عافین! تم کتنے دیوانے ہو برف کے۔"

"تمہارا بھی تو ہوں تو تھوڑا سا برف کا بھی سہی۔ اچھا اب چلو نا۔" عافین نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"نہ بابا میں تو اب گھر جارہی ہوں۔ سردی سے برا حال ہے میرا۔" اس نے تیزی سے ہاتھ چھڑایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوکے ایز یو وش چلو۔" اس نے ہاتھ جھاڑے اور امرحہ کے برابر آتے ہاتھ اس کی کمر کے گرد ڈال دیا۔ وہ مسکرا دی۔

"آنٹی آپ رو رہی ہیں۔" ثناء کی آواز پہ وہ چونکی۔ اس نے اپنے چہرے پر نمی محسوس کی۔ واقعی اسے پتا تک نہ چلا نہ جانے کب وہ رونا شروع ہوگئی۔

"آئم سوری آنٹی۔ میری وجہ سے آپ پریشان ہوئیں نا۔" ثناء شرمندہ سی اس کے پاس کھڑی تھی۔

"ارے نہیں میری جان چلو گھر چلتے ہیں۔" وہ اسے ساتھ لیے گھر کے لیے نکل پڑی۔

"کتنے دعوے کرتے تھے نا تم عافین اور میری ایک چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہ کرسکے۔" نرم برف کو پاؤں تلے روندتے ہوئے اس نے تلخی سے سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

"عافین ایسا کب تک چلے گا؟؟"

وہ ابھی ابھی آفس سے گھر لوٹا تھا اور اس کی توقع کے عین مطابق لائبہ بھابی لمحوں میں اس کے سر پر پہنچی تھیں۔

"کیسا لائبہ بھابھی؟" وہ جان بوجھ کر انجان بن گیا۔

"انجان مت بنو عافین۔ امی ابو تمہاری وجہ سے سخت پریشان ہیں پھر امرحہ۔۔۔" لائبہ بھابی نے اسے کافی کا مگ تھماتے ہوئے کہا۔

"امی ابو ایسے ہی پریشان ہیں ورنہ اتنی پریشانی کی تو کوئی بات نہیں۔" وہ آرام سے بیڈ پہ ٹک گیا۔

"کیوں خوامخواہ خود کو اور امرحہ کو اذیت دے رہے ہو۔" لائبہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں بھلا خود کو اذیت کیوں دوں گا بھابھی۔ آپ جانتی ہیں یہ سراسر امرحہ کا فیصلہ ہے۔ جب وہ ہی ہمارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔" وہ آرام سے کہہ کر کافی پینے لگا۔

"تم تو اس سے بہت پیار کرتے ہو نا عافین۔" لائبہ بھی کہاں ہار ماننے والی تھیں۔

"ہاں کرتا ہوں تو۔" وہاں ہنوز وہی لاپروائی تھی۔

"تو اس کی اتنی چھوٹی سی مانگ پوری نہیں کرسکتے تم۔" لائبہ اس کے پاس رکھی پلاسٹک چیئر پہ بیٹھتے ہوئے بولیں۔ وہ خاموش رہا۔

"پھر ہمیں، امی ابو کو بھی بس اس کی خوشی عزیز ہے۔ تم جانتے ہو وہ ہم سب کی کتنی چہیتی ہے۔" لائبہ کے لہجے میں منت در آئی۔

"آپ سب کے اسی بے جا لاڈ پیار نے ہی تو اس کا دماغ خراب کردیا ہے۔" اس نے مگ خالی کر کے سائیڈ ٹیبل پہ دھر دیا۔

"پیار محبت دماغ خراب نہیں کرتے عافین۔ تم اچھی طرح جانتے ہو اس سب کے پیچھے کیا وجہ ہے امرحہ معصوم ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اسے بھی سمجھ آجائے گی۔ وہ بہت سمجھ دار لڑکی ہے عافین۔" لائبہ نے اسے منانے کی ایک اور کوشش کی۔

"میں بھی یہی سمجھتا تھا بھابی مگر اب میں کوئی رعایت نہیں برت سکتا۔ اگر اسے کوئی پرابلم تھی تو مجھ سے شیئر کرتی۔ وہ تو میرا فون تک نہیں سنتی۔ اب یہ تو مجھ سے ہو نہیں سکتا کہ میں اس کے سامنے جھکنے اس کی بہن کے دروازے پہ جا بیٹھوں۔" اس کی آواز میں مردانہ انا جھلک رہی تھی۔

"تم دونوں ہی بے جا ضد پہ اڑ رہے ہو عافین۔ اس کا قصور یوں بھی کچھ کم ہے کہ اسے راہ راست سے ہٹانے والی خود اس کی بہن ہے اور تمہارا کچھ یوں زیادہ قصور بنتا ہے کہ تمہارے سارے اپنے تمہیں سمجھا رہے ہیں۔" وہ ذرا اور رکیں۔

"سوچ لو عافین تم تو پھر بھی مرد ہو۔ زیادہ نقصان امرحہ کا ہوگا اور اب ان حالات میں جب اس کے بابا بھی۔۔۔ خیر جیسے تم مناسب سمجھو۔" وہ کہہ کر رکیں نہیں۔ اور عافین بے بسی سے لب کاٹنے لگا۔

"کیسی ہے میری کیوٹ سی وائف؟ آج کیا کرتی رہیں سارا دن؟" وہ بیڈ پہ بیٹھی کتاب میں گم تھی کہ عافین کی شریر آواز پہ چونک کے اسے دیکھنے لگی۔

بلیو جینز پہ بلیک ٹی شرٹ پہنے وہ ہمیشہ کی طرح بہت ڈیشنگ لگ رہا تھا۔ براؤن بال ماتھے پہ گرے تھے اور اس نے بھی انہیں ہٹانے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ اس کی خوب صورت نیلی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ وہ یونہی گم سم سی اسے دیکھے گئی۔

"اے میڈم پلکیں جھپک بھی لو یار۔ آئی نو میں بہت پیارا ہوں مگر اتنا بھی نہیں کہ تم بت بن جاؤ۔" وہ شریر ہوا تو امرحہ جھینپ گئی۔

"جی نہیں میں تو صرف یہ دیکھ رہی تھی کہ تم پورے کے پورے انگریز لگتے ہو۔" اس نے زبان چڑائی تو عافین کھل کے ہنس دیا۔

"توبہ کرو کیوں اس نیک نمازی روزہ دار مسلمان کو انگریز بنانے پہ تلی ہو۔" اس نے شرارت سے امرحہ کی چھوٹی سی ناک کو چھوا۔

"اچھا تنگ تو نہ کرو۔" وہ مزید چڑ گئی۔

"کیا ہوا ہے امرحہ تم کچھ پریشان ہو۔" عافین اسے بے زار دیکھ کر فوراً پریشان ہوا۔

"ہاں۔" وہ چونکی۔

"نہیں تو ایسی تو کوئی بات نہیں۔" امرحہ بیڈ سے نیچے اترنے لگی۔

"اب یہ کہاں رہی ہو۔"

"آپ جناب کے لیے کچھ لینے جارہی ہوں۔ صبح سے باہر تھے۔ بھوک لگی ہوگی تمہیں۔" امرحہ نے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

"بھابی ابھی کچھ نہ کچھ لے آئیں گی یار۔ تم بس میرے پاس بیٹھو مجھے کسی چیز کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی تمہارے ساتھ کی۔" اس نے دھیرے سے امرحہ کا ہاتھ تھاما۔

"سچ میں عافین۔" امرحہ نے جیسے ثبوت مانگا۔

"سچ میں امرحہ۔ میں تم سے بے حد پیار کرتا ہوں اور تم سے دور رہ کر بھی کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا جب تمہیں اپنے بے حد قریب نہ محسوس کیا ہو۔" عافین جذب کے عالم میں بولے جارہا تھا اور امرحہ اس کا دل بے قابو ہونے لگا تھا۔

"امرحہ۔۔۔" امرحہ کو لگا جیسے لائبہ بھابی نے آواز دی تھی۔

"امرحہ۔۔۔" اس دفعہ آواز دینے والے نے اس کا کندھا جھنجھوڑ دیا تھا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ علقہ آپی اس کے قریب ہی بیڈ پہ بیٹھی تھیں۔

"پی آپ۔۔۔ میں کبھی ربیبہ بھابی۔" وہ گڑبڑائی۔

"امرحہ۔۔۔ مضبوط بنو میری جان۔ جتنا اسے یاد کرو گی اس قدر کمزور پڑو گی۔ تمہیں خود پہ بھروسہ ہونا چاہیے۔" علقہ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ دھرا۔

"مگر آپی اگر عافین نے بھی ضد نہ چھوڑی تو۔" وہ پریشان تھی۔

"عافین نے ضد کی ہے؟ وہ تو مسلسل تمہیں فون کرتا رہا مگر میری بات مان کر تم نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے تو یقین مانو کچھ دن تم سے دور رہ کر وہ خود تمہارے لیے مچلے گا اور میرے خیال میں تو اب تک وہ کوئی فیصلہ کر بھی چکا ہو گا۔" علقہ نے اسے تسلی دی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو آپی۔" اس نے دل سے دعا کی۔

"اچھا۔۔۔ تمہارے بھائی کو ذرا دیر ہو جائے گی شام کو میں نے ثناء اور ظفر کے ساتھ ان کے دوست کے ہاں کرسمس پارٹی میں جانا ہے۔" علقہ نے لہجے میں منت بھرتے ہوئے کہا۔

"تم اکیلے گھر سنبھال لوگی آج پلیز۔ میں نے تو اس پارٹی کی تیاری کی مصروفیت میں اور کسی کام کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔" علقہ کی بات پہ اس نے بے بسی سے سر ہلا دیا۔ وہ اسے مزید کچھ ہدایات دے کر باہر چلی گئیں آج اس کا کچھ بھی کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر مجبوراً سارے کام نبٹانا پڑے۔ آج سارا دن اسے لائبہ بھی یاد آتی رہیں۔ جو اس قسم کی پارٹی میں بچوں کے ساتھ اس کو بھیج دیتیں مگر گھر کے سارے کام خود سنبھال لیتیں۔

"کہیں میں کوئی بہت بڑی غلطی تو نہیں کر رہی۔" وہ بچوں اور اپنے مشترکہ کمرے کی ڈسٹنگ میں مصروف تھی، تبھی اس کی نگاہ سانتا کے دیے گئے خوب صورت گلاس بال پہ پڑی۔ اس نے بیڈ پہ بیٹھ کر وہ بال اٹھائی اور یونہی اسے دیکھے گئی۔

"ڈیئر فیری میری وش بھی پوری کر دو پلیز۔ نیا سال میں کچھ ایسا ہو جائے کہ میرے اور عافین کے درمیان کی دوریاں خود بخود سمٹ جائیں۔" وہ بے بسی سے کہتی گئی۔ گلاس بال کے اندر ننھی سی پری بس اوپر نیچے گھومتی رہی۔

"اف میں بھی نہ کیا اول فول سوچنے لگی۔ بھلا یہ بے جان چیز بھی مجھے دے سکتی ہے کچھ۔ استغفراللہ۔" اسے خود ہی اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔

"یا اللہ، عافین میری بات مان جائے۔ پلیز مجھے عافین سے جدا مت کیجیے گا۔" اس نے فوراً دونوں ہاتھ باندھ کر دل سے دعا کی تھی۔ پھر وہیں بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا کے سوچنے لگی اپنی ماضی کو۔

☼ ☼ ☼

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو امرحہ۔" عافین جو مزے سے تکیے پہ سر ٹکائے لیٹا تھا۔ اس کی بات سن کر ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں عافین۔ مجھ سے نہیں ہوتا اب برداشت۔ پھر تم جانتے ہو میں اکیلے گھر کی عادی ہوں۔ زیادہ لوگوں میں میرا دل گھبراتا ہے۔" امرحہ کو یوں محسوس ہوا جیسے علقہ کی زبان اس کے منہ میں آگئی ہو مگر وہ بولتی رہی۔

"اگر ایسا کچھ مسئلہ ہوتا تو شادی کے پہلے دنوں میں ہوتا۔ اب ایک سال بعد یوں اچانک۔" عافین حیران تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے میں غلط بیانی کر رہی ہوں۔ جب تک میری سکت تھی میں نے برداشت کیا۔ مگر اب میں ڈپریشن کا شکار ہو رہی ہوں اور پھر سچ بتاؤں تو میرا بھی دل کرتا ہے کہ میرا الگ گھر ہو۔ جہاں صرف میں اور آپ ہوں۔ تھوڑا سا کام اور پھر سارا دن آپ کے ساتھ۔ ہمیں ڈسٹرب کرنے والا اور کوئی نہ ہو۔" وہ بولنے پہ آئی تو بولتی چلی گئی۔ عافین چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔

"پھر میں کوئی غلط ڈیمانڈ تو نہیں کر رہی یہ ہر عورت کا حق ہے۔"

"لائبہ بھابی اور انعم بھابی بھی تو عورتیں ہیں۔ انہوں نے تو کبھی اس حق کے بارے میں نہیں سوچا۔" عافین کے لہجے میں اس بار تلخی سی تھی مگر امرحہ نے مکمل طور پہ اگنور کر دی۔

"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے میں نے تو سوچ لیا ہے۔ مجھے اب الگ گھر میں رہنا ہے۔"

"تم کیا سمجھتی ہو امرحہ۔ امریکہ جیسے ملک میں ہم الگ رہنا افورڈ کر سکتے ہیں۔" عافین نے اسے سمجھانا چاہا۔

"یہاں پہ تو آسانی سے رہ سکتے ہیں۔ جوائنٹ فیملی سسٹم تو پاکستان میں عام ہے یہاں تو لوگ عموماً پرائیویسی پسند کرتے ہیں۔" امرحہ کا لہجہ اٹل تھا۔

"پھر چاہے ایک کمرے کا کوئی چھوٹا سا فلیٹ ہی کیوں نہ ہو۔ میں گزارا کر لوں گی۔"

"لیکن تمہیں یہاں مسئلہ کیا ہے۔ سب تم سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ تمہارا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ امرحہ پلیز صرف اپنے لیے نہیں سب کے لیے سوچو۔ ہم نے ہمیشہ محبت سے سب کچھ بانٹا ہے۔ پھر میں جو سب سے چھوٹا ہوں اور سب سے زیادہ پیار وصول کر چکا ہوں کیسے نفرتوں کا بیج بو دوں بتاؤ۔" اس نے نرمی سے امرحہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اسے سمجھایا۔

"پلیز عافین تم مجھے نہ ہی سمجھاؤ تو بہتر ہے۔ میرا یہ فیصلہ بدلنے والا نہیں ہے۔" اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ عافین نے ایک غصیلی نگاہ اس پہ ڈالی اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

اس کی توقع کے عین مطابق عافین نے سب گھر والوں تک اس کی بات پہنچا دی تھی اور وہ جو توقع کر رہی تھی کہ گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ تب دنگ رہ گئی جب سب گھر والوں نے آرام سے عافین کی بات مان لی۔

"کیا مطلب ہے بابا۔" عافین تو بھڑک ہی اٹھا۔

"مطلب صاف ہے عافین۔ امرحہ کی خواہش پوری کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ تمہاری بیوی ہے وہ۔" بابا نے اسے آرام سے سمجھایا۔

"تو میں نے کب انکار کیا ہے بابا اور اس کی کون سی خواہش پوری نہیں کی میں نے مگر یہ خواہش، ہرگز نہیں۔" وہ اٹل لہجے میں بولا۔

"لیکن اسی میں اس گھر کی بھلائی ہے عافین۔" اب کی بار لائبہ بھابی نے اسے سمجھانا چاہا۔

"اگر امرحہ نے ایک بار یہ فیصلہ لے لیا ہے تو وہ کبھی بھی دل سے اس گھر میں خوش نہیں رہ سکے گی۔ خوامخواہ کی رنجشیں پال لے گی وہ دل میں۔ اس سے مزید بدگمانی بڑھے گی اور دوریاں پیدا ہوں گی۔ میرے خیال میں بھی تمہیں اس کی بات مان لینی چاہیے۔"

"ہرگز نہیں بھابی اگر اسے آپ سب کے ساتھ رہنا ہے تو رہے۔ نہیں رہنا تو شوق سے الگ گھر میں رہے۔ میں اس کا سارا خرچہ اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔ مگر میں یہ گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔"

وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں امرحہ اس کی منتظر تھی عافین کے تنے ہوئے اعصاب اسے سمجھانے کے لیے کافی تھے سو وہ چپ رہی۔ عافین چپ چاپ اپنے بستر پر ڈھے گیا۔

☼ ☼ ☼

"آپی سب گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں مگر عافین۔ مجھے نہیں لگتا کہ عافین راضی ہوں گے۔" وہ آج عافین کے آفس جاتے ہی علقہ کے پاس چلی آئی تھی۔ اس کے ساتھ چند کاموں میں ہاتھ بٹانے کے بعد وہ اب فارغ ہوئی تو فوراً اسے بتانے لگی۔

"مان جائے گا، مان جائے گا۔ تم فکر کیوں کرتی ہو۔ بس ذرا نخرے دکھاؤ۔ خود سے اس سے بات کرنے کی یا اس کی بے جا خدمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ذرا دوری رکھو گی تو دیکھتی ہوں کیسے نہیں پگھلتا۔" علقہ نے اظہر کے کپڑے سمیٹتے ہوئے کہا۔

"ایک تو اتنا پھوہڑ ہے اظہر قسم سے جو کبھی سلیقے سے رکھتا ہو کوئی چیز، سب کچھ ادھر ادھر پھینک دیتا ہے۔ نوکرانی سمجھ رکھا ہے۔" علقہ نے کپڑوں پہ بھی

غصہ تھا۔

"لیکن آپی کبھی کبھی مجھے ڈر لگتا ہے۔ کہیں میں کچھ غلط تو نہیں کر رہی۔" اس کے لہجے میں خوف تھا۔

"یہ لو۔ ارے بے وقوف الگ گھر میں رہنے میں غلطی کیسی۔ مجھے ہی دیکھ لو۔ اگر یہ سارے کیڑے وہاں میرے سسرال میں بکھرے پڑے ہوتے نا تو کتنی باتیں سننا پڑتیں مجھے۔" علفہ نے اسے اپنی مثال دی۔

"خیر مجھے تو کوئی کچھ نہیں کہتا مگر پتا نہیں کیوں بس میرا بھی دل کرتا ہے میرا الگ گھر ہو الگ تھلگ زندگی ہو۔" امرحہ بولی تو علفہ مسکرا دی۔ "یہی تو ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے میری جان۔ یہ فطری عمل ہے اس کو کسی گناہ کی طرح دل پہ بوجھ نہ بناؤ۔ یہ تمہارا حق ہے سمجھیں۔ بس تم عافین سے دو ٹوک بات کرو اور اگر پھر بھی نہ مانے تو کچھ دن یہاں رہنے آجانا۔ تنہائی کاٹنے گا چند دن تو دوڑتا ہوا تمہارے پاس چلا آئے گا۔" علفہ نے اس کے ریشمی بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔

"سچ آپا۔" امرحہ خوش ہوئی۔

"اور نہیں تو کیا۔ بس تم میری ہدایات پہ عمل کرتی جاؤ اور پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔" علفہ نے انگلیاں نچائیں۔ امرحہ پرسوچ نگاہوں سے بس انہیں دیکھے گئی۔

☆ ☆ ☆

"پلیز امرحہ خدا کے لیے یہ ضد چھوڑ دو کیوں اپنا اور میرا سکھ چین برباد کرنے پہ تل گئی ہو۔" وہ کافی کا مگ لے کر ٹیرس پہ آئی تو عافین بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔ عافین کی بات سن کر امرحہ کے چہرے پر عجیب سی ناگواری اتر آئی۔

"عافین مجھے بلیم نہ کرو۔ میں بھلا کیوں اپنا سکھ چین اپنے ہاتھوں سے برباد کروں گی۔" وہ تلخی سے بولی۔

"تو پھر یہ سب کیا ہے امرحہ؟ یوں ایک بے کار کی ضد کی وجہ سے سب سے کٹ کر رہنا۔ یہ بیزاری کتراتا۔" عافین اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"تم کتنی قسمیں کھایا کرتے تھے عافین کہ میں جو مانگوں تم مجھے لادو گے۔ جان کی بازی لگا دو گے میرے لیے۔" امرحہ اس بار نرمی سے بولی۔

"ہاں تو تم بھی تو کچھ ڈھنگ کا مانگو تب نا پھر مجھے اس خواہش کی تم سے کم از کم قطعی امید نہ تھی۔"

"یہ خواہش میری ہے تمہارے لیے یہی کافی ہونا چاہیے عافین۔" وہ تڑپی۔

"ہرگز نہیں۔ نو نیور۔" وہ اٹل لہجے میں بولا۔

"تم میرے پیار میں اتنا بھی نہیں کر سکتے۔" وہ اس کے قریب ہوئی۔

"اور تم سے پہلے جو اتنی محبتیں وصول چکا ہوں۔ ان کا قرض کیا ہوا امرحہ۔ کیا ان سب کو بھلا دوں میں۔" وہ بے بس تھا۔

"نہیں امرحہ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔"

"میں کچھ دن علفہ آپی کے ہاں رہنا چاہوں گی۔ کل آفس جاتے وقت مجھے چھوڑ دینا۔" اس نے آخری حربہ آزمایا۔

"ایز یو وش جیسے تمہاری مرضی۔" وہ نرمی سے کہتا مڑ گیا۔ امرحہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ پائی تھی۔

اور آج اسے علفہ کے ہاں آئے پچیس دن ہو رہے تھے۔ پہلے پہل عافین اسے کال کرتا رہا مگر وہ علفہ کے کہنے پہ مسلسل اس کی کال اگنور کرتی رہی۔ بالآخر عافین نے بھی کال کرنا چھوڑ دیا۔ اور ان دنوں میں تو وہ علفہ کی باتوں سے دل کو تسلی دیتی رہی۔ مگر اب نہ جانے کیوں دل پہ بس ہی نہ چلتا۔ وہ ہر وقت عافین اور سب بھابی کو یاد کرتا رہتا۔

آج دل پہ اتنا بوجھ تھا کہ اس کا ہلنے کو بھی دل نہ چاہ رہا تھا۔ مگر بحالت مجبوری اس نے سارے کام جیسے تیسے کر کے نبٹا ہی لیے تھے۔ ویسے بھی وہ علفہ کی عادت سے خوب واقف تھی۔ ذرا سی بات پہ بھڑک اٹھتی تھی۔

تھکن سے چور وہ صوفے پہ بے حال ہی گر پڑی کہ ڈور بیل کی تیز آواز نے اسے مزید جھنجھلا دیا۔ وہ بوجھل قدموں سے دروازے پہ آئی۔ علفہ کی دیورانی کا مسکراتا چہرہ اس کی بیزاری ختم کر گیا۔

"ارے امرحہ تم بھی ہو یہاں۔ چلو اچھا ہوا تم سے ملاقات ہو گئی۔" اسے امرحہ ویسے بھی بہت پسند تھی۔ خوشی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"آپ کیسے راستہ بھول گئیں بھابی۔" امرحہ کی ان سے کافی گپ شپ تھی۔ تبھی کافی دوستانہ طریقے سے بات ہوئی۔

"نئے سال کی خوشی میں گھر پہ میلاد منعقد کروا رہے ہیں۔ اسی کی دعوت دینے آئی ہوں۔ رات کا کھانا بھی ہمارے طرف ہی کھاؤ گے تم سب اور تم بھی ضرور آنا ویسے بھی تمہاری آواز بہت اچھی ہے۔" انہوں نے خلوص سے اسے بھی دعوت دے ڈالی۔

"جی ضرور۔ کوشش کروں گی۔" وہ مسکرائی۔

"کوشش نہیں تمہیں آنا ہے اوکے۔" انہوں نے اصرار کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی تو دل بھی کچھ پرسکون ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"کیا مصیبت ہے علفہ میں تنگ آگیا ہوں تمہاری روز کی جھک جھک سے نہ تو تم ڈھنگ سے کوئی کام کرتی ہو اور سارا دن جاہل گنوار عورتوں کی طرح چلاتی بھی رہتی ہو۔" آج اظہر کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ علفہ نے نہ صرف ان کی شرٹ جلا دی تھی بلکہ انہیں ہی کوسنے لگیں۔

"کیا کہا میں اجڈ گنوار عورتوں کی طرح چلاتی ہوں۔"

"ہاں تو اور کیا۔ ایک کام تم سے صحیح طریقے سے نہیں ہوتا۔"

"تو جائیں۔ اپنی ماں اور بھابیوں سے کروا لائیں۔"

"کرتے تھے وہ بغیر کسی احسان کے۔ مگر ہاں تبھی تم نے خوامخواہ کے ایشو کھڑے کیے۔ اب تو تمہارا اپنا گھر ہے۔ اب تمہیں کیا پرابلم ہے۔ اب کیوں ان کو یاد کر رہی ہو۔"

"یاد کرتی ہے میری جوتی۔" وہ غصے سے چلائیں۔

"میں بھی تمہیں آج آخری بار وارن کر رہا ہوں علفہ اس کے بعد میں تمہاری کوئی کمزوری برداشت نہیں کروں گا۔ امرحہ جیسی معصوم لڑکی کو بھی تم نے اپنی باتوں کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ رحم کرو خود پر بھی ہم پر بھی اور امرحہ پر بھی۔ اسے ایسی راہ کا مسافر نہ بناؤ کہ ساری عمر اس کے قدموں سے خون رستا رہے اور پچھتاوے اس کا مقدر بن جائیں۔" اظہر کی پرطیش آواز نے امرحہ کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی سہما کے رکھ دیا تھا۔ امرحہ نے انہیں اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"تو تم کیا سمجھتے ہو۔ میں اپنی بہن کا برا چاہوں گی۔"

"جان بوجھ کر نہ سہی علفہ مگر انجانے میں تم واقعی اس کے ساتھ بہت برا کر رہی ہو بلکہ کر چکی ہو۔ سدھر جاؤ اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے۔" وہ تھکنے لگے تھے۔

"آپ اس معاملے میں نہ ہی بولیں تو اچھا ہے۔ ویسے بھی امرحہ کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہے۔ اسے پتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہی ہوں اس کے بھلے کے لیے ہی کر رہی ہوں ورنہ وہ میری بات ہرگز نہ مانتی۔" علفہ نے پہلی بات نرم لہجے میں کی تھی۔ اظہر بس ایک پرشکوہ نگاہ ڈال کر رہ گئے۔ امرحہ البتہ ان کی باتوں کو سوچے گئی۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو۔" امرحہ نے فون اٹھایا تو دوسری جانب آواز سے وہ فوراً پہچان گئی۔

"لائبہ بھابی کیسی ہیں؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"میں ٹھیک ہوں امرحہ تم کیسی ہو؟" لائبہ بھابی کی آواز کچھ دھیمی تھی۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔" وہ مختصراً بولی۔

"امرحہ۔ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی تھی۔" کچھ لمحے توقف کرنے کے بعد لائبہ بھابی بولیں۔

"جی میں سن رہی ہوں۔" وہ بمشکل بولی۔

"امرحہ' امی' بابا اور میں' ہم سب نے کوشش کر کے دیکھ لیا ہے مگر عافین نہیں مان رہا۔ میرے خیال میں اب تمہیں ہی اپنے رویے میں لچک دکھانی پڑے گی۔" لائبہ کے لہجے میں کیا تھا وہ سمجھ نہ پائی۔

"مطلب کیا ہے آپ کا بھابی؟" وہ تلخی سے بولی۔

"مطلب صاف ہے امرحہ۔ مرد جب ضد پہ آئے تو اندھا ہو جاتا ہے۔ بیٹا تم عورت ہو عورت کو اپنا دل بڑا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے لیے تم جو تھیں' وہی رہو گی۔ مگر مرد کے دل میں عورت کا مقام تب تک رہتا ہے جب وہ اس کی انا کو مجروح نہیں ہونے دیتی ——— اپنی ضد مار کے اس کی مرضی پوری کرتی ہے۔ اگر عورت مرد کے سامنے ضد کرے یا اپنی انا کی تسکین کی خاطر اس کی بات سے انکار کر دے تو مرد کے دل میں اس کا مقام نیچے آجاتا ہے امرحہ' عافین تم سے بے حد محبت کرتا ہے۔ اس محبت کو اپنی انا اور بے جا ضد کے ہاتھوں قتل مت کرو۔ یقین مانو محبت کے پاس چلے آنا عزت نفس کا مجروح ہونا نہیں بلکہ تعلقات کو بچانے میں تمہاری جیت کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔ واپس آجاؤ امرحہ۔" انہوں نے بے حد لگاؤ سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں بھابی ایسا ہے تو ایسے ہی سہی۔ عافین کو اگر مجھ سے واقعی محبت ہوتی تو میرے نہ ہونے سے انہیں کچھ تو فرق پڑتا۔" وہ ترش لہجے میں بولی۔

"تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہیں بھی عافین سے کوئی محبت نہیں۔" سدا کی حاضر جواب لائبہ نے اس کی بات پکڑی تھی۔ وہ جیسے خاموش سی ہو گئی۔

"ایک بار پھر سوچ لو امرحہ۔"

"سوری لائبہ بھابی' میں نے بہت سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا ہے اچھا مجھے کچھ کام ہے میں فون رکھتی ہوں۔" اس نے بے رخی کی حد کر دی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بھابی امرحہ سے بات ہوئی تھی آپ کی؟" وہ آفس سے ابھی لوٹا تھا۔ سخت تھکن اور ذہنی انتشار کی وجہ سے اسے چائے کی سخت طلب ہو رہی تھی۔ وہ کچن میں لائبہ بھابی کو چائے کا کہنے آیا تو دروازے سے باہر ہی انعم بھابی کی آواز نے اسے رکنے پہ مجبور کر دیا۔

"ہاں انعم میں نے فون کیا آج صبح۔" لائبہ کی آواز مدھم تھی مگر وہ بخوبی سن سکتا تھا۔

"تو کیا کہا پھر اس نے؟" انعم نے سوال کیا۔

"میں نے اسے بے حد سمجھانے کی کوشش کی۔ اسے بتایا کہ عافین نے بھی ضد پکڑ لی ہے۔ وہ یوں اپنا گھر داؤ پہ نہ لگائے مگر میں کیا کروں انعم وہ بھی ضد پہ اڑ گئی ہے۔ اس نے میری ایک بھی نہ مانی۔" ان کے لہجے میں تاسف تھا۔

"ویسے لائبہ بھابی پورا ایک سال وہ ہمارے درمیان رہی۔ اتنی پیاری اور سب کے ساتھ گھل مل جانے والی امرحہ ایسا بھی کر سکتی ہے میرا تو دل ہی نہیں مان رہا۔ عافین کے دل کو کچھ ہوا۔"

"دل تو میرا بھی نہیں مانتا۔ مگر تم نے سنا ہو گا کہ صحبت کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے اور ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ اس پہ اثر ڈالنے والی کوئی اور نہیں بلکہ اس کی اپنی بہن ہے۔ امرحہ ایسی بالکل بھی نہیں ہے یہ سب علقمہ کا کیا دھرا ہے۔ میں تو بس خدا سے دعا کرتی ہوں کہ کسی طرح علقمہ کی باتوں کے سحر سے امرحہ کو نجات دے۔ اسے اور عافین کو دوبارہ سے ایک کر دے میرا مالک۔" لائبہ نے سچے دل سے دعا کی۔

"پھر بھی لائبہ بھابی امرحہ خود بھی تو اتنی سمجھدار ہے اسے کچھ تو سوچنا چاہیے۔ پھر اپنی زندگی کے اتنے بڑے موڑ پہ تو ضرور اسے اپنا دماغ بھی استعمال کرنا چاہیے۔ مجھے تو بہت خوف آرہا ہے اور سچ بتاؤں عافین اور امرحہ پہ ترس بھی کتنے خوش تھے دونوں۔" انعم نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں مجھے تو لگتا ہے ان دونوں کی جوڑی کو کسی کی نظر لگ گئی پھر بھی عافین کو آج سمجھانے کی پھر کوشش کروں گی دعا کرو مان جائے۔" لائبہ کے لہجے میں امید تھی۔

"اور یہ بھی دعا کریں بھابی کہ امرحہ کی بہن کو اللہ ہدایت دے جو انجانے میں یا اللہ معاف کرے جان بوجھ کر بہن کا گھر تباہ کرنے پہ تلی ہے۔" انعم نے کہا تو لائبہ نے سر ہلا دیا۔ عافین خاموشی سے وہاں سے واپس چلا گیا۔

"مجھے تو عافین کی بکھری حالت دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ہمارے پورے خاندان میں اتنی اچھی طبیعت کا لڑکا نہیں ہے۔ اتنا خوش اخلاق' باکردار اور ہنس مکھ مگر اب تو جیسے ہنسنا ہی بھول گیا ہے۔ ہر وقت بس کام میں مشغول رکھنے لگا ہے خود کو۔" لائبہ بھابی اداس ہو گئیں۔

"ارے ہاں وہ تو آفس سے آگیا ہو گا۔ چلو جلدی سے دو کپ چائے بنا دو۔ میرے بھی سر میں درد ہے۔ اسی بہانے میں بھی پی لوں گی۔" لائبہ کو اچانک ہی خیال آیا۔ انعم نے سر ہلاتے ہوئے فوراً تائید کی تھی۔

☆ ☆ ☆

سارا شہر کرسمس کی خوشیوں میں مگن تھا۔ بڑوں سے زیادہ بچوں کے چہروں سے عجیب سی خوشی اور سرشاری چھلک رہی تھی۔ تھری پیس سوٹ پہنے ننھے منے لڑکے وجاہت میں مردوں کو بھی مات دے رہے تھے۔ پریوں . . . جیسی فراکیں پہنی ننھی منی بچیاں کائنات میں دلفریبی اور پاکیزگی کے رنگ بکھیر رہی تھیں۔ اسی لیے تو دسمبر اس کا پسندیدہ ترین مہینہ تھا کہ پورا مہینہ کرسمس پارٹیوں میں بچوں کی شرکت بہت زیادہ ہوتی اور اسے بچوں سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ وہ مسلمان ہونے کے باوجود بچوں کے ساتھ ان کی خوشی میں برابر شریک ہوتی۔

لیکن اس بار کرسمس کی روشنیاں' رنگ' دسمبر کے جلوے' قدرت کی رعنائیاں' کچھ بھی اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ دل پہ ایک عجیب سا بوجھ آن دھرا تھا۔ آج سارا دن باقی گھر والے باہر پارٹیوں میں مصروف رہے مگر وہ گھر پہ اکیلی بابا کو یاد کرتی رہی۔ دل ہی دل میں ان سے عافین کی شکایتیں کرتی رہی۔ شام کے قریب سب لوگ تھکے ہارے گھر واپس آئے تو وہ ان سب کو چائے دینے کے بعد اپنے کمرے میں آگئی۔ نماز پڑھنے کے بعد اس نے یونہی سائیڈ ٹیبل پہ پڑی جان کیٹس کی کتاب اٹھائی۔ تبھی دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ سمجھ گئی کہ اظہر بھائی ہوں گے تبھی فوراً سنبھل کے بیٹھ گئی۔

"آجائیں۔" اس نے دوپٹہ اچھی طرح سر پہ جمانے کے بعد آواز دی۔

"کیسی ہو گڑیا۔" وہ اسے ہمیشہ گڑیا ہی کہا کرتے۔

"اچھی ہوں۔" امرحہ نے اداسی سے جواب دیا۔

"تمہیں کتنا کہا ساتھ چلنے کے لیے۔ یہاں اکیلی بور ہوتی رہیں۔ بلا لگ تھا وہاں چلتیں ہمارے ساتھ۔" انہوں نے ثناء کے بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھائی آج میرا ذرا بھی موڈ نہیں تھا کہیں باہر جانے کا مجھے گھر پہ ہی رہنا زیادہ مناسب لگا۔" اس نے جواب دیا۔

"ایک بات پوچھوں بیٹا؟" اظہر کے اچانک ہی کیے گئے سوال پہ اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"جی پوچھیے۔"

"ایسا نہیں کہ میں تمہیں نہیں جانتا۔ میں تمہاری فطرت سے اچھی طرف واقف ہوں۔ اس لیے میں یہ مان ہی نہیں سکتا کہ اس قدر فضول اور بے جا ضد کے لیے تم خود کو اور عافین کو اتنا دکھ پہنچا سکتی ہو۔ کیا اس سب کے پیچھے علقمہ ہے؟" ان کی آواز میں شرمندگی واضح تھی۔

"نہیں بھائی علقمہ آپی نے صرف میری توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ لیکن اب عافین کے رویے کی وجہ سے یہ ضد میرے اندر قدم جما گئی ہے۔ مرد اتنا کمزور بھی نہیں ہوتا کہ عورت کی ایک چھوٹی سی ضد نہ مان سکے۔" اس کے لہجے میں دکھ تھا۔

"ہو سکتا ہے اسی مان پہ وہ بھی تم سے زیادہ ضد پہ اڑ گیا ہو کہ عورت اتنی چھوٹی سی خواہش کے لیے اتنے اچھے' چاہنے والے اور نیک شوہر کو چھوڑ کے

نہیں جا سکتی۔" ان کی بات میں وزن تھا۔ امرحہ خاموش سی رہ گئی۔

"اپنے بارے میں سوچتے وقت کچھ وقت کے لیے عافین بن کر بھی سوچ لیا کرو بیٹی۔ اس طرح فیصلہ کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔" انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔ تو امرحہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"نہیں اظہر بھائی بات صرف ضد کی نہیں۔ مجھے کتنا مان تھا ان کی محبت پر دن رات بڑے بڑے دعوے کرتے نہ تھکتے تھے اور جب میں نے ایک چھوٹی سی خواہش ظاہر کی تو اس پہ نہ صرف ناممکن کا ٹھپہ لگا دیا بلکہ ضد ہی پکڑ لی۔ ان کے لیے تو میری محبت سے زیادہ ان کے خاندان کی محبت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔" وہ بولے گئی۔

"ان کی محبت سالوں پرانی ہے بیٹا۔ میں عافین کے گھرانے کو پرسنلی جانتا ہوں۔ ایک ایک فرد نے اپنی محبت اور قربانیوں سے سینچا ہے اس خاندان کو میں سمجھ سکتا ہوں تمہارے اس طرز عمل سے ان کو کتنا دکھ پہنچا ہوگا۔ لیکن ان کی شرافت دیکھو تمہاری بات ماننے میں ذرا بھی تردد نہیں سوائے عافین کے۔" وہ ذرا دیر رکے۔

"عافین سے ملا ہوں میں اور بیٹا میں تمہیں یقین سے کہتا ہوں وہ تم سے بے حد محبت کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ اپنے خاندان کے ہر دکھ سکھ سے اچھی طرح واقف ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ تمہاری چھوٹی سی ضد کی وجہ سے وہ پورے خاندان کو دکھ دینا چاہے گا۔

میرے خیال میں امرحہ۔ تمہیں کھلے دل سے ایک بار پھر سوچنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی بہن کی طرح تم بھی نادانی میں اپنے مخلص اور پیارے رشتوں کو کھو دو۔ دلوں پہ گرد بہت آسانی سے جم جاتی ہے بیٹا۔ مگر اترتی بہت مشکل سے ہے۔ میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں گڑیا۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور باہر چلے گئے۔ وہ دیر تک سسکتی رہی۔

☆ ☆ ☆

"یہ میرے لیے ہے۔" سونے کی خوب صورت انگوٹھی جس میں سبز رنگ کے دل کی شکل کا ہیرا جگمگا رہا تھا اس کے نازک سفید مرمریں ہاتھ میں بہت سج رہی تھی۔

"ہاں تو اور کتنی بیویاں ہیں میری۔ جب تک دوسری نہیں آجاتی تب تک تو تم ایسے ہی عیش کرو۔ دوسری آگئی تو پھر..." عافین کے شریر لہجے پہ اس نے تیکھی نظر عافین پہ ڈالی۔

"خواب میں بھی مت سوچیے گا۔ ورنہ کسی سڑک پہ آپ کی لاش ملے گی وہ بھی بوری بند۔" امرحہ نے اسے ناخن دکھائے۔

"اوئی ماں اتنی خطرناک ہے میری بیوی آئی مین میری پہلی بیوی۔" وہ مزید شریر ہوا۔

"عافین سدھر جاؤ۔" امرحہ خفا ہوئی۔

"اچھا بابا ناراض تو نہ ہو۔" عافین فوراً سیدھا ہوا۔

"ارے ہاں میرا کچھ سامان تو پیک کر دو۔ دو دن کے لیے بھائی کے ساتھ کینیڈا جانا ہے بزنس کے لیے۔" اچانک ہی اسے خیال آیا۔

"کیا دو دن کے لیے! لیکن کیوں عافین؟" امرحہ تڑپی۔

"کیا مطلب کیوں؟ بزنس میٹنگ ہے یار اور پھر ہمیشہ حماد بھائی اور عماد بھائی جاتے ہیں۔ اس دفعہ عماد بھائی کو گھر پہ رہنا ہے اور مجھے جانا ہے تاکہ مجھے بھی تجربہ ہو جائے۔" اس نے کھل کر وجہ بتائی۔

"نہیں عافین، آپ نہ جاؤ۔ اس دفعہ بھی بھیج دو عماد بھائی کو پلیز میں تمہارے بغیر کیا کروں گی۔" امرحہ منت بھرے لہجے میں بولی۔

"ارے یار میں کون سا ایک سال کے لیے جا رہا ہوں۔ دو دن بس یوں چٹکیوں میں گزر جائیں گے۔" عافین مسکرایا۔

"نہیں دو دن بھی نہیں، میں ابھی حماد بھائی سے کہہ کر عماد بھائی کی ٹکٹ کنفرم کرواتی ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے اس کا کان کھینچ کر باہر بھاگ گئی۔

فون کی تیز بیل نے اسے چونکا دیا۔ آفس سے کال آ رہی تھی۔ اس نے بددلی سے فون بند کر دیا۔ سہانی یادوں سے یوں اچانک باہر آجانا اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

"کیسے تم نے بابا سے کہہ کر میرا کینیڈا کا ٹور ختم کرا دیا تھا اور خود ہی ایک دن مجھ سے سارے رابطے توڑ کے بیٹھ گئی ہو امرحہ۔ تم ایسی تو نہ تھیں۔ میں تم سے بے حد پیار کرتا ہوں امرحہ۔ میری محبت کی کشش تمہیں ضرور کھینچ دے گی۔ مجھے اپنی محبت پہ بھروسہ ہے امرحہ، بے حد بھروسہ یوں سمجھو اندھا یقین۔" اس نے دل ہی دل میں کہتے ہوئے امرحہ کی تصویر پہ ہونٹ رکھ دیے۔

☆ ☆ ☆

آج نیو ایئر نائٹ تھی اور سبھی لوگ صبح سے تحائف لینے اور دینے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ لیکن امرحہ آج سارا دن اپنے کمرے میں بند رہی تھی۔ اظہر، عفنہ، بچے سبھی نے بہت اصرار کیا کہ وہ ان کے ساتھ باہر گھومے انجوائے کرے۔ مگر وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے بیٹھی رہی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ گھر کے فون پہ کال کر کے سب کو وش کرے۔ اپنے عافین کی آواز سنے مگر پھر وہی انا عود کر آئی۔ کبھی کبھی اسے خود پہ حیرت بھی ہوتی۔ اس نے کبھی زندگی میں ضد نہیں کی تھی۔ حالات اور وقت کے ساتھ سمجھوتہ کر کے ان کے رنگ میں ڈھل جانا اس کی فطرت تھی۔ تبھی بچپن سے بابا اسے بے حد سمجھدار کہتے تھے۔ مگر اس بار نہ جانے کیوں اپنی کہی بات سے مکرنا، پیچھے ہٹ جانا اسے بے حد مشکل بلکہ ناممکن لگ رہا تھا۔

"میں ایسا ہرگز نہ کرتی مگر عافین کے اس قدر روڈ رویے نے مجھے مجبور کر دیا۔ ورنہ پہلے بھی کبھی میں نے کوئی ضد نہیں کی تھی۔" اس نے دل ہی دل میں اپنی حمایت کی۔

"لیکن یہ بھی تو سچ ہے امرحہ کہ تم نے بالکل ہی فضول سی خواہش کی ہے جس کا نہ کوئی اہم جواز ہے تمہارے پاس نہ کوئی ٹھوس وجہ۔" دل نے اسے جھڑکا۔

"کیوں نہیں ہے وجہ۔ مجھے اپنی زندگی چاہیے آزاد اور بے فکر۔" اس نے ایک اور دلیل دی۔

"اس سے بڑھ کر تمہیں میسر تھا امرحہ بی بی۔ تمہیں اتنا پیار اور کیئرملی تھی کہ کوئی فکر تمہیں چھو بھی نہیں سکتی تھی۔" دل نہ جانے کیوں آج باغی ہو رہا تھا۔

"امرحہ شام ہو رہی ہے۔ ہم نے امی کے گھر کے لیے نکلنا ہے جلدی تیار ہو جاؤ گڑیا۔" تبھی دروازے کے اس پار سے اظہر نے اسے آواز دی۔

"اس دل کی بحث و تکرار سے چھٹکارا پانے کے لیے یہی ایک راستہ ہے۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"جی بھائی میں بس ابھی تیار ہو کر آئی۔" اس نے تیزی سے جواب دیا۔ بھائی خوشی خوشی واپس پلٹ گئے۔

وہ خود کو خوش نظر آنے کے لیے پورے دل سے تیار ہوئی۔ اس نے بلیو جینز پر لانگ پنک شرٹ پہنی جو کبھی عافین بہت پیار سے اس کے لیے لایا تھا۔ پنک کلر کی لائٹ جیولری، لائٹ میک اپ کے ساتھ اس نے ریشمی لمبے بال کھلے چھوڑ دیے تھے اور پنک اور بلیک کلر کی خوب صورت سی اونی ٹوپی سر پہ پہن لی۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی وہی خوب صورت انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ اس نے ننھا سا برسلیٹ اسی ہاتھ میں پہنا اور پرس اٹھا کے باہر چلی آئی۔

تبھی اسے دل سے تیار ہوا دیکھ کر خوش ہوئے۔ مگر عفنہ کو نہ جانے کیوں پہلی مرتبہ بہن کچھ ادھوری سی لگی۔ وہ دل ہی دل میں کچھ سوچنے لگیں۔

امرحہ نے دیکھا سارا گھر بکھرا پڑا تھا۔

"سوری بھابی آج سارا دن کمرے میں پڑی رہی آپ کی ہیلپ ہی نہ کر سکی۔" اسے افسوس ہوا۔

"نہیں بیٹا کوئی بات نہیں۔ چلو دیر ہو رہی ہے۔"

علفہ نے پہلی مرتبہ مختصریات کی تھی۔ سبھی نے حیرت سے ۔۔۔ دیکھا تھا۔ لیکن خاموشی سے ان کے ساتھ ہو لیے تھے۔

۞ ۞ ۞

اظہر بھائی کے گھر وہ پہلے بھی آچکی تھی۔ گھر ہمیشہ کی طرف صاف ستھرا اور رہنے والوں کے بہترین ذوق کا گواہ تھا۔ ان کے گھر میں سبھی مل جل کر کام کرنے کے عادی تھے۔ کئی اور عورتیں لڑکیاں بھی وہاں جمع تھیں۔ کچھ ہی دیر میں خواتین کی محفل میلاد شروع ہوئی تو جیسے ایک فسوں سا طاری ہو گیا ماحول پر۔ امرحہ نے بھی بڑی محبت سے نعت پڑھنی شروع کی تو اس کی درد بھری آواز نے سبھی کی آنکھوں میں عقیدت کے آنسو بھر دیے۔

نام احمدؐ کا لے کر صدا دی
چوم لی رو کے روضے کی جالی
معاف اللہ کرے میری چوری
میں نے طیبہ کی مٹی چرالی
ٹھوکریں دربدر کھاتے کھاتے
جو محمدؐ کی چوکھٹ پہ پہنچے
چھید سارے سلے دامنوں کے
بھر دی آقا نے ہر گود خالی
ان پہ مشکل پڑے بھی تو کیسے
جن پہ برسے کرم مصطفیٰؐ کا
ہو کے وابستہ احمدؐ کے در سے
سب نے تقدیر اپنی بنالی

سبھی نے سبحان اللہ ماشاء اللہ کہہ کر اسے خوب داد دی۔ نعت خوانی کے بعد جب کھانا شروع ہوا تو وہ آپی کے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔ اسے علفہ کچھ چپ سی لگیں۔

"آپی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے پوچھا۔

"امرحہ ایک بات پوچھوں؟" انہوں نے الٹا سوال کیا۔ امرحہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تمہیں نہیں لگتا کہ میرے اکیلے گھر سے زیادہ سکون یہاں اتنے لوگوں کے گھر میں ہے۔" امرحہ کا ۔۔۔ کانپ گیا۔

"ہاں آپی سچ میں یہاں محبتوں کی مہک گھر کی ہواؤں میں رچی محسوس ہوتی ہے۔" اس نے دل سے اعتراف کیا۔

"تمہیں احساس ہو گیا علفہ۔" اظہر بھائی نہ جانے کب آئے۔

"ہاں اظہر اپنی بہن کی اداس ۔۔۔ تمہیں اپنے تجربے وجود اور اس گھر میں آتے ہی سکون سا دل میں اترتا محسوس کر کے اب میں سب سے واقعی شرمندہ ہوں۔" علفہ کے لہجے میں ندامت تھی۔

"یہ شرمندگی کی نہیں بیٹا خوشی کی بات ہے۔" اماں نے آکر اسے اپنی نرم گرم پناہوں میں سمیٹا۔

سبھی اپنی خوشیوں میں یوں مگن ہوئے کہ امرحہ کو ایک دم اپنا آپ بہت تنہا لگا۔

"میں غلط جگہ آگئی۔ مجھے تو اس وقت کہیں اور ہونا چاہیے تھا۔" تبھی دل نے جیسے اسے پکارا۔

"عافین۔" وہ دل ہی دل میں پکارتی تیزی سے باہر نکلی۔ کیب لے کر وہ فوراً "ایسٹ ریور" کی طرف روانہ ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ عافین اس وقت اسے وہیں مل سکتا تھا۔ اسے پہلے بھی بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ مزید دیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس کی توقع کے عین مطابق اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے ہجوم سے کافی دور وجیہہ سراپے کے ساتھ وہ اسے اپنے دل میں اترتا محسوس ہوا۔ وہ بے تابی سے قدم اٹھاتی اس کے پاس آٹھہری۔ عافین کی دراز ۔۔۔ میں اس کا خوب صورت سراپا دیکھتے ہی حیرت اور مسرت کے ساتھ ساتھ نہ جانے کتنے ہی جگنو جگمگا اٹھے۔

"عافین آئی ایم ۔۔۔" وہ نم لہجے میں بمشکل بول پائی۔

"ہش۔" عافین نے فوراً اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا اور دھیرے سے اسے خود سے قریب کر لیا۔

"ادھر دیکھو نئے سال کے آغاز میں بس چند سیکنڈ بچے ہیں۔ کاؤنٹ ڈاؤن بس شروع ہونے والا ہے۔" عافین نے امرحہ کے کانوں میں سرگوشی کی۔

"ٹین 'نائن 'ایٹ۔" وہ چیخ تھی۔ سارے ہجوم میں ۔۔۔ کی آواز بے حد واضح تھی۔ خاص طور پہ امرحہ کے لیے۔

"سیون 'سکس 'فائیو۔" امرحہ نے بھی اس کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ کاؤنٹ ڈاؤن ختم ہوتے ہی پورا ۔۔۔ روشنیوں میں نہانے لگا۔

تبھی امرحہ کے سیل پہ کال آنے لگی۔ وہ خوشی ۔۔۔ آپی کو اپنی منزل پہ پہنچنے کا بتانے لگی۔ علفہ نے ۔۔۔ دل سے دعائیں دے کر فون بند کر دیا۔ عافین مسکراتے ہوئے اسے دیکھے گیا۔

"ہیپی نیو ایئر امرحہ۔" عافین نے اس کے دائیں ہاتھ میں خوب صورت سی رنگ پہناتے ہوئے کہا۔ تو ۔۔۔ کا چہرہ کھل اٹھا۔

"آپ کو یقین تھا کہ میں آؤں گی۔ جو میرے لیے تحفہ لے آئے۔" وہ شرمساری بولی۔

"ہاں سو فیصد۔" وہ مسکرایا۔

"میں تو تمہارے لیے تحفہ بھی نہ لا ئی۔" اسے افسوس ہوا۔

"تم نے تو جو تحفہ مجھے دیا ہے شاید ہی کوئی دے ۔۔۔" امرحہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم نے مجھے میرا یقین لوٹایا ہے امرحہ۔ محبت پہ میرا بھروسہ ٹوٹنے نہیں دیا۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی اور دیکھو تم میرے پاس ہو۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں ۔۔۔ میں کتنا خوش ہوں۔ اس جنوری کی پہلی ساعتوں میں ملی یہ خوشی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔" عافین نے امرحہ کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے اک جذب سے ۔۔۔ امرحہ کی پلکیں بھیگنے لگیں۔ اس نے مطمئن سے انداز میں سر عافین کے سینے پہ ٹکا دیا۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ بعض خوشیاں ہمارے اپنے اختیار میں ہوتی ہیں۔ بس ہمیں ان کا شعور نہیں ہوتا ۔۔۔ ہم جان بوجھ کر یا نہ جانے میں ان کو رد کر دیتے ہیں۔ اسے خوشی تھی کہ وہ جوان خوشیوں کو رد کر رہی تھی وقت پہ سنبھل گئی اور خود چل کر ان خوشیوں کے پاس آگئی۔

Happy new year ہجوم ایک ساتھ چلایا تھا اور اس نے بھی دھیرے سے کہتے ہوئے پلکیں موند لیں۔ نیا سال واقعی ان کے لیے نئی خوشیاں لے کر آیا تھا۔ مسکراتی جنوری انہیں مسکراہٹیں دان کر گئی تھی۔

۞ ۞

حنا یاسمین

محبت کانچ کا سودا

میں نے پہلی دفعہ اسے یونیورسٹی میں تب دیکھا تھا۔ جب وہ داخلے کے لیے فارم جمع کروانے آئی تھی۔ یونیورسٹی میں جانا کیسا لگتا ہے؟ اس پل کی خوب صورتی کا اندازہ اس طرح کے لوگوں کو بخوبی ہوگا جو ہوں بھی ماں باپ کے اکلوتے سپوت اور اوپر سے پانچ بہنوں کے اکلوتے بھائی۔

میرا ایم بی اے میں میری پسند کی یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا تھا اماں اور بہنوں نے نوافل ادا کیے اور میں آنے والے دنوں کی خوب صورتی کو محسوس کرنے میں مگن تھا۔۔۔۔ جو خواب میں سوتے میں دیکھتا تھا۔ اب میں ان ہی خوابوں میں جیوں گا۔

پر خواب نگر بھی خوب' خواہشات نفس کی وہ راہگزر ہے۔ جو اپنے حسین راستوں پر ایک دفعہ کسی کو چلا دے تو مقناطیسی کشش کی طرح اسے چلائے ہی رکھتی ہے انسان چاہے بھی تو قدموں کو اتنا نہیں چلا سکتا۔ وہ واپس مڑنا ہی نہیں چاہتا۔ یونہی صحرا میں بھٹکے اونٹ کی طرح بس ناک کی سیدھ میں خواب نگر میں ہی بھٹکتا رہ جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

میں نے ذیشان کو پہلی دفعہ ایڈمن بلاک کی عمارت کے پاس دیکھا تھا۔ بے حد خوب صورت اور ہینڈسم تو نہیں کہہ سکتے۔ مگر وہ ہوتا ہے نا۔۔۔۔ کہ انسان کے چہرے مہرے چال ڈھال' سرو قد میں کچھ خاص۔۔۔۔ بہت ہی خاص۔۔۔ جو دیکھنے والی نظر ہی سمجھ سکتی ہے۔ بس وہ بھی کچھ خاص بلکہ خاص الخاص بندہ لگا تھا مجھے۔۔۔۔

میں رکی ضرور مگر ٹھٹکی نہیں۔۔۔۔

رابرٹ فروسٹ کی پیراڈائز لاسٹ کی طرح میری جنت بھی گم نہیں ہوئی تھی۔۔۔ نہ "حوا" کی طرح میرے قدم تھم کر ٹھٹھک کے جمے تھے۔ نہ ارد گرد کی ہوائیں ساکن ہوئیں۔ نہ درختوں پر اونگھتے' چہچہاتے' کھڑے اور بیٹھے پرندوں کو سکتہ ہوا تھا۔

پھر کیا تھا۔۔۔؟

بس شور میں' ہجوم میں۔۔۔ اسٹوڈنٹس کی چیخ و پکار میں اسے دیکھ کر میری اپنی سانس ساکن ہوئی تھی۔ دل کی دھڑکنیں نئی دھن ترتیب دینے لگیں۔ مگر کیا کیجیے ہانیہ وقار کا بلا سبب ایسے ہی فضول میں۔۔۔ در آنے والا وقار۔۔۔ اور انا سے کھڑی ناک۔۔۔ دل دھڑکا ضرور۔۔۔ مگر آپ کی dignity (وقار) نے اس کے سانس تھم جانے کی خبر باہر کی ہواؤں کو نہ دی تھی۔ سب کچھ اس نے اپنے اندر ہی قید کر لیا۔

☼ ☼ ☼

لماں جوڑ توڑ میں لگی ہوئی تھیں۔ کتنے سارے خرچے ہو گئے تھے۔ پچاس ہزار پورا لگ گیا' میرٹ پر آنے کے باوجود۔۔۔

نیو آپا کی جوڑ جوڑ کر رکھی گئی جمع پونجی ختم وہ بے چاری مقامی پرائیویٹ اسکول میں چار ہزار پر رکھی گئی ٹیچر تھیں۔ ایف اے پاس تعلیم میں اسکول والے چار ہزار دے رہے تھے۔ یہ بھی غنیمت تھا۔

معصومہ نے گھر میں بچوں کے ریوڑ کر مزید بڑھا لیا۔ اب اکثر یہ گھر کم اسکول زیادہ لگتا۔۔۔۔ پر خرچے کی گاڑی اسٹارٹ تھی۔

صبوحی نے اپنی تین نمبر کی عینک کے ساتھ لہنگوں پر نقشی دیکھے اور دیگر الا بلا کی مدد سے مزید مینا کاریاں شروع کر دیں۔ پہلے وہ دن کو لوڈ لگائے رکھتی مگر اب اکثر رات کو بھی جاگنے لگی۔

وہ دو چار لہنگے اچھی کوالٹی کے بنا کر بھاری قیمت پر بازار میں بیچنا چاہ رہی تھی۔ زارا اسکول جاتی تھی۔ تو وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔ ہاں باقی آپیوں کو مصروف دیکھ کر اماں کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹا دیا جاتا۔

ہر بندہ آخر ناکارہ تھوڑی ہوتا ہے' کہیں نہ کہیں ان کا وجود ضرور کار آمد ہوتا ہے۔ سب سے چھوٹی شاہو۔۔۔ خبریں اکٹھی کرتے اور ہر آپی کے ساتھ کچھ نہ کچھ کروانے پکڑانے کی شوقین۔۔۔

شوق کوئی بھی ہو۔۔۔ بس اس کے سہارے وقت

ضرور پاس ہو جاتا ہے۔ انسان گانے سن کر بھی ٹائم گزار دیتا ہے۔ نماز پڑھ کر بھی۔۔۔ کبوتروں اور مرغوں کو لڑا کر بھی۔۔۔ مسجد دیکھ کر بھی فیس بک پر بھی۔
بس زندگی یا تو بڑی ڈل ہو گئی ہے یا بارود اور گولے کی بو میں اپنے سارے رنگ کھو بیٹھی ہے۔
روٹھے ہوئے دلوں اور پریشان ذہنوں کو تو بس کوئی "شوق" چاہیے اور شوق کا بھی وہ اتنا رسیا ہو کہ زندگی اس میں کھو کر ہی گزر جائے۔

☼ ☼ ☼

دعاؤں کی روشنی میں مجھے رخصت کیا گیا۔ اماں اور بہنیں یوں رو رہی تھیں جیسے میں ملک سے باہر جا رہا ہوں۔ محبت کی آبادی میں آنسوؤں کی شرح ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے اور اگر محبت کی وادی میں صرف ایک ہی پھول ہو تو وہ سب کی نگاہ کا مرکز ہوتا ہے۔ میں بھی اپنی ماں اور بہنوں کی امنگوں، آرزوؤں اور کانچ کی طرح باریک اور نازک خوابوں کا دیا تھا۔ میں دماغ کے اندھیرے میں اس دیے کی لو کو کبھی بھی مدھم نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ یہ لو مجھے پڑھنے میں کافی تحریک دیتی۔

☼ ☼ ☼

امپورٹنٹ اور برانڈڈ شوز مما نے لے کر دیے تھے۔ میں ہمیشہ اپنی شاپنگ خود سے کرتی تھی۔ مجھے دوسروں کی چیزیں عموماً کم ہی پسند آتیں۔ میں اپنے معاملے میں چوزی ہو جاتی۔ ساری دکان کیوں نہ نکلوانی پڑ جائے جب تک مجھے میری پسند کا کپڑا نہ ملتا میں مطمئن نہ ہوتی تھی۔ یہی حال شوز، بیگز اور دیگر چیزوں کے ساتھ تھا۔
میں نے کالج میں ماریہ کے ہاتھ میں بلیک اور پنک کمبینیشن میں ایک رسٹ واچ دیکھی تھی۔ جس کا ڈائل تو سٹیل کا تھا۔ مگر اس کا اسٹرپ (پٹی) نائیلون اور بیڈز کی تھی مجھے وہ بے حد پسند آئی۔ جو چیز پسند آجائے تو اس کی طرح کی حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ بعض لوگ اسے نقل مارنا بھی کہتے ہیں۔

مگر میں کہتی ہوں کہ اگر نقل مارنے سے آپ کی شخصیت میں کچھ خوب صورتی آجاتی ہے تو آپ کو ضرور ضرور نقل مارنی چاہیے۔
یونیورسٹی میں مجھے میرٹ پر داخلہ کیا ملا کہ مما نے مجھے ہتھیلی کا چھالا بنا ڈالا۔ ہادیہ اور جویریہ کو کبھی کبھی بڑی تپ چڑھتی۔ "ہانیہ دودھ پی لو کمزور دکھ رہی ہو۔۔۔ آج میں نے روسٹ بروسٹ ہانیہ کے لیے بنایا ہے۔ میری ہانیہ کو سردی بڑی لگتی ہے۔ یہ ذرا نئے اسٹائل کا کارڈیگن میں ہانی کے لیے خرید لائی ہوں۔"
مما کی لامحالہ شفقت اور محبت کے اظہار پر یہ دونوں بہنیں جلاپے میں مبتلا ہو جاتیں۔ کبھی جو جویریہ اور ہادیہ کو کچھ دیتیں تو وہ منہ بنا کر کہتیں "شکر ہے مما! یہ ہانیہ آپی کے لیے نہیں ہے۔" اتنی مزے کی زندگی۔۔۔

☼ ☼ ☼

بارش کے نم قطروں اور ہوا کے نرم جھونکوں جیسی۔۔۔ بیلا کے پھولوں کی مسحور کن خوشبو۔۔۔ اور پیر ہوئی کے پھولوں پر رقص کرتی تتلی اللہ کی اتنی خوب صورت دنیا۔۔۔
میں ہمیشہ آسان راستوں کا انتخاب کرنے کا قائل ہوں۔ آج بھی میں نے ہاسٹل سے نکل کر قبرستان والے راستے سے یونیورسٹی کا رخ کرنے کا سوچا۔ پبلک ٹرانسپورٹ کا خرچہ بچ گیا تھا۔ فضول میں ٹرانسپورٹ پر پیسے برباد کرو۔ مجھے تو آج تک خوفناک کہانیوں والی بلائیں۔۔۔ روحیں۔۔۔ جن، چڑیلیں قبرستان کے راستے پر نہیں ملیں۔ بلکہ خاموش قبریں زندگی کے بعد والی خاموش طویل زندگی کی خامشی اور طوالت کو میرے دل پر نقش کر رہی تھیں۔
یونیورسٹی کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی وہ مجھے گاڑی سے نکلتی نظر آئی۔ ایمان سے دل خوش ہو گیا تھا۔ کیا وہ اتنی خوب صورت ہے؟ خوب صورت تو یہاں اور بھی بہت ہیں۔ بس اس میں کچھ ہے جو مجھے باقی سب میں نظر نہیں آتا۔

محبت کی عینک اندھا کیوں کر دیتی ہے؟ ارد گرد سے حسب نسب سے۔۔۔ رنگ و نسل سے۔۔۔ اس سے بے گانہ ہو کر بھی برے بھی بنتے ہیں اور اس کے بغیر جینا بھی محال۔۔۔
بے بسی کی یہ کون سی قسم تھی۔۔۔؟
میں اور وہ ایم بی اے پارٹ ون کے اسٹوڈنٹس تھے۔
مجھے ذہانت کے مظاہرے خوب آتے۔ مگر وہ بلا کی ذہین بلکہ فطین تھی۔ جلد ہی وہ ہماری کلاس میں اپنی ذہانت کے بل بوتے پر نمایاں ہو گئی اور میں۔۔۔ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ جو باتیں اور معلومات اسے پتا تھیں۔ مجھے اس کے لیے کتنی راتیں جاگ جاگ کر محنت کرنا پڑتی۔ پوری زندگی شاید ہی میں نے محنت کی ہو۔
مگر ایم بی اے کے ان دو سالوں میں صحیح معنوں میں میں نے ایڑیاں رگڑ ڈالی تھیں۔
پھر کیا ہوا؟ کلاس میں ذہانت پر جب بھی بات آتی تو ہانیہ وقار کے ساتھ ساتھ ذیشان وصی اللہ کا نام ضرور لیا جاتا۔

☼ ☼ ☼

وہ بندہ مجھے ہر روز چونکا رہا تھا۔ اسے ہر پروجیکٹ آسان لگتا۔ اتنی مشکل چیزیں کسی کو آسان لگیں تو وہ بہت "قابل" ہوتا ہے۔ ہماری کلاس کا ابوذر ہمیشہ کہتا تھا کہ مشکل پروجیکٹ کا ہیڈ یا تو ہانیہ کو بنا دیا جائے یا ذیشان کو۔۔۔ وہ بلاوجہ نہیں بولتا تھا۔ اس کی خاص بات اس کی متانت تھی۔ جب وہ بولتا تو ہر شخص سنتا تھا۔ میں بھی اپنا آپ بھول جاتی۔
وہ وقت کو ضائع کرنا نہیں جانتا تھا۔
جب ہم لوگ انجوائے منٹ کے موڈ میں ہوتے تو اس کے لطیفے ہنسا ہنسا کر برا حال کرتے مگر اخلاق سے گرے ہوئے ہرگز نہ ہوتے۔ وہ ہمہ وقت ہر ایک کی مدد کو حاضر۔۔۔ وہ سادہ سا بندہ۔۔۔ سادہ ڈریسنگ پر خاص چیز اس کا نکھرا ہوا رنگ ہے آتا۔

☼ ☼ ☼

وہ بے تحاشا بولتی، مگر بے تکا ہرگز نہیں یا شاید وہ مجھے بولتے ہوئے اتنی اچھی لگتی کہ میرا دل کرتا کہ وہ بولتی رہے اور میں سنتا رہوں۔ وہ ہر رنگ میں اچھی لگتی۔۔۔ اس کے پاس ڈریسز کا اسٹاک تھا، روز نت نئے اسٹائل کے کپڑے زیب تن کیے ہوتے۔۔۔ میں اس کے پہنے ہوئے اتنے سارے رنگوں کے نام تک یاد رکھنا بھول جاتا۔ مجھے گنتی بھول جاتی کہ وہ پچھلے ہفتے کن رنگوں میں تھی اور اس ہفتے کس میں۔

وہ مجھے اپسرا لگتی۔۔۔ میں نے خود کو تخیل کے صحرا میں بھٹکنے پر کبھی ذہنانہ سرزنش کی تھی۔
میں ہر اس جگہ رہنا چاہتا جہاں وہ ہوتی۔ سارے مجھے کلاس کا موسٹ پنکچوئل (پابندیٔ وقت) اور ہارڈ ورکنگ (محنتی) اسٹوڈنٹ سمجھتے۔ درحقیقت میں بتانا چاہتا تھا کہ میرا اس کے بغیر بلکہ اسے دیکھے بغیر گزارا مشکل ہوا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں ہانیہ وقار بلاوجہ لڑکوں سے فری ہونا پسند نہیں کرتی تھی۔ میں کوئی انتہائی مذہبی نہیں تھی۔ مگر مجھے یونیورسٹی میں آکر لڑکوں کے ساتھ گروپنگ کرنا۔۔۔ کینٹین جانا۔۔۔ بلاوجہ فری ہونا۔۔۔ اور فرینڈ شپ کرنا خاصا ناگوار لگتا۔
مگر ذیشان میں کچھ خاص تھا۔ جو مجھے ٹھٹکنے پر۔۔۔ رک جانے۔۔۔ متوجہ ہو جانے پر ٹھہر کر، مڑ کر دیکھنے پر۔۔۔ اسے سننے اسے بولتے ہوئے دیکھنے پر مجبور کر دیتا۔
مگر ہمارے درمیان خاموش تعلق تھا۔ بس ہم کسی نہ کسی پروجیکٹ کو مکمل کرنے کے لیے کبھی کبھار اکٹھے ہوتے تھے۔
"ہمارے کالج میں سر عبدالمتین ہوتے تھے۔ اکثر وہ یہ کہتے کہ بچہ کرتے ہوئے سیکھتا ہے، مگر دیکھتے ہوئے اس کے اندر کرنے کی تحریک زیادہ زور پکڑتی ہے۔"

میں نے اور اس نے "میڈیا کا آج کے دور پر اثر" جیسے موضوع پر مباحثہ کرنا تھا ہماری یونیورسٹی میں سالانہ Debates کا مقابلہ ہونے جا رہا تھا۔ مختلف موضوعات کو مختلف طلباء میں بانٹا گیا۔

ہماری کلاس میں وہ اور میں منتخب ہوئے تھے۔ ہم دونوں زور و شور سے اپنے اپنے موضوع پکڑے اپنے فرینڈز کے سامنے پوائنٹ ڈسکس کر رہے تھے۔

وہ اپنے کالج کے سر کے نظریات اپنے دوستوں کو سنا رہا تھا۔

"ہانیہ کیا تم زیشان کے مقابلے پر جیت جاؤ گی۔" بینش نے سنجیدہ سی شکل بنا کر پوچھا۔

"ان شاء اللہ۔۔۔" بے ساختہ میں نے کہا۔

"اس کی کافی ریسرچ اور محنت ہے۔۔۔" طاہرہ نے بھی شاید اس کے گروپ میں سے کسی سے سن لیا تھا کہ زیشان وصی اللہ آج کل کافی دیر سے ہاسٹل جا رہا ہے۔ وہ زیادہ تک کمپیوٹر لیب میں نیٹ سرچنگ پر ہوتا یا پھر پروفیسرز کے ساتھ ڈسکشن پہ۔۔۔

"یار! میرے پاس بھی کافی اسٹرونگ آئیڈیاز ہیں۔" میں نے اپنا دفاع کیا۔ میں جیتنا چاہتی تھی اور ہمیشہ جیتتی آئی تھی۔ مگر اس دفعہ۔۔۔ بس تھوڑا خوف تھا۔۔۔ مگر میں ظاہر نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

"یاد رکھنا ذہانت ہار جاتی ہے محنت سے۔۔۔" طاہرہ نے بیگز کو ایک دوسرے کے اوپر پھینکتے ہوئے اپنے لیے جگہ بنائی۔ میں کچھ نہ بول سکی تھی۔

مجھے گھر آکر بھی اپنی debate کا خیال رہتا۔ بھوک پہلے کم لگتی تھی مگر اب اڑ گئی تھی۔ مما کو میری فکر لاحق ہوئی۔ کچھ بچوں کے معاملے میں ماؤں کے احساسات زیادہ تیز ہو جاتے ہیں۔ انہیں میری ہلکی سی پریشانی کی بھی خبر ہو جاتی۔

"بیٹا! تم جیت تو جاتی ہو اس دفعہ اتنی پریشانی کیوں ہو رہی ہو؟" وہ محبت سے میرے بال سنوارتے ہوئے بولیں۔

"آج پہلی دفعہ میں نے انہیں زیشان وصی اللہ کے بارے میں بتایا تھا۔

"مما! وہ بڑا ذہین اور محنتی ہے۔۔۔ اس کا ہر کام اتنا پرفیکٹ ہوتا ہے کہ وہ کسی طرف سے بھی کوئی کمی نہیں چھوڑتا۔۔۔"

"ہوں۔۔۔ مگر تم بھی تو محنت کرتی ہو۔ یہ دودھ پی لو اگر زیادہ پریشانی ہو رہی ہے۔ تو نبیل سے مدد لے لو۔" مما نے میرے فرسٹ کزن کا نام لیا۔ جو اپنے دور کا ذہین بچہ شمار ہوتا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ انہیں مطمئن کرنا ضروری تھا۔

"دودھ پی لینا۔۔۔" وہ ایک دفعہ پھر میرے کمرے سے جاتے ہوئے مجھے تاکید کرنا نہ بھولیں میں نے لیپ ٹاپ پر اسکائپ آن کی۔ نبیل بھائی نے میرے ساتھ تقریباً ایک گھنٹہ بات کی۔ انہیں میں نے موضوع بتا دیا تھا۔ کافی پوائنٹس مجھے میل کرنے کا وعدہ کر کے وہ آف لائن ہوئے۔ میں نے بمشکل دودھ پی کر اس کے بارے میں سوچا تھا۔

"اس کی جیت کا مجھے دکھ ہوگا؟" پہلا سوال میرا خود سے یہی تھا۔ پریشانی اور فکر میں میں analysis self شروع کر دیتی۔

"ہاں۔۔۔"

"اس کی ہار کا۔۔۔" دل نے زور سے کہا تھا "ہاں" اور میں حیران ہوئی تھی۔ دل ایک ادا سے مسکرایا تھا۔ انسان جب "ایسا ہو جائے" یا "ایسا نہ ہو" والی کشمکش میں پڑتا ہے۔ تو دماغ سوچوں کی یلغار سے تھک کر چور ہو جاتا ہے۔ دماغ کی تھکن۔۔۔ بدن کی تھکن سے زیادہ مصیبت والی چیز ہے۔

میں منہ پر تکیہ ڈال کر لیٹ گئی۔ کچھ بھی یاد کرنے اور سوچنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں بڑی محنت کر رہا تھا۔ وہ بلا کی ذہین لڑکی تھی۔ میں خود کو اس کے سامنے لیٹ ڈاؤن نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ سامنے ہوتی تو ویسے ہی حواس کو قائم رکھنا مشکل ہو جاتا اور پھر یہ تو باقاعدہ اسی کے ساتھ ڈیبیٹ تھی۔ میں یہاں شام میں ادلیول کے دو بچوں کو پڑھاتا تھا۔ کچھ پیسے نیئر آپا سے منگوائے اس بات کے باوجود کہ ان کا اپنا گزارا کتنی مشکل سے ہوتا ہے۔ بس سارے احساسات پر ایک احساس بھاری تھا کہ میں بھی ہانیہ وقار کے سامنے ویل ڈریس نظر آؤں۔

پروفیسر ذکاء حسین نے ہمیں اتوار کا دن دیا تھا میں صبح سے تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ زوار، شرجیل اور دیگر دوستوں نے مجھے اچھا فیڈ بیک دیا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں جیت جاؤں گا۔

الحمرا ہال میں یہ ڈیبیٹ کمپٹیشن تھا۔ میرے ساتھ پورا ایم بی اے ڈیپارٹمنٹ تھا۔ جبکہ وہ گرلز ونگ کی سپورٹر تھی اور میں بوائز کا۔۔۔

انگلش ڈیبیٹ۔۔۔ اور میں جانتا تھا کہ عام سے سرکاری سکولوں سے پڑھے ہوئے لڑکے کا accent (لہجہ) اور کانونٹ کی پڑھی ہوئی لڑکی کے accent میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

سر ذکاء کہتے تھے آدھی جیت اندر کے احساس کمتری اور خوف کو مار لینے سے حاصل ہو جاتی ہے اور باقی آدھی انسان اپنی قابلیت سے لیتا ہے مجھے گرے کلر کبھی اچھا نہیں لگا۔ ایسے ہی پھیکا ڈل بوریا یوسی کی علامت مکروہ گرے کلر کے سوٹ میں ملبوس تھی۔ اور مجھے آج سے پہلے کبھی گرے (سرمئی) رنگ اتنا شاندار نہیں لگا تھا۔ میرا بس چلتا تو قوس قزح کے سات رنگوں میں ایک سرمئی بھی شامل کر دیتا۔ یہ جذبہ ہی ایسا ہے۔ بلاوجہ کا پاگل پن۔۔۔ بلاوجہ میں خوشی کا سماں پیدا کر دینے والا۔

مباحثہ کا آغاز اس نے کیا۔

"میڈیا نے تو عالمی جنگ چھیڑ دی ہے۔ لوگوں کی فرسٹریشن بڑھتی جا رہی ہے۔" اس نے میڈیا کے مخالف بولنا تھا۔ جبکہ میں نے اس کے حق میں "لوگوں کی فرسٹریشن تو تاریخ کے اوراق میں بھی جوں کی توں قائم تھی۔ جب جنگیں تلوار کے سائے میں لڑی جاتی تھیں۔" میں نے اپنا نقطہ اٹھایا۔

"مگر تلوار سے صرف خون بہتا انسان کٹتے مگر اب رواج۔۔۔ ثقافت۔۔۔ تہذیب کا خون ہو رہا ہے۔ جسم کے ساتھ ساتھ روح بھی کاٹی جا رہی ہے۔"

"ثقافت تو تب بھی کٹ رہی تھی جب ہم برصغیر میں ہندوؤں کی غلامی میں رہ رہے تھے۔ روح کا خون تو تب بھی ہو رہا تھا۔ جب ہمیں ہر شعبہ زندگی میں پچھاڑا جا رہا تھا۔" میں نے اس کی بات کا بھرپور جواب دیا۔ ہال تالیوں سے گونجا تھا۔

وہ ایک نظر ہال میں موجود مجمع پر ڈال کر پھر بولی۔

"مگر میڈیا کی جھوٹی سچی خبریں معاشرتی انتشار پھیلا رہی ہیں۔ لوگوں میں بہادری کی بجائے خوف کے عناصر ابھر رہے ہیں۔ موت کے رقص کی وجہ سے اور ہر اسال زندگی کا ورمن پل رہا ہے۔ میڈیا نے جہاں زندگی کی خوفناک شکل پیش کی ہے۔ وہاں ثقافت کے نام پر نت نئے مہنگے برانڈز والے فیشن بھی نکالے جو خوف کے ساتھ ساتھ زندگی کی محرومیوں کو بڑھا دے رہے ہیں۔۔۔"

اب اس کی بات میں وزن تھا۔ ہال میں پھر سے بھرپور تالیاں بجیں۔

"مگر یہ میڈیا ہی ہے جو دور دراز گاؤں میں بیٹھے ہوئے ایک کسان کو بھی ووٹ سے زندگی بدلنے کا شعور فراہم کر رہا ہے۔ یہ میڈیا ہی ہے۔ جو جان ہتھیلی پر رکھ کر مجرمانہ سرگرمیوں کو منظر عام پر لا رہا ہے۔ اگر میڈیا نہ ہو تو آپ کا فیشن۔۔۔ آپ کو کبھی کلچرڈ نہ دکھائے۔ آپ مغربی دنیا میں ایک ترقی پذیر قوم ہونے کے باوجود کلچرڈ لوگ کیسے بنے؟ اسی میڈیا کی بدولت۔۔۔ میڈیا نے آپ کو پہننا اوڑھنا سکھایا۔ یہ فیشن ہی تو ہے۔ جو آپ کو ڈریسز کی کلر کمبنیشن بتاتا ہے۔ آج آپ ایک سنجیدہ موضوع پر بات کرنے آئی ہیں۔ آپ نے موقع کی مناسبت سے گرے پہن لیا۔ ورنہ آپ شوخ کلر میں بھی آسکتی تھیں۔ میڈیا آپ کو زندگی گزارنے کے سلیقے سکھاتا ہے۔"

اب طلباء کا شور میرے حق میں تھا۔

اس کا چہرہ رنگ بدلنے لگا۔ شور کی طرف میرا دھیان ہی نہ تھا۔ مجھے صرف اس کے چہرے سے اعتماد کی جھلک غائب ہوتی نظر آئی تھی۔

بحث ختم ہونے تک میں اپنے مضبوط دلائل کی بدولت جیت چکا تھا۔ نعروں اور سیٹیوں کا شور میرے گرد پھیلا۔ وہ خاموشی سے وہاں سے چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

میں بڑی مشکل سے گھر پہنچی اس کا جیت جانا بھی مجھے خوش نہیں کر پایا پتا نہیں کیوں؟

کیا میں جیلس ہو رہی تھی؟ میں نے خود سے سوال کیا مگر جواب ندارد۔ میں گھر آکر روئی تھی۔ ہادیہ اور جوریہ بھی پریشان ہو گئیں۔ بہنوں میں مضبوط اعصاب کی مالک میں ہی تھی۔ ذرا ذرا سی ہار جیت پر میں رونے دھونے والوں میں سے نہ تھی۔ مگر اس سے ہارنا برداشت نہیں ہوا تھا۔

میں دو دن یونیورسٹی نہ جاسکی۔

☼ ☼ ☼

وہ خاموشی سے چلی گئی۔ اپنی جیت پر بھی میرے اندر سناٹے سے اتر گئے۔ کسی ایک شخص کے نہ ہونے پر بھی خوشیاں ادھوری سی لگتی ہیں اور وہی ایک شخص پوری زندگی کی مانگ بن جاتا ہے۔ دل بس اسی کے گرد رقص کرنے لگتا ہے۔ وہ اگلے دن یونیورسٹی بھی نہ آئی۔ میری دل گرفتی میں اضافہ ہوا تھا۔

وہ پیاری سی لڑکی اپنے اعتماد کے ساتھ ہی پیاری لگتی۔ میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین سا ہونے لگا تھا کہ وہ اپنی ہار پر دل گرفتہ ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ میں وقت کو تو واپس نہیں کھینچ سکتا تھا۔

ہمارے فائنل ٹرمز شروع ہونے والے تھے۔

میرے نہ چاہنے کے باوجود بھی ساری کلاس نے میرا اور اس کا فرضی کمپٹیشن بنا دیا۔ کچھ اسٹوڈنٹس ہانیہ کو کہتے کہ ہانیہ دیکھو تمہارے ذیشان سے زیادہ نمبر آنے چاہئیں اور ادھر مجھے کہتے پھرتے۔

"یار! بس کرو مین ایجز والی باتیں۔۔۔" میں اکتا جاتا۔ میں اس کے ساتھ کسی قسم کا کمپٹیشن نہیں چاہتا تھا۔ سر ثوبان اور میڈم مہر بھی ادھر میری اور ادھر اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔

ہمارے ایگزامز ہو گئے تھے۔ سب نے اینول پارٹی کا اہتمام کیا۔ لڑکیوں نے رو دھو کر۔۔۔ اور لڑکوں نے ہنسی مذاق کے آنسوے بہا کر۔۔۔ خیر کہیں وعدے۔۔۔ کہیں دوبارہ ملنے کی جگہیں متعین کی گئیں۔ بلنے والے تو خیر چلے جاتے ہیں اور وقت بھی کون سا ٹھہر جاتا ہے۔ ہم سارے اپنی اپنی راہوں کو سدھارے۔ میں نے اس سے کوئی وعدہ کوئی عہد نہ لیا۔ بس ہماری خاموش پسندیدگی۔۔۔ اور بات پسندیدگی تک ہی رہے تو اچھا ہو، ہے مگر یہ پسندیدگی سے بھی اوپر کی بات بن گئی تھی۔

میں بھی محبت کا مریض بن گیا تھا اور مریض تو مریض ہوتا ہے۔ اس کا مرض کتنی شدت تک جا۔۔۔ شاید ہی اس کو ناپنے کا کوئی آلہ ایجاد کیا ہو۔

☼ ☼ ☼

میری بالکونی کے سامنے گل داؤدی کھلے ہوئے تھے۔ بہار کی آمد۔۔۔ اور ماحول کی نیلاہٹ۔۔۔ دل بس دبیز پردوں میں کہیں جا کر چھپ گیا تھا۔ مجھے کوئی چیز بھی خوش نہ کر رہی تھی۔ حالانکہ میں تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جانے والی لڑکی تھی۔

میں ناسٹیلجک ہو رہی تھی۔ مجھے لگتا کہ میں سندھی شال اوڑھے صحرا میں بھٹک رہی ہوتی ہوں۔۔۔ یا پھر سمندر کی لہروں پر مچھلی کی طرح پھسل رہی ہوں۔

نہ پھولوں کو دیکھنا اچھا لگتا۔۔۔۔ نہ مما کے ساتھ مارکیٹ جانا۔۔۔۔ نہ تیار ہونا۔

ہادیہ کے قہقہے اور جوریہ کی داستانیں۔۔۔ کسی میں چٹخارہ نہ تھا۔ میری زندگی کی ڈش بغیر مسالوں کے پھیکی سی ہو گئی۔

"اتنے گندے کپڑے اور حلیے میں کبھی آسکر وائلڈ اپنے زمانے میں نہیں پھرا ہو گا۔ جس حلیے میں تم پھرتی رہتی ہو۔" جوریہ کو اب سچ میں مجھ پر غصہ آنے لگا تھا۔

"ہانی بوریت سے گھبرا گئی ہیں۔ آپ ایسا کریں کہ آج کل کسی نئے ڈرامے میں آڈیشن ہو رہے ہوں تو آپ اپلائی کر لیں۔ ماسی ٹائپ یا ہندوؤں کی ٹیلی پیلی کالی ماں کا کردار تو مل ہی جائے گا۔" ہادیہ اپنے بالوں کی ٹیل کو پنوں کی مدد سے سیٹ کرتے ہوئے بولی۔

"تم لوگوں کو بس ریمارکس ہی پاس کرنا آتا ہے۔۔۔ ہر بندے کی اپنی زندگی ہے۔" بات تو اتنی بڑی نہیں تھی۔ مگر مجھے غصہ آگیا۔

"انہیں کیا ہوا۔۔۔" میں نے اپنے پیچھے ہادیہ کی آواز سنی۔۔۔

"یعنی وہ ہوا جو خیر سے کسی کسی کو ہی ہوتا ہے۔"

جوریہ کی بات مجھے اپنے کمرے میں داخل ہونے تک بہت کچھ سمجھا گئی تھی۔ دوسرے دن کم از کم میں نے اپنا حلیہ اور موڈ ضرور ٹھیک کر لیا۔

☼ ☼ ☼

پڑھنے کے بعد میں مستقلاً گھر آگیا تھا۔ اماں اور بہنوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ مگر میرا دل تو بس سب کچھ وہاں کھو آیا۔ یہاں کیا تھا؟ سارا دن نوکری کی تلاش۔۔۔۔ رات کو کوفت زدہ سوچیں۔۔۔ بے کلی اور بے چارگی۔۔۔ دل بھاگے بھی ایسی سمت جہاں جانے والے راستے بھی مسدود ہو جائیں۔

میں نے چھوٹی موٹی نوکری شروع کر دی۔ مصروفیت دل کی بے قراریوں اور بوجھل لمحوں کو کم کرنے میں ہمیشہ مددگار ثابت ہوتی ہے۔

☼ ☼ ☼

مجھے دانیال نے انگلینڈ بلوا لیا تھا۔ اماں نے میرا حلیہ بمشکل دو ماہ برداشت کیا۔

"ہانی! تم لندن دانی کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں؟" سرما کی سرد رات میں کھڑکی سے باہر نادیدہ شے کو تکتے ہوئے میں نے چونک کر مما کی طرف دیکھا۔ میرے یخ ہاتھ ان کے ہاتھوں میں تھے۔

"تم وہاں جا کر ایم فل کر لو۔۔۔ بزی ہو جاؤ بیٹا!" مما بے خبر ہوتے ہوئے بھی بہت سی باتوں سے باخبر ہو جاتی ہے۔ میں نے گیارہ دسمبر کو انگلینڈ کی فلائٹ پکڑی۔ مگر "دل" وہ ساتھ نہیں تھا شاید۔

☼ ☼ ☼

زوار نے مجھے ایف بی (فیس بک) پر اسے ڈھونڈنے کا مشورہ دیا تھا اور میں جو فیس بک کے اتنا خلاف تھا۔ آج اس کی اہمیت سے آشنا ہوا۔ دنیا میں کوئی بھی چیز اتنی بری نہیں ہوتی۔ ہر چیز نقصان کے ساتھ نفع بھی دیتی ہے۔ پھول کانٹوں کے درمیان اگ آتا ہے۔ اچھوں سے برے اور برے لوگوں سے اچھے لوگ معاشرے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جہاں مندر ہیں وہاں مسجدیں بھی ہیں۔ جہاں ہاسپٹل ہیں وہاں جیم خانے بھی ہیں۔ زندگی کے پاس ہے ہی کیا؟ بس اچھائی اور برائی۔۔۔ اسی کے دو پیمانے لیے وہ دنیا کے ہر شخص کو تول رہی ہے۔

مجھے وہ مل گئی تھی۔ دل جو پچھلے چار سالوں سے اپنی لے میں دھڑکنا بھول گیا تھا' اب اسی ساز کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ منہ بند کلیاں جو سالوں سے کھلنے کی منتظر تھیں۔ صبح کے تازہ دم بہار کے جھونکوں کو چھوئے بغیر کھل اٹھیں اور میرے خون کی گردش نے میری پوروں کو چھو لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج میں کتنا خوش تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں پھر سے اسے دیکھ پاؤں گی۔ باب المحبت (محبت کا دروازہ) کو پھر سے کھٹکھٹایا گیا اور اس کے پیچھے نڈھال۔۔۔ قید کنیز کو رہائی نصیب ہوئی۔ گالوں پر گلاب کیوں کھلنے لگتے ہیں اور مساموں میں خون خوشی بن کر کس طرح سے دوڑتا ہے؟ میں نے اسے مباحثے میں بھی جیتتے دیکھا تھا اور اسٹڈی میں بھی لیکن جب وہ اپنا سب کچھ لٹا کر میرے پیچھے لندن آیا تو میں نے دیکھا کہ اس نے میرا دل کس طرح سے جیت لیا تھا' اس سے پہلے مجھے وہ کبھی فاتح نہ لگا اور میرا رواں رواں گواہ تھا کہ وہ آج مجھے سب سے بڑا فاتح لگا۔ جس نے میرے دل کی دنیا کو تسخیر کیا تھا۔

"تم ہوش میں تو ہو۔۔۔" مما نے بے یقینی سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ میں ان کی کیفیت سمجھ سکتی تھی۔ جویریہ اور ہادیہ البتہ نارمل تھیں۔

انہیں لگتا کہ مما کو ہاں کر دینی چاہیے۔ پچھلے چار سالوں کی اتری ہوئی میری شکل وہ مزید برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

"تم! میری سب سے سمجھ دار بیٹی ہو۔ میں توقع بھی نہیں کر سکتی تھی۔۔۔" دکھ کی شدت سے انہیں بات مکمل کرنا مشکل ہو گیا۔

"وہ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی۔۔۔ اور جاب بھی کوئی خاص نہیں۔۔۔ گھر بھی کرائے کا۔۔۔ استغفراللہ۔۔۔"

مما کی بات پر ہادیہ کی ہنسی نکل گئی۔

"مما! آپ تو استغفراللہ ایسے پڑھ رہی ہیں جیسے ہانیہ نے اپنی خواہش کا اظہار نہ کیا۔ ہو بلکہ کوئی بلیک معیوب سی بات کر دی ہو۔۔۔" ہادیہ کے کہنے کی دیر تھی۔ مما پھر شروع ہو گئیں۔

"ہاں تو معیوب سی بات ہی ہے۔ ہمارے گھر کے ملازمین بھی ان کے گھر کے افراد سے اچھا پہنتے اور اوڑھتے ہوں گے اور دوسری بات اس طرح کی شادیاں زیادہ تر ناکام ہی ہوتی ہیں۔" مما نے غصے سے کہا۔

"مما! پلیز۔۔۔" میں چیخ ہی پڑی۔

"آپ دولت کو درمیان میں لا کر اس طرح کی تکبرانہ باتیں نہ کریں۔ میرا آج بھی یہ فیصلہ ہے اور ہمیشہ یہی فیصلہ ہو گا کہ مجھے ذیشان کے علاوہ کہیں شادی کے لیے آپ نے ذہنی طور پر آمادہ نہیں پانا۔ اگر آپ نہیں راضی تو ٹھیک ہے۔ میں آپ کی رضامندی کے بغیر کوئی کام نہیں کروں گی۔ مگر پھر مجھے آج کے بعد بھی شادی کے لیے فورس نہ کیا جائے۔" میں خاموشی سے وہاں سے اٹھ آئی۔

میرا خیال تھا اس سال دو سال ماننے میں ہی لگا دیں گی۔ مگر بابا تک بات پتا نہیں جویریہ نے پہنچائی تھی یا خود مما نے۔

میرا اگلے ہی ہفتے ذیشان وصی اللہ سے نکاح کر دیا گیا۔ سادگی سے نکاح ہوا تھا۔ بابا نے مجھے بساط سے بڑھ کر دیا۔ مگر مما نے ہمیشہ میرے لندن میں رہنے کی شرط عائد کر دی۔ ذیشان نے بلا چون چرا مان لیا۔

حاصل کرنے کی مسرت کتنی بڑی ہوتی ہے۔ جب زندگی کی سب سے زیادہ من کو بھا جانے والی چیز آپ کی جھولی میں ڈال دے تو اس سے پیاری زندگی بھلا کیا ہو گی اور انسان تب ہی مات کھاتا ہے۔ جب وہ زندگی کو اس کے اصل روپ میں سمجھ نہیں پاتا دلہن بنی زندگی کے پیچھے بدنما چڑیل چھپی ہوتی۔

☼ ☼ ☼

میرا دل معمول سے ہٹ کر اپنی رفتار پر سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ میں کائنات کے شہنشاہ اپنے رب کے حضور کروڑ دفعہ شکر گزار تھی۔ ذیشان نے اپنی شدت سے اظہار کیا تھا اور کئی وعدوں کا۔ اس کی بے تحاشا محبت کے آگے مجھے اپنی محبت بونے کی طرح لگی تھی۔

"میں نہیں چاہتا کہ تم میرے پیچھے زندگی کو رگڑتی۔ بس میرے قدم سے قدم ملا کر چلو۔۔۔"

"اور مجھے لگتا ہے کہ میں تمہاری ہی ذات کا حصہ ہوں زندگی کی دھوپ چھاؤں ہم دونوں پر ایک ساتھ ہی پڑنی چاہیے" اور مجھے لگا تھا کہ میرے یہ الفاظ ہواؤں نے بھی سنے تھے اور وقت کے لمحوں نے بھی ذیشان نے محبت بلکہ بے تحاشا محبت کو میرے قدموں کے نیچے رکھ دیا تھا اور محبت قدموں کے نیچے ہو تو یہ آپ کو چلنا سکھا دیتی ہے۔ ٹوٹی پھوٹی دیواروں پر زندگی کے رنگ بھرنا۔۔۔ سیلن زدہ چھتوں پر محبت کی قلعی کرنا اور بے رنگ بوٹوں پر محبت کی پالش۔۔۔ زندگی صرف محبت ہے اور محبت زندگی۔۔۔ محبت زندگی کو چمکا دیتی ہے۔ روشنی سی بھر دیتی ہے۔۔۔ اور مجھے یہ کہنے میں عار نہیں یہ روشنی بھی جنت کا نور لگتی ہے۔ جب محبت کے کنویں سے بھر بھر پانی پیاسے مسافر کو ملتا ہے تو وہ ملا جاتا ہے۔ محبت۔۔۔ محبت اور اندھا سنیاسی بنا اسی کے وظیفے پڑھتا رہتا ہے۔

جب کنواں سوکھ جائے تو سنیاسی کیا کرے گا؟ بغیر پانی کے لہلہاتا گلستاں۔۔۔ بنجر نہ ہو جائے گا اور

دھرتی۔۔۔ کبھی اولین سرخ خون کی واپسی نہیں کرتی بلکہ آپ کو نگل لیتی ہے۔

میں نے اس کے ساتھ لندن میں ہی جاب شروع کر دی تھی۔

ذیشان نے پانچ سال تک فیملی پلاننگ کا عہد کیا اور میں بھی مان گئی۔ وہ پانچ سال میں نے اس کے ساتھ لندن میں رات دن مشینی انداز میں گزارے تھے۔ مما نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔

وہ اپنی نازوں پلی بیٹی کو بے تحاشا بھاگ دوڑ کرتے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ ہادیہ کی شادی ماموں زاد فراز سے ہو گئی۔ وہ اس کے ہمراہ امریکہ شفٹ ہو گئیں۔ بابا اور دانی دبئی میں اپنا کاروبار شفٹ کرنے کے چکروں میں وہاں چلے گئے جبکہ میں ذیشان کی ہمراہی میں لندن رہ گئی۔

لندن کی کہر آلود راتوں میں جب ہم تھک ہار کر اپنے فلیٹ پر آتے تو وہ میرے یخ ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں بڑی محبت سے تھام کر مجھے ہزاروں راستے محبت کے ہنڈولے میں بیٹھ کر ازبر کرواتا۔

ہم دونوں نے ان پانچ سالوں میں بڑی محنت کی۔۔۔ انتہائی محنت۔۔۔ محبت کم کی اور محنت زیادہ۔۔۔ ہماری محبت کو ہماری ضرورت نے کھانا شروع کر دیا تھا۔ ایک وقت میں ویسے بھی ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔ مگر کوئی چیز بے کار نہیں ہوتی۔۔۔ کوئی بھی محنت رائیگاں نہیں جاتی۔ پاکستان میں مقیم اس کی پانچ بہنوں میں سے چار اپنے گھر کی ہو گئیں۔ اس کی چھوٹی بہن شہر کے بہترین لاء کالج میں پڑھنا شروع ہو گئی تھی۔ اس کا کرائے کا مکان ذاتی بن گیا۔

☼ ☼ ☼

میری آنکھوں کی کمزوری پہلے حلقوں میں بدلی۔۔۔ خوب صورت بڑی بڑی ساحرانہ نرگسی۔۔۔ شرمیلی اور نجانے کیا کیا۔۔۔ پہلے ان آنکھوں کو حلقوں کی قید ملی۔۔۔ پھر عمر بھر کی۔۔۔

"تم! کتنی ڈل ہو رہی ہو ہانی!"

"یار! اپنی اسکن کا بھی خیال رکھو۔۔۔"

"کیا ہر وقت لانگ شرٹ اور جینز میں رہتی ہو۔۔۔"

"ذیشان! ٹائم نہیں ہوتا اتنے کپڑے پریس کرنے کا۔۔۔ جینز بغیر پریس کیے آسانی سے چل جاتی ہے۔"

"ہانی! تمہارے کینوس شوز سے میں تنگ آ گیا ہوں۔۔۔"

"ذیشان! ہم کپڑوں، جوتوں پر تو پیسے نہیں لگا سکتے۔۔۔ پھر بچت کیا کریں گے۔۔۔"

"ہانی! بالوں کی اسٹریکنگ کروالو۔۔۔ کتنے وائٹ ہو رہے ہیں۔"

"ذیشان! ایک عمر بڑھ رہی ہے۔۔۔ اوپر سے ذہنی کمزوری۔۔۔ خوراک کی کمی۔۔۔"

"تم کھایا کرو۔۔۔"

"ذیشان! بڑی جو ہوتے ہیں۔"

"میں بھی تو ہوں۔۔۔"

"تم! صرف آفس جاتے ہو اور مجھے گھر آ کر بھی سارا کام کرنا پڑتا ہے۔۔۔"

"تمہارے کون سے چار پانچ بچے ہیں۔ جو تھک جاتی ہو۔۔۔"

اس کی بات نیزے کی انی کی طرح ٹھاہ کر کے ڈائریکٹ دل پر جا لگی تھی۔

"ہاں تو بچے ہونے چاہئیں۔" پانچ سال بعد میں دبی دبی زبان میں اپنی خواہش کا اظہار کرتی۔

مما نے چار سالوں میں کوئی تین چکر لگائے تھے اور میری روٹین لائف دیکھ کر ان کا بی پی شوٹ کر جاتا۔ ہادیہ نے انہیں ادھر بھیجنا ہی چھوڑ دیا۔ بابا اور مما مالی مدد کرنے کی کوشش کرتے مگر میرا ہمیشہ سے صاف جواب ہوتا۔

محبت کے مریض جو بن بیٹھے تو اس مرض کی شدت کو بھی خود ہی برداشت کرنا ہے۔

"بچے ہونے تو چاہئیں۔۔۔" پانچ سال بعد اب اسے بھی بار بار خیال آتا۔

شادی کے چھٹے سال میں ہم نے چھوٹی ثناء کی بھی

شادی کروی۔ ذیشان کی امی نے لندن آنے سے انکار کر دیا۔ وہاں ان کے لیے آیا کا انتظام کروایا گیا۔ زندگی کے سب لوازمات سب کے حصے میں آگئے تھے اور میرے حصے میں بھی کچھ نہ کچھ آیا ہی تھا۔

مگر کیا؟

دکھ، پچھتاوا یا پھر کچھ اور... میں عمر کی پینتیس بہاریں پوری کر چکی تھی۔

لندن پارک میں میں شالی کو اچھی طرح اوڑھے بدلتے موسموں کو سمجھ رہی تھی۔ میری کان کی لوئیں اور ناک معمول سے زیادہ سرخ ہو رہے تھے۔

انسان کی اوسط عمر صرف پچیس یا ساٹھ سال ہے زندگی کو تلاشتے زندگی گزر جاتی ہے۔ برف باری ہونے لگی تھی۔ دور کہیں درخت کی اوٹ میں بیٹھی فاختہ کو سردی لگی۔ ساتھ کے درخت سے چڑیا بے چاری کا گھو... تنکا تنکا کر کے کھل رہا تھا اور گھونسلے کو جوڑنا کتنا صبر آزما کام ہوتا ہے۔ یہ اللہ جانتا ہے یا پھر وہ چڑیا... چڑیا اڑنا چاہتی ہے۔ مگر چڑا اپنے زخمی پر اسے دکھا کر اسے اپنے ساتھ ٹھہرنے کو کہہ رہا ہے۔

فاختہ اپنے درخت کے دو ٹوٹے پتے چڑیا کو دیتی ہے۔ وہ اسے بچانا چاہتی ہے۔ سردی سے موسم کی نزاکتوں سے ماحول کی شدتوں سے...

مگر چڑیا تو چڑے کو چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتی۔ وہ اس کے لیے اپنے پر کاٹ بیٹھتی ہے۔ کوئی طوفان نہیں آیا تھا۔ مگر کچھ تھا کوئی خوشبو کوئی ہوا کے ساتھ چار سو بکھر جانے والی خبر جو طوفان سے پہلے طوفان کی آمد کا پتا دے رہی تھی۔

زندگی کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور خود وہ سلو موشن میں چل رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"تو ہانیہ! آج ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لیں۔ تم چیک اپ کرواؤ۔ چھٹا سال چل رہا ہے اور بچہ..." ذیشان نے فکر سے اس کا کندھا تھاما۔

"ویسے بھی کچھ کھایا کرو... بڑی کمزور ہو گئی ہو۔ تمہیں ہاتھ لگا کر محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کسی ڈھانچے کو پکڑ لیا ہو..." بظاہر بشاشت سے کہتا وہ گہری چوٹ دے گیا۔ ہانیہ نے اثبات میں سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

ہانیہ کو دو دن سے ہلکا ہلکا بخار تھا۔ جس اسٹور پر وہ اکاؤنٹنگ منیجر کا کام کرتی تھی۔ انہوں نے ہی اسے ڈاکٹر کو چیک کروایا۔ مکمل چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے اسے دو دن کا ریسٹ لکھ کر دیا تھا۔

ذیشان نے لیڈی گرائن سے ٹائم سیٹ کر لیا۔ وہ وہاں کی بہترین گائنی اسپیشلسٹ تھیں۔ انہوں نے ہانیہ کی تمام رپورٹس کلیئر بتائیں۔

قدرت کی طرف سے دیر تھی ورنہ پیچیدگی تو کوئی بھی نہ تھی۔ وقت کو اپنا فیصلہ وقت پر ہی کرنا ہوتا ہے۔ مگر زندگی وقت کے فیصلوں کی ہمیشہ سے نفی کرتی آئی ہے۔

ہادیہ کے ہاں دوسرا بیٹا ہوا تھا۔ ممی نے اپنے لندن آنے کی خبر سنائی۔

وہ شدت سے ماں بہنوں کو یاد کر رہی تھی۔ ساون میں سب کا آپس میں مل کر بہاولپور کی گلیوں میں چھن سموسے کھانا... شرطیں لگا لگا کر لڈو کھیلنا... وہ ٹائم مشین میں پھنس گئی تھی۔ جہاں پر وجود کو روبوٹ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ وہ اسٹور سے تھک ہار کر اوپر آئی۔ ایک تو فلیٹ بھی سیڑھیوں والا ملا تھا۔ رہی سہی ٹانگوں کی جان بھی سیڑھیاں چڑھنے کے دوران نکل جاتی۔

ابروڈ (باہر کے ملک) میں رہنے والوں سے متاثر ہونے والے افراد میں ہر ایک کو وہ پکڑ پکڑ کر دو تھپڑ رسید کرنا چاہتی تھی۔ جو اجنبی زمینوں کی خاطر اپنے گھروں کے سکون آرام کو برباد کر کے چلے آتے ہیں۔ جو تھوڑے کو ناکافی سمجھتے ہیں اور زیادہ کی چاہ میں جسموں کو ایندھن کی طرح آگ میں جھونک دیتے ہیں۔

صرف ایک زندگی... ایک بار کے بعد دوبارہ نہ ملنے والی... زندگی کو دیار غیر میں اجنبیوں کے ہاں گروی رکھوا دیتے ہیں۔

"مجھے پانی لا دو..." وہ بیڈ پر پاؤں پسارے ریموٹ کی مدد سے چینل گھمانے میں لگا ہوا تھا۔

اس کی آہٹ سے ہی وہ پہچان گیا تھا کہ وہ ہانیہ ہے۔ اس کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ کی گئی۔ زمانوں کی تھکن اس کے چہرے پر رقم تھی۔ وہ نیم جان ہو کر پانی لینے چل دی۔

ہادی کو عشق کی خاطر لندن کے صحرا میں مات ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ممی اتنی کی شام کو اس کے ہاں پہنچیں وہ ہانیہ کی شکل دیکھ کر ہی رو پڑیں۔

"ہانی! تم بیمار ہو کیا ہوا تمہیں بیٹا؟" کمزور وجود... دھنسی آنکھیں۔ سوکھے ہونٹ... ان کی وہ شگفتہ کلی مرجھا گئی تھی۔

"ممی! آپ بیٹھیں۔ میں آپ کے لیے جوس لاتی ہوں۔"

ہانیہ نے پوری کوشش کی تھی لہجے کو بشاش کرنے کی۔ جبکہ ممی تاریکی میں اندازے لگانے لگی تھیں اور تاریکی میں بعض دفعہ صحیح مقام اور چیزیں مل ہی جاتی ہیں۔ ممی نے ذیشان کو کھری کھری سنائی تھیں۔

"ذیشان! ہانیہ کو بوجھ ڈھونے والا گدھا نہ بناؤ... بیوی ہے تمہاری۔" وہ برس ہی پڑیں۔

"کیا مطلب ہے آپ کا آنٹی۔" ذیشان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ہانیہ اس صورت حال پر بوکھلا گئی تھی۔

"ممی! پلیز... چپ کریں، میں اپنی خوشی سے کام کرتی ہوں۔ ذیشان تو میرا بڑا خیال رکھتے ہیں۔" وہ منمنائی۔

"خاک خیال رکھتا ہے... یہ تو میری بیٹی کے جوڑوں میں ہی بیٹھ گیا ہے۔ یہ کیا اس کی ماں بہنیں بھی... معصوم سی میری بیٹی... تر نوالہ سمجھ کر ہی اسے نگل گئے ہیں۔ اکیلی نہیں ہے... ابھی اس کی ماں زندہ ہے۔" ممی کا بس نہ چل رہا تھا کہ ذیشان سے ابھی ہانیہ کی علیحدگی کروا دیتیں۔

"آنٹی نے جتنے دن یہاں رہنا ہو تو مجھے بتا دینا۔ اتنے دن کے لیے میں اپنے دوست کا فلیٹ شیئر کر لوں گا اور آج کے بعد میں دوبارہ ان کے منہ سے اتنے گھٹیا الفاظ نہیں سنوں گا۔" ذیشان کا سرد لہجہ اور سرد آنکھیں اسے ٹھٹھرا رہی تھیں۔

"ہاں تو کیا کرو گے تم..." ممی کا جوش پھر بلند ہوا۔

"میں آپ کی بیٹی کو طلاق دے دوں گا۔" اس نے مزید لہجے کو ٹھنڈا کیا۔

"دے دو... دو ابھی طلاق، اگر غیرت مند ماں کے بیٹے ہو۔" ممی کی للکار پر ہانیہ کی چیخ نکل گئی۔

"نہیں ممی! پلیز چپ کر جائیں..."

"ٹھیک ہے... ہانیہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں... طلاق... طلاق۔"

"نہیں ذیشان... پلیز اسٹاپ اٹ ذیشان، ذیشان" ہانیہ کے ہونٹ ہلتے ہی رہ گئے۔ مگر وہ چلا گیا کبھی نہ آنے کے لیے پل بھر میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ اپنی پوری زندگی اسے دان کر چکی ہے۔ وہ اس کے پیچھے اپنے پر کاٹ کر اڑنا بھول چکی ہے۔

وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر نہ جائے۔ دنیا کا جنگل بڑا بیابان ہے۔ وہ بھٹک جائے گی... کھو جائے گی... ذیشان... اس وجود پر تمہارا لمس ہے اور اسے کسی کی ضرورت نہیں۔ وہ رونا چاہتی تھی۔ ممی پر... ذیشان پر مگر حیرت انگیز طور پر وہ چپ تھی بڑی چپ۔

☼ ☼ ☼

ایک گمبھیر چپ نے اس کے وجود کو چادر کی طرح ڈھانپ دیا تھا۔ اس کی چپ امریکہ پہنچنے تک بھی نہ ٹوٹی تھی۔

"میں نہیں چاہتا کہ تم میرے پیچھے زندگی کو رول دو... بس میرے قدم سے قدم ملا کر ضرور چلو..."

"اور مجھے لگتا ہے کہ میں تمہاری ہی ذات کا ایک حصہ ہوں۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں ہم دونوں پر ایک

ساتھ ہی پڑنی چاہیے۔"

آوازیں بازگشت بن گئیں اور بازگشت واہمے.... واہموں سے یقین اور یقین سے حقیقت کا سفر کوئی اتنا دور تو نہ تھا۔ ہادیہ اسے کھانا کھلا دیتی تو وہ کھا لیتی.... ممی سارا دن اس کے پاس بیٹھی رہتیں وہ سب اس سے باتیں کرتے.... مگر وہ اس سے باتیں کرتی....

ممی سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جاتیں۔ اس کی تحلیل نفسی کی گئی۔ اسے ہپناٹائز کیا گیا.... وہ انگریزوں کے ملک میں جدید مشینوں کے آگے بیٹھ کر بھی اپنا دکھ بیان نہ کر سکی۔ سب نے فرسٹریشن.... اور ٹینشن کا مسئلہ قرار دیا.... بڑی بڑی رپورٹس بنائی گئیں ممی نے پیسہ پانی کی طرح لٹایا۔ مگر وہ گھائل ہو گئی تھی پاگل ہو گئی بے چین....

وہ بتانا چاہتی تھی کہ اس کا نہ ہونا.... اس کے ساتھ نہ ہونا.... اسے سب کچھ بے قرار کر رہا تھا وہ بے گھر نہیں "بے دل" ہوئی ہے.... وہ جی رہی ہے.... مگر دل کے بغیر.... اس کا وجود صرف ایک ہی بات پر اصرار کر رہا تھا کہ وہ اس کے پاس رہتا.... وہ اس کے ساتھ رہتا۔

ٹیکنیکل.... ملک مشینی لوگ اور وہاں کی مسحور جاگتی راتیں۔ کوئی چیز بھی تو اسے خوش نہ کر رہی تھی وہ عشق کے سامنے بے بس کھڑی تھی مصنوعی لوگوں کے درمیان "اصل محبت" قیامت بن کر اسے ستا رہی تھی۔

وہ روتی تھی.... گھنٹوں....

ہادیہ ممی سے لڑتی.... کہ اگر ہانیہ خوش تھی تو آپ نے اسے یہ تڑپ کیوں دے ڈالی۔ برباد کر کے رکھ دی اس کی زندگی....

یہ کس طرح کا انداز آپ نے اپنایا اس پر ستم ڈھانے کا۔"

پاکستان میں بیٹھی.... جویریہ اپنی قابل بہن کی قابل رحم حالت پر پریشان پریشان روتی.... روئی رہتی۔

ہادیہ نے پاپا اور دانی کو ایک مہینے کی صبر آزما کیفیت سے گزر کر سب کچھ بتا دیا۔ پاپا کا تو سنتے ہی بی پی شوٹ کر گیا۔ دانی نے امریکہ کے لیے سیٹیں بک کروانے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ بڑی قیامت گزری تھی سب کے دلوں پر....

"ہانیہ! جو ہوا بھول جانا آسان نہیں مگر اتنا رو کر پاگل ہو کر کیا حاصل ہو گا؟"

دانی نے محبت سے اس کا سر اپنے کندھے سے لگایا۔

"دیکھو! تم میری بہنوں میں سب سے زیادہ سمجھدار ہو.... اپنی زندگی برباد نہ کرنا.... ہانیہ! زندگی صرف ایک دفعہ ملتی ہے اور اس زندگی میں دکھ بار بار آتے ہیں۔ دکھوں کو نہ تو جان کا روگ بنانا چاہیے نہ ہی عمر بھر کے لیے ان کو اپنے اوپر حاوی کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کچھ دکھ آنے والی زندگی میں کوئی بہتر موڑ لے کر آئیں...."

ایک پانی کا قطرہ اس کی آنکھ سے ٹپکا تھا۔ جیسے آسمان سے ننھا ستارہ روٹھ کر اپنے جھرمٹ سے ناتا توڑ بیٹھا ہو۔

☆ ☆ ☆

روزگار زندگی نے سب کو مصروف کر دیا۔ بس اس کی رواں دواں بھاگتی دوڑتی زندگی کی گاڑی پنکچر ہوئی تھی۔ جسے گیئر لگانے کی.... تیل ڈالنے کی ضرورت تھی۔

"میں چاہتی ہوں تم کوئی جاب کر لو.... یا آگے کچھ پڑھ لو...." ممی نے اسے لاؤنج میں پڑے کاؤچ پر نیم تاریکی میں لیٹا ہوا دیکھ کر کہا۔

"کیا کروں گی؟ جاب پہلے بھی تو کرتی تھی۔" وہ بالوں کو کیچر لگانے لگی۔

"پہلے والی زندگی بھول جاؤ...." مسز احسان کو اپنی بیٹی کا یوں سوگ منانا اچھا نہ لگا تھا۔

"بھول جانا اتنا آسان نہیں ہوتا...." وہ اپنے ناخنوں کو ایک دوسرے پر رگڑتے ہوئے بولی۔

"اتنا مشکل بھی نہیں ہے...." وہ غصے سے بولیں

"آپ کے لیے مشکل نہیں.... آپ کے لیے تو بہت آسان ہے...." وہ بے رخی سے بولی۔

"کیا تم مجھے بار بار یاد دلانا چاہتی ہو کہ میں نے تمہارے لیے غلط کیا۔ اس ٹٹ پونجیے نے اپنا مفاد نکال کر دو سیکنڈ نہیں لگائے تمہیں ٹھوکر مارنے میں" لفظ ٹھوکر پر اس کے چہرے کی رنگت بدلی تھی۔

"ممی!...." ایک چیخ.... گولہ بن کر حلق میں اٹک گئی۔

"پاپا! مجھے کراچی جویریہ کے پاس بھیج دیں۔" اس نے دبئی باپ کو فون کھڑکا دیا۔ سب کے منع کرنے کے باوجود امریکہ کا شاندار مستقبل ٹھکرا کر کراچی آ گئی۔ جویریہ نے اس کے لیے لان کے پاس والا کمرہ سیٹ کروا دیا۔

"میں چاہتی ہوں تم یہاں مکمل آرام محسوس کرو...." وہ محبت سے ہانیہ کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولی۔

"ممی، تمہارے پاکستان آنے پر خوش نہیں...." جویریہ نے اس کا سامان الماری میں سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

"ممی مجھ سے ویسے بھی خوش نہیں...." وہ لاپرواہی سے بولی۔

"ہانیہ ممی ہم میں سب سے زیادہ تم سے محبت کرتی ہیں۔ کوئی بھی ماں اولاد کے لیے برا نہیں سوچ سکتی۔ تم ممی سے اتنی بدگمان کیوں ہو رہی ہو؟ وہ شخص واقعی دنیا deserve نہیں کرتا تھا۔ جتنا تم خود کو اس کے لیے قربان کر چکی ہو۔"

"وہ اتنا برا بھی نہیں تھا۔ وہ میرا شوہر تھا۔ اس کے ساتھ میرا چھ سال سے ایک تعلق تھا۔ مائیں تو بیٹیوں کے گھر بساتی ہیں 'اجاڑتی نہیں'۔ دنیا کا کوئی مرد ایسا نہیں جو اپنی بیوی سے کچھ برا نہ کرے.... اس نے کیا انوکھا کام کر دیا تھا...." وہ جویریہ کو سامنے پا کر کافی دنوں کی بھڑاس نکال رہی تھی۔

"دنیا کا وہ بے وقوف مرد ہوتا ہے۔ جو ذرا سی تلخ کلامی پر دو منٹ کے اندر آپ کو بے کار رزہ سمجھ کر اپنی زندگی سے نکال باہر کرے۔" جویریہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ بولے۔

"وہ پانچ سال تک اس لیے بچے نہیں پیدا کرنا چاہتا تھا کہ اسے اپنی بہنوں کو سپورٹ کرنا تھا۔ کیا وہ سب کے رزق کا مالک تھا؟" جویریہ کو مکمل صاف گوئی کا مظاہرہ کرنا پڑا۔

"مگر مجھے اس سے محبت ہے۔ وہ میرا شوہر تھا۔ میں پوری زندگی اس کے بغیر کیسے گزاروں گی...." وہ بے بس.... زخمی خوفزدہ ہرنی کی طرح بولی۔

اس وقت جویریہ کو اس کی حالت دیکھ کر خود بھی بے تحاشا دکھ محسوس ہوا۔

"ہانیہ! کوئی بھی اچھا شخص دیکھ کر ہم تمہاری شادی کر دیں گے...." وہ محبت سے اسے خود سے لپٹاتے ہوئے بولی۔

"شادی؟ نہیں کبھی دوبارہ ایسا مت کہنا بلکہ سوچنا بھی نہ.... مجھ میں اب ہمت نہیں۔ میں نے ایک کو ہی بھگت لیا۔" وہ..... آنکھوں کو مسلتے ہوئے بولی۔ جیسے ڈراؤنے خواب سے جاگی ہو۔

"دنیا کی بہت سی عورتیں دوسری شادی کرتی ہیں۔ کسی ایک کے پیچھے تو دنیا برباد نہیں کرتے...."

"میں ان عورتوں میں سے نہیں...." جویریہ کی بات پر وہ تڑپ اٹھی۔

"پر عورت ضرور ہو.... اور عورت کا اکیلے رہنا مشکل ہے" جویریہ تھک گئی تھی اسے سمجھا سمجھا کر۔

"بہت سی عورتیں ایسے رہتی ہیں...." وہ اسے مزید بحث کا موقع دیے بغیر واش روم میں گھس گئی۔

پہلے اس نے لان میں پودوں کی کاٹ چھانٹ کی پھر پرندوں کے دانے اور پانی کے باؤل صاف کر کے بھرے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پرندوں کے غول دانا چگنے آ گئے۔

ہلکے بادلوں نے سورج کی روشنی کا راستہ روک رکھا تھا اور قدرت کے قانون میں بعض رستوں کا رک جانا آنے والی آندھی سے بچاتا ہے۔ خوشیوں کی نئی نوید سناتا ہے۔

چڑیا کو دانا کھانے کی جلدی تھی۔ کائیں کائیں کرتا کوا اپنی باری کے انتظار میں تھا اور صدیوں کی بھوکی کوئل بھی کوکتی پھر رہی تھی۔

”عورت کے مقدر میں بھوک نہیں رکھی جاتی۔ بھوک“ تو مرد کا مقدر ہے۔ عورت کو تحفظ چاہیے ہوتا ہے اور مرد کو عورت۔“ جویریہ نے اس کا انہماک توڑا تھا۔

”بعض عورتیں بھی تو بھوک نہیں چاہتیں ”مرد“ چاہتی ہیں۔۔۔“ اس نے بھی جواب دیا۔

”مگر پھر بھی وہ ”مرد“ کے پیچھے بھی بھوک کی خاطر بھاگتی ہیں۔۔۔“ جویریہ نے اپنی قابل بہن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”پھر زندگی اس بھاگم بھاگ ’پکڑ دھکڑ‘ میں کیوں گزر جاتی ہے۔۔۔“ نمکین پانی سے بھری آنکھیں اس نے جویریہ پر جمائی تھیں۔

”ہانیہ! زندگی ان نمکین پانیوں سے بھی پرے کی کوئی چیز ہے۔ یہ تو راستہ ہیں دل سے درد تک کا اور درد۔۔۔ منزل بن جاتا ہے۔“

”تم اتنی گہری باتیں کیسے کر لیتی ہو۔“ وہ جویریہ کی ذہانت پر حیران ہوئی۔

”یہ بھی زندگی کی مہربانی ہے۔ وہ دانا ڈالنے والی لڑکی دیکھ رہی ہو۔ اس بڑے سے گھر میں صرف دو عورتیں ہیں۔ ایک یہ اور ایک اس کی بڑی بہن۔ ٹارگٹ کلنگ میں اس کا شوہر، بھائی اور باپ مارے گئے۔ ماں پہلے نہیں تھی۔ بڑی اس کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑ کر آئی ہے۔ مگر کتنے دنوں کے لیے؟ آخر تو اس نے اپنے گھر جانا ہے۔ ان عورتوں کے دل کا اندازہ لگاؤ جن کے گھر کا کوئی مرد نہیں بچا۔

یہاں ایک شفیع صاحب رہتے ہیں۔ ٹی وی ڈراموں میں کام کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک چھوٹی سی این جی او کراچی کے لوگوں کے لیے بنا رکھی ہے۔ جہاں ایسے cases ہوں وہ مدد کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔۔۔ یہ گھٹن زدہ معاشرے میں تبدیلی کا تازہ جھونکا ہے۔ ہم اپنے پیاروں کو بچا نہیں پا رہے تو کم از کم ان کی اپنے اپنے انداز سے مدد تو کر سکتے ہیں۔

بتانے کا مقصد ہے کہ یہ بھی زندگی کا ایک پہلو ہے اور زندہ رہنے کے ایسے بھی اسباب پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ ہم خود بعض چیزوں کو فرض کر لیتے ہیں اور تلخ سے تلخ ماحول بنا لیتے ہیں۔ اس دنیا میں وہی کامیاب ہیں جو دکھوں کو ٹھوکر مارنا سیکھ لیں۔ لوگوں کے بغیر رہنا سیکھو ہانی! یہ زندگی سب کو اکٹھا نہیں رکھتی۔ جو آپ کو ٹھکرا دے جس کے لیے آپ کی ذات تنکے سے بھی ہلکی ہو تو دل میں اٹھنے والی ذرا سی خلش بھی دل سے نکال پھینکو۔ ہم کیوں اہمیت دیں انہیں جو ہمیں ڈس اون (اپنائے نہ) کر دے۔“

جویریہ اس کی دماغی تھراپی ڈاکٹر سے بھی زیادہ اچھی کر رہی تھی۔ وہ زندگی کو پزل گیم میں پھنسی تصویر کی مانند ٹکڑیوں میں سیٹ کر کے دکھا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج وہ ٹریک پر جانا چاہ رہا تھا۔ کچھ بھی اچھا نہ لگ رہا تھا۔ سوکھے توس کھا کر ٹریک پر آنا زہر سے بھی زیادہ برا تھا۔ ہمیشہ وہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔

سب سے پیچھے درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلی اکلوتی ٹہنی اسے دیکھ کر مسکرائی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ اپنے شجر سے بچھڑ کر یوں اکیلے پڑے رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

اس نے ہندوستان سے آئی انجلی شرما سے دوستی گانٹھ لی۔ وہ تنہائی کی بہترین ساتھی ثابت ہوئی۔ مگر اپنا کام نکلوا کر وہ اسے یوں چھوڑ گئی تھی جیسے کبھی ملی نہ ہو۔

اسے کھانے کا سامان خریدنے میں بھی دقت تھی بھوک سے نڈھال جسم کو گھسیٹتا وہ سانتا کلاز کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ”بھوکے ہو“ سانتا کلاز نے انگلش میں پوچھا۔

”یہ لو یہ پہن لو۔“ جوکروں والا ایک کاسٹیوم اس نے اس کی طرف اچھالا تھا۔

”تم بھی آج سے یہاں میرے ساتھ کھڑے ہو گے کمائی money (رقم) جمع ہو جائے گی۔ پھر پیٹ بھی بھرا رہے گا۔“

وہ بت بنا سنے گیا۔ ذیشان وصی اللہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی تھی کہ زندگی کے پرچے میں پورے مارکس لیتے لیتے یکدم فیل ہونا کیسا لگتا ہے؟

☼ ☼ ☼

بادل کی گرج چمک زوروں پر تھی۔ وہ بے خوفی کے ساتھ این جی اوز کے دیگر ممبران کی مدد کرانے میں لگی ہوئی تھی۔ اس کا کام پیکنگ ڈیپارٹمنٹ کو چیک کرنا تھا۔ صاف ستھرے طریقے سے اشیاء خورد و نوش کو ڈبوں میں سمیٹا جا رہا تھا۔ بم بلاسٹنگ سے متاثرہ افراد کے لیے کھانے کی چیزوں کا بندوبست تھا۔

”میم! آپ کو جواہر صاحب بلا رہے ہیں۔“ شفیع صاحب کے بھانجے بھی اسی این جی او کا حصہ تھے۔

”آجائیے مس ہانیہ! ہمارے ساتھ مل کر کھانا کھا لیجیے۔“ وہ بشاشت سے ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے آفس کے کمرے کے ایک طرف کھانے کے لیے لگائی جانے والی ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

مین ایج گزر چکی تھی۔ اب وہ پینتیس سالہ خاتون تھی۔ ان کے ساتھ ، جبیں بھی کام کرتی تھی۔ وہ بھی آکر بیٹھ گئی۔ کوفتہ بریانی بنی ہوئی تھی ساتھ کھیرے کا رائتہ۔

”تم! اتنے امیر بندے ہو اور کھانا کھاتے ہوئے غریبوں کو بھی مات کرتے ہو۔۔۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حیران ہوا۔

”مطلب یہ ہے کہ بندہ دو چار اور ڈشز منگوا لیتا ہے۔“ جبیں نے اپنے بالوں کو کانوں کے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

”پیٹ ہی تو بھرنا ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ مسکرایا۔۔۔ ہانیہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ سنجیدہ چہرہ۔۔۔ روشن مگر پُرعزم آنکھیں۔۔۔ ستواں ناک۔۔۔ اور کھلتی ہوئی گندمی رنگت۔۔۔ مردوں کی اٹریکٹ کی جانے والی خوب صورتی۔۔۔ اگر ہوتی کوئی اور خاتون تو یقیناً ”سر جواہر کی چھا جانے والی شخصیت پر ضرور الجھ جاتی“ وہ محض سوچ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

کاسنی پھولوں پر کب سے ایک ہرے رنگ کی تتلی منڈلا رہی تھی۔ وہ غور سے اس کا معائنہ کر رہی تھی۔

”بندہ جتنا بھی خوش اور آزاد ہو۔۔۔ مگر اس تتلی کی طرح آوارہ نہ ہو۔۔۔“ جمشید صاحب گلا کھنکار کر غالباً کچھ اور کہنا چاہتے تھے۔ ہانیہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ جویریہ کے سسر تھے اور پچھلے کئی سالوں سے اردو کے استاد بھی مگر ہر وقت کسی نہ کسی فلسفے میں الجھے رہتے۔

”چلو آؤ ادھر بیٹھو۔۔۔“ وہ اسے حکمیہ انداز میں کہتے لان کی چیئرز پر آ گئے۔

”جویریہ بتا رہی تھی کہ تمہارا شوہر کافی خود غرض انسان تھا۔ جس نے محض ایک معمولی جھگڑے میں عمر بھر کی تمہاری ریاضت برباد کر دی۔“

”جی انکل۔۔۔“ وہ تذبذب کا شکار ہوئی۔ اس زیرک انسان کی نظروں سے اس کی ہاتھوں کو مسلنے والی حرکت پوشیدہ نہ رہ سکی۔

”دیکھو بیٹی! میرے لیے تم بھی جویریہ کی طرح ہی ہو۔ جو بات میں تمہیں سمجھانا چاہ رہا ہوں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تمہارا باپ تمہیں سمجھاتا۔ مگر خیر۔۔۔ تم شادی کر لو۔۔۔ دربدر ہونے سے تو بہتر ہے خدا را اس کا یہ مطلب نہ لینا کہ میں تمہیں یہاں سے جانے کو کہہ رہا ہوں۔۔۔ میں ایک باپ کی طرح تمہیں سمجھا رہا ہوں۔“

”جی انکل! میں سوچوں گی۔“ ہلکی سی آواز میں اس نے خود کو کہتے سنا۔ وہ اسے کچھ اور نصیحتوں کا پلندہ تھما کر چلے گئے۔

”میری زندگی کتنی بے وقوف سی ہو گئی ہے۔ اگر تم ایسا نہ کرتے تو مجھے دنیا کے سامنے یوں تو نہ بار بار موضوعِ گفتگو بننا پڑتا۔“

بہت ساری سوچیں صرف سوچیں ہی بن کر رہ

جاتی ہیں۔ سرما کی چمکیلی دھوپ اور بے پروا آزاد آوارہ تتلی بھی اس کی سرگوشیاں ہمہ تن گوش ہو کر سن رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ گرین ولیج کے پاس سانتا کلاز بنتا۔۔۔ وہاں لوگوں کا رش زیادہ تھا اور کافی رقم جمع ہو جاتی۔ وہسکی پیتے۔۔۔ بانہوں میں بانہیں ڈالے کچھ ہپی قسم کے جوڑے۔۔۔ ننھے امریکیوں کے بچے۔۔۔ حبشی قسم کے بابے۔۔۔ کوئی نہ کوئی کچھ نہ کچھ رقم اس کے Happy Ball میں پھینک کر جاتا اور وہ مختلف شکلیں بنا کر ان کو ہنساتا۔

"تمہارے پاس تو تعلیم ہے تم اور کام کیوں نہیں کرتے۔۔۔" اس کے ساتھی سانتا کلاز نے ایک دن اس کے منہ سے جون کیٹس کا ایک خوب صورت اوڈ سنتے ہوئے کہا۔

"میں محنت کرنا بھول گیا ہوں۔" وہ خود سے ہم کلام ہوا تھا۔

اس کے ساتھی سانتا کلاز نے اسے دور افق کے پار کچھ ڈھونڈتے پایا۔ "جب آپ ناکارہ ہو جاؤ' جب آپ خود سے بھی زیادہ دوسروں سے محنت وصول کرو اور وہ کوئی "دوسرا" آپ کو جان سے بھی زیادہ عزیز ہو تو پھر آپ کی زندگی الفریڈ لارڈ کے "idle Tears" جیسی ہو جاتی ہے۔

Tears' idle tears' I know
not what they mean
Tears from the depth
of some devine Despair
Rise in the heart
and gather in the eyes
In looking on the
happy autumn Fields
And thinking of the
days that no more_

"آنسو' ست آنسو' مجھے پتا ہے کہ ان کا کیا مطلب ہے۔ آنسو جو مایوسی کی گہرائیوں سے دل سے اٹھتے ہیں اور آنکھوں میں جمع ہوتے ہیں۔ ایک خوش کن خزاں کے کھیت میں کھڑے میں سوچ رہا ہوں کہ دن خوشی کے مزید نہیں ہیں۔۔۔)

دوسرا سانتا کلاز نا سمجھی سے اس کی ذہنی کیفیت کو محسوس کرتا رہا اور نا سمجھی سے کسی بھی شخص کی شخصیت کے بارے میں بہت سے تاثرات بس یونہی بنا لیے جاتے ہیں۔

"تمہیں پتا ہے کہ تم کتنے عرصے سے پیسے نہیں بھیج رہے۔۔۔" اس کی ماں کا پاکستان سے فون آیا تھا۔

"ہاں! وہ رو رہا تھا۔ لندن کی سڑکوں پر ٹھٹھرتے ماڈرن فقیروں نے ایک سانتا کلاز کو روتے دیکھا۔ جو پاکستان کی ایک یونیورسٹی سے ایم بی اے کی ڈگری وصول کر چکا تھا۔ ایک شاندار۔۔۔ جوان مرد۔۔۔ سانتا کلاز۔۔۔ رو رہا تھا بچوں کی طرح۔۔۔ وہ ماں کو بتا رہا تھا کہ اس نے کیسے مشتعل ہو کر ہانیہ کو طلاق دے ڈالی تھی۔ مگر اس کی ماں کے لیے اس کو دینے کے لیے کوئی دلاسانہ تھا سوائے برہمی کے۔

"اس لڑکی نے تمہارا ساتھ دے کر تمہاری غربت کے دن ختم کیے۔۔۔ تمہاری بہنوں کے لیے اچھا مستقبل بنایا وہ تو اللہ کی طرف سے بہترین تحفہ تھی۔ تمہیں اتنی گھٹیا حرکت کرتے شرم آنی چاہیے۔" وہ بے حد دکھی ہو گئیں۔

وہ ماں کو یہ نہ بتا سکا کہ اس نے اسے اتنی "محبت" دی ہے۔ اس کی اتنی "پروا" کی ہے کہ وہ خود کچھ دینے کی پوزیشن سے نکل گیا ہے۔ وہ تو صرف وصول کرنا جانتا تھا۔ پہلے ماں اور بہنوں کی محبت اور پھر بیوی کی محبت۔۔۔ وصول شدہ محبت ہمیشہ محبت کا مذاق ہوتی ہے۔ محبت "وصولی" کی کیفیت میں آجائے تو سارے رنگ روپ کھو کر پھیکی سی رہ جاتی ہے۔ محبت کا سمندر تب ہی گہرا ہوتا ہے۔ جب اس کے اندر کچھ دینے کی بھی صلاحیت ہو۔

☆ ☆ ☆

"تم! واپس جا رہی ہو۔۔۔" جویریہ کو اس کے اچانک فیصلے پر حیرانی ہو رہی تھی۔

"ہاں۔۔۔"

"مگر کیوں۔۔۔؟ کیا کسی نے کچھ کہا؟" وہ پریشان ہوئی۔

"نہیں جویریہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔۔۔" وہ سوٹ کیس کی زپ بند کر رہی تھی۔ صبح کی فلائٹ تھی۔ وہ رات میں ہی پیکنگ مکمل کرنا چاہ رہی تھی۔

"مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"جویریہ! اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ بس میرا دل نہیں لگ رہا پاکستان میں۔"

"تمہارا کہیں دل لگے گا بھی کہ نہیں۔۔۔" وہ غصے سے بولی۔

"دل۔۔۔ ایک دل کا ہی تو مسئلہ ہے۔۔۔" وہ افسردہ ہوئی۔

"جواہر کے رشتے پر غور کر دہانی۔۔۔!" جویریہ نے دبی زبان میں اپنا مدعا بیان کیا۔ دراز کے اندر سے ضروری اشیاء نکالتے اس کے ہاتھ وہیں تھم گئے۔

"کیا غور کروں؟ نہیں کرنی شادی۔"

"وہ شخص بہت اچھا ہے۔۔۔" اس کے دو ٹوک الفاظ پر جویریہ منمنائی۔

"ہر شخص ہی اچھا ہے۔ بس میرے علاوہ۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"تم نے زمین و آسماں کا بڑا مسئلہ بنا لیا ہے۔" جویریہ نے اسے کندھوں سے تھاما۔

"جب طلاق ہوتی ہے تو آسماں بھی یونہی کانپتا ہے۔۔۔ جیسے میری روح کانپ رہی ہے۔۔۔"

"آج کل کے دور میں ایسے حادثات معمولی بات ہے۔" جویریہ اپنے موقف پر قائم تھی۔ وہ چپ ہی رہی۔

"بہرحال' جب شادی کا ارادہ ہو تو جواہر کے لیے ضرور سوچنا۔۔۔" ہانیہ کو کشادہ روشن آنکھیں۔۔۔ منزل کی راہنمائی کرتی ہوئی یاد آئیں۔۔۔

"یہ لو جواہر سے بات کرو۔۔۔" جویریہ نے موبائل

پر نمبر پریس کیا۔
ہانیہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔
"منہ مت بناؤ۔۔۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔۔۔ اور بات کر کے جو جواب دینا ہو خود ہی دے لینا۔۔۔"
جویریہ کو اس کی گالوں کی لالی سے ہی متوقع رد عمل کا احساس ہو گیا تھا۔
اتنے میں دوسری طرف سے فون ریسیو کر لیا گیا۔ جویریہ اس کے ہاتھ میں موبائل تھما کر خود باہر چلی گئی۔
"ہانیہ! مجھے آپ کی طلاق کا پتا ہے۔ مجھے کوئی طوفانی قسم کی محبت بھی آپ سے نہیں ہوئی۔ میں نے صرف آپ کو پسند کیا ہے۔ وہ بھی آپ کی کچھ اچھی عادات کی وجہ سے مجھے جویریہ کے ذریعے پتا چل چکا ہے کہ آپ اپنے سابقہ شوہر سے کتنی محبت کرتی تھیں۔ میرے پاس اتنا ظرف ضرور ہے کہ کبھی بھی آپ اس کو یاد کر کے رونا چاہیں تو میرا کندھا حاضر ہو گا۔ میں آپ کو اور تو کچھ نہیں عزت۔۔۔ قدر اور رشتوں کا مان ضرور دوں گا۔" اتنے اچھے الفاظ میں اس نے اسے پرپوز کیا تھا۔ وہ جو دو ٹوک فیصلہ سنانے جا رہی تھی۔ سوچنے کی مہلت مانگ کر فون بند کر چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ لندن چلی گئی۔ اسی اسٹور میں دوبارہ سے کام شروع کر دیا جہاں پہلے کرتی تھی۔
وہی راستے۔۔۔ وہی موڑ۔۔۔
"تم فوراً ہانیہ کو واپس بلاؤ۔۔۔" اس کی ماں نے پاکستان سے فون کر کے اسے حکم دیا تھا۔
"میں اور تمہاری بہنیں تمہاری اس حرکت پر سخت ناخوش ہیں۔ میں نے دو تین علماء اکرام سے فتویٰ لیا ہے۔ طیش کے عالم میں دی جانے والی طلاق واقع نہیں ہوتی۔"
"تم نے بھی تو طیش میں آکر ایسا کیا نا۔" ماں کی بات پر امید کی کرن جاگی تھی۔ وہ گم سم سنے جا رہا تھا۔
"میں ہانی کی ماں سے بات کرتی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

مغربی بیچ کے ساحل پر سفید کبوتروں کی مانند بگلوں نے اونچی اونچی [illegible] بھرنی شروع کر دی تھیں۔ نیلگوں سمندر میں تیرتی مچھلیاں، بگلوں کی آمد پر بے چین ہو جاتیں۔ نجانے کون سا بگلا ان میں سے کسی ایک کو چونچ سے پکڑ کر نگل جائے۔
ساحل کی چمکیلی ریت پر عجیب بے ڈھنگے انداز میں بیٹھے سانتا کلاز۔۔۔ یورپین گانوں کی دھن پر بچوں سے [illegible] کرتے رہے۔ آوارہ پھرتے ایک آرٹسٹ نے ایزل پر اس پورے منظر کو رنگوں اور برش کی صورت میں اتارنا شروع کر دیا۔
ساحل کی ریت پر اپنی افریقن سہیلی کے ہمراہ وہ مسلسل اپنی ہرجائی سانتا کلاز کی حرکتوں کو نوٹ کر رہی تھی۔ ساتھی سانتا کلاز کی وہ مسلسل منتیں کر رہا تھا کہ وہ اسے چین کیک لا دے۔ وہ شاید بھوکا تھا اور بھوک سے نڈھال جسم ارد گرد سے بے نیاز تھا ساتھی سانتا کلاز نے اپنا جھوٹا کیک اس کی طرف بڑھایا جیسے وہ بے صبری سے کھا گیا تھا۔
"تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا؟" اس کی افریقن سہیلی سسلی نے اس سے پوچھا۔
وہ منظر میں کھوئی سوچوں کو جھٹکے سے اپنی دماغ کی دیواروں سے جھاڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
"پتا نہیں۔۔۔" وہ مختصراً بولی۔
"میں ابووانہ کے ساتھ واپس ساؤتھ افریقا جا رہی ہوں۔۔۔" اس نے ہانیہ کو اطلاع دی۔
"ممی کو لگتا ہے کہ وہ میرے ساتھ زیادتی کر چکی ہیں۔ وہ ذیشان کی ممی کے کہنے پر ہمیں دوبارہ ملانا چاہتی ہیں۔"
"ڈیٹس گریٹ۔۔۔" اس کی بات پر وہ خوشی سے اپنے گھنگریالے بالوں کو جھٹک کر کھڑی ہوئی۔
"مگر ہمارے مذہب میں وہ طلاق ہی گردانی جاتی

ہے جس کے مطابق ہم دوبارہ نہیں مل سکتے۔"
اس کی بات پر اس کا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ پھر سے اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔
"تم لوگوں کا مذہب بھی عجیب ہے۔ جو ذرا سی رنجشوں کو طلاق کہہ کر ہمیشہ کے لیے دور کر دیتا ہے"
"جی نہیں، ہمارا مذہب بہت اچھا ہے۔ یہ عورت کو ایک پہچان، ایک مقام اور عزت دیتا ہے۔ اگر ایسے معاملات میں سخت احکامات جاری نہ کرے تو تم لوگوں کی طرح ہر روز ہر عورت یونہی ذلیل ہوتی پھرے۔
اب خود سوچو پچھلے تین سالوں میں تم کوئی پانچویں چھٹی بار ابووانہ کے ساتھ جا رہی ہو۔ وہ تمہیں مارتا پیٹتا ہے۔ اپنی زندگی سے الگ کر دیتا ہے۔ پھر محبت سے پکارتا ہے۔ پھر سے اپنی زندگی میں شامل کر لیتا ہے۔ تم بار بار اپنے آپ کو توڑ کر پھر جوڑتی ہو۔ ٹوٹ کے جڑنے کا عمل کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ تم خود اس کا اندازہ لگا سکتی ہو۔ ہمارا مذہب کم از کم ہمیں بار بار کی تکلیف سے تو بچاتا ہے۔" ہانیہ کی بات پر سسلی کے چہرے پر شرمندگی در آئی۔
مصور نے اپنی تصویر پر یہ کیپشن دی تھی۔ "جو خود سے کچھ نہ لے سکے وہ ہمیشہ کے لیے سہاروں کے عادی بن جاتے ہیں۔" اور آگے کی کیپشن اس کے اپنے دماغ نے مکمل کر دی تھی "اور جو سہاروں کے عادی بنتے ہیں ان کی مثال طفیلیوں کی اس قسم کی طرح ہو جاتی ہے۔ جو اپنے میزبان کو کھا کر کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ اور کھوکھلی جڑوں پر کوئی مضبوط عمارت نہیں بنا کرتی۔"
قدرت نے اسے فیصلہ لینے میں آسانی فرما دی تھی۔
اس نے دور بیٹھے سانتا کلاز پر آخری دفعہ محبت کی نظر ڈالی۔ آفاقی محبت جو خون بن کر دوڑتی ہے، لمحے بھر کے لیے آپ کو جھنجھوڑتی ضرور ہے۔ محبت کی اس نظر میں محبوب اور محبت کو کھو دینے کا دکھ صاف عیاں تھا۔
"جویریہ! جواہر کو میری طرف سے ہاں کہہ دو۔۔۔" بات کرنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ اس نے جویریہ کو ٹیکسٹ کیا۔
محبت اپنے ساتھ ایسی بے رخی پر دھاڑیں مار مار کر روئی تھی۔ وہ جھٹکے سے عزت اور قدر کی انگلی تھام کر پھر سے اس دنیا کے آب رواں میں تیرنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔۔۔

محبت کانچ کا سودا
محبت آگ کا دریا
محبت جون جیسی ہے
محبت برف جیسی ہے
محبت رات کالی ہے
محبت نیلا موسم ہے
محبت کچا آنگن ہے
محبت تتلیوں کا گھر
مگر پھر بھی
محبت ہو ہی جاتی ہے
کسی نامعلوم ہستی سے
کسی انجان ہستی سے
کسی کاغذ کی کشتی سے
کسی کھڑکی کے منظر سے
کسی دھندلی سی حسرت سے
محبت ہو ہی جاتی ہے
محبت ہو ہی جاتی ہے

☼

تمثیلہ زاہد

اپنی چادر
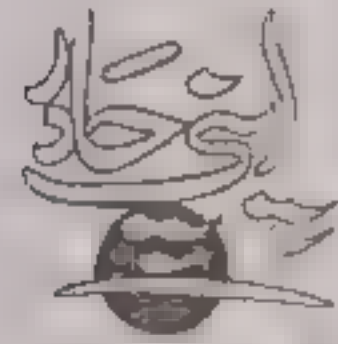
آنکھ کھلتے ہی اس کی نظر سامنے قطار میں لگے چار بند سوٹ کیس کی طرف پڑی جو جوں کے توں رکھے ہوئے تھے۔ عصر کی اذانیں ہو چکی تھیں اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اماں باہر تخت پر بیٹھی تھیں۔ اس کے دونوں بچے ان کے اردگرد کھیل رہے تھے۔ مٹی کی سوندھی خوشبو پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ شاید اماں پودوں کو پانی دے کر فارغ ہوئی تھیں۔

اس نے بالوں کا جوڑا بنایا اور بوجھل قدموں کے ساتھ باہر آگئی۔ کسمسا کے اس نے گردن ہلائی جہاز کے طویل سفر کی تھکن سے اس کا جسم اب تک چور تھا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ اماں کے تخت کے سامنے پہنچ گئی۔ اماں کے سامنے رکھی ٹوکری بے شمار موتیے کے پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ سوئی دھاگہ ہاتھ میں لیے وہ ایک ایک پھول چن کر پرو رہی تھیں وہ جانتی تھی اماں کا یہ محبوب ترین مشغلہ ہے۔ جب کیاری موتیے کے پھولوں سے بھرنے لگتی وہ انہیں چن چن کر اپنی ٹوکری میں بھر لیا کرتیں پھر اس کی مالا تیار کرتیں جب مالا تیار ہو جاتی وہ اسے اپنے سرہانے رکھ کر سوتیں۔

اس نے احتیاط سے اپنی مٹھی میں چند موتیے کے پھول سمیٹ لیے پھر انہیں سونگھ کر اپنے سانسیں معطر کرنے لگی۔

"اٹھ گئی میری گڑیا چل ادھر آ بیٹھ میرے پاس۔" اماں نے لاڈ سے ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔

"بس اماں دل تو کر رہا تھا تھوڑا اور سو لوں چھ سال بعد اپنا بستر پا کر جسم نے بے فکری کی چادر اوڑھ لی تھی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

لندن سے پاکستان تک کا طویل سفر طے کر کے آج رات کی فلائٹ سے کراچی پہنچی تھی۔ شادی کے چھ سال بعد میکے میں اس کی یہ پہلی آمد تھی شادی کے فوراً" بعد ایک بچے کے بعد دوسرے کی آمد نے اس کے پیروں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔ وہ جب بھی فون پر اپنے گھر والوں کو یاد کر کے رونے لگتی اماں ڈھیروں نصیحتوں کے ساتھ اسے چپ کرا دیتیں۔

"دیکھ بیٹا پردیس میں رہنا آسان نہ وہاں سے آنا ہر ہفتے ہماری بات ہوتی ہے۔ اب لاکھوں روپے چند دن کے لیے برباد کرو یہ کون سی دانشمندی ہے۔ اپنا دل شوہر اور بچوں کے کاموں میں لگایا کرو۔ بیٹا اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے۔ اللہ نے چاہا تو اپنے اکلوتے بھائی وصی کی شادی میں آرام سے سارے ارمان پورے کرنا۔"

آج چھ سال بعد وصی بھائی کی شادی کی خبر نے اس کو میکے کے آنگن پہنچایا اب اسے روکنے کے لیے نہ شوہر کے پاس تاویلیں تھیں نہ وہ ڈھیروں نصیحتیں جو وہ سالوں سے سنتی آ رہی تھی۔ وہ تین بہن بھائی تھے۔ عصمت آپا اور وصی بھائی جڑواں تھے۔ وہ ان دونوں سے سات برس چھوٹی تھی۔ آپا کی دونوں بیٹیوں کو اس نے اپنی گود میں کھلایا تھا آپا کا بیٹا اس کی شادی کے بعد پیدا ہوا تھا۔ وہ کئی سالوں سے اپنوں کی شکلیں دیکھنے کے لیے ترسی ہوئی تھی۔

"آپا کب آئیں گی اماں ایئرپورٹ بھی نہیں آئیں۔" وہ بے تابی سے بولی۔ گھر میں وہ دونوں ہی تھیں۔ ابا دکان سے رات کو لوٹتے تھے۔ وصی بھائی دفتر سے چھ بجے کے بعد ہی گھر واپس آتے۔

"بس آنے ہی والی ہوگی۔ کہہ رہی تھی بچوں کو اسکول سے لا کر شام تک آئے گی۔ اس کے چھوٹے بیٹے زوہیب کو رات سے بخار ہے جب ہی رات ایئرپورٹ پر بھی نہ آسکی۔"

"اب تو زوہیب اسکول جاتا ہوگا نا۔" وہ سہلا کر بولی۔

"ہاں ماشاء اللہ تین سال کا ہوگیا ہے۔ تمہارے بیٹے زیم اور اس میں چھ ماہ کا تو فرق ہے۔"

"جی اماں۔" اس نے پھر سہلایا اور چنبیلی کے پھولوں کو ہوا کے دوش پر لہراتے دیکھنے لگی۔ پورا گملا چنبیلی کے پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے کچھ فاصلے پر گلاب کے پودے تھے۔ اماں کو پھولوں سے انسیت تھی۔ وہ بچپن سے اماں کے اس شوق کو دیکھتی آ رہی تھی۔ اس کے میکے کے صحن کا حصہ آج بھی ویسا ہی تھا جیسے چھ برس پہلے تھا۔ صاف ستھرا بے شمار پھولوں سے لدا۔

"اماں برابر والی ریشم کا کیا حال ہے؟ اب تو اس کی شادی بھی ہو گئی ہوگی۔" وہ اپنی ہم عمر سہیلی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ جس کے ساتھ اس نے اپنے بچپن کے سنہرے دن گزارے تھے۔

"کہاں بیٹا بیٹھی ہے اپنی ماں کی دہلیز پر" اماں موتیے کے پھول سوئی میں پروتے ہوئے بولیں۔

"مگر کیوں اماں اس نے تو جاب شروع کر دی تھی نا۔ کہتی تھی اپنے ساتھ ڈھیروں جہیز جمع کر کے لے کر جائے گی۔" اس کے دونوں بچے تھک کر نڈھال اس کی گود میں آ کر لیٹ گئے۔ وہ دھیرے دھیرے ان کے چہروں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

"بس اسی شرط نے تو ماں باپ کو آزمائش میں ڈال

رکھا ہے۔ اکلوتی بیٹی کی خواہشوں کی لمبی فہرست ایک ریٹائر باپ کیسے پوری کرے۔ اب ایک اسکول کی ملازمت سے لاکھوں روپے کا جہیز وہ جوڑنے سے رہی۔ ریشم کے باپ کی نوکری سے گھر میں مشکل سے گزر اوقات تھی اب تو اسے ریٹائر ہوئے بھی پانچ برس بیت گئے ہیں۔ ماں شوگر کی مریض ہے۔ باپ دل کا مریض ہوگیا ہے' علاج پر خرچ الگ ہوتا ہے۔ لیکن بیٹی کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ جو رشتہ آتا ہے۔ سنا ہے اس میں سو عیب نکال کر انکار کردیتی ہے۔" اماں نخوت سے بولیں۔

اس کے دونوں بچوں بے سدھ سو چکے تھے وہ انہیں گود میں اٹھا کر کندھے پر ڈال کر کمرے میں لٹا آئی پھر دوبارہ تخت پر اماں کے سامنے بیٹھ گئی جو ایک مالا مکمل کرکے دھاگے کو گانٹھ لگا رہی تھیں۔ پھر دھاگے کو نوک سے پکڑ کر اپنے آگے مالا لہرانے لگیں۔

"لو دیکھو ایک مالا مکمل ہوگئی۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولیں۔

"اللہ کرے ریشم کا بھی نصیب جاگ جائے۔"

اسے اپنی سہیلی کا سن کر افسوس ہو رہا تھا۔ وہ محلے کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی۔ محلے سے اس کے لیے دو تین رشتے آئے بھی لیکن اس کا انکار سن کر پھر کسی کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ جانتی تھی اس کی دوست ریشم محلے میں ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں جانا نہیں چاہتی تھی وہ اپنے لیے ایک پرآسائش زندگی کا خواب دیکھتی تھی۔

"نصیب تو اللہ نے کھولنا چاہا بس اس کی عقل کھول دے۔ اللہ کسی کو اولاد کی آزمائش میں نہ ڈالے۔ وہ کہتے ہیں نا اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے۔" اماں نے اپنا مخصوص جملہ دہرایا۔

"جی اماں۔" وہ سرہلا کر اماں کی بات سے متفق ہوتے ہوئے بولی۔

"اماں آپا کی نند کیسی ہیں؟ وہ خود کتنی کیوٹ ہیں ان کے دونوں بیٹے بھی ان ہی کی طرح انگریز لگتے ہیں۔ میری شادی پر دونوں A لیول کر کے فارغ ہوئے تھے۔" وہ آپا کی اکلوتی نند اور اپنی تایا زاد کزن کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

"ہاں انگریز تھے جب ہی دونوں بچوں کو انگریزوں کے دیس سدھار دیا اب تو سنا ہے وہیں شادیاں بھی رچالی ہیں۔ بے چاری ماں سارا دن بھرے پرے گھر میں ڈالر گنتی رہتی ہے۔" اماں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اچھا۔" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ رانی باجی کے دونوں بیٹے خاندان بھر میں خوبرو اور ماں کے فرمانبردار مشہور تھے۔ وہ خود بھی وضع دار خاتون تھیں۔ بیوہ ہونے کے بعد انہوں نے اپنی ملازمت سے دونوں بچوں کو پڑھایا' سکھایا بہتر اور اعلا تعلیم دی بیٹے بھی ماں کے ہر حکم کو ماننا اپنا فرض سمجھتے تھے سب کچھ کیسے؟

"بس بیٹا بے چاری نے اپنی جوانی دن رات ایک کر کے بچوں کی بہتر تعلیم کے حصول کی خاطر لگادی کہ کل کو سکھ کے دن دیکھے گی۔ A لیول کرنے کے بعد دونوں کو مزید تعلیم کے لیے کینیڈا بھیج دیا۔ وہیں سنا دونوں نے ملازمت بھی کرلی۔ ملازمت سے دونوں کے تعلیمی اخراجات بھی نکل جاتے اور ماں کے ہاتھ چار پیسے آنے لگے۔"

"پھر۔" وہ ماں کے رکنے پر بے چینی سے بولی۔

"بس بیٹا زیادہ سے زیادہ پالینے کی ہوس میں مبتلا دماغ انسان سے اس کا شعور چھین لیتا ہے بیٹے کسی قابل کیا ہوئے خاندان بھر کی لڑکیاں کم تر لگنے لگیں۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ تیری عصمت آپا نے بھی کئی لڑکیاں دکھائیں۔ لیکن یہ کہہ کر ناک چڑھادی اسے خوب صورت کم عمر لڑکی کے ساتھ اچھے اسٹیٹس والا گھرانہ درکار ہے۔ پھر جب ایسی لڑکی ملی تو معلوم ہوا کینیڈین شہریت کے چکر میں دونوں بیٹوں نے شادیاں کرلی ہیں۔ تب سے لوگوں سے منہ چھپاتی پھرتی ہے کچھ کچھ ذہنی مریضہ بھی ہوگئی ہے۔" اماں غم زدہ لہجے میں بولیں۔

"اماں۔ اماں۔" عقب سے بے شمار آوازیں آنے لگیں۔ عصمت آپا اپنے تینوں بچوں سمیت بے شمار تھیلے ہاتھ میں پکڑے داخل ہوئیں۔

"السلام علیکم آپا بہت انتظار کروایا آپ نے۔" وہ خوشی سے جھومتے ہوئے ان سے لپٹ گئی۔ دونوں بہنوں کی آنکھیں ایک دوسرے کو دیکھ کر نم ہوگئیں۔

"کیسی ہے میری گڑیا؟ ماشاء اللہ شادی کے بعد تو میری گڑیا اور بھی خوب صورت ہوگئی ہے۔" آپا اس کا ماتھا بے تحاشا چومتے ہوئے اس کے گلنار چہرے کو دیکھ رہی تھیں جو شادی کے بعد مزید نکھر گیا تھا۔ صحت بھی قابل رشک ہوگئی تھی۔

"لائیے آپا یہ مجھے دے دیں۔" اس نے آپا کے ہاتھ سے بڑے بڑے شاپر لے کر تخت پر رکھ دیے۔

"بچے کہاں ہیں؟" آپا شاپر کا منہ کھولتے ہوئے بولیں۔

"ابھی سوئے ہیں۔" وہ آپا کے تینوں بچوں کو پچکارتے ہوئے بولی۔

"عصمت دونوں جوڑے لے آئیں۔" اماں ایک شاپر میں جھانکتے ہوئے بولیں۔

"اماں عروسی جوڑا ابھی تیار نہیں ہوا کچھ کام باقی ہے۔ کل پرسوں تک ان شاء اللہ مل جائے گا یہ دوسرا تیار تھا یہ لے آئی ہوں اس کے ساتھ کی میچنگ جیولری بھی لے لی ہے۔" یہ کہہ کر آپا نے ولیمہ کا جوڑا نکالا۔ لائٹ بلیو اور پنک کلر کے امتزاج کے ساتھ زرقون کے نگوں کے نفیس کام سے مزین شرارہ بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔

"آپا یہ تو بہت خوب صورت لگ رہا ہے۔" اس نے آپا کے ذوق کو داد دی۔

"ایک لاکھ کا بھی تو ہے۔"

"ایک لاکھ۔" اس کا منہ کھلا رہ گیا۔

"گڑیا! بوتیک کے کپڑے اتنے ہی مہنگے ہوا کرتے ہیں۔ یہ تو پھر سستا مل گیا ہے۔ میری دوست کی بہن کا بوتیک ہے طارق روڈ پر۔ عروسی جوڑے کی بھی اتنی ہی قیمت ہے۔" آپا شرارہ کی تہ احتیاط سے لگا کر بولیں۔

"آپا! وصی بھائی تو فضول خرچی کے حق میں نہیں ہوں گے آپ نے ان سے پوچھا۔"

وہ وصی بھائی کی کنجوس فطرت اور قلیل تنخواہ دونوں سے واقف تھی۔ اسے اپنی شادی پر کی جانے والی شاپنگ یاد آگئی جس پر اماں کے ساتھ ساتھ وصی بھائی نے بھی بجٹ پر لمبی لمبی تقریریں کی تھیں۔ وہ اپنی ہر خریداری پر صبر کا گھونٹ بھر لیا کرتی۔ ابا اور بھائی کی تنخواہ' گھر کے حالات' کئی اخراجات اس کے ارمانوں کے آگے دیوار بن کر کھڑے ہوجاتے تھے۔ سستی سے سستی مل جانے والی چیزوں پر اس کا ایک کمزور احتجاج سر اٹھانے لگتا تو وصی بھائی اس کو سادگی پر ایک درجن حدیثیں سنا کر خاموش کردیا کرتے۔

"وصی کے کہنے پر ہی تو یہ سب ہو رہا ہے۔ بڑا ہی فرمانبردار بچہ ہے میرا جہاں ہم نے کہا وہیں شادی کے لیے سر جھکادیا ورنہ آج کل کے لڑکے لڑکیوں پر تو لو میرج کا بھوت سوار ہے۔ اچھے بڑے لوگوں میں شادی ہو رہی ہے۔ لڑکی چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے۔ باپ بڑا سرکاری افسر ہے۔ اب جوان لڑکا ہے اس کے دل میں بھی ارمان ہوں گے ہم نہیں پورا کریں گے تو کون کرے گا۔ وصی کہہ رہا تھا اپنی شادی کا ولیمہ دھوم دھام سے ہوٹل میں کرے گا۔ شادی کے لیے ہر چیز اس نے اپنی پسند سے مہنگی اور نفیس لی ہے۔ اب شادیاں روز روز تو ہوتی نہیں۔ ایک ہی بیٹا ہے میرا۔ تمہارے ابا نے پانچ لاکھ قرض لیا ہے۔ کچھ کمیٹی کے پیسے ہیں مل ملا کے ہو ہی جائے گا یہ قرض بھی ادا۔ بس دعا کرو بیٹا اللہ بہتر وسیلہ بنانے والا ہے۔"

میں نے بے خیالی میں اماں کی طرف دیکھا جو اپنی روانی میں کہے جا رہی تھیں۔

وہ بہت کچھ کہہ گئی تھیں لیکن اپنا ایک جملہ کہنا بھول گئیں۔

اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا!

✻ ✻

آصفہ عنبرین

گلی میں گاہکوں کے منتظر گل فروش اسے ترحم بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے وہ منزل پر پہنچ کر بھی بے نیل و مرام ہو رہا تھا۔ اس سے قدم اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے پیروں میں لکڑی کی کھڑاویں آگئی ہوں۔ وہ اپنی سوختہ بختی اور تیرہ بختی پر نوحہ کناں تھا۔ اسے اپنا وجود چنار کے پیڑ کی مانند لگ رہا تھا جو بظاہر خوب صورت مگر بے ثمر رہتا ہے ہاتھ میں پھڑپھڑاتا کاغذ کا ٹکڑا اس کی بے بسی پر مسکرا رہا تھا۔

اسے گا ہوں کے گجرے بیچنے والے اسی کے بارے میں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے ہیں ان کے سوکھے ہونٹ اور پیلے دانت اس کی تہی دامنی پر ہنس رہے تھے۔ کسی کا فیصلہ لمحے کا تھا اور اس کا دکھ صدیوں کا ٹکڑ پر تانگے کی اوٹ میں بیٹھ خشخشی داڑھی والا بوڑھا کوچوان بھی اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیے ہوئے تھا۔

وہ جلد از جلد اس گلی سے نکل جانا چاہتا تھا مگر پاؤں اٹھ رہے تھے نہ فاصلہ گھٹ رہا تھا۔ اپنی بے بسی پر اس کا دل بھر آیا تھا مگر آنکھیں خشک تھیں کسی بے آب و گیاہ چٹیل میدان کی طرح اس نے جو مسافت بھوگی تھی۔ وہ رائیگاں گئی وہ شکستہ پا ہی نہیں شکستہ دل بھی تھا گلی کا موڑ مڑنے سے پہلے اس نے دو منزلہ خستہ حال مکان پر ایک نظر ڈالی اور ہاتھ میں پکڑا کاغذ کا ٹکڑا پرزوں میں تقسیم کر کے ہوا کے سپرد کر دیا اس کی اگلی منزل کیا تھی وہ نہیں جانتا تھا۔

☆ ☆ ☆

سید کمال الدین شاہ کی حویلی پورے علاقے میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی تھی اگرچہ سید پور میں اور بھی کئی خوب صورت گھر تعمیر کیے گئے تھے مگر حویلی جو کہ قدیم طرز تعمیر کا اچھوتا شاہکار تھی اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے تھی۔ بطخ کے انڈے کی مانند سفید رنگ و روغن والی سہ منزلہ حویلی مہیب اندھیرے میں بھی کوسوں دور سے نظر آتی تھی اس کے سرخ محرابی دیوہیکل دروازے پر یونانی طرز کی کندہ کاری کی گئی تھی۔

تقریباً "نصف صدی قدیم اس عمارت میں وقتاً فوقتاً" ہونے والی مرمت نے اسے نا صرف شکست و ریخت سے محفوظ رکھا تھا بلکہ اس کے بعض حصوں میں جدت بھی نظر آنے لگی تھی پرانی حویلی بڑے شاہ صاحب کے زمانہ میں یک منزلہ تھی ان کی وفات کے بعد کمال الدین شاہ نے اسے دو منزلہ کروا دیا پھر جیسے ہی دونوں بھائیوں کے بچے بڑے ہونے لگے تو زیادہ کمروں کی ضرورت کے پیش نظر انہوں نے تیسری منزل بھی تعمیر کروا ڈالی کمال الدین کی اولاد میں صرف دو بیٹیاں عنایا اور ہالہ تھیں جبکہ چھوٹے بھائی جلال الدین کے دو بیٹے یحییٰ اور موسیٰ اور ایک بڑی بیٹی ہدیہ تھی۔ دونوں بھائی مشترکہ خاندانی نظام کے تحت ایک ہی چھت تلے مثالی اتفاق سے رہ رہے تھے اس کی ایک بڑی وجہ عنایہ کی امی فاطمہ شاہ کی ناگہانی اور بے وقت موت تھی۔

بڑی عنایا اس وقت صرف چھ سال اور ہالہ چار سال

کی بھی جب کمال الدین شاہ کو اپنی رفیق حیات کی جدائی کا صدمہ سہنا پڑا بچیوں کی پرورش میں ایک بڑا ہاتھ موسیٰ کی والدہ خدیجہ بیگم کا بھی ہے جنہوں نے اپنے تین بچوں کے ساتھ ان دونوں کی بھی اچھی تربیت کی حویلی کی تیسری منزل پر عنایا کی پھپھو شہربانو رہائش پذیر تھیں۔

جس سال عنایا کی امی کا انتقال ہوا وہ سال حویلی والوں کے لیے بڑا بھاری ثابت ہوا تھا اسی برس شادی شدہ شہربانو اپنی نو سالہ ازدواجی زندگی کا باب بند کر کے حویلی چلی آئی تھیں۔ بڑے شاہ صاحب نے بڑے چاؤ اور مان سے انہیں اپنے ایک رفیق کے بیٹے کے ساتھ بیاہ کر رخصت کیا تھا مگر شادی کے اولین دنوں میں ہی ان کی ازدواجی زندگی تنازعات میں گھر گئی غیاث شفیع نا صرف عمر میں شہربانو سے چھوٹے تھے بلکہ وہ طبیعت اور عادات میں بھی شہربانو سے بہت مختلف تھے شہربانو سید گھرانے کی باپردہ اور صوم و صلوٰۃ کی پابند خاتون تھیں جبکہ غیاث نے عیاش اور لاابالی فطرت پائی تھی شاہ صاحب کی وفات کے فوراً بعد انہوں نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے ناجائز طریقے سے کمائی گئی دولت کو وہ بڑے دھڑلے سے غیر شرعی کاموں پر اڑانے میں لگ گئے۔ کچھ عرصہ تو شہربانو نے اپنے شوہر کی پردہ پوشی کے ساتھ ساتھ انہیں سمجھانے کی بھی کوشش کی مگر جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ اب شوہر نامدار پینے پلانے کے ساتھ قحبہ خانوں میں بھی آنے جانے لگے ہیں تو ان کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا ایک شب وہ کثرت مے نوشی سے لڑکھڑاتے ہوئے گھر آئے تو شہربانو نے ہنگامہ کھڑا کر دیا سات سالہ سعدون حیرت سے ماں باپ کو اونچی آواز میں جھگڑتے سن رہا تھا۔ غیاث شفیع سرخ انگارہ آنکھیں لیے شہربانو پر برس رہے تھے وہ احتجاجاً حویلی جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔

"میں یہاں ایک پل بھی نہیں رہ سکتی بہت ہو گیا تماشا!" ان کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے۔

"ٹھیک ہے جاؤ' زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے میری میں ملاؤں والی زندگی نہیں گزار سکتا!" وہ برہم تھے۔

"جا رہی ہوں اور اب جیسے جی میں آئے ویسے زندگی گزاریے گا آپ جیسے بے دین شخص کے ساتھ رہنا ایک گناہ سے کم نہیں میں کوشش کے باوجود بھی آپ کو راہ راست پر نہ لا سکی!" وہ گالوں سے نمی صاف کرتے ہوئے بیگ میں کپڑے ٹھونسنے لگیں۔

"جاؤ... جاؤ!" وہ بہکی بہکی آواز میں بولے۔

"مگر سعدون ادھر ہی رہے گا حویلی صرف تم جاؤ گی" انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر گاڑی کی چابی پھینکتے ہوئے اطمینان سے کہا تو شہربانو کے پیروں سے کسی نے جیسے زمین کھینچ لی تھی۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے وہ میرا بیٹا ہے اس گندے ماحول میں اسے چھوڑ کر جانے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی!" وہ تڑپ اٹھی تھیں۔

"میرا بھی بیٹا ہے' شرعی اور قانونی حیثیت سے وہ میرے پاس رہ سکتا ہے تم جہاں مرضی ہو جا سکتی ہو مگر وہ نہیں!" ان کا لہجہ سخت اور حتمی تھا شہربانو مرقع حیرت بنی ساکت کھڑی تھیں۔

"وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا!" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

"رہ لے گا چھوٹا بچہ نہیں ہے وہ!" غیاث لاپروائی سے گویا ہوئے اور دروازے کی اوٹ میں کھڑا سعدون انجانے خوف سے کانپنے لگا وہ اپنے مستقبل کے فیصلے کا منتظر تھا شہربانو کے پاس اب ایک ہی راستہ تھا یا تو ممتا کی محبت کے سامنے سر تسلیم خم کر کے گھر سے جانے کا ارادہ موقوف کر دیں یا پھر ساری کشتیاں جلا کر اپنے ضمیر کی آواز پر اس بے دین شخص کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیں دوسری صورت میں انہیں اپنے جگر گوشے کی جدائی برداشت کرنا تھی اور انہوں نے دوسری صورت قبول کر لی۔ وہ غم سے نڈھال ایک مختصر بیگ کے ہمراہ حویلی چلی آئیں کمال الدین شاہ کو اس [illegible] تھے... بھی غیاث شفیع کی سرگرمیوں سے

لاعلم نہیں تھے مگر مجبور تھے۔ شہربانو نے جو بھی فیصلہ کیا تھا وہ اس میں حق بجانب تھیں اس لیے دونوں بھائیوں میں سے کسی نے ان سے سوال نہ کیا۔

خدیجہ بیگم نے حویلی کی اوپری منزل ان کے لیے مخصوص کر دی وہ ہر روز اس امید پر جیتیں کہ شاید غیاث اپنے رویے پر نادم ہو کر انہیں لینے آجائیں مگر دن پر دن گزرتے گئے انہوں نے رابطہ کیا نہ لینے آئے چھ ماہ کا عرصہ گزرنے کے بعد شہربانو کو وکیل کے ذریعے طلاق کے کاغذات موصول ہو گئے تھے وہ جیسے ٹوٹ پھوٹ سی گئی تھیں ایک موہوم سی امید باقی تھی وہ بھی نہ رہی وہ سعدون کی جدائی میں مسلسل گھل رہی تھیں وہ بہت کم اپنے کمرے سے باہر نکلتیں کمال الدین ان کی گوشہ نشینی پر ملول سے بیٹھے رہتے ایسے میں عنایہ شہزاور پھپھو کے پاس چلی جاتی اور باتوں سے ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتی کچھ سالوں بعد شہربانو نے سنا کہ غیاث نے دوسری شادی کر لی ہے سعدون اب لڑکپن کے دور میں قدم رکھ چکا تھا لیکن غیاث شفیع کے شب و روز اب بھی نہ بدلے تھے وہ عورتوں اور مے نوشی کا اب بھی ویسا ہی رسیا تھا۔ نئی بیوی کا سعدون کے ساتھ رویہ بہت ہتک آمیز تھا۔ غیاث کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ بیٹے پر بیتنے والی کیفیت سے آگاہ ہوتے۔ سعدون جو باپ کے رویے اور سرگرمیوں سے پہلے ہی نالاں تھا سوتیلی ماں کا ہتک آمیز رویہ تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا تھا۔ ایک دن وہ غیاث کے روبرو تن کر کھڑا ہوا اور شہربانو کے پاس جانے کی اجازت مانگی تب تو وہ آگ بگولہ ہو گئے مگر جب یہ دیکھا کہ جوان بیٹا اب اپنی ضد پر اڑ گیا ہے تو بادل ناخواستہ اس شرط پر اجازت دے دی کہ وہ غیاث سے قطع تعلق نہیں کرے گا بلکہ وقتاً فوقتاً ملنے بھی آئے گا۔ سعدون کو ہر شرط منظور تھی وہ جانتا تھا کہ اس کے باپ کے پاس نئی بیوی سے دو بیٹے اور بھی ہیں مگر اس کی ماں بالکل اکیلی ہے۔

بچپن میں اس نے جو کچھ اپنی ماں کے ساتھ ہوتے دیکھا تھا وہ اس کے ذہن کے پردے پر پوری جزئیات کے ساتھ نقش تھا۔ اگلے روز ایک سفید کرولا اٹھارہ سالہ سعدون کو حویلی کے گیٹ کے سامنے اتار کر چلی گئی۔ شہربانو سعدون کو دیکھ کر جیسے پھر سے زندہ ہو گئی تھیں وہ کتنی دیر اسے سینے سے لگائے بچوں کی طرح روتی رہیں۔ حویلی کے سب مکینوں نے سعدون کا خیر مقدم کیا تھا جمال الدین کے تینوں بچے اور کمال الدین کی بیٹیاں بھی اب بچپن سے نکل کر جوانی میں قدم رکھ چکے تھے سب نے سعدون سے دوستی گانٹھ لی۔ وہ بہت جلد سب کزنز میں گھل مل گیا تھا۔ وقت کا طائر اپنی رفتار سے اڑتا رہا۔ حویلی کے دامن میں کھیلنے والے نوعمر لڑکے لڑکیاں اسکول سے کالج اور پھر کالج سے یونیورسٹیوں میں پہنچ گئے۔ یحییٰ سکالرشپ پر امریکہ چلا گیا تھا مدیحہ نے جیسے ہی ماسٹرز کیا اس کی ماموں کے گھر نسبت طے کر دی گئی۔ شہربانو عنایا کو بہت پسند کرتی تھیں جیسے ہی مدیحہ کا رشتہ طے کیا گیا انہوں نے عنایا کو سعدون کے لیے مانگنے کا فیصلہ کر لیا وہ نا صرف خوش گفتار اور سلیقہ مند تھی بلکہ اس کے تیکھے نقش

بھی بہت پیارے تھے وہ اپنی ماں سے بہت مشابہت رکھتی تھی۔ فاطمہ شاہ اپنی جوانی میں بے پناہ حسین تھیں اور علینا نے جیسے ان کی قدو قامت اور خوب صورتی چرالی تھی وہ ہو بہو اپنی ماں کا پرتو تھی۔ شہربانو نے سعدون سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

☼ ☼ ☼

وہ آیا تو کتابیں خریدنے تھا مگر اپنی آمد کا مقصد یکسر فراموش کرچکا تھا اس کی نگاہیں ایک چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں ___ وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی چند کتابوں کو وہ اپنے ہاتھ میں لے کر کسی اور کتاب کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑا رہی تھی کہ اسی اثنا میں اس کی نظر کاؤنٹر کے قریب کھڑے لڑکے پر پڑی وہ مسلسل اسے اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے ہوئے تھا وہ ذرا سی ٹھٹکی مگر اگلے ہی لمحے سر جھٹک کر دوبارہ اپنی تلاش میں سرگرداں ہوگئی۔ اس نے بے خیالی میں ہی کوئی کتاب ریک سے نکال کر سامنے کاؤنٹر پر رکھ دی مگر نظروں کا زاویہ تبدیل نہ کیا کہ گہری نیلی چادر کے ہالے میں قید وہ چہرہ اسے پابند کیے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھیں بے پناہ حسین تھیں مسمرائز کرنے والی اور وہ ہوچکا تھا۔ اس لڑکی نے صرف ایک لمحے کو ہی اسے دیکھا تھا اور اس کی گہری سیاہ جھیل سی آنکھیں جیسے اس کے دل میں ترازو ہوگئی تھیں۔ وہ سادہ سے حلیے میں حسن کا مرقع تھی اگر اسے اپنی دلکشی کا احساس ہوتا تو خوب صورتی کی رعونت اس کی رگ رگ میں بھری ہوتی مگر وہ بے خبر لگ رہی تھی ناز و نمود سے پاک بہت ہی معصوم چہرہ زیر کر گیا تھا۔ وہ کتاب کاؤنٹر پر رکھ کر اس کے پاس چلا آیا۔

"ایکسکیوزمی میں کچھ مدد کر سکتا ہوں آپ کی؟" اس نے لڑکی کے عقب میں جاکر آہستگی سے کہا اس نے پلٹ کر حیرت سے اسے یوں دیکھا جیسے کوئی معیوب بات کی ہو وہ نادم سا ہوگیا۔

"ایک بک ڈھونڈ رہی تھی پر وہ یہاں نہیں ہے شاید!" وہ مایوسی سے گویا ہوئی۔

"کون سی؟" اس نے ہمت کرکے دوبارہ پوچھا مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ بیگ اٹھا کر کاؤنٹر تک گئی اور پیسے ادا کرکے باہر نکلنے کو تھی کہ وہ جو پتھر بنا ایک جگہ کھڑا تھا جیسے خرد کی دنیا میں لوٹ آیا اور تیزی سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور ایک دفعہ پھر ہمت کی۔

"میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں!" وہ ذرا سی دیر رکی اس کی طرف دیکھا وہی بے بس کر دینے والی نگاہیں وہ اس کے جواب کے منتظر تھا۔

"نہیں!" اس نے سپاٹ سے انداز میں کہا اور دکان کی سیڑھیاں اترنے لگی وہ پہلی سیڑھی پر کھڑا دیکھتا رہ گیا پھر نہ جانے اچانک کیا خیال آیا وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ اس سے کافی فاصلہ رکھ کر چل رہا تھا تھوڑا سا چلنے کے بعد وہ ایک رکشا میں سوار ہوگئی وہ بجلی کی سی تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف آیا اور اسے رکشا کے پیچھے لگادیا۔ اس کے اندر کی دنیا اتھل پتھل ہو رہی تھی اور وہ اس لڑکی کو فی الوقت لوگوں کے ہجوم میں گم نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ وہ آہستگی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا رکشا کی رفتار بہت سست تھی اور اسے بھی چالیس کی رفتار سے گاڑی چلانا پڑ رہی تھی تقریباً چار کلومیٹر چلنے کے بعد رکشا بائیں طرف مڑ گیا آگے تنگ گلیاں تھیں وہ گاڑی ایک گلی کے نکڑ پر کھڑی کر کے چلنے لگا تھوڑی دیر بعد جہاں وہ کھڑا تھا وہ جگہ شرفا کے نزدیک گناہ کا منبع اور فحاشی کا گڑھ تھی۔

وہ اس بازار کے نکڑ پر تھا جہاں آواز بکتی تھی حسن کا مول لگتا تھا جسموں کی نمائش ہوتی تھی نوٹوں کی بارش میں نازک و مرمریں پاؤں تھرکتے تھے اور چھن چھن کی چھن چھن پر زندگی رقص کرتی تھی۔ وہ رکشا سے نکلی اور اسی گلی میں قطار میں بنے دو منزلہ بوسیدہ مکانوں میں سے ایک میں گھس گئی وہ نکڑ پر کھڑے ایک تانگے کی اوٹ میں ایستادہ یہ منظر دیکھتا رہا۔ زیادہ دیر چلنے کی وجہ سے اس کی سانس پھول چکی تھی تانگے کی اگلی سیٹ پر اونگھتا ہوا بوڑھا کوچوان نیم باز آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

"کہیں جانا ہے بابو؟" اس نے تھوڑی دیر بعد

خنودگی میں اس سے سوال کیا۔ اس نے نفی میں سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ سامنے پھولوں کی ریڑھیاں کھڑی تھیں جن پر گلاب موتیے اور چنبیلی کے پھول اور گجرے ترتیب سے پڑے تھے۔ گل فروش اسے ایک گاہک سمجھ کر امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر وہ گاہک نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

ہدیہ کا رشتہ اس کے ماموں زاد شجاع احمد سے طے تھا۔ جیسے ہی شجاع تعلیم مکمل کرکے اعلا پوسٹ پر فائز ہوا اس کے گھر والوں نے شادی کے لیے خدیجہ بیگم پر دباؤ ڈالنا شروع کردیا وہ اپنے بھائی اور بھاوج کی بات کیسے ٹال سکتی تھیں شجاع ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ چاہتے تھے جلد از جلد گھر میں رونق لے آئیں تھوڑی سی پس و پیش کے بعد جلال الدین مان گئے جیسے ہی ہدیہ کی شادی کی تاریخ طے ہوئی لگتا تھا انتظامات طویل ہوگئے تھے اور وقت قلیل، کہیں چندن پیسا جارہا تھا تو کہیں ابٹن، شادیانے تیار ہو رہا تھا۔ سب مرد و زن مصروف تھے حویلی میں ہلچل مچی ہوئی تھی شادی بہت قریب آگئی تھی ایسے میں کمال الدین نے حویلی کا از سر نو رنگ و روغن کروانا شروع کردیا۔ ایک طرف شادی کی تیاری عروج پر تھی دوسری طرف مستری اور مزدوروں نے پوری حویلی میں افراتفری مچا رکھی تھی جلال الدین نہیں چاہتے تھے کہ شادی کے دنوں میں تعمیر و مرمت کا کام شروع ہوجائے مگر وہ بڑے بھائی کی منطق کے سامنے خاموش تھے بقول کمال الدین گھر میں سینکڑوں مہمانوں کی آمد ہوگی اس لیے حویلی کو آراستہ کرنا بہت ضروری ہے کام کو جلد ختم کرانے کے لیے وہ سیاہ شیروانی زیب تن کیے بہ نفس نفیس مزدوروں کے سر پر کھڑے رہے۔

حویلی کی غلام گردشوں میں سنگ مرمر کی جدید ٹائلیں نصب کی گئیں۔ ہشت پہلو ڈیزائن والی ٹائلوں نے راہداری کو بہت خوب صورتی سے نمایاں کردیا ہدیہ کی رخصتی میں صرف دس روز باقی تھے۔ ہر

کوئی عجلت میں تھا یکی کی فلائیٹ دو دن لیٹ تھی موسیٰ کے ذمے شادی پر مدعو کیے جانے والے مہمانوں کی فہرست تیار کرنا تھی۔ وہ لسٹ مکمل کرکے اپنے ابو کی خدمت میں پیش کرتا تو وہ کوئی نہ کوئی اعتراض لگا کر واپس کردیتے بعض حضرات کے ناموں کو دیکھ کر انہیں خیال آتا کہ انہوں نے فلاں فلاں تقریب میں ہمیں نظر انداز کردیا تھا اور بعض ایسے نام جو موسیٰ کی دانست میں ضروری نہیں تھے جلال الدین کو ان کی موجودگی ناگزیر لگتی سو وہ اپنے ناپسندیدہ حضرات کا نام لسٹ سے حذف کرنے اور پسندیدہ کے نام شامل کروانے کے لیے موسیٰ کو دوبارہ درستگی کے لیے کہہ دیتے وہ جزبز سا ہو کر مدعوین کی فہرست کا رجسٹر بغل میں دابے ڈرائنگ میں آکر بیٹھ جاتا اور از سرنو ترتیب اور ترمیم کرنے لگتا۔

سعدون کے ذمے شادی کی شاپنگ کے سلسلے میں لڑکیوں کو بازار کے چکر لگوانا تھا پچھلے کئی روز سے وہ ایک ڈرائیور کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ حویلی کی ملازمہ زیبی چند دن پہلے میں لگی تھی جو ابٹن کے روز کو لگانا تھا۔ موسیٰ اور ہالہ کی بچپن میں نسبت طے ہو گئی تھی ایسے میں شہربانو کی شدید خواہش تھی کہ وہ عنایا کو بھی اپنی بہو کے طور پر چن لیں اور مدیحہ کی شادی پر تمام مہمانوں کی موجودگی میں وہ عنایا کو انگوٹھی پہنانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے سعدون سے بات کرنے سے پہلے کمال الدین سے بات کی وہ جانتی تھیں کہ وہ انکار نہیں کریں گے لیکن حویلی میں بھتیجی بھی موجود تھا اور ایسا ہو سکتا تھا کہ انہوں نے عنایا کے لیے شریک زندگی کے طور پر سعدون کی بجائے بھتیجی کو سوچ رکھا ہو۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپا لیکن میرے خیال میں آپ پہلے سعدون کی منشا معلوم کرلیں اگر وہ راضی ہے تو عنایا کل بھی آپ کی بیٹی تھی اور آج بھی۔" وہ شہربانو کے سامنے والے صوفے پر بیٹھے تھے خدیجہ بھی وہاں موجود تھیں انہوں نے شہربانو کے فیصلے کو سراہا تھا۔

"وہ میرا بیٹا ہے بھائی جان، اپنی ماں کی خواہش کا ضرور احترام کرے گا!" وہ مطمئن تھیں۔

"یہ بات نہیں ہے آپ میرا مطلب کچھ اور تھا۔" سر پر رکھی جو گوشیا ٹوپی درست کرتے ہوئے [illegible] گویا ہوئے۔

"میں سمجھی نہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔" سوالیہ نگاہوں سے کمال الدین شاہ کو دیکھتے ہیں۔

"کچھ بھی ہو ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے۔ غیاث کا خون ہے اس نے پندرہ سولہ برس اس [illegible] تربیت گزارے ہیں اور خون کبھی بھی جوش مار [illegible] ہے غیاث کو اگر پھر خیال آگیا تو کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کر سکتا ہے بس میں یہی سوچ سوچ کر ڈر رہا ہوں۔" سر جھکائے اپنے خدشات بیان کر رہے تھے شہربانو [illegible] تک انہیں دیکھے جا رہی تھیں۔

"آپ کا خیال ہے وہ سعدون کو واپس [illegible] کیسے ہو سکتا ہے بھائی جان سعدون اب باشعور ہے اسے اپنے برے بھلے کا پتا ہے آپ دل میں وسوسے پیدا نہ کریں!" شہربانو نے انہیں تسلی دی۔

"میرے دل میں جو بات تھی ــــ کردی باقی سب میں نے خدا پر چھوڑ دیا ہے وہ ان دونوں کو خوش رکھے مجھے تو خوشی ہوگی کہ دونوں بیٹیاں میری آنکھوں کے سامنے رہیں گی!" انہوں نے شہربانو کی درخواست قبول کرلی تھی۔ رات کو سعدون اپنے کمرے میں [illegible] اس کے پاس چلی گئیں۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے سعدی!" وہ دراز سے کچھ تلاش کر رہا تھا شہربانو کی بات پر سب چھوڑ کر ان کے پاس آبیٹھا۔

"جی!" وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

"عنایا کیسی لگتی ہے تمہیں!" وہ شہربانو کے سوال پر حیران سا ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب؟" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"مطلب تم سمجھ رہے ہو؟" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"میں نے اسے کبھی کسی اور زاویے سے دیکھا ہی نہیں، اچھی لڑکی ہے بس!" وہ کندھے

اچکا کر سہولت سے بولا۔

"میں نے اسے تمہارے لیے مانگ لیا ہے آج ہی تمہارے ماموں سے بات کی ہے!" وہ آرام سے بہت بڑی بات کہہ گئی تھیں وہ ہونٹ بھینچے انہیں خاموشی سے دیکھے گیا۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے کس سوچ میں پڑ گئے تم!" وہ اسے گیان میں ڈوبا ہوا دیکھ کر بولیں۔

"اب میرے کچھ کہنے یا نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے جب آپ ماموں جان سے بھی بات کر چکی ہیں۔" وہ اٹھ کر سامنے کھلے دراز میں سے کچھ تلاش کرنے لگا۔

"میں تمہاری مرضی معلوم کرنا چاہتی ہوں سعدی!" وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔

"اب اگر میں انکار کردوں تو ماموں جان کو کتنا برا لگے گا جب آپ عنایا کی بات کر چکی ہیں ان سے!" اسے شہربانو کی جلد بازی اچھی نہیں لگی تھی۔

"عنایا بہت اچھی لڑکی ہے تمہیں اس میں کیا عیب نظر آیا ہے جو یوں نخرے کر رہے ہو!" وہ قدرے سخت انداز اپناتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"یہ بات اچھی یا بری کی نہیں میں نے کبھی اس بارے میں ایسا نہیں سوچا!" وہ دراز پر جھکا ہوا تھا۔

"نہیں سوچا تو اب سوچ لو یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ جس لڑکی سے شادی طے ہو اسے بچپن سے سوچنا شروع کردو!" شہربانو کو اس کی دلیل نہایت بودی لگی تھی۔

"امی میں ابھی پڑھ رہا ہوں ابھی مجھے کیریئر بنانا ہے آپ مجھے کس جھمیلے میں الجھا رہی ہیں۔" وہ چڑ سا گیا تھا۔

"میں صرف منگنی کی بات کر رہی ہوں شادی کی تمہیں جتنا مرضی ہے پڑھ لو شادی اسی وقت ہوگی جب تم چاہو گے مگر صرف عنایا سے!" اسے لگا شہربانو جیسے اس پر اپنی مرضی مسلط کر رہی تھیں۔ وہ گہری سانس لے کر واپس پلٹا۔

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی مگر شادی اسی وقت ہوگی جب میں چاہوں گا!" وہ شرط عائد کرتے ہوئے بولا تو شہربانو خوش ہوگئیں۔

"ایسا ہی ہوگا!" وہ کچھ اور کہے بنا کمرے سے نکل گئیں وہ جانتی تھیں سعدون نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا ہوگا مگر انہیں یقین تھا کہ اس بندھن میں اتنی کشش ضرور ہوگی کہ وہ خود بخود عنایا کے بارے میں سوچنے لگے گا اور عنایا تھی بھی ایسی کوئی اسے دیکھتا تو نظر ہٹانا بھول جاتا وہ اپنی محبت سے سعدون کے دل میں یقیناً جگہ بنا لے گی۔ عنایا تک جب یہ خبر پہنچی تو وہ جیسے ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔

غیر محسوس طریقے سے وہ سعدون کو پسند کرنے لگی تھی اور یہ پسند آہستہ آہستہ محبت کے جذبے میں بدلنے لگی تھی۔ سعدون جب سے حویلی میں آیا تھا وہ اس کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتی تھی اور اسے یہاں آئے ہوئے چھ سال ہو چکے تھے اور اتنا عرصہ محبت کے پنپنے کے لیے بہت تھا۔ سعدون اگرچہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور ان چھ سالوں میں اس نے کبھی بھی عنایا سے بلاوجہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی مگر عنایا کو اس کا یہی گریز اور احتیاط بھا گئی۔ وہ عام لڑکوں سے بہت مختلف تھا اور عنایا کو مختلف لوگ اچھے لگتے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ بہت طمطراق سے اس کے دل کی مسند پر آبیٹھا تھا اور عنایا دل جیسی سلطنت ہار گئی تھی مگر پتا نہیں کیا وجہ تھی کہ وہ کبھی عنایا کی طرف مائل نہ ہوا اور نہ ہی اس کی ان کہی کو سن سکا یہی بات عنایا کو دکھی کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی طاقت نے مصلوب کرلیا تھا اسے۔ وہ کب سے نیچے ماربل کے فرش پر نظریں گاڑے ہوا تھا جو کچھ ہوا تھا بہت اچانک اور غیر متوقع تھا وہ تو بہت مضبوط اور قوی اعصاب کا مالک تھا پھر یہ کون تھی جو اس کے اندر کی دنیا اتھل پتھل کرکے غائب ہو گئی تھی اسے یوں محسوس ہو رہا تھا اس کی رگوں میں گردش کرتے لہو میں بھی بے

چھما سرائیت کر گئی تھیں وہ اپنا ماتھا مسل کر اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی کے قریب کھڑے ہو کر اس کے دونوں پٹ پوری طرح وا کر دیے جاڑے کی سرد ترین رات کا پتا نہیں کون سا پہر تھا اس کے چہرے سے ٹھنڈی اور منجمد کرنے والی ہوا کا جھونکا ٹکرایا تھا۔ مگر وہ یونہی کھلی کھڑکی کے سامنے ایستادہ رہا اس کے اندر جو تپش تھی وہ اس یخ بستہ ہوا کی لہر سے بھی کم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

باہر آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے لگتا تھا کچھ ہی دیر بعد بارش شروع ہو جائے گی وہ مہیب اندھیرے میں کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے ہوئے تھا بادل گرجنے لگے تھے بجلی کا زوردار تڑاکا ہوا تھا وہ پیچھے ہٹ گیا مگر کھڑکی جوں کی توں کھلی رہی۔ کمرہ ٹھنڈی ہوا کی لپیٹ میں تھا وہ چلتا ہوا دوبارہ اپنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی چائے کی پیالی کو دیکھا جو اس کی بے التفاتی کا شکار ہو کر ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس نے پیالی اٹھا کر ٹھنڈی چائے کی سطح پر جمی بالائی کو ایک طرف ہٹا کر اسے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اسے ٹھنڈی چائے سے نفرت تھی اپنی چوبیس سالہ زندگی میں اسے نہیں یاد پڑتا کہ اس نے کبھی نیم گرم چائے کا بھی سپ لیا ہو وہ ہمیشہ دھواں اڑاتا ہوا تیز گرم گرم چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیتا اور دو تین منٹ میں خالی کر دیتا اور آج وہ پتا نہیں کس کیفیت سے گزر رہا تھا اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ جس چائے کے گھونٹ حلق سے اتار رہا ہے وہ کس قدر بد مزا ہو چکی ہے۔

"میں اس سے ملنے جاؤں گا۔" خالی پیالی کو بے خیالی میں ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے خود کلامی کی وہ دل میں فیصلہ کر چکا تھا وہ جانتا تھا اب اس کے سوا اور کوئی حل نہیں ہے پچھلے تین دن سے اس نے خود کو سمجھانے کی سر توڑ کوششیں کی تھیں مگر بے سود اور اب تو بے چینی سوا ہو گئی تھی اسے لگ رہا تھا اگر وہ کچھ دن اور اسے دیکھ نہ پایا تو وہ اپنے حواس کھو دے گا اس نے بے بسی سے سر تکیے پر رکھ دیا اسے لگا کمرے کی ہر چیز اس کی بے بسی پہ ہنس رہی ہے۔ باہر تیز بارش برسنے لگی تھی وہ یونہی آنکھیں موندے بارش کی [illegible] سنتا رہا۔

☼ ☼ ☼

شادی کا دن آن پہنچا تھا پوری حویلی کو [illegible] قمقموں سے روشن کر دیا گیا تھا ایک دن پہلے ہی [illegible] امریکہ سے واپس آیا تھا سید کمال الدین اگرچہ [illegible] سے اور بغیر نمود و نمائش کے شادی کے حق میں تھے [illegible] موسیٰ کی خواہش تھی کہ حویلی میں شادی کی پہلی تقریب ہے اس لیے ہلا گلا نہ سہی مگر کچھ سجاوٹ [illegible] ہونی چاہیے حویلی کے لان میں صبح سویرے ہی [illegible] اور پیلے رنگ کے شامیانے تان دیئے گئے تھے شہر کے بہترین کیٹرنگ ایکسپرٹس کو بلایا گیا تھا۔ مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ مہندی کی رسم کے بعد عنایا اور سعدون کی منگنی اور ہدیہ کا نکاح تھا اس لیے مہندی کی رات صرف قریبی اور چیدہ چیدہ افراد ہی مدعو تھے۔ یحییٰ کو کچھ دیر قبل ہی عنایا کی منگنی کے بارے میں پتا چلا تھا اور وہ سب کے درمیان میں بیٹھا دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

"یہ بڑی زیادتی کی بات ہے ہدیہ آپی کی شادی ہو رہی ہے موسیٰ اور ہالہ کی منگنی ہو چکی آج سعدون شفیق صاحب بھی عنایا پر مہر لگا دیں گے مجھ غریب کا کیا قصور ہے کسی نے میرے بارے میں نہیں سوچا۔" وہ پھولوں کے گجرے ترتیب سے ٹوکری میں رکھتی خدیجہ بیگم سے مخاطب تھا۔

"پہلے تم اپنی پڑھائی تو مکمل کر لو بھئی!" وہ [illegible] ہوئے ٹوکری ہالہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولیں۔

"تو کیا یہ سب کر چکے جن کو بھگتایا جا رہا ہے!" شہربانو کے کندھے کے گرد اپنے بازو حمائل کرتے ہوئے مصنوعی خفگی سے بولا۔

"تم امریکہ جو بھاگ گئے تھے یہاں ہوتے تو تمہارا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کر دیتے۔" شہربانو اس کے سر پر چپت رسید کرتے ہوئے بولیں۔

"اب بھی دیکھنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے کل [illegible] رنگ برنگی چڑیوں کی آمد ہو گی، نظر ضرور رکھیے گا کچھ اپنے دل کو بھی تسلی ہو۔" وہ ٹھنڈی آہ بھر کر شرارت سے بولا تو سب ہنس پڑے۔

"یحییٰ بھائی آپ کو تو اوپن چوائس ہے امریکہ میں چڑیاں بہت رنگ برنگی نہ سہی پر گوری گوری تو ہیں نا کوئی سی لے آئیں آپ بھی!" مہندی کا تھال تیار کرتی ہالہ نے مشورہ دیا۔

"میں بھی سوچ رہا ہوں اب یہی کرنا پڑے گا۔" وہ خود پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔

"اور یہ سعدون صاحب کہاں ہیں؟" اسے اچانک خیال آیا تو آس پاس نگاہ دوڑاتے ہوئے استفسار کیا۔

"اوپر کمرے میں ہے شاید!" شہربانو نے جواب دیا۔

"کمال ہے اوپر کیا کر رہے ہیں جناب' آج اس کی منگنی ہے اور وہ کمرے میں چھپ کر بیٹھا ہے۔" یحییٰ کو حیرانی ہوئی کونے میں کھڑی عنایا نے چونک کر یحییٰ کو دیکھا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

"حضرت بڑے شرمیلے واقع ہوئے ہیں اس لیے منظر پر نہیں آرہے۔" موسیٰ نے اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔

"میں اس کو لے کر آتا ہوں کر کیا رہا ہے اوپر۔" یحییٰ اتنا کہہ کر اٹھنے ہی والا تھا کہ سامنے سیڑھیوں سے سعدون اترتا نظر آیا۔

"لو وہ آگیا۔" شہربانو نے جیسے ہی اسے دیکھا فوراً بول پڑیں۔

"کہاں تھے یار؟" وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ یحییٰ نے سوال کر ڈالا۔

"کمرے میں تھا کچھ اسائنمنٹس تھیں فائنل کی وہ دیکھ رہا تھا پرسوں جمع کرانی تھیں۔" وہ آرام سے کہہ کر سامنے میز پر رکھا شادی کارڈ اٹھا کر پڑھنے لگا جسے پہلے دیکھا ہی نہیں تھا۔ شہربانو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے وہ کچھ بھی اخذ نہ کر سکیں نہ اس کے چہرے سے خوشی عیاں تھی نہ وہ پریشان لگ رہا تھا بس ایک لاتعلقی سی تھی جو وہ خود پر طاری کیے ہوئے تھا۔ وہ اسے اپنا واہمہ سمجھ کر ذہن سے جھٹکنے لگیں۔ انہوں نے ایک نظر ادھر ادھر گزرتی عنایا پر ڈالی خوشی اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی آج وہ بلا بے بات مسکرا رہی تھی وہ مسکراتی ہوئی بہت پیاری لگتی تھی۔ ایسا لگتا تھا مسکان بنی ہی اس کے ہونٹوں کے لیے تھی۔

رات کے کھانے سے پہلے ہدیہ کی مہندی کی رسم ادا کی گئی۔ لڑکے والے چونکہ زیادہ دور نہ تھے لہٰذا وہ جلد ہی آگئے۔ کمال الدین نے مہندی سے پہلے نکاح پر اصرار کیا اور ایسا ہی کیا گیا جیسے ہی مہندی کی رسم اختتام کو پہنچی پھولوں سے لدے پھندے اسی جھولے پر عنایا اور سعدون کو بٹھا دیا گیا۔ شہربانو نے اس کے ہاتھ میں انگوٹھی پہنائی تو مبارک سلامت کی آوازیں آنے لگیں۔ سعدون کے چہرے پر ہنوز سنجیدگی کا سایہ تھا۔ جبکہ عنایا کی شرماہٹ میں جاندار مسکراہٹ بھی نمایاں تھی۔ لمبے چوڑے سعدون کے پہلو میں بیٹھی وہ سب کی نظروں کا مرکز تھی۔ اس نے انتہائی نفیس مگر سادہ سا پنک رنگ کا شفون کا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا جس پر سلور ایمبرائیڈری اسے مزید خوب صورت بنا رہی تھی۔

"سعدون بھائی مسکرانے کے پیسے نہیں لگتے۔" ہاتھ میں کیمرہ تھامے ہالہ نے اس کے کان میں دھیرے سے کہا۔

جو یقیناً عنایا کی سماعتوں سے بھی ٹکرایا تھا اس نے کن انکھیوں سے پاس بیٹھے سعدون کو دیکھا جس کے لبوں پر ہالہ کی بات پر ہلکی سی مسکراہٹ عود آئی تھی۔

رات گئے تمام فنکشن اختتام پذیر ہو گئے قریبی مہمان اور لڑکے والے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ صبح بارات کی آمد تھی اور رات کا صرف تھوڑا سا حصہ باقی تھا۔ سب اٹھ کر اپنے کمروں میں جا رہے تھے حویلی کی تیز روشنیاں بجھا دی گئی تھیں صرف چند حصوں میں نصب بڑی ٹیوب لائٹیں جل رہی تھیں۔ خدیجہ بیگم کچن میں گھر کے ملازموں فیض بخش اور زبیدہ کے ساتھ رات کا بچا ہوا کھانا سمیٹ رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں جا بجا سامان بکھرا پڑا تھا۔ عنایا کپڑے تبدیل کر کے وہ سمیٹنے میں لگی تھی۔ رات کے

سب بجے وقت۔

"ارے بھائی اب سو جاؤ سب یہ کام صبح کر لینا رات بہت ہو گئی۔" جلال الدین کسی کام سے وہاں آئے تھے انہوں نے پہلے کچن میں جھانکا پھر عنایا کو دیکھا تو کہنے لگے۔

"بس چچا جان تھوڑا سا کام رہ گیا ہے یہ ڈرائنگ روم سیٹ کر لوں صبح صبح مہمان پھر آ جائیں گے ایسے بکھیرا اچھا نہیں لگتا آپ سو جائیں۔" وہ کارپٹ سے کشن اٹھا کر صوفوں پر ترتیب سے رکھتے ہوئے بولی۔

"میں تو سونے جا رہا ہوں اب تم لوگ بھی آرام کرو۔" وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولے تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اسی اثناء میں سعدون وہاں آیا تھا۔

"امی کدھر ہیں؟" اس نے اپنے عقب میں سعدون کی آواز سنی اور پلٹ کر دیکھا۔

"پھپھو شاید اوپر اپنے کمرے میں ہوں۔" وہ پرسوچ انداز میں بولی۔

"کیوں کیا کہنا تھا؟" اس نے سعدون کو واپس مڑتے دیکھا تو پوچھا۔

"مجھے ڈسپرین چاہیے تھی سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔" اس نے ایک نظر عنایا کو دیکھ کر ہاتھ پر بندھی گھڑی کو دیکھا حالانکہ وقت دیکھنا غیر ضروری تھا جبکہ سامنے دیوار گیر کلاک نصب تھا۔

"تم یہیں بیٹھو میں لا دیتی ہوں۔" وہ سارے میگزین اکٹھے کر کے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی تو سعدون نے سر ہلایا وہ شاید اپنے کمرے میں گئی تھی سعدون وہیں صوفے پر بیٹھ گیا اسے شدید تھکاوٹ ہو رہی تھی۔

پچھلے دو دن سے وہ شادی کے کاموں میں کافی مصروف رہا تھا اور آج حویلی میں تو رش بھی بہت تھا اور اسے شور سے الجھن ہوتی تھی۔ کمرے میں گیا تو وہ لیٹنے کی غرض سے تھا مگر سر میں ٹیسیں اتنی شدید تھیں کہ وہ سو ہی نہ پایا اس نے صوفے کی بیک سے سر ٹکا دیا۔

"یہ لو۔" تھوڑی دیر بعد عنایا ہاتھ میں ٹیبلٹ اور پانی کا گلاس لے کر وہاں آ گئی تھی مگر وہ آنکھیں موندے ہوئے تھا۔

"سعدی!" اس نے دھیرے سے پکارا مگر اسے شاید آنکھ لگ گئی تھی وہ ایک ٹک اسے دیکھے گئی اس کے وجیہہ چہرے پر سکون ہی سکون تھا وہ اسے نہیں چھیڑ رہی تھی مگر اس نے اچانک آنکھیں کھول دی تھیں وہ اس کے عین سامنے کھڑی گڑبڑا کے پیچھے ہٹ گئی۔ سعدون کو کچھ بھی سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی وہ اس کی نگاہوں کی تپش محسوس کر کے ہی تو جاگا تھا مگر اس نے کچھ کہنے کی بجائے خاموشی سے ٹیبلٹ سعدون کے ہاتھ پر رکھ کر پانی کا گلاس سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔

"اور کچھ؟" اس نے کچھ توقف کے بعد سعدون سے کھڑے کھڑے پوچھا۔

"نہیں۔" سوال جتنا مختصر تھا جواب اس سے بھی مختصر تھا۔ وہ صوفے پر رکھا اپنا موبائل اٹھا کر وہاں سے چلی گئی۔ وہ بے خیالی میں پانی کا گلاس تھامے کسی اور سوچ میں گم تھا۔

بارات والے دن بھی تمام انتظامات کمال الدین کی تسلی کے مطابق تھے۔ ہدیہ کی رخصتی کے وقت سب سے زیادہ رونے والی عنایا ہی تھی۔

"اب بس بھی کرو۔" ہالہ نے اسے پیچھے سے ٹوک دیا جب وہ ہچکیوں کے ساتھ ہدیہ سے گلے مل کر رو رہی تھی وہ ایسی ہی تھی چھوٹی سی بات پر بہت سارا رونے والی۔ ہدیہ شجاع کی سنگت میں پیا گھر سدھار گئی تو حویلی کی چہل پہل اور رونق ایک دم بے رونقی میں بدل گئی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھی تھی جب موسیٰ اور سعدون وہاں آئے۔

"ان لڑکیوں کی مجھے سمجھ نہیں آتی مہندی کی رات کیسے شوق و ولولے سے دلہن کو رخصت کرنے کے گیت گائے جاتے ہیں ان کا بس نہیں چلتا کہ لڑکی ابھی گھر سے نکال باہر کریں اور جب وہ خدا خدا کر کے رخصت ہو جاتی ہے تو ادھر رونے دھونے کا سلسلہ

شروع ہو جاتا ہے۔" وہ بیزاری سے کہہ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا تو سعدون زیر لب مسکرا دیا۔ وہ بولی نہیں بس یونہی اداس سی بیٹھی رہی۔

"لیکن ہو سکتا ہے یہ اس لیے بھی رونے کا سیشن طویل کر رہی ہیں کہ اس گھر سے یہ پہلی اور آخری رخصتی تھی بعد میں ان دونوں نے تو رخصت ہو کر بھی اسی گھر میں رہنا ہے کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔" اس نے تائید کے لیے سعدون کو دیکھا تو وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔

"کیوں تنگ کر رہے ہو بچی کو' چلو اٹھو یہاں سے۔" شہربانو نے اس کا آخری جملہ سن لیا تھا وہ کان لپیٹ کر اٹھ گیا۔

"بس بیٹا۔" وہ اس کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے بولیں تو وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔ شہربانو پریشان سی ہو گئیں۔

"ارے بس نا' چلو تم اندر جا کر آرام کرو۔" وہ اسے وہاں سے بھیجنا چاہتی تھی سعدون اسے غور سے دیکھ رہا تھا اس کے رخسار مسلسل بھیگ رہے تھے۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ آنسو ہدیہ کی رخصتی کی وجہ سے نہیں بہہ رہے تھے وہ بھی نہیں جو سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے دل میں ایک انجانا سا غبار تھا گھٹن تھی اور اس گھٹن کو باہر نکالنے کا وسیلہ اس کے لیے صرف آنسو تھے اور وہ اس معاملے میں بہت فیاض تھی۔

☼ ☼ ☼

اماوس کی رات معمول سے زیادہ تاریک تھی فضا میں خون کو منجمد کر دینے والی خنکی تھی۔ گلی میں اس قدر سناٹا تھا کہ اس کے قدموں کی چاپ اس کی سماعتوں پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ لیدر کے کوٹ کی جیبوں میں ہونے کے باوجود یخ ہو چکے تھے۔ گلے میں لپٹا ہوا سیاہ مفلر اس نے منہ کے گرد لپیٹ لیا جو بار بار سرک کر اس کی تھوڑی پر آ جاتا ہے ناک سے خارج ہونے والا گرم سانسوں کا مرغولہ سا ہوا میں تحلیل ہوتا تو وہ ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لیے دوبارہ مفلر کو ناک پر لپیٹ لیتا۔

اس کی حالت زنداں سے فرار ہونے والے قیدی کی سی تھی چال میں تیزی سے زیادہ لرزش نمایاں تھی۔ اس نے ایک جگہ رک کر سانسیں بحال کیں اور سامنے دیکھا پرانی خستہ حال گلی میں ہو کا عالم تھا پھولوں کے ہار اور گجرے بیچنے والے بھی ہڈیوں کو چیرتی سردی سے خائف ہو کر سر شام وہاں سے غائب ہو گئے تھے۔ وہ مزید دو قدم چل کر مطلوبہ دروازے کے سامنے رک گیا بالا خانے کی دوسری منزل پر روشنی تھی جو اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ مکین ابھی جاگ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازے کی طرف ہاتھ بڑھاتا کسی نے اس کے کندھے پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا تھا وہ گھبرا کر پلٹا۔

سامنے وہی خشخشی داڑھی والا لاغر سا بوڑھا کوچوان کھڑا تھا جو سارا دن گلی کے چوک میں کھڑے تانگے میں بیٹھ کر اونگھتا رہتا اور رات کو چوکیداری کے فرائض انجام دیتا۔ یہی اس کی آمدنی کا ذریعہ تھا کیونکہ رکشوں کی بھرمار نے تانگہ بانوں کی کمی بندھی آمدنی کو بھی ختم کر دیا تھا اب کوئی سواری سستے داموں پر بھی تانگے پر بیٹھنے کے لیے راضی نہ ہوتی اور کوچوانوں کے پاس گھوڑوں کو ڈالنے کے لیے چارہ بھی میسر نہ ہوتا۔ فاقہ کشی سے تنگ آ کر اکثر نے یا تو قرض پر رکشے لے لیے تھے یا پھولوں کی ریڑھی لگا لی تھی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے سیاہ مفلر سے توھے سے زیادہ چہرہ چھپا کر قدرے سختی سے بوڑھے کوچوان سے سوال کیا۔

"بابو جی آپ کو شاید نہیں معلوم یہاں کے اکثر کوٹھوں میں کام ٹھپ ہو گیا ہے۔" بوڑھا اپنی ملگجی سی چادر سے ناک کی پھننگ پر سانسوں کی بھاپ سے بننے والی نمی کو صاف کرتے ہوئے بولا۔

"میں اس مقصد کے لیے نہیں آیا تم جاؤ۔" اسے بوڑھے کی خواہ مخواہ مداخلت گراں گزری۔

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔" وہ اتنا کہہ کر جانے کی بجائے وہیں ایستادہ رہا۔ وہ سمجھ گیا تھا اس

نے کوٹ کی اندروالی جیب میں ہاتھ ڈال کر والٹ باہر نکالا اور ایک کورا نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا اندھیرے کی وجہ سے وہ تو نہ دیکھ سکا مگر نوجوان کی آنکھوں میں عود آنے والی چمک سے وہ سمجھ گیا کہ نوٹ ہزار سے کم کا نہ تھا۔

"تازہ پھولوں کے گجرے لادوں جی آپ کو؟" بوڑھے نے اس کی فیاضی سے متاثر ہو کر اپنی خدمات پیش کیں۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو میں اس کام سے نہیں آیا۔" شدید خفگی میں اسے بوڑھے کو بیان سے بحث کرنا پڑ رہی تھی جو سراسر وقت کا زیاں تھی اس کے چہرے پر برہمی کے آثار دیکھ کر وہ بوڑھا کندھے اچکا کر آگے بڑھ گیا وہ یقیناً حیران ہوا ہو گا کہ اس کوچے میں کوئی کسی اور مقصد کے لیے بھی آ سکتا ہے۔ اس نے دروازہ کھولنے کے لیے دوبارہ ہاتھ بڑھایا تو حیران رہ گیا دروازہ اندر سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ اس گلی میں دروازے بند کرنا دولت کو لات مارنے کے مترادف تھا۔

ایک در تھوڑا سا وا کر کے اس نے اندر دیکھا سامنے تنگ و تاریک سیلن زدہ سیڑھیاں تھیں اور سیڑھیوں کے اختتام پر ایک اور دروازہ تھا۔ وہ موبائل ٹارچ لے کر آہستگی سے اوپر چڑھنے لگا۔ اس کے بوٹوں کی چاپ سیڑھیوں کی دونوں اطراف کی دیواروں سے ٹکرا کر دھم دھم کی آوازیں پیدا کر رہی تھی۔ آخری سیڑھی کو پار کر کے وہ اپنی سانس بحال کرنے کو رک گیا سیاہ رنگ کا بوسیدہ سا دروازہ شاید اندر سے بند تھا اس نے باہر لٹکتی زنجیر نما کنڈی سے دروازے پر دستک دی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا متوقع صورت حال کا سامنا کرنے کا حوصلہ بھی نہ تھا اور واپس پلٹنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ اسے دوبارہ قدرے زور سے دستک دینی پڑی قدموں کی چاپ دروازے کے قریب سنائی دی تھی جو کوئی بھی تھا دروازہ کھولنے ہی والا تھا اس نے مفلر کو چہرے سے نیچے سرکا کر گلے میں ڈھیلے ڈھالے انداز میں چھوڑ دیا۔

"کون ہے؟" اندر سے نسوانی آواز ابھری۔

"دروازہ کھولیے یہ میں ہوں۔" اس نے اپنا نام بتانے میں تامل سے کام لیا۔ استفسار کرنے والی نسوانی آواز کو وہ پہچان گیا تھا مگر وہ نوارد کی آواز نہیں پہچان سکی اس لیے دوبارہ پوچھا۔

"میں کون؟" دروازہ ہنوز بند تھا اور وہ کسی اجنبی کے لیے رات کے اس پہر دروازہ کھولنے سے ہچکچا رہی تھی۔

"سعدون شفیع!" اس نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا۔

☆ ☆ ☆

شہربانو کی فرمائش پر عنایا نے خود رومالی سویاں اور ہریسہ تیار کیا تھا۔ وہ جانتی تھیں سعدون ہریسہ بہت شوق سے کھاتا ہے امور خانہ داری میں اگرچہ وہ خود بھی طاق تھیں مگر انہوں نے دانستہ عنایہ کو کچن میں بھیجا تھا جہاں نور بی بی شام کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں تاکہ کسی طریقے سے سعدون عنایہ کی طرف مائل ہو سکے۔ تھوڑی دیر بعد وہ کچن سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی جہاں موسیٰ، ہالہ اور پھپھو کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ پھپھو ہنسے جا رہی تھیں۔ ہالہ دونوں پاؤں صوفے پر رکھے پستہ کھانے میں مصروف تھی شدومد سے بول رہا تھا تو صرف موسیٰ۔

"لیجیے عنایہ آپی آ گئیں۔ آپ ہی کچھ انصاف کیجیے پھپھو کی تو ساری ہمدردیاں اس کاہل اور سست الوجود لڑکی کے ساتھ ہیں۔" وہ کسی بات پر جلا بھنا بیٹھا تھا جبکہ ہالہ لاپروائی سے جگالی میں مصروف تھی۔

"کیسا انصاف؟ بھئی مجھے بھی تو کچھ پتا چلے۔" وہ کشن کھینچ کر نیچے کارپٹ پر بیٹھ کر پاؤں پسارتے ہوئے بولی۔

"یہ تو آپ ہالہ بی بی سے پوچھیں اک ذرا سا کام کہہ دو تو جان جاتی ہے ان کی۔" وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار کو خواہ مخواہ الٹتے پلٹتے ہوئے بولا۔ وہ سوالیہ انداز میں ہالہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"ان جناب کو بھی شوق چرایا ہے میرے ہاتھ کے پکے کھانے کا آج آپ سعدون بھائی کے لیے ہریسہ کیا بنانے گئیں یہ تو میرے پیچھے ہی پڑ گیا ہے کہ تم بھی میرے لیے شامی کباب تیار کرو بھئی مجھے کیا ضرورت ہے تابعدار ہونے کی۔" وہ پستہ منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

"دیکھا آپ نے دیکھا کتنی ڈھٹائی سے اپنے ہونے والے مجازی خدا کو ہری جھنڈی دکھا رہی ہے یہ۔" وہ تپ گیا تھا۔

"ارے اس میں اتنا جھگڑنے والی کیا بات ہے۔ تم خاموش رہو کل ہالہ بنا دے گی جو تم چاہو گے آخر اسے بھی تو کچھ نہ کچھ تو سیکھنا چاہیے۔" شہربانو نے صلح کرانے کی سعی کی۔

"انہیں کچھ بنانا آتا ہی نہیں ہے۔" وہ آنکھیں نکال کر ہالہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا عنایہ خاموشی سے مسکرا رہی تھی ان دونوں کی آئے روز کی نوک جھونک ہوتی رہتی تھی اور اس کے پیچھے سراسر پیار ہی تھا۔

"اچھا اس نے نہ بنائے تو میں شامی کباب بنا دوں گی تمہارے لیے۔" عنایہ نے دیکھا ہالہ ذرا سی بھی ٹس سے مس نہ ہوئی تو اس نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیا۔

"آپ نہیں یہی بنائے گی ورنہ کل میں اسے کالج چھوڑنے نہیں جاؤں گا پھر منتیں کرتی پھرے گی۔" موسیٰ نے آخری حربہ آزمایا۔

"خوب جاؤ یہ عنایا آپی ہی ہیں جو سعدون بھائی کی خوشنودی کی خاطر لگی ہیں میں تو ذرا بھی نہ کروں۔" وہ پستے کے چھلکے میز پر رکھی پلیٹ میں پھینکتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ عنایہ نے چونک کر ہالہ کی طرف دیکھا وہ یہ غور کیے بغیر کہ اس نے کیا کہہ دیا وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ پھپھو کو اچانک احساس شرمندگی نے گھیرا تھا وہ تاسف سے عنایا کو دیکھنے لگیں جو مسکراہٹ لبوں پہ سجائے کر وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

رات کھانے کی ٹیبل پر وہ بے چینی سے سعدون کا انتظار کر رہی تھی مگر گھڑی کی سوئیاں رات کے ساڑھے نو بجا رہی تھیں اور سعدون کا کچھ پتا نہ تھا۔

"سعدون کہاں ہے ابھی تک گھر نہیں آیا؟" جیسے ہی سید صاحب ٹیبل پر آئے انہوں نے سعدون کی عدم موجودگی کو بھانپ کر شہربانو سے سوال کیا۔

"یونیورسٹی سے تو آ گیا تھا، پھر نجانے کہاں چلا گیا میرے پاس تو اس کے کسی دوست کا نمبر بھی نہیں ہے کہ دریافت کر سکوں۔" وہ پریشانی کے عالم میں بیٹھی تھیں آج سے پہلے وہ کبھی بغیر بتائے گھر سے نہ نکلا تھا اور اب تو اتنی دیر ہو چکی تھی اس کا موبائل ابھی آف تھا۔

"فکر نہ کریں پھپھو آ جائے گا وہ چھوٹا بچہ تھوڑی ہے کسی دوست کے ہاں چلا گیا ہو گا۔" یحییٰ نے انہیں تسلی دی۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا مگر آج کل جو حالات ہیں اتنی دیر سے گھر آنا کہاں کی دانشمندی ہے اسے بتانا تو چاہیے تھا کہ کہاں جا رہا ہے وہ۔" شہربانو کو وسوسوں اور خدشوں نے آن گھیرا تھا انہوں نے روٹی کا ایک لقمہ تک منہ میں نہ رکھا تھا۔

"اچھا آپ کھانا تو کھائیں آ جائے گا وہ۔" موسیٰ کی امی خدیجہ نے انہیں یوں کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے دیکھا تو سالن کا ڈونگا ان کے سامنے سرکایا انہوں نے بمشکل دو تین لقمے زہر مار کیے اور اٹھ کر بے چینی سے راہداری میں چکر کاٹنے لگیں کسی نے اس بات کو نوٹ ہی نہیں کیا تھا کہ شہربانو کے علاوہ ٹیبل پر کوئی اور بھی متفکر سا بیٹھا تھا جس نے کھانا تو در کنار پانی تک کو ہاتھ نہ لگایا۔ عنایا کی بھوک مر چکی تھی جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اس کے دل کی دھڑکنیں ڈوب رہی تھیں۔ سعدون اس کے لیے اتنا اہم ہو جائے گا اس نے سوچا تک نہیں تھا۔ وہ محبت کی ان شدتوں سے واقف نہیں تھی جس کا اسے اب سامنا تھا۔

"پھپھو آپ اوپر جا کر سو جائیں رات کافی ہو گئی ہے۔" وہ لاؤنج میں تسبیح ہاتھ میں لے کر بیٹھی شہربانو کے پاس چلی آئی۔

"بیٹا جب تک وہ گھر نہیں آ جاتا میں کیسے سو سکتی،

ہول۔" وہ سچ کہہ رہی تھیں جب تک او پا دھر نہ آئے ماں کیسے سکون سے سو سکتی تھی۔
"پھر بھی آپ تو تھک جائیں گی یوں بیٹھ بیٹھ کر، آپ اوپر اپنے کمرے میں چلی جائیں وہ پتا نہیں کس وقت آئے آپ فکر نہ کریں وہ چابی بھی ہے آجائے گا۔" اس نے شہباز کو تسلی دی تھی جانے کیوں اس کا اپنا دل انجانے خدشے سے دھڑک رہا تھا وہ تھکے تھکے قدموں سے اٹھ کر بالائی منزل کی طرف چلی گئیں عنایا نے ایک نظر وال کلاک پر ڈالی گھڑی کی سوئیاں رات کے بارہ بجانے کو تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ واڑ کھولے حیرانی سے سعدون کو دیکھے جا رہی تھی اس کی آنکھوں میں بے یقینی ہلکورے لے رہی تھی رات کے اس پہر سعدون پہنچ آپ کے دروازے پر کھڑا ہوگا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔
"یہ باہر کون ہے؟" وہ ابھی اسی تذبذب میں تھی کہ سعدون کو اندر آنے کے لیے کہے یا نہیں کہ پیچھے سے اس کی خالہ زہرہ بائی کی آواز سنائی دی۔
"اندر آجائیے!" اس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے تھوڑا سا راستہ دیا سعدون آہستگی سے قدم اٹھاتے اندر داخل ہوا تو اس نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا سامنے دیوار کے ساتھ رکھے پلنگ پر جس پر ایک میلا سا تخت پوش بچھا تھا زہرہ بائی استراحت فرما تھیں اندر کا منظر سعدون کی توقع کے بالکل برعکس تھا اندر سفید براق چاندنی بچھی تھی نہ سرخ رنگ کے مخملیں گاؤ تکیے سازندے تھے نہ سازندے بہت ہی مختصر سے سامان پر مشتمل ایک چھوٹا سا کمرہ اس کے سامنے تھا۔ زہرہ بائی نے اسے دیکھا تو اپنے فربہ جسم کو بمشکل سنبھالا دے کر اٹھ بیٹھی۔
"السلام علیکم!" سعدون نے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر آہستگی سے کہا۔
"وعلیکم السلام!" وہ بھی حیرت سے اس اجنبی کو دیکھ رہی تھیں۔

"کون ہو برخوردار اور یہاں کیسے؟" انہوں نے سرہانے رکھا دوپٹہ اٹھا کر شانوں پر پھیلاتے ہوئے ایک نظر سعدون کا ناقدانہ جائزہ لیا اور قدرے ... سے سوال پوچھا۔ سعدون نے جواب دینے کی بجائے ایک نظر بیلا کی طرف دیکھا جو سعدون سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی مگر وہ ہنوز مہر بلب تھی اب ... پاس اس شخص کا تعارف کرانے کے لیے کوئی لفظ تھا نہ ہی پس منظر شناسائی تھی تو صرف دیکھنے ... تک اسے نہیں یاد پڑتا تھا کہ کبھی سعدون سے بات چیت ہوئی ہو دو بار سامنا بھی اتفاق تھا ... کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا یہ شخص اس کا پیچھا کرتے کرتے یہاں تک پہنچ جائے گا وہ دونوں خاموش کھڑے تھے۔
"کون ہے یہ؟" اب کی بار اس نے بیلا سے سوال کیا۔
"خالہ یہ اس دن مجھے بک شاپ میں ملے تھے ... سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ سہمی سہمی سی کہہ رہی تھی اس کی خالہ نے اب کے کڑے تیوروں سے سعدون کی طرف دیکھا۔
"تمہارے آنے کا مقصد پوچھ سکتی ہوں؟" وہ ... دیر سے کھڑا تھا ان دونوں میں سے کسی نے بھی بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا بلکہ بیلا کی خالہ تو باقاعدہ تفتیش کرنے پر تلی بیٹھی تھیں اور کرنا بھی چاہیے تھی وہ اس میں حق بجانب تھیں ... پھر اس کا وہاں آنا کتنی معیوب بات تھی اسے ... احساس ہوا تھا۔ وہ اپنی آمد کا مقصد بیان کرنے سے ... ذہن میں الفاظ ترتیب دے رہا تھا مگر کوئی بھی ... جملہ اسے سجھائی نہیں دے رہا تھا۔
"پلیز آپ غلط مت سمجھیے گا میں کسی بری نیت سے نہیں آیا۔" وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا زہرہ بائی اب بھی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔
"میں.... میں ان سے ملنے آیا تھا۔" اس نے ... نظر پلنگ کے سرہانے کھڑی بیلا پر ڈالی اور صاف ...

... گوئی سے بولا۔
"کیا تعلق ہے تمہارا اس سے؟" وہ ٹٹولتی ہوئی نظروں سے پہلے بیلا کو پھر اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔ بیلا کا خوف سے رنگ زرد پڑ چکا تھا وہ ایک بت کی مانند ... سے ایستادہ کھڑی تھی۔
"بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ایک تعلق ایسا ... ہوتا ہے جس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا آپ وہی ... سمجھ لیں۔" اس نے جرات سے کام لیا۔
"صاف صاف بات کرو لڑکے زیادہ فلسفہ بگھارنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ کینہ توز نظروں سے سعدون کو دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں بولیں۔
"معاف کیجیے گا شاید آپ کو برا لگے مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا اگر یہاں نہ آتا تو شاید..." اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔
"کب سے یہ سلسلہ چل رہا ہے؟" انہوں نے ماتھے پر تیوریاں ڈال کر پاس کھڑی بیلا کو دیکھا وہ اس ساری صورت حال کے لیے تیار نہیں تھی اس لیے سٹپٹا سی گئی۔
"خالہ میں اس کو نہیں جانتی۔" وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بمشکل بولی۔
"ایک بات کان کھول کر سن لو برخوردار۔" وہ ... اٹھ کر اٹھتے ہوئے بولیں وہ اب خالہ کو دیکھنے کی بجائے عقب میں کھڑی بیلا کو دیکھ رہا تھا وہ کسی ... کی مانند سہمی ہوئی لگ رہی تھی اس کی گہری جھیل ... آنکھیں اب بھی سعدون کو مسمرائز کر رہی ...
"تم یہاں کسی اور چکر میں آئے ہو تو آئندہ کبھی ... کا رخ نہ کرنا یہ گلی اگرچہ بہت بدنام جگہ ہے مگر ... کے پیچھے تم آئے ہو وہ بہت شریف ہے نہ یہاں ... چھیڑی جاتی ہے نہ ٹھمکے لگتے ہیں کوئی اور ... تلاش کرو جہاں تم جیسے شوقین اور رنگین مزاجوں کے شوق کی تسکین ہو سکے سمجھے تم۔" وہ ... تندی سے بولیں۔
"میں نے عرض کیا ہے میں اس مقصد کے لیے نہیں آیا آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔" وہ ذرا سا تلخ ہوا۔
"مجھے پتا ہے اس وقت کسی کے گھر جانا درست نہیں ہے مگر دن کی روشنی میں میرا اس طرف آنا ممکن نہیں تھا اگر کوئی دیکھ لیتا تو..." اسے بات ادھوری چھوڑ دینے کی عادت تھی خالہ ماتھے پر شکنوں کا جال لیے اس کی وضاحت سن رہی تھیں۔
"میں غلط بیانی نہیں کروں گا بات صرف اتنی سی ہے کہ یہ مجھے اچھی لگی تھیں اور میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہیں دیکھنے نکل پڑا۔ اس میں ان کا کوئی دوش نہیں ہے یہ واقعی سچ کہہ رہی ہیں یہ مجھے نہیں جانتیں۔" وہ اپنی صفائی دینے کے ساتھ ساتھ بیلا کی پوزیشن بھی واضح کرنے لگا۔ وہ حیرانی سے ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔
"محبت کرتے ہو بیلا سے؟" زہرہ بائی نے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔
"یہی سمجھ لیجیے۔" اس نے ایک نظر بیلا کی طرف دیکھا وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔
"سمجھنے میں اور کرنے میں بہت فرق ہے۔" وہی کھردرا سا لہجہ تھا۔
"جاڑے کی سرد ترین راتوں میں کسی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گلیوں میں خوار ہونے کو آپ جس جذبے کا نام بھی دے دیں میں اس کا اقرار کرتا ہوں آپ محبت کہہ لیں عشق یا پھر جنون۔" وہ خطرناک حد تک صاف گو تھا۔
"تم جانتے ہو بیلا کون ہے؟" خالہ نے پھر سوال کیا۔
"نہیں! مجھے نام بھی ابھی معلوم ہوا ہے۔" وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔
پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ یونہی ایک جگہ پر جم کر کھڑا تھا ابھی تک اسے بیٹھنے کی پیشکش نہیں کی گئی تھی اس کی ٹانگیں جواب دینے کو تھیں مگر وہ کھڑا رہا۔
"تم جیسے امیرزادے اور دل پھینک نوجوان دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ادھر تو نکلتے ہیں مگر بہت جلد انہیں اپنا اسٹیٹس اور دوسرے کا حسب نسب یاد آجاتا ہے

اور پھر وہ آنکھیں بالا خانوں کی سیڑھیوں پر نظریں جمائے بوڑھی ہو جاتی ہیں جن کو تم محبت کے خواب سونپ کر جاتے ہو۔" زہرہ بائی کی آنکھیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ ان کی آنکھوں میں بھی کچھ خواب کرچیاں بن کر چبھ رہے تھے۔

"اس سے پہلے کہ تم اپنے ہی جیسے بیلا کو سونپ کر اپنی دنیا میں مگن ہو جاؤ یہ اچھی طرح جان لو کہ تم کس جگہ آئے ہو اور کس لڑکی سے محبت کرتے ہو۔ اب بھی وقت ہے تم واپس پلٹ سکتے ہو۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر یک ٹک سامنے ایستادہ سعدون شفیع کو دیکھ رہی تھیں۔

"بیلا کے بارے میں کوئی غلط فہمی دل میں نہ رکھنا' اس نے یہاں پرورش ضرور پائی ہے مگر یہ ایک پاکباز ماں اور شریف باپ کا خون ہے اس لیے اسے دھوکا دینے کی کوشش مت کرنا محبت کے نام پر۔" وہ دو ٹوک انداز اپنائے ہوئے تھیں سعدون کی حالت کٹہرے میں کھڑے اس شخص کی سی تھی جسے اپنی صفائی کا موقع ہی فراہم نہیں کیا جا رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ کس جگہ آیا ہوں اگر محبت واقعی سچی نہ ہوتی تو اسی دن بیلا کا خیال اپنے دل سے نکال دیتا جب پیچھا کرنے کے دوران اس کے قدم اس بازار کی طرف مڑ گئے تھے۔ نہ ہی میں ان امیر زادوں میں سے ہوں جو تتلیوں کے پیچھے رنگ دبوچنے کے لیے بھاگتے ہیں اور نہ ہی شوقین مزاج ہوں کہ راگ رانگی کے چکر میں ادھر کا رخ کروں اور شوق پورا کر کے چلتا بنوں میں اپنے جذبے میں سچا ہوں اور خلوص نیت سے یہاں آیا ہوں۔" وہ بہت سج کر اور دھیمے انداز میں بول رہا تھا۔

"جن کی نیت خالص ہو وہ رات کے اندھیرے میں نہیں آتے برخوردار۔" زہرہ بائی کے لہجے میں طنز کی کڑواہٹ گھلی تھی۔

"دن کی روشنی میں آتا تو لوگ انگلی اٹھاتے سوال پوچھتے مجھ سے نہیں آپ سے۔ اس لیے اندھیرے میں چلا آیا کہ ان کے بارے میں کوئی غلط خیال نہ کرے۔" اس نے بیلا کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر قدرے سکون تھا مگر آنکھوں کی چتیوں میں نمی اب بھی ٹھہری ہوئی تھی۔

"تم جا سکتے ہو کسی شریف خاندان کے گھر ہوتا اگر دن کی روشنی میں آتے۔ عرصہ ہوا اس گھر کے دروازے اجنبیوں کے لیے بند ہو چکے ہیں اور رات کو اٹھنے والے راتوں کو زیادہ چوکنے ہو کر رہتے ہیں اگر اس لڑکی کی عزت بہت عزیز ہے تمہیں تو تمہیں بھی ... چاہیے۔" ان کے انداز میں اب کے نرمی تھی۔ ... چونک کر خالہ کو دیکھا وہ واپس جانے کے لیے مڑا۔

"میں تمہیں بیٹھنے کے لیے ضرور کہتی اگر رات کے بجائے دن ہوتا یہاں تمہیں دن میں خوش آمدید کہا جا سکتا ہے رات کے اندھیرے میں نہیں۔" اس نے اپنے عقب میں زہرہ بائی کی آواز سنی بیلا دروازہ بند کرنے کے لیے آگے بڑھی تھی اس نے دہلیز سے قدم باہر رکھتے ہوئے ایک نظر پلٹ کر بیلا کی طرف دیکھا وہ قریب سے اور بھی دلکش اور خوب صورت لگ رہی تھی سعدون زیادہ دیر تک اسے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا تھا وہ دروازے کے کھلے کواڑوں پر اپنے نازک مرمریں ہاتھ رکھے اس کے جانے کی منتظر تھی۔ سعدون کے چہرے پر دھیمی سی مسکان عود آئی تھی مگر دوسری طرف گہری سنجیدگی تھی جیسے ہی اس نے دہلیز چھوڑا بیلا نے دروازے کے دونوں پٹ آہستگی سے بند کر کے کنڈی چڑھا دی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور مفلر لپیٹ کر سیڑھیاں اترنے لگا۔

☆ - ☆ ☆

دور سے برف کی مانند سفید حویلی اب اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے گاڑی حویلی کے گیٹ پر روکی ہارن دینے سے گریز کیا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی کی لائٹیں دیکھ کر چوکیدار نے گیٹ کھول دیا حویلی کے در و دیوار پر سناٹے اور تارکی کا پوری طرح غلبہ تھا۔ چار دیواری کے اندر ایستادہ سنبل اور یوکلپٹس کے درخت گہری دھند کی لپیٹ میں تھے۔ رات کا پتہ نہیں کون سا پہر تھا وہ واپس پلٹا تھا اس نے ایک نظر اوپر چوبارے کی طرف دیکھی شہربانو کے کمرے میں روشنی تھی جو روشندان کی درز سے باہر آ رہی تھی۔ اسے ایک گونہ اطمینان کے احساس نے آن گھیرا جیسے وسوسوں اور خدشوں میں انہوں نے ایک ایک لمحہ گزارا ہو گا۔ مجھے ان کو بتا کر جانا چاہیے تھا چاہے کوئی بھی عذر پیش کر دیتا وہ کبھی نہ روکتیں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ سب کہتا ہوا اندر داخل ہوا دوسری منزل کی سیڑھیاں اگرچہ باہر کی طرف بھی تھیں مگر وہ ڈرائنگ روم کی طرف چل دیا کہ ہو سکتا ہے شہربانو اس کی منتظر ہوں ڈرائنگ روم کی روشنیاں گل تھیں صرف مدھم سی نیلی روشنی پورے ماحول پر چھائی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا اندر داخل ہوا تھا ایک نظر ڈرائنگ روم میں ڈال کر وہ دائیں طرف بنی سیڑھیوں کی طرف مڑنے ہی لگا تھا کہ اس کی نظر صوفے پر پڑی زیرو کے بلب کی مدھم روشنی میں نظر آنے والا سراپا یقیناً "عنایا" کا تھا وہ صوفے کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں موندے ہوئے تھی وہ سیڑھیوں سے پلٹ کر اس کے پاس جا کر رک گیا۔

"یہ یہاں کیوں بیٹھی ہے وہ بھی اتنی رات گئے اور سردی میں۔" اس نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے حیرانی سے سوچا جس کی سوئیاں رات کے دو بجانے کو تھیں کوئی جواب سمجھ میں نہ آیا تو دوبارہ سیڑھیاں چڑھنے کے لیے مڑا اس کا پاؤں سیڑھیوں کے قریب رکھے مصنوعی پھولوں کے گملے سے ٹکرایا تھا جسے وہ اندھیرے کی وجہ سے نہ دیکھ پایا تھا اس کھٹکے پر عنایا نے آنکھیں کھول دیں سامنے سعدون کھڑا تھا جو گردن سینے کو سیدھا کر کے عنایا کو دیکھ رہا تھا۔

"آئی ایم سوری تمہیں جگا دیا۔" وہ شرمندہ سا ہوا۔

"کہاں رہ گئے تھے اتنی دیر کر دی پھپھو بہت پریشان تھیں۔" اس نے اپنی پریشانی کو چھپا لیا تھا۔

"ضروری کام تھا ایک دوست کے پاس چلا گیا تھا۔" اسے نہ چاہتے ہوئے بھی جھوٹ بولنا پڑا۔

"مگر تم بتا تو سکتے تھے کہ کہاں ہو اور کتنے دیر تک گھر آؤ گے۔" اسے واقعی سعدون پر غصہ آیا ہوا تھا۔

"میرا موبائل گھر رہ گیا تھا اس لیے بتا نہیں پایا۔" اسے ماں کی بجائے کسی اور کے سامنے وضاحتیں کرنا پڑ رہی تھیں۔

"دوست کے پاس بھی تو موبائل ہو گا؟" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"پلیز عنایا کھانا یاد نہیں رہا تھا۔ اب بس بھی کرو تفتیش کرنا۔" وہ اکتا سا گیا وہ اس غیر متوقع ٹکراؤ کے لیے تیار نہیں تھا اور وہ اسے آڑے ہاتھوں لے رہی تھی۔

"جناب کو اندازہ نہیں ہے نا کہ کتنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے ہمیں' الٹا موصوف بگڑ رہے ہیں کھانا بھی نہیں کھایا میں نے تمہاری فکر میں اور پچھلے چار گھنٹوں سے یہاں سردی میں بیٹھی ہوئی ہوں۔" اسے سعدون کے رویے پر تاؤ سا آیا۔

"تو کھا لیتا کھانا اور کس نے کہا تھا کہ یوں جاگ کر میرا انتظار کرو خوامخواہ کا احسان جتایا جا رہا ہے مجھ پر۔" وہ بہت ہی کٹھور لہجے میں گویا ہوا عنایا نے ایک نظر بے یقینی سے اسے دیکھا کیا یہ انسان واقعی اتنا بے حس ہے یا مذاق کر رہا ہے مگر وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔

اسے واقعی بہت دکھ پہنچا تھا سعدون کے رویے سے۔ وہ تھوڑی دیر کھڑا رہا پھر تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگا یہ دیکھے بغیر کہ اس کی پشت پر جمی آنکھیں بھیگ گئی تھیں وہ کتنی دیر سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی اس کا دل رونے کو چاہ رہا تھا کتنی آسانی سے وہ اسے بے مایہ کر کے چلا گیا تھا اس کے اندر غبار سا بھرنے لگا تھا وہ جتنی شدت سے اسے چاہتی تھی وہ اتنا ہی اسے نظر انداز کر رہا تھا کیا تھا اگر وہ ذرا سا دل رکھ لیتا میرا۔ میری اس کے سامنے ذرا سی بھی اہمیت نہیں ہے تو میں کیوں مری جا رہی ہوں اس کے لیے وہ کھڑے کھڑے اپنے آپ کو کوس رہی تھی آنکھوں کی نمی تھی کہ خشک ہونے میں نہیں آ رہی تھی وہ آنکھیں رگڑتی اپنے کمرے کی طرف چل پڑی ڈائننگ ٹیبل پر رکھا کھانا جوں کا توں پڑا تھا جو وہ سعدون کے لیے رکھ کر

بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا شہر بانو ہاتھ میں تسبیح لیے بیڈ پر نیم دراز تھیں اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو اٹھ بیٹھیں اور ایک نظر سامنے لگے وال کلاک پر ڈال کر شکوہ کناں سی اسے دیکھنے لگیں وہ بھی اپنے آپ کو اس صورت حال کے لیے تیار کر چکا تھا للذا فوراً" آ کر پاس بیٹھ گیا۔

"آئی ایم سوری امی مجھے پتا ہے آپ بہت پریشان ہوں گی لیکن ایک دوست کے ساتھ ایمر جنسی ہو گئی تھی مجھے فوراً" نکلنا پڑا اور جلدی میں آپ کو بتا بھی نہ سکا۔" وہ خود ساختہ عذر پیش کرنے لگا شہر بانو خاموش تھیں تسبیح کے دانے آہستہ آہستہ ایک دوسرے پر گر رہے تھے اور ان کے لب خاموش ورد میں مشغول تھے۔

"امی پلیز!" وہ ان کے گھٹنے دباتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ رات کافی ہو گئی ہے۔" ناراضی ان کے چہرے سے عیاں تھی اور وہ ماں کی خفگی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

"آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں' نہیں تو میں سو نہیں پاؤں گا۔" وہ محبت سے بولا۔

"اپنی نیند کی فکر ہے تمہیں اور دوسروں کی ذرا پروا نہیں جنہوں نے آدھی رات تمہاری راہ تکتے گزار دی ہے۔" وہ قدرے درشتی سے گویا ہوئیں وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"حد ہوتی ہے غیر ذمہ داری کی۔ تم بچے نہیں سعدون جوان مرد ہو' دوسرے کی پریشانی اور خوشی کا ادراک ہونا چاہیے۔" وہ اپنی تسبیح سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولیں۔

"آئندہ ایسا نہیں ہو گا آپ ایک بار تو جانے دیجیے پلیز۔" وہ ملتجی ہوا تو شہر بانو اثبات میں سر ہلا کر دوسری طرف دیکھنے لگیں وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"عنایا کو بتایا ہے تم نے کہ تم آ گئے ہو وہ یقیناً" جاگ رہی ہو گی تمہارے انتظار میں۔" وہ دروازے کے قریب پہنچا تھا کہ شہر بانو نے دریافت کیا وہ کچھ دیر یونہی دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھے کھڑا رہا۔

"میں اپنے آنے یا جانے کے متعلق اسے بتانے کا مجاز نہیں ہوں اسے کوئی ضرورت نہیں ہے میرے معاملات میں گھسنے کی۔" اس کا لہجہ ایک دم روکھا سا ہو گیا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو سعدون وہ منگیتر ہے تمہاری رویہ ٹھیک کرو اس کے ساتھ۔" شہر بانو کو اس کا انداز برا لگا تھا۔

"اگر وہ تمہارا خیال رکھتی ہے اہمیت دیتی ہے تمہیں تو تم خوش ہونے کی بجائے اتنا نظر انداز کر رہے ہو اسے آج تمہاری وجہ سے اس نے کھانا تک نہیں کھایا کتنے گھنٹے کچن میں صرف کر کے اس نے تمہاری پسند کا کھانا تیار کیا تھا کچھ احساس ہے تمہیں۔" ان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں امی کہ اسے کوئی ضرورت نہیں ہے یوں میرے آگے پیچھے پھرنے کی مجھے سخت چڑ ہوتی ہے ایسی ڈرامہ بازی سے۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا شہر بانو گنگ سی اسے دیکھنے لگیں۔

"مجھے سخت نیند آ رہی ہے اس موضوع کو آپ کسی اور دن پر اٹھا رکھیے!" وہ انتہائی رکھائی سے کہتا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ شہر بانو بیٹے کی عنایا سے برگشتگی پر ملول سی بند دروازے کو دیکھتی رہ گئیں ان کی نکتہ رسی اور دور اندیشی کچھ اشارے دے رہی تھی کچھ نہ کچھ بے ترتیب ہو رہا تھا ان کا ہاتھ بے اختیار پھر تسبیح کی طرف چلا گیا۔

"یا اللہ رحم!" وہ گہری سانس لے کر دوبارہ تسبیح ہاتھ میں لے کر دانے پر دانا گرانے لگیں نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ کمرے میں آیا تو سونے کی نیت سے تھا مگر تکیے پر سر رکھتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں سے روٹھنے والی نیند نہیں بے چینی تھی جو بیلا سے ملاقات کے بعد اور بھی سوا ہو گئی تھی۔ وہ لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ بیلا کی محبت اسے اس طرح بے بس کر دے گی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ بیلا کے رویے نے اسے سخت مایوس کیا تھا۔ اس کے چہرے پر اپنے لیے اس نے ذرہ بھر بھی کسی جذبے کی رمق دکھائی نہیں دی تھی۔

"یہ ضرورت ہے کہ میں اس کے پیچھے مجنوں بنا پھروں وہ بھی میرے اوپر مرے۔" وہ اپنی ہی سوچ پر تلخی سے مسکرا دیا۔ "مجھے قبول کرنا اس پر فرض نہیں چاہے وہ مجھے دھتکار دے یہ اس کی مرضی۔" وہ بہت دیر تک لے کر کمرے میں ٹہلتے زیر لب بڑبڑاتا رہا سعدون کا ذہن عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھا ایک طرف بیلا تھی جو اس کی پہلی اور آخری خواہش بن چکی تھی دوسری طرف اس کی ماں کی پسند عنایا تھی جو بقول شہر بانو کے اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی وہ جانتا تھا کہ جس دن بھی اس کے منہ سے بیلا کا ذکر ہوا اس دن حویلی میں وہ طوفان اٹھے گا جس کا سامنا کرنا اس کے بس سے باہر ہو گا شہر بانو اس کا چہرہ دیکھنا تک گوارہ نہیں کریں گی اور بابا جان شاید وہ ان کے سامنے سر اٹھا کر چل سکے گا ان کے سر پر کیا گزرے گی اور عنایہ۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"وہ تو شاید جیتے جی مر جائے گی۔" وہ سر تھام کر کتنی دیر وہیں بیٹھا رہا دماغ میں سوچوں کی یلغار تھی ایک ایسی شدت پسند بیلا تھی جو اسے توڑ پھوڑ رہی تھی۔ دماغ منطق کی بات سمجھتا تھا تو دل جذبوں کی۔ ایک طرف محبت دوسری طرف سمجھوتا اور وہ سمجھوتے اور جبر کی زندگی گزارنے کے حق میں نہ تھا۔ تھک ہار کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ نیند کی دیوی تو اب بھی اس کی آنکھوں سے کترا رہی تھی مگر سعی کرنے میں کیا حرج تھا۔ جاڑے کی طویل رات کا آخری پہر بھی گزرنے کو تھا۔

اگلی صبح حسب معمول بہت عام سی تھی مگر عنایا کے لیے جیسے سب کچھ ہی بے معنی ہو کر رہ گیا تھا گزشتہ شب جو کچھ اس پر بیتا وہ جانتی تھی یا اس کا خدا۔ سعدون کی بے اعتنائی کو وہ پہلے اس کی احتیاط پر محمول کرتی آئی تھی لیکن رات کو جو رویہ سعدون نے اختیار کیا تھا وہ اس کی انا کے لیے تازیانے سے کم نہ تھا۔ وہ اس کی طرف ہاتھ کیا بڑھاتا اس نے تو عنایا کی بے لوث محبت کو بھی در خور اعتنا نہ سمجھا تھا اور وہ جو بیماری کی حد تک حساس تھی ساری رات اس بات پر چلتی رہی۔ اس کی سوجی آنکھوں کو اور کسی نے نہ سہی مگر شہر بانو نے ضرور دیکھ لیا تھا اور وہ سمجھ گئی تھیں ان خوب صورت آنکھوں کو رت جگوں کے حوالے کرنے کا سبب کون تھا۔ مگر وہ دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی تھیں۔ سعدون کو وہ سمجھا تو سکتی تھیں مجبور نہیں کر سکتی تھیں اور اسی جگہ آ کر وہ بے بس ہو جایا کرتی تھیں۔

ان دنوں ان کے دل میں نئے خدشے سر اٹھا رہے تھے۔

"کہیں غیاث شفیع تو سعدون کو نہیں بہکا رہا؟ ہو سکتا ہے وہ نہ چاہتا ہو کہ شہر بانو کے خاندان کی کوئی لڑکی سعدون کی زندگی میں آئے یہ بات سب کو پتا ہے کہ سعدون اپنے باپ سے ملتا رہتا ہے اور غیاث کی ذہنیت سے کچھ بھی بعید نہیں اس کے پاس شہر بانو سے بدلہ لینے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا کہ وہ سعدون کی برین واشنگ کر کے اسے اپنی ماں کے فیصلے سے منحرف ہونے پر اکسائے سعدون کٹھ پتلی کی طرح غیاث کی انگلیوں کی جنبش پر یہ سب کچھ کر رہا ہو گا اس سے پہلے کہ وہ کوئی انتہائی قدم اٹھا لے یہ ڈور غیاث کے ہاتھوں سے چھیننی پڑے گی۔" وہ حویلی کے دالان میں بظاہر سب کے درمیان بیٹھی تھیں مگر ذہن کسی اور تانے بانے میں الجھا تھا۔

"پھپھو!" موسیٰ کی آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"آں...." وہ کسی گہرے خیال سے چونکیں۔

"کیا بات ہے آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟" موسیٰ نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کینو چھیلتے ہوئے شہر بانو کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"کچھ نہیں بیٹا بس ایسے ہی۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ٹال گئیں۔

"نہیں پھپھو جانی کچھ تو ہے آپ چھپا رہی ہیں۔"

بالہ نے بھی گود میں رکھی کتاب کو بند کرتے ہوئے سوال کیا وہ دونوں اتوار کی چھٹی کی وجہ سے آج گھر پر تھے۔

"بس رات نیند نہیں آئی نا اس لیے طبیعت ذرا سی بوجھل ہے اور کچھ نہیں۔" وہ گہری سانس لے کر میز پر رکھا اخبار اٹھاتے ہوئے بولیں۔

"سعدون بھائی کتنے بجے آئے تھے رات اور کچھ بتایا کہاں رہ گئے تھے؟" موسی کو اچانک خیال آیا۔

"کہہ رہا تھا کسی دوست کے ہاں ٹھہر گیا تھا بس اسی کے انتظار میں جاگتی رہی شاید اس وجہ سے بھی کچھ بھاری پن ہو رہا ہے سر میں۔" وہ اخبار پڑھنے کا ارادہ موقوف کر کے اسے دوبارہ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"تم لوگ گپ شپ لگاؤ میں سعدون کو دیکھ لوں دوپہر ہونے کو آئی ہے اور وہ ابھی تک سو رہا ہے۔" وہ بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ کر اندر چلی گئیں حالانکہ وہ جانتی تھیں سعدون کب کا اٹھ چکا ہے۔

☼ ☼ ☼

بادلوں اور سورج کی آنکھ مچولی جاری تھی کبھی ایک دم ہر طرف ہلکی سنہری دھوپ نمایاں ہو جاتی تو کبھی بادلوں کی اوٹ میں چھپ کر سایہ سا بن جاتی۔ بارش کا امکان کم تھا کہ ہر طرف ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جس سے بادل روئی کے نرم گالوں کی طرح وسیع و بسیط آسمان پر بکھرے جا رہے تھے۔

وہ بالکونی میں کھڑا جاتی سردیوں کے موسم کی اٹھکیلیاں دیکھ رہا تھا کہ اسے اپنے عقب میں کھٹکا محسوس ہوا اس نے ریلنگ پر رکھے ہاتھ اٹھا لیے اور پلٹ کر پیچھے دیکھا اس کے پیچھے شہربانو کھڑی تھیں۔

"یہاں کیوں کھڑے ہو؟" انہوں نے عام سے انداز میں پوچھا۔

"بس یونہی ذرا موسم انجوائے کر رہا تھا آپ آیئے نا بیٹھیے۔" اس نے بالکونی میں رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں یہاں بہت ٹھنڈ ہے ذرا اندر آؤ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" وہ قدرے سنجیدگی سے بولیں۔

"کون سی بات؟" وہ نہ سمجھنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"کہا نا اندر چلو میرے کمرے میں بتاتی ہوں کیا بات ہے۔" وہ اتنا کہہ کر واپس مڑ گئیں اور وہ کچھ سوچتے ہوئے ان کی تقلید میں چل پڑا۔ اندر کمرے میں ... زبی کمرے کی جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔

"بس رہنے دو اب تم جاؤ۔" انہوں نے اسے روک کر جانے کے لیے کہا تو وہ سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"بیٹھو!" انہوں نے سعدون کو بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر خود بھی بیڈ کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر وہ چپ بیٹھی رہیں شاید جو بات کرنی تھی اس کے لیے مناسب جملے کی تلاش میں تھیں اور وہ ان کے بولنے کا منتظر تھا خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد وہ گویا ہوئیں۔

"سعدون مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے لیکن پہلے مجھ سے وعدہ کرو کہ بالکل سچ سچ بتاؤ گے۔" انہوں نے تمہید باندھی تو وہ کانپ سا گیا وہ کیا پوچھنے جا رہی تھیں اس کا خیال فوراً بیلا کی طرف چلا گیا تو کیا انہیں پتا چل گیا ہے اس کے ہاتھوں میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

"آپ پوچھیے کیا پوچھنا ہے۔" وہ خشک ہوتے حلق سے تھوک نگلتے ہوئے بولا وہ اگر خدا کے بعد کسی سے ڈرتا تھا تو وہ شہربانو تھیں وہ انتہائی سخت گیر اور دبنگ خاتون تھیں اور سعدون جانتا تھا کہ اس کی ماں اصولوں پر سمجھوتے کی قائل نہیں ہے۔ انہوں نے اپنا ... شوہر چھوڑ دیا تھا یہاں تک کہ بیٹا بھی مگر اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹی تھیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس نے یہ بتایا کہ وہ کس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے تو وہ نا صرف اس سے قطع تعلق کریں گی بلکہ شاید دودھ بھی نہ بخشیں اور وہ عنایہ سے بہت محبت کرتی تھیں یہ کبھی برداشت نہ کریں کہ ...

اور لڑکی وہ بھی بازار حسن کی پیداوار اس کے حقوق سلب کر لے۔ وہ چند لمحوں میں دل ہی دل میں حالات کے نئے رخ بھانپ گیا تھا۔

"تم غیاث سے ملتے رہتے ہو؟" انہوں نے ٹٹولنے والے انداز میں اسے دیکھا تو وہ جو شہربانو کے تیور دیکھ کر سہم سا گیا تھا ان کا سوال سن کر جیسے کسی بڑے بوجھ سے آزاد ہو گیا تھا۔

"ملتا رہتا تھا لیکن اب تو کافی دن ہو گئے ہیں ملاقات نہیں ہوئی۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"کیوں؟" شہربانو نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔

"ان کا سیکریٹری بتا رہا تھا کہ وہ انگلینڈ گئے ہوئے ہیں؟" اس نے کندھے اچکا کر کہا۔

"کب سے تمہاری اس سے ملاقات نہیں ہوئی!" انہوں نے تفتیشی انداز اپنایا۔

"تقریباً" تین ماہ ہو گئے ہیں چھوٹی عید پر ان سے ملنے گیا تھا اس کے فوراً" بعد شاید وہ انگلینڈ چلے گئے تھے اب کا مجھے پتا نہیں کہ وہ واپس آ گئے ہیں یا نہیں۔" اس نے تفصیل شہربانو کے گوش گزار کر دی۔

"لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟" اس نے حیرانی سے شہربانو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے اسے بتایا کہ تمہاری عنایا سے منگنی ہو گئی ہے۔" انہوں نے سعدون کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں وہی بتا رہا ہوں کہ کافی عرصہ ہو گیا ان سے ملاقات نہیں ہے پھر منگنی کے بارے میں کیسے بتاتا۔" وہ ... بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ شہربانو نے اثبات میں سر ہلا دیا ان کے خدشات درست نہیں تھے غیاث کا ... سارے معاملے میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

"مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہی ہیں؟" اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دہرایا۔

"مجھے لگ رہا تھا کہ وہ تمہیں مس گائیڈ کر رہا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔"

"کس معاملے میں؟" وہ نا سمجھی کے عالم میں ان کو دیکھنے لگا۔

"تمہارے معاملے میں۔" شہربانو نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تمہارا رویہ روز بروز عجیب و غریب ہوتا جا رہا ہے مجھے تو وجہ سمجھ نہیں آ رہی کیوں تم ایسا کر رہے ہو؟" وہ بالآخر اصل بات پر آ گئیں۔

"کیا ہوا ہے میرے رویے کو امی آپ کو پتا نہیں کیوں ایسا لگ رہا ہے۔" وہ خود بھی سمجھ گیا مگر اس طرف آنا نہیں چاہتا تھا۔

"ایسا لگ نہیں رہا واقعی ایسا ہے مجھے عنایا سے تمہارے گریز کی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ گھر والوں سے تم الگ الگ رہتے ہو بغیر بتائے غائب ہو جاتے ہو یہ کیا ڈرامہ ہے سعدون؟" ان کے لہجے میں ترشی نمایاں تھی۔

"امی وجہ کچھ بھی نہیں ہے اصل میں آخری سمسٹر چل رہا ہے نا اس لیے ذرا مصروف رہتا ہوں پڑھائی کی ٹینشن بھی تو آتی ہے۔" اسے یہی جواز سوجھا تھا سو بیان کر ڈالا۔

"ٹھیک ہے لیکن آئندہ تمہارا رویہ درست ہونا چاہیے۔ مجھے خوامخواہ شرمندہ مت کروایا کرو۔" وہ تحکمانہ انداز میں بولیں تو اس نے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا اب اس پر بحث کرنا لاحاصل تھا وہ جانتا تھا کہ ماں سے بحث کرنے کا نتیجہ ماسوائے ان کی خفگی اور ناراضی کچھ نہ ہو گا۔ وہ اجازت لے کر اپنے کمرے میں آ گیا اس کے اسٹڈی ٹیبل پر نوٹس بکھرے پڑے تھے۔ وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر بلاوجہ ماؤس کو ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا حالانکہ وہ بالکل بھی متوجہ نہیں تھا۔

ذہن پھر اس بات پر اٹک گیا تھا کہ دل کا کیا کیا جائے اگر بیلا سے اس کا ٹکراؤ نہ ہوتا تو وہ عنایا کو شریک سفر کے طور پر چن کر یقیناً" خوش ہوتا مگر اب وہ دو کشتیوں کا سوار تھا اور بیچ منجدھار وہ ڈوبنا نہیں چاہتا تھا جو بھی تھا بیلا کا پلڑا پھر بھی بھاری تھا کہ دل کا جھکاؤ اسی کی طرف تھا۔ وہ دل کی مسند پر پورے کروفر سے براجمان تھی۔ ساری راجدھانی اسی کی تھی عنایا تو کہیں دل کے بعد

دریچوں کے پیچھے رہ گئی تھی تنہا خالی ہاتھ۔ بیلا کا خیال آتے ہی اس کے سامنے پھر وہی دلکش بیضوی چہرہ اور غلافی آنکھیں آگئی تھیں جن پر وہ فدا ہو گیا تھا کچھ بھی ہو جائے وہ اسے حاصل کرنے کی ٹھان چکا تھا اسے یقین تھا کہ بیلا کی رضامندی کے بعد وہ حالات کے مطابق شہربانو کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لے گا مگر اب سوال یہ تھا کہ بیلا کو کس طرح باور کرایا جائے کہ سعدون شفیع کے لیے وہ جزولاینفک بن چکی ہے ابھی ریاضت باقی تھی اور اس ریاضت کا ثمر اس کے مقدر کے ہاتھ میں تھا۔ اسے یقین تھا بیلا ایک دن اس کی محبت کے سامنے سر جھکا دے گی۔

محبت خود بتاتی ہے
کہاں کس کا ٹھکانہ ہے
کسے آنکھوں میں رکھنا ہے
کسے دل میں بسانا ہے
رہا کرنا ہے کس کو
اور
کسے زنجیر کرنا ہے
مٹانا ہے کسے دل سے
کسے تحریر کرنا ہے
گھروندہ کب گرانا ہے
کہاں تعمیر کرنا ہے
اسے معلوم ہوتا ہے
سفر دشوار کتنا ہے
کسی کی چشم حیراں میں
چھپا اقرار کتنا ہے
شجر جو گرنے والا ہے
وہ سایہ دار کتنا ہے
محبت خود بتاتی ہے

اس پر بھی جیسے محبت الہامی صورت میں اتر رہی تھی اور وہ اس الہام کو اپنے دل میں اتار رہا تھا قطرہ قطرہ ۔۔۔ بوند بوند اس کا تن اور من بھیگ رہا تھا یہ ساون اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

شبلی بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا وہ سعدون کا قریبی دوست ہونے کے ساتھ ساتھ رازدار بھی تھا۔ تب ہی تو سعدون نے ساری صورت حال اس کے گوش گزار کر دی تھی اور وہ یونیورسٹی کے لان میں بیٹھا حیرانی سے سعدون کو دیکھنے لگا تھا۔

"تم جانتے ہو اس کے نتائج کیا نکلیں گے۔" بچپن ہی سے وہ خاصا دور اندیش واقع ہوا تھا۔

"تم مجھے ڈرا رہے ہو؟" سعدون نے گھاس سے تنکے نوچتے ہوئے ایک نظر شبلی کی طرف دیکھا۔

"بات ڈرانے یا نہ ڈرانے کی نہیں ہے حقیقت ہے۔ حقیقت یہ ہے تمہاری آنکھیں جس لڑکی سے چار ہوئی ہیں اس کا تعلق جس محلے سے ہے اسے قبول کرنا موجودہ حالات میں بھی اتنا آسان نہیں ہے اور تمہاری تو پہلے ہی منگنی ہو چکی ہے کیسے سامنا کرو گے عنایہ کا اور گھر والوں کا؟" وہ اسے حقیقت کا تلخ پہلو دکھا رہا تھا۔

"وہ بعد کی بات ہے فی الحال تو مجھے بیلا اور اس کی خالہ کو راضی کرنا ہے وہ میرا ساتھ دینے پر تیار ہو گئی تو میں ہر طرف کی چویشن کا سامنا کر لوں گا مجھے اسے حاصل کرنا ہے ہر صورت اور ہر قیمت پر۔" وہ ٹھوس اور قطعی لہجے میں بولا تو شبلی گہری سانس لے کر رہ گیا۔

یونیورسٹی سے واپسی پر اس کا رخ پھر اسی کوچے کی طرف تھا جہاں وہ اپنا بے قرار دل چھوڑ آیا تھا بے کلی اضطراب کا جو بیج اس کے دل میں بویا تھا وہ جڑ پکڑ چکا تھا وہ نہ چاہتے ہوئے بھی محبت کے اس پودے کی آبیاری کرنے پر مجبور تھا۔ ایک بے نام سی خلش اور ۔۔۔ گراں سی تپش تھی جو اس کا من جھلسائے جا رہی تھی اور وہ چند ٹھنڈے چھینٹوں کی تلاش میں پھر اس طرف چلا آیا تھا۔

زہرہ بائی نے کہا تھا کہ وہ دن کی روشنی میں ادھر آئے دروازہ اس کے خیر مقدم کے لیے کھلا ہو گا بصورت دیگر نہیں لہٰذا وہ حویلی جانے کی بجائے بیلا کے مکان کی طرف آ گیا۔ گلی کے نکڑ پر بیٹھا بوڑھا غور سے اسے دیکھ رہا تھا وہ جب عین اس کے سامنے سے گزرا اس نے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر اسے سلام کیا سعدون

آگے بڑھ گیا۔ آج اس کے قدموں میں لرزش نہیں تھی وہ جانتا تھا اب وہ اس گھر کے مکینوں کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ وہ آخری سیڑھی پر پہنچ کر ایک لحظے کے لیے رکا پھر دروازے پر آہستگی سے دستک دی کچھ دیر بعد کھڑک کی آواز کے ساتھ اندرونی کنڈی ہلی اور زہرہ بائی کا چہرہ سامنے آیا۔

"السلام علیکم!" اس نے فوراً مودب ہو کر کہا۔

"وعلیکم السلام 'اندر آجاؤ۔" زہرہ بائی نے آرام سے کہا آج ان کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں غائب تھیں۔ سعدون کو حوصلہ سا ہوا۔ وہ اندر چلا آیا جس چہرے کا وہ متلاشی تھا وہ سامنے نہ تھا۔

"بیٹھو" قریب ہی زہرہ بائی بمشکل چلتی ہوئی اپنے پلنگ تک پہنچیں وہ دیوار کے ساتھ رکھی دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

"کیسے آنا ہوا؟" وہ پھولے سانسوں کے درمیان بولیں۔

"آپ جانتی ہیں۔" سعدون نے فرش پر نظریں جمائے ہوئے آرام سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ایسا کب تک چلے گا؟"

"میں سمجھا نہیں" اس نے سر اٹھا کر زہرہ بائی کی جانب دیکھا۔

"میں بلا مقصد کسی کے گھر چکر لگانے کے حق میں نہیں ہوں تم مجھے سلجھے ہوئے اور سنجیدہ انسان لگے ہو اس لیے اجازت اور رعایت دی مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم بیلا سے ملنے کے لیے آئے دن چلے آؤ اگر واقعی سنجیدہ ہو تو اس تعلق کو کوئی نام دینا ہو گا۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر مگر مضبوط لہجے میں بول رہی تھیں سعدون خاموشی سے سنتا رہا وہ سمجھ سکتا تھا کہ زہرہ بائی کی بات کا مفہوم کیا ہے مگر اس وقت وہ جس مقصد کے لیے آیا تھا وہ پورا نہیں ہوا تھا اس کو شک سا گزرا کہ بیلا گھر پر نہیں ہے اس کا جی ایک دم اوب سا گیا زہرہ بائی اپنی گفتگو جاری رکھے ہوئے تھیں۔

"میں چاہتی ہوں کہ اس سے پہلے کہ گلی والے مجھے اور بیلا کو شک بھری نظروں سے دیکھیں تم کوئی

فیصلہ کر لو اور مجھے بتا دو۔" وہ دوٹوک انداز میں کہہ کر سعدون کو دیکھنے لگیں۔

"جی ۔۔۔۔ وہ میں بات کرتا ہوں گھر والوں سے۔" متذبذب سے سعدون نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا "کس کے بیٹے ہو اور کہاں رہتے ہو؟" زہرہ بائی کو اگلے مرحلے کے سوال بھی از بر تھے۔

"سید پور کے علاؤالدین شاہ میرے نانا تھے!" اس نے گہری سانس لے کر کہا اپنے تعارف کے لیے یہی حوالہ اسے سب سے بہتر لگا۔

"میں نے پوچھا کس کے بیٹے ہو' تمہارے والد حیات ہیں کیا کرتے ہیں؟" انہیں اپنے مطلوبہ جواب کی تلاش تھی لہٰذا سوال کو پھر سے دہرایا۔

"وہ باہر ہوتے ہیں بزنس مین ہیں میں اپنی امی کے ساتھ نانا کے گھر رہتا ہوں غیاث شفیع کا بیٹا ہوں۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تعارف کروا بیٹھا حالانکہ باپ کا حوالہ کچھ اتنا معتبر نہ تھا اس کے لیے مگر زہرہ بائی کو شناخت کے لیے کوئی حوالہ تو دینا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھیں۔

"اچھا تو تم غیاث شفیع کے بیٹے ہو۔" انہوں نے سپاٹ سے لہجے میں کہا سعدون نے چونک کر انہیں دیکھا اسے اندازہ نہ ہوا کہ زہرہ بائی کے لہجے میں حیرت تھی طنز تھا یا ستائش۔

"آپ ان کو جانتی ہیں؟" اس نے فوراً سوال کیا۔

"وہ ایک مشہور بزنس مین ہے اسے کئی لوگ جانتے ہیں۔" سعدون کو لگا وہ اسے ٹال گئی تھیں وہ لاجواب سا ہو کر دوبارہ فرش کے ٹوٹے پھوٹے حصوں کو دیکھنے لگا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری کوئی خاطر مدارات نہیں کر سکی کیونکہ جب سے گھٹنوں کا عارضہ لاحق ہوا ہے کچن کا تو جیسے رستہ ہی بھول گیا ہے اور ابھی بیلا کے آنے میں بھی کچھ وقت ہے۔" وہ تکیے کا سہارا لے کر لیٹتے ہوئے بولیں۔

"کوئی بات نہیں میں چلتا ہوں ورنہ دیر ہو جائے۔" وہ مایوس سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ زہرہ بائی کی باتوں سے اسے

بھی اندازہ ہوا کہ وہ درپردہ اسے جانے کا اشارہ کررہی تھیں وہ بولیں کچھ نہیں بس غور سے اسے دیکھتی رہیں۔ وہ اللہ حافظ کہہ کر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

ابھی اس نے نیچے جانے کے لیے تین چار سیڑھیاں ہی پھلانگی تھیں کہ اس کا سامنا بیلا سے ہو گیا۔ وہ کچھ کتابیں ہاتھ میں تھامے اس کے عین سامنے سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی کہ سعدون کو نیچے اترتے دیکھ کر رک سی گئی۔ وہ ایک بار پھر مسمرائز ہو گیا تھا۔ وہی روح تک اترتی گہری آنکھیں اس نے کالی چادر سے اپنے نصف چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا سعدون اس کی آنکھوں میں حیرانی کو دیکھ سکتا تھا وہ پہلی سیڑھی پر ساکت کھڑی تھی جیسے سعدون کے اترنے کی منتظر ہو وہ تین سیڑھیوں سے ایک بار پھر نیچے اترنے لگا آخری سیڑھی پر پہنچ کر وہ عین اس کے سامنے رک گیا۔

"کیسی ہو؟" اس نے سعدون کی طرف دیکھا وہ اس کا رستہ روکے کھڑا تھا۔

"ٹھیک ہوں" اس نے بالآخر کہہ ہی دیا سعدون فوراً ایک طرف ہو گیا وہ جھجکتی ہوئی اس کے پاس سے گزر کر اوپر چلی گئی۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر مسکرا کر گلی کی طرف مڑ گیا۔ اس کا سفر رائیگاں نہیں گیا تھا ایک ادھوری سی جھلک ہی سہی اس کے دل کو بہرحال کچھ قرار مل گیا تھا۔

"وہ پھر آیا تھا تمہیں؟" اس نے جیسے ہی اندر آکر چادر اتاری خالہ نے دریافت کیا۔

"جی۔" اس نے مختصراً کہا اور چادر کو تہ کرنے لگی۔

"تم کھانا کھالو پھر مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" زہرہ بائی نے دیوار کے ساتھ پشت ٹیکتے ہوئے یوں سے کہا۔

"کیا بات؟" اس کے حرکت کرتے ہاتھ ایک دم رک گئے۔

"کہا ناں تم پہلے کھانا کھالو۔" زہرہ بائی نے آرام سے کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ چادر کو تہ کرکے ایک طرف رکھتے ہوئے بولی سعدون سے ٹکراؤ کے بعد اس کی بھوک ویسے ہی اڑ گئی تھی پھر خالہ کے انداز نے اس کی رہی سہی بھوک کو بھی ختم کر دیا تھا وہ کتابیں اٹھا کر سامنے ٹیبل پر ترتیب سے رکھ کر دوبارہ زہرہ بائی کے پاس چلی آئی۔

"بیٹھو یہاں" انہوں نے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا وہ پلنگ پر ٹک گئی۔

"بھوک کیوں نہیں ہے تمہیں صبح ٹھیک طرح سے ناشتہ بھی نہیں کیا اور کالج چلی گئیں۔" خنسہ کو فکر مندی نے آن گھیرا۔

"کالج میں کچھ کھا لیا تھا اب اتنی بھوک نہیں ہے خالہ۔" اس نے بالوں کو سمیٹ کر پیچھے کی طرف باندھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے کیا بات کرنی تھی؟" اس نے خالہ کی طرف دیکھا۔

"وہ آج تمہارے لیے پھر یہاں آیا تھا میں نہیں جانتی کہ وہ کتنا سچا ہے مگر اتنا اندازہ ہو گیا ہے کہ۔۔ تمہارے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔" خالہ آہستہ آہستہ بول رہی تھیں وہ خاموشی سے انہیں دیکھنے لگی جو کچھ وہ اسے بتا رہی تھیں اس میں بیلا کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی سعدون کے بارے میں اتنا اندازہ تو وہ بھی لگا چکی تھی۔

"مجھے تم سے صرف اتنی سی بات پوچھنی ہے تم اس کے بارے میں کیا سوچتی ہو؟" خنسہ کے اس غیر متوقع سوال پر وہ کچھ گھبرا سی گئی۔

"میں نے کیا سوچنا ہے؟" وہ سوالیہ انداز میں زہرہ بائی کی طرف دیکھنے لگی۔

"گھبراؤ نہیں میں تم سے صرف سچ سننا چاہتی ہوں تم اس لڑکے کے بارے میں کتنی سنجیدہ ہو کیا یہ معاملہ یک طرفہ ہے؟" خالہ نے پلنگ کی پائنتی پر رکھے اس کے مرمریں اور نرم و گداز ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"خنسہ ایسی کوئی بات نہیں ہے میں نے کبھی اس

کے بارے میں نہیں سوچا میری توجہ ابھی صرف اپنی تعلیم پر ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"ہوں! تو اس کا مطلب ہے جو فیصلہ میں کرنے جا رہی ہوں اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہوگا اور نہ ہی یہ تمہاری زندگی پر اثر انداز ہوگا۔" خالہ نے کچھ سوچتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"کون سا فیصلہ؟" بیلا نے چونک کر زہرہ بائی کی طرف دیکھا۔

"اگر تم اس لڑکے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں تو اس کے یہاں آنے کا کیا مقصد تم اسے صاف صاف منع کیوں نہیں کر دیتیں" خالہ نے بیلا کے تاثرات پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے اگر آپ کو اس کا آنا یہاں اچھا نہیں لگتا تو بہتر ہے منع کر دیں میری تو اس سے کبھی بات چیت ہی نہیں ہوئی اتفاقاً" سامنا ہو جائے تو وہ اور بات ہے۔"

"اب اگر تمہارا اس سے سامنا ہو تو اسے کہہ دینا کہ تمہارا خیال چھوڑ دے اور ادھر کے چکر نہ لگائے۔" زہرہ بائی نے پاندان اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

"وجہ پوچھ سکتی ہوں؟" بیلا کو اچانک خالہ کا سعدون کے معاملے میں یوٹرن لینا سمجھ میں نہ آیا یہی خالہ چند دن پہلے اس بات پر خوش ہو بیٹھی تھیں کہ وہ ایک اچھا لڑکا تھا اور کسی بری نیت سے یہاں نہیں آیا تھا اس لیے بیلا کے لیے اس کا انتخاب کرنے میں کیا حرج تھا بشرطیکہ وہ اپنے والدین کو اس رشتے پر راضی کر لے اور آج وہ اسے سعدون کو یہاں آنے سے منع کرنے پر اکسا رہی تھیں۔

"ایک وجہ ہے مگر تمہیں وہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے بس تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے اسی میں ہم دونوں کی عافیت ہے۔" خالہ تجسس پھیلا کر آرام سے پان بنانے میں مصروف ہو گئی تھیں اور وہ نا سمجھی کے عالم میں انہیں دیکھتی رہی وہ دوبارہ پوچھنے کی ہمت بھی نہیں رکھتی تھی۔

وہ بچپن سے زہرہ بائی کی سخت طبیعت سے ڈری رہتی تھی پچھلے دو سالوں سے وہ ادھر ہی رہ رہی تھی مگر وہ اب تک اپنے خوف کو ختم نہ کر سکی تھی۔ خالہ کے سخت رویے کی ایک وجہ تو تنگ دستی بھی تھی اور دوسرا ان کا ماضی جو انہوں نے کبھی بیلا پر ظاہر نہیں کیا۔ پچھلے سال وہ بہت بیمار ہو گئی تھیں مگر مکان چھوڑنے پر بھی راضی نہ تھیں مجبوراً" بڑی بہن کو دیکھ بھال کے سبب بیلا کو بھیجنا پڑا اس کے ساتھ ساتھ زہرہ بائی کا خرچ بھی انہوں نے اپنے ذمے لیا۔ زہرہ بائی کی سخت طبیعت کی بدولت کوئی بھی بیلا کو میلی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆
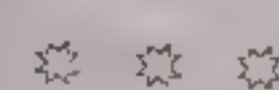
شہربانو اشراق کے نوافل پڑھ کر فارغ ہوئیں تو زیبی ٹرے میں چائے لے کر اندر آ گئی۔ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رکھے تھے زیبی ان کے اشارے کی منتظر ٹرے ہاتھ میں تھامے کھڑی تھی۔

"ٹیبل پر رکھ دو" انہوں نے دعا ختم کرتے جب نماز لپیٹتے ہوئے زیبی کو کہا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر چائے پینے لگیں زیبی جانے کی بجائے وہیں ایستادہ رہی شہربانو نے محسوس کیا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر ہچکچا رہی ہے۔

"کوئی بات کرنی ہے تمہیں؟" شہربانو نے چائے کا گھونٹ لے کر پیالی دوبارہ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے گویا اس کی مشکل حل کر دی۔

"جی بی بی ایک بات بتانی تھی آپ کو" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"ہاں بولو!" شہربانو اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"آپ غصہ تو نہیں کریں گی جی ہو سکتا ہے میری سنائی غلط ہو پر میرے دل سے یہ بات نکل نہیں رہی تو جب تک اپنا وہم نہ دور کروں۔"

"اب بتا بھی چکو زیبی۔" شہربانو اس کی تمہید سے اکتا کر بولیں۔

"وہ جی میں نے ایک بات سنی ہے سعدون صاحب کے بارے میں۔" وہ ذرا نزدیک ہوتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولی۔

"کیا بات؟" شہربانو کا دل دھڑکا تھا پتا نہیں زیبی اب کیا کہنے جا رہی ہے۔

"ایک کے بندے نے بتایا ہے جی میرا نام نہ آئے۔" وہ پھر اپنے تحفظات کا اظہار کرنے لگی۔

"بات بتاؤ!" شہربانو نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھ کر ڈپٹا۔

"میں نے سنا ہے جی سعدون صاحب کا ادھر کوٹھے والیوں کے پاس آنا جانا ہے طوائفوں کے پاس جی۔" زیبی نے جیسے شہربانو کے سر پر بم پھوڑا تھا وہ بے یقینی سے دیکھ رہی تھیں ایک لمحے کو وہ سن سی ہو گئیں "تمہیں کس نے بتایا؟" الفاظ ان کے حلق سے بمشکل ادا ہوئے زیبی جو کچھ کہہ رہی تھی وہ جھوٹ بھی تو ہو سکتا تھا۔

"میرا سسر بتا رہا تھا اللہ کرے ایسا نہ ہو مجھے تو خود یقین نہیں آیا توبہ۔" وہ باری باری دونوں ہاتھوں سے کان کی لوؤں کو چھو کر بولی۔

"اسے کس نے بتایا کہ سعدون ادھر جاتا ہے!" شہربانو کو اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"اس نے خود دیکھا ہے جی۔" زیبی پورے تیقن سے بولی۔

"کیسے؟"

"وہ جی میرا سسر ادھر تانگہ چلاتا تھا شہر سے بازار تک مگر اب اس نے وہاں چوکیداری شروع کر دی ہے۔ پچھلے جمعہ کو وہ مجھے ادھر چھوڑنے آیا تو اس نے سعدون صاحب کو گاڑی میں بیٹھتے دیکھا تھا بولا یہ تو وہی ہیں جو ادھر کوٹھے کے چکر لگاتا ہے۔" زیبی نیچے قالین پر چسکڑا مار بیٹھ گئی تھی شہربانو کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔

"ابھی اس بات کا کسی سے ذکر مت کرنا تم کل جب اپنے گھر جاؤ تو اس سے پوچھ کر آنا کہ کس کے کوٹھے پر آنا جانا ہے اس کا ہو سکتا ہے اسے غلط فہمی ہوئی ہو مجھے اس جگہ کا پتا لا کر دینا میں تحقیق کراؤں گی لیکن یہ بات باہر نہ نکلے سمجھیں تم۔" انہوں نے ایک بار پھر اسے باور کرایا وہ اثبات میں سر ہلا کر اٹھ گئی۔

شہربانو بے چینی سے پہلو پر پہلو بدلنے لگیں ضرور اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی سعدون ایسا ہرگز نہیں کر سکتا وہاں اس کا کیا کام۔ وہ خود کو طفل تسلیاں دے رہی تھیں اور اس انکشاف پر سکون تو کب کا ختم ہو گیا تھا۔ سعدون یونیورسٹی کے لیے نکل چکا تھا۔ وہ ناشتے کی ٹیبل پر آئیں تو یونہی چپ چاپ بیٹھی رہیں عنایا کی چھٹیاں تھیں یونیورسٹی سے اور وہ پچھلے ایک ہفتے سے گھر پر تھی جبکہ یلہ بھی کالج جا چکی تھی۔

"آپ ناشتا نہیں لے رہیں؟" عنایا نے ان کی پلیٹ میں رکھے گئے سلائس کو جوں کا توں پڑے دیکھا تو پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"بس بیٹا آج بھوک نہیں لگ رہی۔" ان کی بھوک واقعی مر چکی تھی۔

"کیوں طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" یحییٰ نے فکر مندی سے انہیں دیکھا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے بس جی نہیں چاہ رہا کچھ دیر تک کر لوں گی۔ یہ بتاؤ تمہاری چھٹیاں کب ختم ہو رہی ہیں؟" انہوں نے موضوع تبدیل کرنے کے لیے یونہی پوچھ ڈالا۔

"بس پھپھو آٹھ دس دن اور رہ گئے ہیں اس ماہ کی پچیس کو فلائیٹ ہے میری ایک ماہ گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔" وہ عنایا کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے بولا۔

"چلو خیر سے ایک سال رہ گیا ہے گزر جائے گا وہ بھی۔" وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ؟" عنایا نے انہیں بغیر کچھ کھائے یوں اٹھتے دیکھا تو پوچھا۔

"مجھے لگ رہا ہے میرا بلڈ پریشر کچھ لو ہو رہا ہے ذرا دیر لیٹتی ہوں اپنے کمرے میں۔" وہ ناسازی طبع کا بہانہ بنا کر وہاں سے اٹھ گئیں۔

"پھپھو کچھ پریشان ہیں کیا بات ہے؟" ان کے اٹھنے کے بعد یحییٰ نے عنایا سے پوچھا۔

"پتا نہیں میں کیا بتا سکتی ہوں۔" وہ گہری سانس لے کر تخیل کی سطح کو دیکھنے لگی۔

"وجہ سعدون تو نہیں ہے؟" یحییٰ نے عنایا کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی مجھے کیا پتا۔ وہ بتاتا ہے نہ پھپھو مجھے تو سمجھ نہیں آرہی ہو کیا رہا ہے۔" وہ چڑ کر بولی۔

"پیار رکھا کرو آفٹر آل وہ تمہارا ہونے والا مجازی خدا ہے اس کی سرگرمیوں اور دلچسپیوں پر نظر رکھا کرو۔" یحییٰ نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا تو وہ زخمی سی ہنسی ہنس کر وہاں سے اٹھ گئی۔

شہربانو بے چینی سے سعدون کا انتظار کررہی تھیں انہیں ایک ایک لمحہ صدی کا محسوس ہو رہا تھا۔ سعدون کے رویے سے انہیں یہ تو شک پڑ چکا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ اس حد تک خطرناک ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے مقررہ وقت پر آن پہنچا تھا اور حسب معمول سب سے پہلے شہربانو کے کمرے میں حاضر ہوا۔ وہ ظہر کی نماز پڑھ کر اس کی انتظار میں بیٹھی تھیں۔

"السلام علیکم امی۔" اس نے اندر داخل ہو کر کہا انہوں نے تسبیح ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا پھر ایک نظر سامنے کھڑے سعدون کو دیکھا جیسے اس کے اندر چھپے چور کو بے نقاب کرنا چاہتی ہوں وہ کندھے سے بیگ ٹکائے ان کے سامنے ایستادہ حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟" وہ ذرا سا مسکرایا۔

"کچھ نہیں جاؤ جا کر کھانا کھاؤ۔" انہوں نے نفی میں سر ہلا کر نظروں کا زاویہ تبدیل کرلیا تو وہ کندھے اچکا کر باہر نکل گیا۔

وہ جو صبح سے سوچ کر بیٹھی تھیں کہ سعدون کو آڑے ہاتھوں لیں گی اسے دیکھ کر ارادہ موقوف کردیا اس وقت بھی انہوں نے اپنی دور اندیشی اور زیرک نظری سے کام لیا تھا کہ سعدون سے بات کرنے سے پہلے اس بات کی تحقیق اور تصدیق ہونی ضروری ہے زیبی نے جو کچھ بتایا ہے اس میں کتنی حقیقت ہے اگر وہ سعدون سے پوچھ لیتیں اور بات جھوٹ ثابت ہو جاتی تو انہیں شرمندگی اور سعدون کو دکھ ہوتا انہوں نے دل ہی دل میں ایک اور پلان ترتیب دے ڈالا۔

☼ ☼ ☼

وہ کپڑے تبدیل کرکے نیچے آیا تھا۔ عنایا نوری بی بی کے ساتھ کچن میں کھڑی تھی۔ وہ لاؤنج میں آکر بیٹھ گیا۔ عنایا جانتی تھی کہ وہ صبح ناشتا کیے بغیر یونیورسٹی کے لیے نکلتا ہے۔ صرف ایک کپ چائے حلق سے اتار کر وہ عجلت میں نکل جاتا تھا اور واپسی پہ یقیناً اسے شدید بھوک لگی ہوتی تھی۔

"کھانا لاؤں؟" وہ بال سمیٹ کر اس کے پاس آئی تھی۔

"لے آؤ۔" وہ صوفے سے اٹھ کر ڈائننگ ٹیبل پر آگیا۔ سردیوں میں دوپہر کا کھانا صرف سعدون اور عنایا کے ابو کمال الدین کھاتے تھے گھر کے باقی افراد تگڑا سا ناشتا کرنے کے بعد شاذ و نادر ہی لنچ کرتے تھے۔ عنایا جس دن گھر ہوتی وہ خدیجہ بیگم کو ایک طرف کردیتی اور سب کچھ خود دیکھتی ناشتا لنچ اور رات کا کھانا اس کی نگرانی میں بنتا اور وہی سرو بھی کرتی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کھانا سعدون کے سامنے لاکر رکھ دیا تھا۔

"تم نہیں کھاؤ گی؟" وہ سلاد کی پلیٹ میز پر رکھ کر واپس پلٹی ہی تھی کہ سعدون کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ اسے اپنی سماعتوں پر شک سا گزرا۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ اپنی پلیٹ میں چاول ڈال رہا تھا۔

"تم نے کچھ کہا؟" عنایا نے تصدیق چاہی۔

"ہوں..... تم بھی کھاؤ نا۔" اس نے اپنے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ حیران سی اسے دیکھتی ہوئی سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ وہ اب پلیٹ پر جھک گیا تھا۔ وہ اسی ادھیڑبن میں تھی کہ کھانا شروع کرے یا نہیں کہ سعدون نے ڈش اس کی طرف سرکا دی۔

"کیا سوچ رہی ہو یہ لو۔" اس نے خاموشی سے

پلیٹ اٹھائی اور اس میں پلاؤ ڈالنے لگی۔ وہ اس شخص کی طبیعت پر حیران تھی پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ کبھی تو یوں پیش آتا ہے جیسے آپس میں کوئی رشتہ ہی نہ ہو اور آج جیسے وہ ہی اس کا سب سے بڑا خیر خواہ تھا خیر جو بھی تھا وہ خوش ہو بیٹھی تھی کچھ بہتری تو آئی تھی تولہ بھر کی ہی سہی وہ بغیر کچھ کہے کھانے لگی سعدون اس کی خاموشی کو چند دن پہلے ہونے والی تلخ کلامی پر محمول کررہا تھا۔ شاید وہ اپنے دل میں ناراضی رکھے ہوئے تھے۔

آج اس کی بیلا سے پھر ملاقات ہوئی تھی اور وہ بہت خوش تھا اور اسی خوشی میں وہ عنایا کو توجہ کا شرف بخش رہا تھا۔ پانی پیتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی وہ مسرور سی اپنی پلیٹ پر جھکی ہوئی تھی۔ سعدون اس کے دل کی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔ وہ ترحم بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"آج تم بہت خوش لگ رہے ہو۔" عنایا نے اس کی خوشی نوٹ کرلی تھی۔

"بس ایسے ہی۔" وہ کندھے اچکا کر ٹال گیا۔

"عنایا کمال اگر تمہیں یہ پتا چل جائے کہ میں کیوں خوش ہوں تو اگلا نوالہ تمہارے حلق سے نہ اترے۔" وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔

☼ ☼ ☼

وہ ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہہ رہی تھیں زیبی نے اپنے سسر سے پوچھ کر متعلقہ ایڈریس انہیں مہیا کیا تھا وہ اب جلد از جلد وہاں پہنچ کر حقیقت کا پتا چلانا چاہتی تھیں۔ حویلی میں انہوں نے یہی بتایا کہ وہ اپنی ایک دیرینہ دوست سے ملاقات کرنے جارہی ہیں۔ زیبی نے ساتھ چلنے کے لیے کہا مگر انہوں نے منع کردیا۔ اگر یہ سب کچھ سچ بھی نکلا تو وہ زیبی کو سارے معاملات سے آگاہ نہیں کریں گی بہرحال وہ اس گھر کی ملازمہ تھی اور ملازموں کو گھر کے راز ہاتھ آجائیں تو تشہیر میں دیر نہیں لگاتے اور یہ زیبی تو [illegible] کی بیٹی بھی تھی۔

وہ ڈرائیور کے ہمراہ اکیلی ہی چل پڑیں۔ اس بازار سے کچھ فاصلے پر انہوں نے گاڑی رکوا دی مبادا ڈرائیور کو شک نہ پڑے کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہیں۔

"اسلم تم کچھ دیر یہاں ٹھہرو میں آتی ہوں!" وہ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولنے سے پہلے اسے ہدایت دیتے ہوئے بولیں۔

"جی اچھا!" وہ مودب انداز میں بولا اور گاڑی ایک طرف پارک کرکے بند کردی۔ شہربانو دو تین موڑ مڑنے کے بعد مطلوبہ گلی میں تھیں مگر سامنے کے دو منزلہ خستہ حال مکانات ایک دوسرے سے مشابہ تھے۔ گلی کی کھلی نالیوں میں سے اٹھنے والے ناگوار بو کے بھبکے پھولوں کی مہک پر حاوی تھے۔ شہربانو نے سفید چادر سے اپنا پورا چہرہ ڈھانپا ہوا تھا۔

"زہرہ بائی کا کوٹھا کون سا ہے؟" انہوں نے ایک نو عمر راہگیر سے پوچھا۔

"وہ والا جس کے باہر بجلی کا کھمبا لگا ہوا ہے۔" راہ گیر نے اشارے سے انہیں سمجھایا وہ نپے تلے قدم اٹھاتی اسی طرف چل پڑیں۔

زہرہ بائی سر پہ کپڑا لپیٹے پلنگ پر یونہی آڑی ترچھی لیٹی تھیں درد شقیقہ نے انہیں بے کار کرچھوڑا تھا۔ ان پر نیند کا غلبہ ہوا ہی چاہتا تھا کہ دروازے کو کسی نے پوری قوت سے دھڑدھڑایا تھا وہ ہڑبڑا کر مندی مندی آنکھوں سے دیکھنے لگیں سامنے گھڑی پر دن کے سوا گیارہ بجے تھے اور یہ وقت بیلا کے واپس آنے کا نہیں تھا وہ کالج سے دو بجے لوٹتی تھی۔

"کون ہو سکتا ہے؟" وہ پاؤں میں چپل اڑستے ہوئے سوچنے لگیں اسی اثنا میں دروازے پر دوسری دستک ہوئی۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کنڈی کھول دی کہ اکثر پڑوس سے کوئی نہ کوئی ان کا حال دریافت کرنے آجاتا تھا مگر سامنے ایک بارعب سی خاتون سفید براق چادر کے ہالے میں کھڑی تھیں۔

"اندر آجایئے۔" زہرہ بائی اپنے فربہی مائل جسم کو دروازے سے ہٹاتے ہوئے بولیں شہربانو کچھ سوچتے ہوئے اندر داخل ہوگئیں ان کے ماتھے پر شکنوں کا

جال اور آنکھوں میں ملال تھا۔
"بیٹھیے!" زہرہ بائی نے دیوار کے ساتھ رکھی دو کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
"میں بیٹھنے نہیں آئی کچھ پوچھنے آئی ہوں۔" انہوں نے خدرے اور سپاٹ لہجے میں کہا۔
"جی!" زہرہ بائی کے چہرے سے حیرت مترشح تھی۔
"شریف زادوں کو پھانسنے کا کام کب تک جاری رکھو گی تم لوگ؟" وہ چبھتے ہوئے انداز میں کہہ کر زہرہ بائی کی طرف دیکھنے لگیں جو ان سے چند قدم کے فاصلے پر ساکت و صامت کھڑی تھیں۔
"کیا مطلب؟" وہ متوحش سی ہو کر شہربانو کو دیکھنے لگیں۔
"مطلب تم اچھی طرح جانتی ہو۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولیں۔
"میں سمجھی نہیں آپ کہنا کیا چاہتی ہیں کون ہیں آپ؟" زہرہ بائی اس اجنبی خاتون کا رویہ سمجھنے سے قاصر تھیں۔
"میں سعدون کی ماں ہوں اب تو ساری کہانی سمجھ میں آگئی ہو گی۔" وہ تنفر سے گویا ہوئیں تو زہرہ بائی کو ساری صورت حال سمجھ میں آگئی۔
"اچھا تو وہ شریف زادہ آپ کا بیٹا ہے۔" وہ شریف زادے پر زور دیتے ہوئے طنز سے بولیں۔
"ہاں میرا بیٹا ہے اور میں اسے تمہارے چنگل میں اتنی آسانی سے پھنسنے نہیں دوں گی۔ اچھی طرح جانتی ہوں تم جیسوں کو، کتنی بے رحمی سے تم دوسروں کے گھر برباد کرتی ہو، سہاگ چھین لیتی ہو معصوم لڑکیوں کے۔" شہربانو کے دل میں برسوں پرانی بھڑاس تھی جسے وہ اب نکال رہی تھیں ان کے لفظ تھے کہ نشتر جو زہرہ بائی کے دل میں پیوست ہو گئے تھے۔
"زبان سنبھال کر بات کیجیے خاتون۔" احساس توہین سے زہرہ بائی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
"سچ کڑوا لگ رہا ہے نا اس لیے، کہاں ہے وہ مہو جسے تم نے سعدون کو زیر کرنے کے لیے استعمال کیا؟" شہربانو زہر اگل رہی تھیں۔

"اپنے شریف زادے سے پوچھیے کہ وہ کیسے زبر... اس میں میری بھانجی کا کوئی قصور نہیں اور وہ تو... مٹنے کو تیار ہے ہماری دہلیز پر اس کو حاصل کرنے کے لیے جائیں سمجھا سکتی ہیں تو اسے سمجھائیں ہم نے بہت دیکھے ایسے نجیب الطرفین!" زہرہ بائی ... جیسے آئینہ دکھا رہی تھیں۔
"جو کچھ بھی ہے یہ بات دل سے نکال دو کہ ... کوٹھے سے کوئی لڑکی اٹھ کر سیدوں کی حویلی میں ... میں مر کر بھی ایسی لڑکی کو اپنی بہو کے طور پر ... کروں گی جس کا تعلق اس بازار سے ہے۔" شہربانو ... تند لہجے میں بولیں۔
"میری باکباز بھانجی پر الزامات مت لگائیے ... اس بازار سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ صرف میری ... بہن کے لیے یہاں آئی ہے کچھ دنوں کے لیے ... جہاں تک بہو بنانے کی بات ہے تو وہ کیا آپ بھی ... گی تو مجھے بیاہ کے لیے ہرگز یہ رشتہ قبول نہیں ہو گا ... لڑکا غیاث شفیع کا خون ہے نا؟" وہ طنزیہ نظروں سے شہربانو کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں تو وہ چونک ... گئیں۔
"وہی غیاث شفیع جس کا کام اس بازار کی ... خواب دکھا کر بیچ منجدھار چھوڑنا تھا اسی شخص نے مجھے سہانے خواب دکھائے محبت کی گلابی چادر میرے ... ڈالی اور اپنا مطلب پورا ہونے پر ہمیشہ کے لیے ... بھلیوں میں چھوڑ گیا۔" زہرہ بائی کی آواز میں دکھ کے ساتھ نفرت اور غصے کی بھی آمیزش تھی شہربانو ایک بت کی مانند کھڑی تھیں۔
"اسے قدرت کا انتقام سمجھ لو کہ آج پچیس ... بعد اس کا اپنا بیٹا اسی چوکھٹ پر آیا ہے ایک بھکاری کی طرح پھر کہاں گئی وہ نجابت وہ حسب نسب وہ شرافت" وہ شہربانو کے سامنے ہاتھ نچاتے ہوئے بولیں ... تو قوت گویائی جیسے کسی نے سلب کر لی تھی۔ ... حیرت بنی گنگ کھڑی تھیں۔
"جائیے جا کر بتائیے سید سعدون شفیع کو کہ ... عورت کو آپ شرافت اور حسب نسب کی مار مار...

آئی ہیں وہ اس کے باپ کی داشتہ رہ چکی ہے اگر اس میں ذرا سی بھی غیرت ہوئی تو اس دہلیز پر نہیں آئے گا میں اگر چاہتی تو سارے بدلے چکا سکتی تھی مگر ہم لوگ عزت ضرور ہیں آپ کی طرح کم ظرف نہیں۔" وہ دروازے کا پٹ کھول کر کھڑی تھیں جیسے شہربانو کو جانے کے لیے کہہ رہی ہوں۔
"غیاث شفیع کے لیے اتنی ہی کافی ہے کہ وہ جس بازار کی عورت کو برباد کر کے گیا تھا اس کا بیٹا اسی بازار کی ایک عورت کے لیے تمام عمر تڑپے گا۔" شہربانو جیسے ہی ان کے سامنے سے گزریں انہوں نے ایک مرتبہ پھر ایک ایک لفظ پر زور دے کر انہیں باور کرایا کہ وہ غیاث سے کتنی نفرت کرتی ہیں۔ انہیں شاید بات معلوم ہی نہ تھی کہ برسوں ہوئے وہ غیاث شفیع سے اپنی راہیں الگ کر چکی ہیں مگر وہ خاموش رہیں ان سے قدم اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا انہوں نے جیسے ہی دروازے کو پار کیا زہرہ بائی نے کھڑاک کی آواز کے ساتھ دونوں کواڑ مضبوطی سے بند کر دیے اور انہوں نے شہربانو پر نہیں جیسے سعدون شفیع پر بند کیے تھے۔ وہ تھکی ہوئی سعدون کے ساتھ گئی تھیں اور تنہا تھکی ہوئی کے ساتھ واپس پلٹ آئیں۔
وہ اپنی سوختہ بختی پر نوحہ کناں تھیں انہیں تو اپنی تربیت پر غرور تھا مگر بیٹا باپ سے بھی دو قدم آگے نکلا غیاث شفیع جو کچھ کرتے تھے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا مگر سعدون نے انہیں دھوکا دیا تھا ان کی آنکھوں میں دھول جھونکی تھی۔ ان کے دل پر تازیانہ سا پڑا تھا۔ اگر غیاث کو معلوم ہو جائے کہ ان کی پارسا بیوی اپنے بیٹے کے لیے اس بازار میں خوار ہونے آئی تھی تو وہ کس قدر خوش ہو گا اس تذلیل پر! وہ غم و غصے سے سب کٹ رہی تھیں۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ کافی سنبھل گئی تھیں انہیں اپنا اور اپنی تربیت کا بھرم تو رکھنا تھا سو وہ سر پر منوں بوجھ لیے حویلی میں داخل ہوئیں اور کسی کا سامنا کیے بغیر اپنی منزل کی طرف چلی گئیں۔

☆ ☆ ☆

وہ آج خلاف معمول حویلی دیر سے آیا تھا یونیورسٹی سے واپسی پر گاڑی میں معمولی نقص ہو گیا تھا جسے ٹھیک کروانے میں اسے ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ وہ بعجلت گھر پہنچا مبادا اس کی ماں پریشان ہو جائیں۔ ڈرائنگ روم سے گزرنے لگا تو سامنے ہدیہ بیٹھی تھی وہ آج کافی دنوں بعد حویلی آئی تھی۔
"شجاع بھائی کیسے ہیں وہ نہیں آئے؟" حال احوال معلوم کرنے کے بعد وہ ہدیہ سے کھڑے کھڑے پوچھنے لگا۔
"آئے تھے کسی کام سے باہر گئے ہیں کبھی تم بھی چکر لگا لیا کرو ایسی بھی کیا مصروفیت۔" ہدیہ نے جوس کا گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس سے شکوہ کیا جو پچھلے دو ماہ میں ایک بار بھی اس کے گھر نہیں جا سکا تھا۔
"بس ذرا کچھ ایگزامز کی مصروفیت ہیں جیسے ہی فراغت ملی ضرور آؤں گا۔" اسے تھوڑی ندامت سی ہوئی۔
"آپی ان سے نہ پوچھیں یہ دنیا کے مصروف ترین انسان ہیں جن کا سنڈے بھی بہت بزی ہوتا ہے۔" سامنے صوفے پر دونوں پاؤں رکھ کر بیٹھی ہالہ نے کہا تو وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔
"ویسے یہ اچانک آمد کی وجہ پوچھ سکتا ہوں آپ تو سنڈے کو ہی چکر لگاتی تھیں۔" سعدون کو اچانک خیال آیا تو پوچھ بیٹھا۔
"ارے بھئی میرے ماں باپ کا گھر ہے جب دل چاہے گا آؤں گی ویسے اب تو اس لیے آئی ہوں کہ کل یحییٰ کی روانگی ہے نا۔" ہدیہ کی بات پر اس نے چونک کر سامنے لگے کیلنڈر کو دیکھا۔ وہ تو بھول ہی گیا تھا کہ کل چوبیس جنوری ہے اور یحییٰ کو امریکہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔
"اوہ یحییٰ کل جا رہا ہے میرے ذہن میں ہی نہیں تھا۔" وہ کچھ جھجکتے ہوئے شرمندگی سے بولا تو موسیٰ ہنس پڑا۔
"سعدون بھائی ذہن کو حاضر رکھا کریں ابھی تو

صرف منگنی ہوئی ہے شادی ہو گئی تو بالکل ہی کام سے جائیں گے۔" موسیٰ کی بات پر اس نے ایک نظر عنایہ کو دیکھا اس کے چہرے پر کئی رنگ بکھر گئے تھے اس نے جلدی سے نظروں کا زاویہ تبدیل کر لیا تھا وہ عنایا کی خوش فہمی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"چلیں آپ گپ شپ لگائیں میں امی سے مل کر آتا ہوں۔" وہ وہاں سے کھسک آیا تھا عنایا کی آنکھوں نے اس کا آخری سیڑھی تک تعاقب کیا اور وہ اس کی نظروں کی تپش محسوس کر سکتا تھا واپس پلٹ کر دیکھنے پر وہ پتھر کا نہیں ہونا چاہتا تھا۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے سیدھا شہربانو کے کمرے کی طرف گیا ہلکی سی دستک کے بعد وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا سامنے بیڈ پر شہربانو بیٹھی تھیں کسی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی متورم آنکھیں اور سرخ چہرہ کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ انہوں نے سعدون کے سلام کا جواب نہیں دیا تھا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے امی؟" وہ متفکر سا آگے بڑھا دوسری جانب ہنوز خاموشی تھی کہ جیسے وہ سعدون کی آمد سے یکسر لاعلم ہوں وہ اسے دیکھنے کی بجائے ایک ٹک نیچے قالین کو دیکھے جا رہی تھیں۔

"کیا ہوا امی؟" وہ ان کے پاس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا اور اپنا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر رکھ دیا جسے انہوں نے جھٹک کر قہر بھری نظروں سے سعدون کو دیکھا۔

"چلے جاؤ میرے کمرے سے؟" ان کی غصے سے لرزتی آواز کمرے کے در و دیوار سے ٹکرائی سعدون ناسمجھی کے عالم میں شہربانو کو دیکھ رہا تھا یہ تمام صورت حال اس کے لیے غیر متوقع تھی۔

"آپ بتائیں گی ہوا کیا ہے؟" وہ پریشان سا ہو کر بولا۔

"میں نے کہا نا میری نظروں سے دور ہو جاؤ میں شکل نہیں دیکھنا چاہتی تمہاری۔" ان کی آواز میں غم و غصہ تھا وہ گنگ بیٹھا تھا۔

"آپ کو کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟"

"پہلے تھی اب نہیں۔" وہ سپاٹ سے لہجے میں بولیں۔

"کیا مطلب؟" شہربانو کی باتیں اور رویہ اس کے فہم و ادراک سے دور تھا وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ سعدون کیا ہے ماں کا رویہ اسے الجھا رہا تھا۔

"کہاں سے آ رہے ہو اس وقت؟" انہوں نے سعدون کی طرف دیکھا شہربانو کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔

"یونیورسٹی سے۔" اس نے مختصراً کہا۔

"یونیورسٹی کے بعد کہاں گئے تھے؟" انہوں نے دو ٹوک انداز اپنایا۔

"گاڑی خراب ہو گئی تھی ورکشاپ پہ کچھ وقت لگ گیا مگر آپ یہ سب اس طرح کیوں پوچھ رہی ہیں؟" وہ کشمکش میں مبتلا تھا۔

"یہ کون ہے اور کب سے جانتے ہو اسے؟" شہربانو کا یہ سوال اس کے سر پر کسی بم کی طرح گرا تھا اسے اپنا خون خشک ہوتا محسوس ہوا۔

"آ... آپ کو کس نے بتایا؟" وہ بمشکل بول پایا۔

"اب یہ مت کہنا سعدون کہ مجھے کسی نے غلط بتایا ہے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں وہ خاموشی سے کارپٹ کو دیکھنے لگا۔

"مجھے اپنی تربیت پر بہت ناز تھا مگر مجھے یہ نہیں بھولنا چاہیے تھا کہ تمہاری رگوں میں دوڑنے والا خون کبھی نہ کبھی ضرور رنگ دکھائے گا تم تو اپنے باپ سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے سعدون۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے زہر خند لہجے میں بولیں۔

"امی آپ...!"

"خاموش ہو جاؤ مجھے کسی قسم کی صفائی دینے کی کوشش مت کرنا۔" وہ جلدی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولیں وہ لب بھینچ کر بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری کوکھ سے جنم لینے والا ایک طوائف زادی کا آستانہ بنے گا تم نے میرا سارا وقار سارا زعم مٹی میں ملا دیا سعدون، امی... اس بازاری عورت کے سامنے

نے مجھے دو کوڑی کا کر دیا خاک میں ملا دی خاندان کی نجابت۔" غصے سے ان کی آواز میں لرزش عود آئی تھی

"کیوں کیا تم نے ایسا بولو؟" وہ اس کے روبرو آن کھڑی ہوئی تھیں وہ ایک بت کی مانند ساکت و صامت کھڑا تھا۔

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم غیاث کے بیٹے ہو میں نے تمہارے لیے ایک معصوم اور پاکیزہ لڑکی کا انتخاب کیا اور تم گندگی کے ڈھیر پر فدا ہو گئے' بالکل ٹھیک کیا ناپاک مردوں کے لیے کبھی بھی پاک عورتیں نہیں ہوتیں' تم نے بھی اس کو عنایا پر ترجیح دی تمہارے لیے وہ ناپاک..."

"امی پلیز وہ ایسی نہیں ہے۔" اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

"وہ جیسی بھی ہے جس خاندان سے تعلق رکھتی ہے اس سے کوئی رشتہ جوڑنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تمہاری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی کیا؟" وہ پھٹ پڑیں۔

"میں نے جان بوجھ کر یہ سب نہیں کیا میں نہیں جانتا تھا وہ کون ہے کہاں سے آئی ہے۔" وہ سچ کہہ رہا تھا اور اب کسی قسم کے جھوٹ کی گنجائش بھی کہاں تھی وہ شہربانو سے اب کچھ بھی نہیں چھپ سکتا تھا وہ بات ذرا حالات سازگار دیکھ کر وہ خود بتانا چاہتا تھا اس کی ماں نے خود ہی معلوم کر لی تھی یہ صورت حال اتنی نازک اور غیر متوقع ہو گی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ شہربانو کی طبیعت سے بھی اچھی طرح واقف تھا وہ اصولوں سے ہٹنے والی خاتون ہرگز نہیں تھیں ان کے منہ سے نکلنے والا لفظ حرف آخر ہوتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ انہوں نے اپنے شوہر اور گھر کس بات کو بنیاد بنا کر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا اور اب... وہ سعدون اور غیاث کا موازنہ کر رہی تھیں جو سعدون کے لیے تکلیف دہ تھا۔

"جو بھی ہے تم نے میرے بھروسے اور مان کو ٹھیس پہنچائی ہے تمہارے معمولات اور بدلے رویے پر مجھے شک تو پہلے ہی تھا مگر معاملہ اس حد تک خراب ہو سکتا ہے میرے گمان میں بھی نہیں تھا۔"

"آپ میری بات تو سنیں میں آپ کو دھوکا دے رہا تھا نہ اندھیرے میں رکھنا چاہتا تھا میں حالات دیکھ کر آپ کو بتانے ہی والا تھا مگر..." اس سے پہلے کہ وہ بات مکمل کرتا شہربانو بول پڑیں۔

"تمہیں ذرا خیال نہ آیا اس لڑکی کا جو تمہارے ساتھ منسوب ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولیں۔

"وہ آپ کا فیصلہ تھا میرا نہیں میں نے بارہا آپ سے کہا کہ اتنی جلد بازی نہ کریں مگر میری کسی نے سنی ہی نہیں اس سارے معاملے میں آپ قصور وار صرف مجھے نہیں ٹھہرا سکتیں۔" وہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھ رہا تھا۔

"اگر تمہارے دل میں چور نہ تھا تو اس وقت کیوں نہ بتایا اندھیرے میں کیوں رکھا اسے بھی اور مجھے بھی اتنا ظلم کیوں کیا تم نے اس پر؟" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولیں۔

"میں نے کسی پر ظلم نہیں کیا اور نہ ہی دھوکے میں رکھا یہ آپ کی خواہش تھی اور میں آپ کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔"

"اور اب جو اتنے سارے دل ٹوٹیں گے وہ؟" شہربانو چیختے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"اس وقت تو صرف میرا دل ٹوٹتا اب اگر حقیقت معلوم ہوئی تو عنایا کے ساتھ ساتھ کتنے لوگوں کے دل دکھیں گے جو تم سے پیار کرتے ہیں' اور میں کیسے سر اٹھاؤں گی اپنے بھائی کے سامنے جس نے پچھلے چھبیس سالوں سے مجھے اس حویلی میں عزت و احترام سے رکھا ہے۔ میں کیا جواب دوں گی تمہارے ماموں کو جنہوں نے تمہیں اپنے بیٹے سے بڑھ کر چاہا؟" شہربانو کی آنکھیں دکھ سے ڈبڈبانے لگیں۔ مگر آواز کمزور نہیں پڑی تھی وہ سر جھکائے کھڑا تھا اس کی ماں جو کچھ کہہ رہی تھی وہ غلط نہ تھا مگر وہ بھی تو غلط نہیں تھا۔

"میں معافی چاہتا ہوں امی آپ کو دکھ ہوا مگر..."

"مگر ایا؟" وہ تڑپ کر بولیں۔

"تم اب بھی اگر مگر پر غور کرو گے، جتنی شرمندگی اور سبکی مجھے ہوئی ہے اس لڑکی کی خالہ کے سامنے اس کے بعد بھی تم کہہ رہے ہو مگر۔" وہ درشتگی سے کہہ کر سعدون کو دیکھنے لگیں وہ ابھی تک یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ شہربانو کو یہ سب کیسے معلوم ہوا اور وہ بیلا کی خالہ تک کیسے پہنچیں نہ ہی وہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کا سیاق و سباق جانتا تھا مگر اب یہ سب معلوم کرنا بے معنی تھا کہ ان تک یہ بات کیسے پہنچی اور نہ ہی وہ پوچھ بتانے پر رضامند ہوں گی اہم تھا تو بس یہ کہ اب کیا کرنا ہے وہ خوف اندیشی سے گھرا تھا۔

"آپ کا غصہ بجا ہے لیکن میں نے کچھ غلط نہیں کیا نہ ہی میری نیت بری تھی یہ سچ ہے کہ میں اس لڑکی سے محبت کرتا ہوں جو بد قسمتی سے اس علاقے میں رہتی ہے جو بدنام ہے مگر وہ ایسی نہیں ہے نہ اس کے ماں باپ اس بازار سے حق رکھتے تھے آپ یہ مت دیکھیں کہ وہ کس جگہ رہتی ہے یہ دیکھیں کہ وہ کون ہے۔" وہ اپنی طرف سے مضبوط دلیل دے رہا تھا مگر شہربانو کو راضی کرنے کے لیے دلیل کافی نہ تھی۔

"مجھے صفائی مت پیش کرو ایسی لڑکیاں اپنا گھر بساتی تب نہ وہ سروں ڈھنے رہتی تب مجھے پتا ہے تم راہ راست پر نہیں آسکتے آخر خون کس کا ہو۔" ان کا لہجہ طنز میں ڈوبا ہوا تھا اور سعدون کو یہ الفاظ نیزے کی انی کی طرح لگ تھے وہ لب بھینچے ماں کو دیکھنے لگا۔

"تمہارے باپ نے بازاری عورتوں کے جال میں پھنس کر میری زندگی برباد کی اسی نام نہاد محبت کے پیچھے وہ مجھے نظر انداز کرتا رہا اور بالآخر چھوڑ دیا مگر میں عنایا کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گی اب بھی کچھ نہیں بگڑا میں نہیں چاہتی کہ وہ ساری عمر تمہاری محبت کو ترستی رہے اور تم اس لڑکی پر محبت لٹاتے رہو یا اس کے غم میں جلتے رہو۔" وہ ایک ایک لفظ اس کی سماعتوں میں اتار رہی تھیں اور وہ کٹہرے میں کھڑے کسی مجرم کی طرح کندھے جھکائے ہوئے اگلی فرد جرم کا انتظار کر رہا تھا۔

"اگر تم اسے بھولنا نہیں چاہتے تو یہاں سے چلے جاؤ اس سے پہلے کہ بات باہر نکلے میں زندگی بھر سر نہ اٹھا سکوں اس حویلی سے نکل جاؤ چاہے تو اپنے باپ کے پاس چلے جاؤ یا اس لڑکی کے پاس جس کی محبت میں اندھے ہو کر تم میری بھتیجی کو دھوکا دے رہے ہو۔" اس نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا جنہوں نے اتنا مشکل فیصلہ بڑی آسانی سے کر لیا تھا۔ ان کے چہرے سے ممتا کی محبت اور رحم مفقود تھا۔ وہ بے یقینی سے شہربانو کو تکنے لگا وہ اسے محبت کے جرم میں اپنی زندگی اور حویلی سے بے دخل کر رہی تھیں جرم معمولی اور سزا بہت بڑی تھی۔

"امی آپ ایسا کیسے کر سکتی ہیں مجھے کچھ وقت۔۔۔" وہ سراپا احتجاج تھا مگر شہربانو نے اسے کچھ کہنے سے روک دیا۔

"تم جانتے ہو میرا فیصلہ قطعی اور حتمی ہوتا ہے۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولیں۔

"مجھے پتا ہے جب تک وہ تمہارے دل سے نہیں نکلتی تم عنایا کے ساتھ مخلص نہیں ہو سکتے اور میں اس کی زندگی جانتے بوجھتے برباد نہیں کرنا چاہتی میں تمہیں صرف اتنی رعایت دے سکتی ہوں کہ اگر وہ لڑکی تمہیں ٹھکرا دے تو حویلی واپس آجانا اور اگر راضی ہو جائے تو اسے بیوی بنا کر اپنے باپ کے پاس چلے جانا حویلی کا رخ کبھی نہ کرنا۔" شہربانو اتنا کہہ کر دوبارہ بیڈ پر جا بیٹھیں اور وہ پشت کیے یونہی ایستادہ رہا شہربانو کی نا ندلی کی دونوں صورتیں اس کے لیے سوہان روح تھیں اگر وہ بیلا کو حاصل کر لیتا تو اسے حویلی چھوڑنا تھی اور یہاں رہنا تھا تو بیلا سے دستبردار ہونا ضروری تھا۔ وہ بے بسی سے کارپٹ کو دیکھ رہا تھا اسے اپنا آپ پنڈولم کی طرح جھولتا محسوس ہو رہا تھا ایک طرف محبت اور دوسری طرف شہربانو کے بنائے ہوئے اصول۔

"جلدی فیصلہ کر کے مجھے بتاؤ۔" اس نے اپنی پشت پر شہربانو کی آواز سنی وہ کمرے سے باہر نکل گیا یہ فیصلہ کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد شہربانو تسبیح ہاتھ میں پکڑ کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

جانتی تھیں کہ سعدون کبھی بھی نافرمانی نہیں کرے گا اور وہ اس لڑکی کو کبھی ماں پر ترجیح نہیں دے گا چاہے خود پر جبر کر کے ہی کیوں نہ کرے عمران کے پاس جانے کی بات کی ضمانت بھی تو نہ تھی کہ وہ عنایا کے ساتھ شادی کر کے اسے خوش رکھے گا تاوقتیکہ وہ لڑکی اس کے دل سے نکل جائے۔

وہ اضطرابی کیفیت میں ہاتھ میں تھامی تسبیح کے دانے بڑی تیزی سے ایک دوسرے پر گرا رہی تھیں ان کا ذہن عجیب سے تانے بانے میں الجھ رہا تھا انہوں نے اپنا غصہ تو نکال دیا تھا مگر اب فہم و فراست کی ضرورت تھی ایسی فہم و فراست کی جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ وہ سامنے دیوار پر نظریں مرکوز کیے سوچ رہی تھیں۔

ہو سکتا ہے سعدون میری ناراضی کے پیش نظر اس کو چھوڑ دے مگر اس کے دل سے ساری زندگی یہ بات نہیں نکلے گی کہ میں نے اس کے جذبات کا احترام نہیں کیا اور عنایا بھی اس کی بے التفاتی کی آگ میں جلے گی۔ کیوں نہ کچھ ایسا ہو جائے کہ وہ لڑکی خود بخود اس کے دل سے اتر جائے اسے اس بات کا ادراک ہو جائے کہ میں غلط نہ تھی کچھ دیر بعد وہ پرسکون تھیں ان کا ذہن ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔

✲ ✲ ✲

چار گھنٹے بعد یحییٰ کی فلائٹ تھی سعدون کو ایگزامز کی وجہ سے یونیورسٹی سے چھٹیاں تھیں مگر گزشتہ رات وہ اک پل بھی نہیں سو پایا تھا دماغ میں عجیب طرح کی کشمکش جاری رہی اور وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ صبح اٹھا تو رت جگے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوجی ہوئی اور لال تھیں۔ عنایا نے اسے غور سے دیکھا بے چینی اور پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی وہ اور موسیٰ یحییٰ کو ایئرپورٹ چھوڑنے چلے گئے۔ شہربانو یحییٰ سے مل کر دوبارہ اوپر اپنے کمرے میں چلی گئیں ۔۔۔ عنایا بے چینی سے سعدون کی واپسی کا انتظار کرنے لگی کچھ دیر بعد وہ یحییٰ کو چھوڑنے کے بعد واپس حویلی آگئے۔ دن کے گیارہ بجنے والے تھے اور عنایا جانتی تھی کہ سعدون نے ابھی ناشتا بھی نہیں کیا۔ چھٹی والے دن سب نیچے ڈرائنگ روم میں ہی ناشتا کرتے تھے وہ کچن میں نور بی بی اور زہبی کے ساتھ ناشتے کی تیاری میں لگ گئی آج ہدیہ اور شجیع بھی ادھر ہی تھے اس لیے ناشتے کا خاص اہتمام تھا اس نے ٹیبل پر برتن لگائے۔ ڈرائنگ روم میں سبھی موجود تھے سوائے سعدون کے، وہ پھپھو کو بلانے اوپر چلی آئی حالانکہ مقصد کچھ اور تھا اس نے پھپھو کے کمرے میں جھانکا تو وہ واش روم میں تھیں وہ واپس پلٹ کر سعدون کے کمرے کی طرف چلی گئی دروازہ ادھ کھلا تھا اس نے ہلکی سی دستک دی اور اندر دیکھا سعدون بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹا تھا۔ اس نے عنایا کی دستک اور آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا وہ شاید دوبارہ سو چکا تھا۔

وہ کچھ خاموشی سے بیڈ کے قریب کھڑی رہی سعدون نے اس کی موجودگی محسوس کر لی تھی اس نے سر اٹھا کر دیکھا وہ سامنے موجود اسے ہی دیکھ رہی تھی سعدون نے دوبارہ سر نیچے رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" عنایا نے متفکر سا ہو کر پوچھا۔

"ہوں!" اس نے آنکھیں کھولے بغیر بس اتنا ہی کہا اس نے دونوں ہاتھ سر کے پچھلے حصے پر رکھے ہوئے تھے۔

"لیکن مجھے نہیں لگ رہی کیا بات ہے سعدی؟" وہ اس کے اوپر ہلکا سا جھکتے ہوئے بولی وہ خاموش رہا وہ گہری سانس لے کر پیچھے ہٹ گئی ان دونوں کے درمیان کبھی ایسا رشتہ بن ہی نہیں پایا تھا کہ سعدون اپنے دکھ سکھ اس سے شیئر کرتا وہ نجانے کس زعم میں اس کو کرید رہی تھی۔

"نیچے آکر ناشتا کر لو۔" اس نے کچھ دیر بعد فقط اتنا ہی کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے ابھی۔" اس نے اسی انداز میں لیٹے لیٹے جواب دیا وہ تاسف سے اسے دیکھ کر باہر نکل آئی۔

"سعدون کہاں ہے؟" آملیٹ کی پلیٹ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے خدیجہ بیگم نے شہربانو سے استفسار کیا اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتیں عنایہ نے ان کی مشکل حل کردی۔

"اس کی شاید طبیعت ٹھیک نہیں میں نے ناشتے کا پوچھا وہ کہہ رہا ہے بھوک نہیں ہے۔" عنایہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا ہوا اسے؟" کمال الدین شاہ نے بھی نوٹس لیا۔

"میں دیکھتی ہوں۔" شہربانو ناشتا ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں مبادا کوئی بات کسی تک نہ پہنچ جائے۔ رات جو لائحہ عمل انہوں نے ذہن میں ترتیب دیا تھا اس کے بعد وہ کافی حد تک پرسکون تھیں۔ وہ کمرے میں داخل ہوئیں تو سعدون ہنوز اسی پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا۔

"سعدون!" انہوں نے اس کے بازو کو ذرا سا ہلا کر اسے پکارا۔

"جی" وہ آنکھیں بمشکل کھولتا ہوا سیدھا ہوا۔

"یہ کیا طریقہ ہے۔" انہوں نے سرزنش والے انداز میں کہا تو وہ آنکھیں رگڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ اس کو بغور دیکھنے لگیں۔

وہ ایک رات میں ہی بہت ویران اور کمزور سا ہو گیا تھا اس کی آنکھیں رت جگے کی غماز تھیں شہربانو کے دل پر چرکا سا لگا تھا مگر وہ مجبور تھیں۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس لڑکی کی خاطر یوں مجنوں بن جاؤ گے۔" انہوں نے بیڈ پر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا وہ نظریں چرا سا گیا یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔

"میں تمہاری خوشی کی خاطر تمہاری بات مان سکتی ہوں مگر ایک شرط پر؟" شہربانو نے کہا تو وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگا اسے اپنی سماعتوں پر شک سا ہوا تھا۔

"اور تو مجھے اس بات کا یقین ہے کہ وہ لڑکی تمہیں دھوکا دے رہی ہے۔ ایسی لڑکیاں کبھی بھی گھر نہیں بساتیں انہیں صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے لیکن پھر بھی تمہاری تسلی کی خاطر اور اسے آزمانے کے لیے میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ اس لڑکی کو شادی پر راضی کر لو۔" وہ منہ کھولے ماں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مذاق کر رہی تھیں مگر ان کے چہرے پر تو حد درجہ سنجیدگی تھی۔

"تمہیں یقین نہیں آرہا مگر میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں اگر وہ راضی ہو گئی تو میں اسے بہو بنانے پر تیار ہوں۔" شہربانو نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تو اس نے وفور جذبات سے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیے۔

"آپ... آپ سچ کہہ رہی ہیں؟" اس کی آنکھوں میں ابھی بھی بے یقینی ہلکورے لے رہی تھی۔

"ہاں میں نہیں چاہتی کہ تم ساری عمر اپنی ماں کو موردِ الزام ٹھہراؤ اگر وہی تمہارے مقدر میں ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔" وہ محبت سے بولیں تو وہ ممنون سا انہیں دیکھنے لگا اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ کایا یوں پلٹ جائے گی وہ شہربانو جو رات اسے حویلی بدر کرنے کے درپے تھیں وہ آج خود اسے بیلا کو اپنانے کے لیے کہہ رہی تھیں وہ اپنی قسمت پر مسرور اور نازاں سا نظر آرہا تھا۔

"لیکن تم نے میری شرط نہیں سنی۔" انہیں اچانک یاد آیا۔

"کون سی شرط؟" اسے ہر شرط منظور تھی۔

"تمہارے فائنل کے امتحانات دو دن بعد شروع ہونے والے ہیں تم اس وقت تک بیلا سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرو گے اور نہ ہی ملو گے جب تک تم پیپرز سے فارغ نہ ہو جاؤ۔" شرط بہت معمولی سی تھی وہ فوراً آمادہ ہو گیا۔

"جیسے آپ چاہیں گی ویسا ہی ہو گا۔" وہ ان کے ہاتھ چومتے ہوئے خوشی سے بولا۔

"چلو اٹھو اب نیچے آؤ ناشتا کرنے کے لیے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"میں نہا کر بس ابھی آیا۔" وہ بیڈ سے اٹھ کر واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولا وہ لب بھینچ کر اسے باتھ روم میں جاتا دیکھنے لگیں وہ جانتی تھیں یہ خوشی محض وقتی اور عارضی ہے مگر سعدون کا دل اپنی طرف سے صاف کرنے کے لیے یہ ضروری تھا اور اس لیے بھی بہت ضروری تھا کہ وہ عنایہ کو مکمل سعدون سونپنا چاہتی تھیں ادھورا نہیں وہ کچھ سوچتے ہوئے نیچے چلی آئیں۔

سعدون خوشی سے ہواؤں میں اڑنے لگا تھا ہفت اقلیم کی دولت ملنے پر بھی اسے شاید اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی اب ہو رہی تھی۔ وہ جی جان سے پیپرز کی تیاری میں لگ گیا تھا۔ یونیورسٹی سے فراغت میں ابھی سوا مہینہ پڑا تھا اور جیسے تیسے اسے یہ دن گزارنے تھے۔

☆ ☆ ☆

شہربانو کی گاڑی حویلی سے نکل کر ایک بار پھر اسی طرف رواں دواں تھی جہاں سے نکلتے وقت انہوں نے کبھی بھی ادھر کا رخ نہ کرنے کی ٹھانی تھی مگر اس وقت تجسس اور تحقیق کی غرض سے اس کوچے میں آنا پڑا تھا اور اب وہ اپنا آخری حربہ آزمانے جا رہی تھیں۔ گاڑی انہوں نے اسی جگہ رکوا دیا جہاں کچھ دن پہلے وہ چھوڑ کر گئی تھیں۔ مطلوبہ مکان پر پہنچ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ان کا دل آج بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا مگر حوصلے کی مضبوطی اپنی جگہ تھی دروازہ ایک پیاری سی لڑکی نے کھولا تھا کچھ دیر وہ مبہوت سی ہو کر اسے دیکھتی رہیں وہ واقعی حسن و جمال کا مرقع تھی سعدون کا کسی پر دل ہار جانا انہیں اب سمجھ میں آیا تھا وہ یقیناً اس قابل تھی کہ کوئی بھی اس کو ایک نظر دیکھتا تو پلک جھپکنا بھول جاتا۔

"جی فرمایئے" اس کی آواز بھی بہت خوب صورت تھی شہربانو کو جیسے ہوش سا آگیا۔

"میں سعدون کی امی ہوں۔" انہوں نے صرف اتنا ہی کہا وہ بیلا کے چہرے پر حیرت کا عکس دیکھ سکتی تھیں۔

"اندر آجایئے" اس نے دروازے سے ایک طرف ہٹ کر اس معزز اور بارعب خاتون کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ شہربانو کمرے میں آکر کھڑی ہو گئیں سامنے والا پلنگ خالی پڑا تھا زہرہ بائی شاید گھر پر نہیں تھیں۔

"بیٹھیے!" بیلا نے جھجکتے ہوئے انہیں کرسی پیش کی وہ کچھ سوچ کر بیٹھ گئیں۔

"تمہاری خالہ کہاں ہے؟" ذرا سے توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔

"وہ ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں ذرا طبیعت خراب تھی۔" بیلا نے کہا وہ خاموشی سے کمرے کا جائزہ لینے لگیں سفید روشنی ہر چیز سے عیاں تھی بیلا ان سے کچھ فاصلے پر کھڑی ان کے اگلے جملے کی منتظر تھی۔

"تم کھڑی کیوں ہو بیٹھو مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" ان کی نظر ایک طرف کھڑی بیلا پر پڑی تو انہوں نے اسے مخاطب کیا وہ خالہ کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"میں بات تو تمہاری خالہ سے کرنے آئی تھی لیکن اچھا ہوا کہ تم مل گئیں۔" انہوں نے بیلا کو اپنی نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے کہا وہ ناسمجھی کے عالم میں شہربانو کو دیکھنے لگی۔

"میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گی کہ سعدون کو تم نے کیسے اور کیوں زیر کیا تم واقعی اتنی خوب صورت ہو کہ کوئی بھی تمہیں پہلی نظر میں پسند کر سکتا ہے۔" انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر اس کی تعریف کر ڈالی وہ ہنوز سراپا حیرت بنی ان کے عین سامنے بیٹھی تھی۔

"اس میں تمہارا قصور ہے نہ سعدون کا لیکن قصور تو اس کا بھی نہیں ہے جو سعدون کے نام منسوب ہے اور اسے دل سے چاہتی ہے۔" شہربانو نے ٹھہر ٹھہر کر بات شروع کی تو بیلا نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"ہو سکتا ہے یہ بات سعدون نے نہ بتائی ہو اور تمہیں سن کر حیرت بھی ہو کہ اس کی اپنی ماموں زاد کے ساتھ منگنی ہو چکی ہے مجھے نہیں معلوم کہ سعدون کی زندگی میں تم عنایہ سے اس کی منگنی کے بعد داخل ہوئی ہو یا پہلے اور نہ ہی مجھے اس سے غرض ہے مگر اب تمہاری سعدون کے دل میں موجودگی عنایہ کی زندگی میں زہر گھول دے گی۔" شہربانو بول رہی تھیں اور بیلا مہربہ

لب ان کی بات سن رہی تھی منگنی کے ذکر پر اسے واقعی حیرت سے دھچکا لگا تھا شہربانو اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھیں۔

"مجھے یقین ہے کہ تم ایک اچھی لڑکی ہو اور اس کا ثبوت بھی دو گی۔" شہربانو نے اپنی گفتگو میں نرمی سموتے ہوئے اسے دیکھا جو عجیب سی کیفیت سے گزر رہی تھی۔

"مجھے تم سے ایک درخواست کرنا تھی اسے تم منت بھی سمجھ سکتی ہو کہ سعدون سے کہو وہ تمہارا خیال اپنے دل سے نکال دے۔" وہ بالآخر اپنی اصل بات پر آگئیں۔

"ایسا کسی کے کہنے یا نہ کہنے سے نہیں ہوتا" آپ شاید غلط سمجھ رہی ہیں میں نے آپ کے بیٹے کو اپنی طرف مائل نہیں کیا اور نہ ہی وہ میرے کہنے سے اپنے خیالات بدل سکتا ہے۔" اس نے پہلی بار شہربانو کی کسی بات کا جواب دیا تھا۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ گہری سانس لے کر گویا ہوئیں۔

"مگر تم اس کی حوصلہ شکنی تو کر سکتی ہونا۔"

"میں نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔" بیلا نے اپنا دفاع کیا۔

"یہ بھی میں جانتی ہوں مگر وہ تمہاری محبت میں عنایا کو نظر انداز کر رہا ہے ایک لڑکی ہونے کے ناتے تمہیں پتا ہو گا کہ اس کے احساسات کیا ہو سکتے ہیں اور سعدون کے رویے سے اسے کتنا دکھ پہنچے گا میں یہ بات بھی تم سے نہیں چھپانا چاہتی کہ سعدون اور تمہارا ساتھ کسی کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہو گا، اگر وہ اپنی ضد پر قائم رہا تو نا صرف عنایا کا دل ٹوٹے گا۔ بلکہ میرا پورا خاندان ٹوٹ جائے گا۔" ان کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا بیلا ان کی دلی کیفیت سمجھ سکتی تھی۔

"میرے سمجھانے سے شاید وہ سمجھ تو جائے مگر وہ دل سے کبھی بھی عنایا کو قبول نہیں کرے گا جب تک اس کے دل سے تمہارا خیال نہ نکل جائے۔"

"آپ صاف صاف بات کریں میں کیا کر سکتی ہوں آپ کے لیے؟" بیلا کو ان کی گفتگو سے الجھن ہونے لگی تھی اسے خواہ مخواہ اپنا آپ مجرم لگ رہا تھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم اس کے ساتھ [illegible] طرح سے پیش آؤ کہ وہ تمہاری طرف سے مایوس ہو جائے میرا مطلب ہے اس کی تم سے محبت نفرت میں بدل جائے۔" شہربانو نے بدقت اپنی بات مکمل کی۔

"پھر کیا ہو گا؟" بیلا نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"اتنا ضرور ہو گا کہ وہ عنایا کی طرف پلٹ [illegible] یا بدیر وہ اسے اپنی محبت سے رام کر لے گی اور [illegible] صورت میں ممکن ہے جب تم اس کی زندگی سے [illegible] جاؤ گی۔" انہوں نے وضاحت کی۔

"اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ میں اس کی [illegible] سے نکل گئی تو وہ کسی اور کو قبول کر لے گا۔" [illegible] نکتہ اٹھایا۔

"یہ ہمارا مسئلہ ہے اس عمر کی محبت صرف وقتی [illegible] ہے محض جذباتی پن مجھے یقین ہے کہ وہ سمجھ جائے گا [illegible] پلیز تم میری مدد کرو۔" وہ ملتجی نظروں سے بیلا کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"میں آج تم سے اپنے بیٹے کی بھیک مانگنے آئی ہوں [illegible] اسے مکمل طور پر مجھے سونپ دو میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی تمہیں خدا کا واسطہ۔" وہ اپنی آنکھوں میں آنسو لیے بیلا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولیں وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"دیکھیے پلیز ایسا مت کیجیے میں آپ کی پریشانی سمجھ سکتی ہوں۔" وہ ان کے پاس چلتی ہوئی [illegible]

"آپ بے فکر ہو کر گھر جائیں آپ کا بیٹا [illegible] واپس لوٹ آئے گا۔ میں نے کبھی اس کے نام کی [illegible] تمنائیں اپنے دل میں نہیں پالیں اس لیے اسے [illegible] طور پر آپ کو سونپنے کی کوشش کروں گی۔" وہ کہہ رہی تھی اور شہربانو آنکھوں میں نمی لیے بے یقینی سے دیکھ رہی تھیں وہ کتنی آسانی سے دستبردار ہو گئی [illegible] وہ آنکھیں صاف کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"تم واقعی بہت اچھی ہو ایک دن خدا تمہیں [illegible] اجر دے گا، خوش رہو۔" وہ اس کا کندھا دبا کر [illegible]

طرف چل پڑیں۔ بیلا اپنی جگہ خاموشی سے کھڑی رہی۔ اسے سعدون شفیع پر ترس آ رہا تھا ہر کسی کو اپنا مفاد عزیز تھا ایک طرف اس کی خالہ تھی جس نے سعدون کی محبت اور دیوانگی کو درخور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے اسے سعدون سے ملنے سے منع کر دیا تھا دوسری طرف سعدون کی ماں تھیں جو اپنے بیٹے کی خواہش کو جانتے ہوئے بھی اسے خالی ہاتھ لوٹتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھیں انہیں اپنا بیٹا چاہیے تھا اس کی محبت نہیں [illegible]

[illegible] وہ کہاں تھی وہ گہری سانس لے کر دوبارہ پلنگ پر [illegible] اس کشمکش میں وہ تو کہیں تھی ہی نہیں۔ وہ شاید [illegible] بھی نے ایک دوسرے کو چھوڑنے کے لیے [illegible] تھا وہ زخمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کر دروازہ بند کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

اس کا آخری پیپر ختم ہوا تو اس کے قدم خود بخود اس دریچے کی طرف مڑ گئے جہاں وہ اپنا سکون کھو کر آیا تھا وہ [illegible] کر وہاں پہنچنا چاہتا تھا اسے بیلا سے ملاقات کیے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے ملاقات کیا وہ تو اسے دیکھ کر [illegible] تھا وہ بہت کم بولتی تھی کچھ بولتا تھا تو وہ اس کی آنکھیں اور چہرہ جس کی زبان سعدون نہیں سمجھ پایا تھا۔ اس نے بہت عجلت میں دروازے پر دستک دی تھی۔

"کون؟" وہی مانوس سی آواز ابھری تھی سعدون کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا تھا۔

"سعدون۔" اس نے مختصراً کہا۔ اگلے ہی لمحے کھٹ سے دروازہ کھول دیا گیا تھا وہ سامنے کھڑی تھی اسی سادہ سے حلیے میں مگر چہرے پر اجنبیت کا عکس لیے۔

"مجھے ایک ضروری بات کرنا تھی اندر آ سکتا ہوں۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو اندر آنے کے لیے ضرور کہتی مگر خالہ اس وقت گھر نہیں ہیں۔"

"اوکے میں کل آ جاؤں گا۔" وہ بیلا کا گریز سمجھتے ہوئے بادل ناخواستہ واپس مڑتے ہوئے بولا۔

"بات سنیے۔" پیچھے سے اس نے پکارا تھا۔ وہ دوبارہ اس کی طرف پلٹا۔

"آپ بار بار یہاں مت آیا کریں۔" اس نے کواڑوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں کسی غلط نیت سے نہیں آتا صرف آپ کو دیکھنے آیا تھا بس۔" وہ اس کے چہرے کو اپنی نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے بولا۔

"کسی غیر لڑکی کو دیکھنا معیوب بات ہے نیت اچھی ہو یا بری۔" وہی چبھتا ہوا جواب وہی روکھے الفاظ سعدون شفیع اسے گنگ سا دیکھنے لگا یہ لڑکی میری دیوانگی میری محبت کی لو سے پگھلتی کیوں نہیں ہے یہ بظاہر موم کی گڑیا نظر آنے والی اندر سے کس قدر آہنی ہے وہ لب بھینچ کر اسے دیکھنے لگا۔

"آپ شاید نہیں جانتیں بیلا میں آپ کی محبت میں کس قدر آگے نکل چکا ہوں اب واپس پلٹنا ممکن نہیں میرے لیے۔" وہ بے بسی سے تنگ سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگا جہاں دن کے وقت بھی گھپ اندھیرا تھا۔

"لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے سعدون صاحب اپنی راہ تو آپ کھو بیٹھے ہیں مجھے کیوں بھٹکاتے ہیں۔ آپ کی کوشش لاحاصل ہو گی اس لیے اب بھی وقت ہے واپس پلٹ جائیے اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بھی بند ہو جائے جو آپ کے لیے کھلا ہے۔" وہ لب کاٹ کر نیچے ٹوٹے پھوٹے فرش کو دیکھنے لگی۔

"اس طرح مت کرو بیلا میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتا ایک پل بھی نہیں تم بس ایک بار ہاں کر دو دیکھنا میں ساری خوشیاں تمہارے قدموں میں لا کر رکھ دوں گا۔ تم میرے جنون کو نہیں سمجھ سکتیں اس لیے اتنی

آسانی سے پلٹنے کا کہہ دیا۔"

"اب واپس پلٹنا آسان ہے سعدون صاحب سفر زیادہ طے کر لیا تو واپسی مشکل ہو جاتی ہے بہت خواری جھیلنی پڑتی ہے۔" وہ دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"میرا کیا ہوگا بیلا؟" وہ ششدر تھا۔

"کچھ عرصہ لگے گا آپ بھول جائیں گے اور ویسے بھی یہ محبت نہیں ہوس ہے کسی کو پانے تحویل میں لینے کی ہوس۔ اس بازار کی تاریخ میں کبھی سچی محبت نے جنم نہیں لیا نہ اولاد جنی۔ ہمیشہ ہوس کو محبت کا نام دیا گیا یہ محبت بھی ویسی ہے بے نام و نشاں رہے گی۔ جائیے سعدون صاحب اگر تو یہ ہوس ہے تو اپنے نفس امارہ کو کسی اور چیز سے بہلائیے اگر محبت ہے تو دل سے طلب نکال دیجیے!" لفظ نہیں نشتر تھے وہ سعدون کی محبت کی توہین کر رہی تھی۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو بیلا؟" وہ بمشکل بول پایا الفاظ اس کے حلق میں پھنس گئے تھے اور بیلا جو کچھ بول رہی تھی وہ اس کے دل کی زبان تھوڑی تھی اس کے پس پردہ تو کوئی اور تھا۔

"میں ویسا نہیں ہوں جیسا تم سمجھ رہی ہو یقین کرو میں تمہیں سچے دل سے اپنانا چاہتا ہوں۔" وہ اسے قائل کرتے ہوئے بولا۔

"لیکن میں آپ کو کسی خوش فہمی اور اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی باوجود اس کے کہ آپ مجھے چاہتے ہیں میں اپنے دل میں آپ کے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا نہیں کر سکی اور نہ دل کو آپ کے لیے راضی کر پائی ہوں آپ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔" وہ حد درجہ کھنور لہجے میں بولی۔

"ایک مرتبہ پھر سوچ لو بیلا؟" اس نے جیسے آخری استدعا کی تھی وہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہی وہ اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

"ٹھیک ہے آپ پرسوں آجائیں ابھی خالہ گھر پہ نہیں ہیں میں کچھ وقت چاہتی ہوں غور کرنے کے لیے۔ آپ کے حق میں فیصلہ کرنا میرے لیے اتنا آسان نہیں ہے کہ یہاں دہلیز پہ کھڑے کھڑے کر دوں۔" اس نے امید کی ایک ہی کرن دکھائی تھی سعدون کا دل ایک بار پھر امیدوں کے مینار تعمیر کرنے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے میں پرسوں آؤں گا۔" وہ تھکے تھکے قدموں سے واپس پلٹتے ہوئے بولا اس نے ایک نظر سعدون پر ڈال کر دروازہ بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

شام کا ملگجا اندھیرا آہستہ آہستہ در و دیوار پر چھانے لگا تھا وہ واپس آکر ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھ گیا۔ ہالہ حسب معمول ڈرائی فروٹ کھانے میں مصروف تھی۔ وہ بھی اس میں سے پستہ اٹھا کر کھانے لگا۔

"کیسا ہوا آپ کا آخری پیپر سعدون بھائی؟" ہالہ نے مونگ پھلی توڑتے ہوئے پوچھا۔

"بس ہو گیا یہ مت پوچھو کیسا ہوا؟" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا تو اخبار اٹھا کر اندر آتی عنایا رک سی گئی۔

"کیوں اچھا نہیں ہوا کیا؟" وہ سعدون سے پوچھ رہی تھی۔

"اچھا ہوا ہے۔" وہ اتنا کہہ کر ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور عنایا کے پاس سے گزر کر سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر چلا گیا ہالہ اور عنایا حیرت سے اسے جاتا دیکھتی رہیں۔

"مجھے تو کبھی کبھی سعدون بھائی پر نفسیاتی مریض کا گمان ہوتا ہے کبھی اتنے خوش کہ سارے دن ہنستے پھرتے ہیں اور باچھیں کھلی رہتی ہیں اور کبھی اتنے بے زار کہ کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔" ہالہ نے حسب عادت بے لاگ تبصرہ کر دیا وہ کچھ کہے بغیر صوفے پر بیٹھ گئی ہالہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی اس کا مزاج واقعی ان دنوں ایسا ہی تھا چند دن پہلے جب وہ اس کو کمرے سے اٹھانے گئی تو وہ یونہی آنکھیں بند کیے اوندھا پڑا رہا اور پھر پتا نہیں کیا ہوا اگلے ہی لمحے اس کے چہرے سے خوشی عیاں تھی اور وہ پچھلے کئی روز سے گھر میں یونہی خوشی خوشی پھر رہا تھا کافی دنوں بعد اس نے حویلی لان میں موسیٰ کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلی اور دوسروں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف رہا۔ اسی خوشی میں وہ عنایا پر بھی نظر التفات کرنا نہ بھولا۔

وہ اس سے موسم پر اور کبھی حالات حاضرہ پر گفتگو کرتا کبھی اس کی پڑھائی پر بات ہوتی تو کبھی کھانے کے مینیو پر جو بھی تھا وہ اس کی بدلی ہوئی روش پر خوش تھی مگر آج اس نے پھر نوٹ کیا کہ وہ کچھ بجھا بجھا سا ہے اور وہ وجہ نہیں جانتی تھی اگر جاننا بھی چاہے تو سعدون شاید اس کو بتانا پسند نہ کرے وہ صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر ایک بار پھر سعدون کے رویے کا تجزیہ کرنے لگی تھی جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

وہ الماری سے اپنے کپڑے نکال رہا تھا جب شہربانو اندر داخل ہوئیں ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور لب ورد میں آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے۔

"آئیے امی" وہ جونہی الماری بند کر کے مڑا اس کی نظر شہربانو پر پڑی۔

"فارغ ہوگئے ہو خیر سے۔" وہ پرشفقت انداز میں بولیں۔

"جی امی آج لاسٹ پیپر تھا فی الحال تو فراغت ہے۔" وہ شرٹ کو بیڈ پر پھیلاتے ہوئے عام سے لہجے میں بولا۔

"میں چاہتی ہوں جتنے دن تم فارغ ہو ماموں کے ساتھ فیکٹری چلے جایا کرو کچھ انہیں بھی آرام ملے گا اور تم بھی کچھ داؤ پیچ سیکھ لو گے فیکٹری سنبھالنے کے۔" وہ چھوٹے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"اس کا مطلب ہے آپ مجھے فارغ نہیں دیکھنا چاہتیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"نہیں تم کچھ روز آرام کر لو پھر دیکھ لینا جیسے تمہاری مرضی۔" وہ تسبیح لپیٹ کر ہاتھ میں رکھتے ہوئے بولیں۔

"اچھا تم کپڑے تبدیل کر لو میرا ارادہ ہے آج شام ہدیہ کے گھر سے ہو آئیں وہ بے چاری کتنی بار کہہ چکی ہے تھوڑی دیر کے لیے چلیں گے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"جی بہت بہتر۔" وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے مودب ہو کر بولا۔

"سعدون بات سنو۔" وہ دروازے سے نکلتے ہوئے بولیں اور وہ جو کپڑے اٹھا کر واش روم کی طرف جانے لگا تھا رک گیا۔

"جی۔" وہ ہمہ تن گوش تھا۔

"تم نے بتایا نہیں تمہاری اس سے بات ہوئی یا نہیں۔" انہوں نے اچانک پوچھا وہ گڑبڑا سا گیا۔

"پرسوں جاؤں گا۔" وہ اتنا ہی کہہ سکا وہ اب انہیں کیا بتاتا کہ آج گھر آنے سے پہلے وہ بیلا سے مل کر آیا ہے۔

"ٹھیک پرسوں جاؤ اور مجھے اس کی مرضی معلوم کر کے بتاؤ میں عنایا کو مزید کسی اذیت میں نہیں دیکھ سکتی پتا تو چلے ان تلوں میں کتنا تیل ہے۔" وہ اتنا کہہ کر کمرے سے نکل گئیں اور وہ بند دروازے کو دیکھنے لگا۔

☼ ☼ ☼

موسم سرما کی نرم چمکیلی دھوپ کائنات کو روپہلا پن عطا کر رہی تھی سورج کی حدت کم تھی اور ہلکی سی ہوا موسم کو خوشگوار بنا رہی تھی۔ وہ دوپہر کا کھانا کھا کر ٹیبل سے گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر کی طرف جانے لگا اس کی نظر لاؤنج کے کونے میں ظہر کی نماز پڑھتی عنایا پر پڑی۔ وہ ایک لحظے کو رکا اس کے چہرے پہ پاکیزگی اور معصومیت تھی۔ باوضو نکھرا نکھرا چہرہ اس کے دل میں ندامت سی بھرنے لگا۔ محبت سے گندھی ہوئی یہ لڑکی اس کی بے التفاتی اور کم ظرفی کا شکار ہو رہی تھی وہ اسے دیکھ کر یہی سوچ رہا تھا کہ اس نے سلام پھیر کر سعدون کو دیکھا جو لاؤنج کے دروازے پر کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا اس کے یوں دیکھنے پر وہ ایک لمحے کو چونکی اسے بھی احساس ہوا تو خجل سا ہو کر باہر نکلنے لگا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اس نے نک سک سے تیار ہو کر باہر نکلتے سعدون سے پوچھا۔

"ایک کام سے جا رہا ہوں۔" وہ نظریں نہ ملا سکا اور چابیاں ہاتھ میں اچھال کر باہر چلا گیا اب وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ کس کے در پر سوالی بن کر جا رہا ہے۔

وہ معمول سے زیادہ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے گلی میں داخل ہوا۔ اس کے دل کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ آج اسے منزل ملنے والی تھی جس کے لیے وہ نجانے کب سے مسافتوں کو بھوگ رہا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ بیلا اس کی منتظر ہے وہ اس کی دیوانگی اور آشفتہ سری کا بھرم رکھے گی۔ دل میں وسوسے بھی تھے اور سرخوشی بھی وہ اسی کیفیت میں زہرہ بائی کے مکان کے سامنے آکر رک گیا۔ دروازہ بند تھا اس نے دستک کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ دروازے کے اوپر موٹا سا تالا لگا تھا۔ اس کا ہاتھ ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ کہاں گئے یہ لوگ اس نے اپنے دل سے سوال کیا مگر جواب ندارد اس نے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آواز سنی تھی۔

"صاحب!" کسی نے آہستگی سے اسے پکارا وہ واپس پلٹا بوڑھا چوکیدار اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

"تمہیں پتا ہے کچھ یہاں تالا کیوں لگا ہے؟" اس نے بے تابی سے بوڑھے سے سوال کیا۔

"میں یہی بتانے آیا ہوں صاحب! وہ دونوں یہ مکان چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔" بوڑھے نے گویا اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔

"کہاں؟" اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔

"پتا نہیں جی انہوں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا کل شام سارا سامان ٹرک پر لوڈ کروایا اور آج منہ اندھیرے یہاں سے چلی گئیں آپ کے نام یہ خط دیا تھا بس۔"

اس نے اپنی میلی کچیلی جیکٹ کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ نکال کر سعدون کی طرف بڑھایا اس نے لرزتے ہاتھوں سے وہ پکڑ لیا بوڑھا واپس مڑ گیا۔ لفافے سے تہ شدہ ایک ورق برآمد ہوا جس پر بیلا کی تحریر درج تھی۔

"محترم سعدون صاحب!

مجھے افسوس ہے کہ میں کوشش کے باوجود بھی اپنے دل کو راضی نہیں کر پائی آپ بلاشبہ ایک اچھے انسان ہیں مگر ضروری نہیں کہ آپ جس سے محبت کریں وہ آپ کی قسمت کے گوشوارے میں بھی لکھی جائے ہمیں مجبوراً گھر چھوڑنا پڑا ہے تلاش کرنے کی کوشش لاحاصل ہو گی میں دعا کروں گی کہ آپ کی آنے والی زندگی خوشگوار گزرے۔ مجھے معاف کر دیجئے گا میں نے کسی سے وعدہ کر رکھا تھا اور اسے ایفا کرنا میرا فرض تھا۔ میں نے کسی کی خوشیاں بچانے کے لیے اپنی بساط سے بڑھ کر قربانی دی ہے ایسا نہ کرتی تو اس بات کی تصدیق ہو جاتی کہ اس بازار کی عورت کسی کا گھر بسنے نہیں دیتی۔ دعا گو بیلا۔"

وہ تہی دست کھڑا تھا اس مسافر کی طرح جو منزل پہنچ کر بھی بے ٹھکانہ تھا اور رستے بھی سارے مسدود لگ رہے تھے۔ اس نے نمناک آنکھوں سے ایک بار ہاتھ میں پکڑے کاغذ کے ٹکڑے کو دیکھا اور اسے لفافے سمیت پرزے پرزے کر کے ہوا میں اڑا دیا۔ اسے اپنا وجود بھی انہی ٹکڑوں کی طرح ہوا میں بکھرتا محسوس ہوا۔

شہربانو بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں ان کا دل وسوسوں اور خدشوں میں گھرا تھا۔ شام ہونے کو آئی تھی جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ان کی آنکھوں کے سامنے کسی انجانے خوف سے ترمرے سے ناچنے لگے تھے اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوتے جا رہے تھے۔ اگر بیلا اپنی بات سے مکر گئی تو اگر زہرہ بائی پرانے بدلے چکانے کا خیال آگیا تو اور اگر بیلا نے سعدون کو ساری حقیقت سچ سچ بتا دی تو وہ اس سے آگے نہ سوچ سکیں ان کے لب خاموش دعا میں مصروف تھے شام گہری ہونے سے پہلے سعدون لوٹ آیا تھا ان کے سارے خدشے بس خدشے ہی تھے۔ بیلا نے ان کا بیٹا انہیں لوٹا دیا تھا۔ وہ آگیا تھا ٹوٹا ہوا ویران سا جیسے بہت طویل سفر سے تھک کر آیا ہو انہوں نے سعدون سے کچھ نہیں پوچھا ساری کہانی اس کے چہرے اور آنکھوں میں لکھی تھی۔ شہربانو اپنے کمرے میں جا کر خاموشی سے واپس پلٹ آئیں۔

اس کے دل میں غبار تھا دکھ تھا وہ رونا چاہتا تھا کسی کے کندھے پر سر رکھ کر مگر رو نہ پایا۔ اس کا وجود کسی انجانی تپش سے دہک رہا تھا بیلا نے اس کی خوش فہمی خاک میں ملا دی تھی۔ اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا اور جڑنے میں پتا نہیں کتنا عرصہ لگے۔ وہ کہیں دور بھاگ جانا چاہتا تھا جہاں اس کی یادیں نہ پہنچ سکیں وہ کتنی دیر بیڈ پر سر جھکائے بیٹھا رہا پھر کچھ سوچ کر اٹھا اور سامنے ٹیبل کی دراز سے کچھ کاغذات نکالنے لگا تھوڑی سی کوشش کے بعد مطلوبہ چیز اس کے ہاتھ میں آگئی تھی اور وہ سبز رنگ کا پاسپورٹ تھا۔ وہ چند سال قبل انگلینڈ گیا تھا۔ غیاث شفیع نے بصد اصرار اسے گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے اپنے پاس بلایا تھا۔ اس نے کچھ اور مطلوبہ چیزیں اپنے بیگ میں ٹھونسیں اور بیگ بند کر کے شہربانو کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بظاہر تو سوئی ہوئی تھیں مگر نیند ان کی آنکھوں سے بھی کوسوں دور تھی ذرا سے کھٹکے پر انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا کمرے کے وسط میں سعدون کھڑا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھیں کمرے میں مدھم سی سبز روشنی تھی۔

"کیا بات ہے سعدون؟" وہ چونکی تھیں۔

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"ہاں بولو" انہوں نے سامنے لگے وال کلاک کو دیکھنے کی کوشش کی جو رات کے سوا دو بجا رہا تھا رات کے اس پہر یہ کیا کہنے آیا ہے ان کا دل ہول سا گیا۔

"میں انگلینڈ جانا چاہتا ہوں۔" اس نے اتنی بڑی بات بہت آرام سے کہہ دی۔

"مگر کیوں؟" وہ حیران تھیں۔

"بس میرا دل نہیں لگ رہا یہاں آجاؤں گا کچھ عرصے بعد۔" اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور وہ جانتی تھیں اس بے زاری کی وجہ کیا ہے۔

"مگر اس طرح تم اچانک جاؤ گے تو سب کیا کہیں گے میں کیا جواب دوں گی ان کو۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں پہلی بار نہیں جا رہا وہاں آپ کچھ بھی کہہ دیجیے لیکن میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔" اس نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ شہربانو کچھ دیر کے لیے چپ سی ہو گئیں۔

"بیلا نے کیا کہا؟" ان کا تجسس ان کی نوک زبان پر آگیا۔

"گھر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔" وہ ماں سے نظریں ملائے بغیر بولا وہ گہری سانس لے کر سعدون کو دیکھنے لگیں۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" انہوں نے امید بھری نظروں سے دیکھا۔

"یہی سمجھ لیجیے میں بہت بکھر گیا ہوں مجھے اتنا وقت ضرور دیجیے کہ نئے سرے سے اپنا آپ جوڑ سکوں۔" وہ دکھ سے بولا۔

"اور عنایا اس کا کیا ہو گا۔" شہربانو کو خیال آیا۔

"فکر نہ کیجیے کچھ نہیں ہو گا۔" وہ اتنا کہہ کر رکا نہیں اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ شہربانو کمرے کے بیچوں بیچ اکیلی کھڑی تھیں۔ وہ جانتی تھیں اب کچھ بھی ہو جائے وہ اسے نہیں روک سکیں گی۔ نتیجہ ویسا نہیں نکلا تھا جیسا وہ چاہتی تھیں۔

اس نے اپنی تیاری کر لی تھی شہربانو نے اس کے جانے کے متعلق بتایا تو سب گنگ تھے اور سعدون کے پاس ایک ہی جواب تھا جو قابل قبول بھی تھا کہ وہ بور ہو گیا ہے اور باہر جانا اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ وہ اپنا کیریئر بنانا چاہتا ہے یہ جواب سب کو خاموش کر دینے کے لیے کافی تھا مگر عنایا مطمئن نہیں تھی۔ سعدون کے جانے کا سن کر اسے صدمہ پہنچا تھا اس کے اندر کی دنیا تہ و بالا ہو رہی تھی۔

"کیوں جا رہے سعدی اس طرح اچانک۔" دو دن بعد اس کی فلائیٹ تھی وہ اس کے کمرے میں آگئی۔

"بس میرا دل چاہ رہا تھا۔" وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا مگر وہ سامنے آگئی تھی۔

"تمہارے دل کے علاوہ کسی اور کی اہمیت ہے تمہاری زندگی میں؟" وہ حد درجہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بولی وہ چپ بیٹھا رہا۔

"کون سا کیریئر بنانا چاہتے ہو وہاں جا کر اتنے سارے

دگوں کو چھوڑ کر۔" وہ چلتی ہوئی اس کے سامنے آگئی وہ ہنوز مہر بہ لب تھا آج اس کے ماتھے پہ ناگواری کی شکن تھی نہ چہرے پر بے اعتنائی کا عکس بت کی مانند بیٹھا تھا۔

"سعدی مجھے بتاؤ تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ تم مجھ سے دور بھاگ رہے ہو؟" اس نے وہ سوال کر ڈالا جو کئی مہینوں سے اس کے دل میں تھا۔

"میں جانتی ہوں تمہارے دل میں میرے لیے کسی بھی جذبے کی ... نہیں ہے مگر میں نے کبھی اس کا تقاضا بھی نہیں کیا جو لوگ محبت کرتے ہیں وہ بنا کسی لالچ اور بغیر کسی شرط کے بس کرتے چلے جاتے ہیں۔" اس کے حلق میں آنسوؤں کا پھندہ سا اٹک گیا تھا مگر وہ بول رہی تھی اور وہ سن رہا تھا۔

"ہمارے درمیان کبھی قول و قرار یا عہد و پیمان نہیں ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے اس لیے تم مجھے چھوڑ دو مگر ملک نہ چھوڑو۔" اس نے سامنے کھڑی عنایہ کو دیکھا اس کی آنکھوں کی بھری جھیلیں باڑھ توڑ کر بہنے کو تھیں وہ پگلی سی لڑکی اپنے آپ کو قصوروار سمجھ رہی تھی وہ رو رہی تھی اس کی محبت میں جو اپنی محبت ہجر کے دھندلکے میں کسی کی دہلیز پر بھول آیا تھا۔ اس کے پاس اب کچھ تھا تو اس کا تہی داماں دل۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

"میرے کہنے سے تم اپنا فیصلہ کبھی نہیں بدل سکتے مگر اتنا ضرور یاد رکھنا سعدون میری محبت تمہارے رویے سے مشروط نہیں، کبھی تمہیں حویلی لوٹنے کا خیال آجائے تو محبت کا شجر تمہیں سبز ہی ملے گا کہ یہ وصل کے پانی کا محتاج نہیں ہوتا اور مجھے یقین ہے تم ایک دن آؤ گے اس شجر کی چھاؤں میں بیٹھنے کے لیے میرا دل کہتا ہے۔" وہ بھیگی ہوئی پلکیں لیے اس پر آخری نظر ڈال کر باہر چلی گئی۔

وہ چپ چاپ اسے جاتا دیکھتا رہا باہر رات گہری ہو رہی تھی وہ کچھ دیر چت لیٹا چھت کو گھورتا رہا کمرے میں عجیب سی گھٹن اور حبس ہو گیا تھا اس کے سینے میں دھڑکنوں کی بے ترتیبی بڑھ سی گئی تھی اس نے پوری قوت سے اپنا سینہ مسل ڈالا اور کمبل پرے پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ باہر کی تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتا تھا۔ وہ دروازہ ادھ کھلا چھوڑ کر باہر نکلا۔ رات کا پتا نہیں کون سا پہر تھا ہر طرف گمبھیر خاموشی اور ہلکی سی خنکی تھی۔ اسے حویلی کی غلام گردشوں میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی چل رہا تھا وقفے وقفے سے ٹھہر ٹھہر کر وہ صرف اس کی پشت دیکھ سکتا تھا چلنے والے کی چال سے بے چینی عیاں تھی۔ وہ سایہ راہداری کے آخری سرے پر جا کر رک گیا چاند کی دودھیا روشنی میں اب وہ دور سے دیکھ سکتا تھا میرون رنگ کی شال میں لپٹی کوئی اور نہیں عنایا تھی۔ وہ ستون سے ٹیک لگائے پتا نہیں کن سوچوں میں گم تھی۔ وہ حیران سا اسے دیکھنے لگا وہ اس وقت یہاں کیوں کھڑی ہے کیا کر رہی ہے اس نے اپنے آپ سے پوچھا پھر خود ہی تلخی سے مسکرایا اسے بھی وہی بے کلی باہر لائی ہے جس نے رات کے اس پہر تمہیں چین سے سونے نہیں دیا وہ حویلی کی روش پر نظریں جمائے کسی گہرے گیان میں ڈوبی تھی۔ وہ چلتا ہوا اس کے برابر میں آکھڑا ہوا۔ ہر طرف خاموشی تھی ایک عجیب سا سکوت تھا ان دونوں کا وہ ایک تھا سو دونوں چپ کھڑے تھے عنایا نے آنکھ کے گوشے سے سعدون کو دیکھا وہ بھی سامنے دیکھ رہا تھا دونوں چپ تھے خاموشی بول رہی تھی وہ کچھ اور سن رہا تھا۔

جب آنکھیں بجھ کر راکھ ہوئیں
جب دل کا جوار سرد پڑا
جب شام و سحر کے صحرا میں
خوابوں کے ستارے ریت ہوئے
جب عمر رواں کے میدان میں
سب زندہ جذبے کھیت ہوئے
اس وقت مجھے محسوس ہوا
جس عشق میں ساری عمر کٹی شاید وہ نظر کا دھوکا تھا

وہ گہری سانس لے کر عنایا کو دیکھنے لگا۔ وہ دونوں مڑی حویلی کی غلام گردشوں میں ایک بار اس قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔

"کہاں جا رہی ہو۔" سعدون نے بغیر گردن موڑے پوچھا۔

"عشاء کی نماز پڑھنے۔" وہ ایک لمحے کو رکی اور اتنا کہہ کر اندر کی طرف چل دی۔ اسے نہیں معلوم وہ بعد میں کتنی دیر یونہی غلام گردشوں میں پھرتا رہا۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنا تمام سامان باندھ چکا تھا۔ اس نے آخری بار الماری اور درازوں کو چیک کیا۔ کل رات جب شہربانو نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا تم غیاث کے پاس رہو گے تو اس نے نفی میں سر ہلا کر انہیں حیران کر دیا تھا۔

"لیکن میں تو سمجھ رہی تھی تم اپنے باپ کے پاس ٹھہرو گے؟" وہ اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"آپ سے کس نے کہہ دیا میں ان کے پاس نہیں جا رہا پچھلے دنوں شبلی وہاں گیا ہے اپنی فیملی کے پاس میں اس سے ملوں گا پھر دیکھوں گا کیا کرنا ہے۔" وہ ریک میں کتابیں ترتیب سے رکھتے ہوئے بولا تو شہربانو خاموش ہو گئیں۔

"تم واپس کب آؤ گے۔" کچھ توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔

"پتا نہیں" وہ تلخی سے گویا ہوا۔

"اگلے سال موسیٰ اور ہالہ کی شادی کا سوچ رہے ہیں عنایا کا کیا ہو گا؟" ان کی پریشانی بجا تھی اور اس بار پر حسب معمول وہ خاموش ہو گیا۔

"سعدون میں نے کچھ پوچھا ہے؟" وہ قدرے برہم ہو کر بولیں۔

"منگنی کے وقت یہ بات طے ہوئی تھی کہ شادی میں اپنی مرضی سے کروں گا اور آپ نے مان بھی لی تھی اب اس پر بحث کرنا بے معنی ہے آپ پلیز مجھے اب شادی کے لیے مجبور نہیں کریں۔" وہ بے نیازی سے گویا ہوا تو شہربانو بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

اس نے وقت دیکھا شام کے آٹھ بج رہے تھے وہ دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس کے دماغ پر کل رات کا منظر اور عنایا کی باتیں حاوی ہونے لگیں۔ اس کا آنسوؤں میں بھیگا ہوا چہرہ اور شاکی آنکھیں اس کے دل میں ندامت سی پیدا کرنے لگی تھیں۔

اس سارے قصے میں وہ سراسر بے قصور تھی اور اگر دیکھا جائے تو مظلوم بھی وہ جن بے چینیوں سے پیچھا چھڑا کر بھاگنا چاہ رہا تھا اگر وہاں جا کر سوا ہو گئیں تو وہ کیا کرے گا۔ تمہیں عنایا کو یوں بے وقعت اور نظر انداز کرنے کا حق نہیں۔ اس کے اندر کوئی بولا تھا۔ بیلا کی محبت تمہارے مقدر میں نہیں تھی سعدون وہ ایک سراب تھا جسے تم حقیقت سمجھ بیٹھے کیا اب اسی سراب کے پیچھے ساری عمر بھاگتے رہو گے۔ اس لڑکی کے لیے گھلتے رہو گے جو تمہیں نا صرف چھوڑ کر چلی گئی بلکہ تمہاری بے لوث محبت کو ہوس کہہ ڈالا۔ اس نے تمہاری محبت کی توہین کی اور تم عنایا کی کر رہے ہو

آسیہ ریاض

طمانچہ

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ضمیر کی عدالت میں اس کی پیشی تھی وکیل بھی وہ خود تھا مدعی بھی اور منصف بھی کتنی دیر وہ اپنے آپ سے لڑتا رہا بالآخر نڈھال ہو کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

☆ ☆ ☆

اک متاعِ دل و جاں تھی جسے کھوتے ہوئے آئے
ہم تیرے پاس کہیں اور سے ہوتے ہوئے آئے
کل تری یاد نے وہ ہجر منایا ہے کہ بس!
ضبطِ گریہ میں بھی دامن کو بھگوتے ہوئے آئے

دروازے پر کسی نے ہلکے ہاتھ سے دستک دی تھی وہ ابھی جائے نماز پر بیٹھی تھی۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ وہ نماز پڑھ رہی تھی۔ اس کے باوضو چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں مقید اس کا معصوم چہرہ عبادت کے وقت بہت پاکیزہ اور نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا۔ سعدون اس حالت میں اسے دیکھ کر کئی بار بلا ارادہ ہی رک سا جاتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ دعا مانگ رہی تھی اس کی آنکھیں بند اور پلکیں ایک دوسرے میں پیوست تھیں اس کے لب حرکت کر رہے تھے وہ یونہی بے حس و حرکت کھڑا رہا وہ اس کی آمد سے بے خبر نہیں تھی مگر ان دنوں اس کے سجدوں اور دعاؤں میں طوالت آگئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دعا ختم کر کے جائے نماز تہ کی۔

"کچھ کہنا ہے تم نے؟" وہ اسے یوں خاموش کھڑا دیکھ کر بالآخر خود ہی بول پڑی۔

"ہاں۔" اس نے مختصراً کہا۔

"بولو۔" وہ اس کے عین سامنے کھڑی تھی وہ ایک بار پھر چپ ہو گیا۔

"تیاری ہو گئی تمہاری؟" خاموشی کو کسی نہ کسی نے توڑنا تھا سو اس نے ہی پہل کی۔

"تقریباً ہو گئی ہے۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تو تم جا رہے ہو؟" وہ بھی تلخی سے مسکرائی۔

"جانا تو ہے لیکن" وہ بات ادھوری چھوڑ کر۔۔۔

"لیکن کیا؟" وہ متجسس ہوئی۔

"کچھ رہ گیا ہے یہاں" وہ اسے دیکھ کر بولا۔

"کیا؟" وہ تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم!" وہ اطمینان سے بولا وہ بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے تو تم چھوڑ کر جا رہے ہو" وہ باہر [illegible] پرے دیکھتے ہوئے بجھے بجھے ہوئے انداز میں بولی۔

"کوئی اپنی چیز بھی چھوڑتا ہے بھلا؟" وہ اپنائیت سے بولا۔

"اس کا مطلب ہے تم نہیں جا رہے؟" وہ [illegible] سے چہکی۔

"جا رہا ہوں لیکن تمہیں لے کر" وہ [illegible] لپیٹتے ہوئے بولا۔

وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی اس کے [illegible] کی طوالت اور دعاؤں کی تاثیر رائیگاں نہیں گئی [illegible] سعدون شفیع اسے اپنا کہہ رہا تھا اس کی آنکھیں ایک بار پھر بھیگنے لگی تھیں۔

"میں محبت کے سبز شجر کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں میں کڑی دھوپ کا جھلسا ہوا اب اس [illegible] چھاؤں میں آنا چاہتا ہوں۔" وہ اس کے قریب [illegible] وہ بھیگی پلکوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"پگلی، روتے تھوڑی ہیں۔" وہ اپنی [illegible] اس کے رخسار پر پھسلتے نمکین پانی صاف کرتے [illegible] بولا خوشی عنایا کے چہرے سے چھلک رہی [illegible] سعدون نے اس کے عقب میں کھلی کھڑکی سے [illegible] دیکھا رات کے دامن میں ماہِ تمام روشن تھا وہی [illegible] عنایا کی آنکھوں میں بھی نظر آ رہا تھا اور وہ سوچ رہا [illegible] محبت کی ایک بوند کے لیے وہ خواہ مخواہ ہی دشت [illegible] رہا جبکہ محبت کے سمندر کا سبز پانی تو اس کے [illegible] ہی تھا……!

عورت کا حسن مرد کے دل کے اندر ایک مقناطیسی کشش رکھتا ہے۔ مگر ایک اور چیز ہے جس کے مقابل حسین ترین عورت کا جادو حسن بھی بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔

ندیم اپنی بہن ندا اور مانو کے ساتھ جس قصبے میں رہتا تھا۔ یہ قصبہ کافی بڑا تھا اور شہر کے قریب ہی تھا۔ ان کا باپ ایک سرکاری ملازم تھا۔ ندیم کو دونوں بہنوں سے زیادہ ذہین اور ہونہار سمجھا جاتا تھا۔ اور اس وقت سے وہ ایک سال میں دو کلاسیں پاس کر رہا تھا۔ چنانچہ وظیفہ پایا اور انجینئر بننے کے لیے کالج میں داخل ہو گیا۔ اسی وجہ سے اسے گھر چھوڑ کر کالج کے بورڈنگ میں رہنا پڑا۔

ندا کو بھی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ اس نے بھی تعلیم جاری رکھی اور کالج میں ایڈمیشن لے لیا۔ کالج قصبے سے سات آٹھ میل دور تھا روزانہ بس سے آتی جاتی۔ کالج میں ندا اپنی کلاس کی لڑکیوں سے بہت جلد گھل مل گئی اسے اپنے مضامین سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس لیے تمام استاد بھی اس سے بہت خوش تھے وہ کالج کی تمام سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی یہی وجہ تھی کہ اپنے دراز قد روکھے بالوں اور معمولی شکل و صورت کے باوجود سب میں مقبول ہو گئی۔

ندا کی اپنی ٹیچر کی بیٹی سلوی سے گہری دوستی تھی اور سلوی نے آج اسے اصرار کر کے اپنی برتھ ڈے کی تقریب میں بلایا تھا۔ وہ آ تو گئی تھی مگر بے حد بور ہو رہی تھی۔ بوریت دور کرنے وہ لان میں چلی آئی جہاں اس کی نظر اس اجنبی شخص پر پڑی۔

اجنبی کی عمر اٹھائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ خاموش سا اور غمگین سا نظر آ رہا تھا۔ وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا جسم پر لباس نہایت مناسب تھا۔ اس نے سگریٹ نکال اسے سلگا کر گہرا کش لیا اور پھر ادھر ادھر دیکھا اچانک اجنبی کی نظریں ندا کی نظروں سے ملیں وہ ندا کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں نے ایک نشیلی مٹھاس سی گھول دی تھی جس کے سرور نے ندا کو مدہوش سا کر دیا۔ ندا اجنبی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی جیسے اسے جانتی ہو۔ اور سچ مچ اسے اب بہت ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے ہمیشہ سے جانتی ہے اور ایک عمر سے اس لمحے کے انتظار میں تھی۔

ندا کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی نظروں کو کسی طاقت نے اجنبی کی نظروں سے چسپاں کر دیا ہے۔ تقریب کا خیال ہی اس کے ذہن سے محو ہو گیا۔ معلوم ہونے لگا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں ہے جس میں بے پایاں ہنستی مسکراتی ہوئی آنکھیں اسے خوابوں میں۔ سلوی کی آواز نے چونکا دیا وہ اس اجنبی کو جس کا نام اویس تھا کو اپنے والد کا پیغام دے رہی تھی وہ لائبریری میں بلا رہے تھے ندا کو ایسا محسوس ہوا جیسے اب اس جگہ —— کچھ بھی نہیں بچا۔ سلوی نے اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہی مگر اس نے خود کو اپنی حالت پر قابو پا لیا اور اس کے ساتھ دوستوں کی طرف چلی گئی۔ چلتے ہوئے اس نے سرسری پوچھا۔

”کون ہیں یہ اویس صاحب؟“

”ابا کے کوئی جاننے والے ہیں۔ حال ہی میں امریکا سے یہاں سیٹ ہوئے ہیں۔“ سلوی نے بتایا۔

”بہت نفیس انسان ہیں۔ خوش اخلاق اور ویل ایجوکیٹڈ“ سلوی ان کا تفصیلی تعارف کروا رہی تھی۔ سب سے مل کر وہ لان کی طرف ایک نیم تاریک گوشے میں جا بیٹھی۔

اسے وہاں بیٹھے کچھ ہی دیر گزری ہو گی کہ کوئی سایہ آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا اور ندا کے قریب آ کر رک گیا۔

”معاف کیجیے!“ اس نے ندا کو شست لہجے میں مخاطب کر کہا۔ ندا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اویس تھا۔ ندا کا دل چاہا کہ اسے بیٹھنے کے لیے کہے مگر زبان نہ ہلی۔ اور اویس جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا اویس چلا گیا۔

جب وہ اٹھ کر ہال میں آئی تو تقریب اختتام پذیر تھی۔ مہمان رخصت ہو رہے تھے اس کی نظریں اویس کو تلاش کر رہی تھیں۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ تھوڑی بعد ہی اویس سلوی سے باتیں کرتا ہوا باہر کی طرف چلا گیا۔ پھر ندا کا دل بھی اس تقریب میں نہیں لگا وہ سلوی سے اجازت لے کر چلی آئی۔

دوسرے دن کالج میں سلوی نے باتوں باتوں میں اویس کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اویس بڑا قابل انجینئر ہے مگر بے چارہ بیوی کے معاملے میں بڑا بدنصیب ہے۔

کس طرح؟ یہ سلوی نے بتایا نہ ندا نے پوچھا وہ اویس کے ساتھ اپنی گہری دلچسپی کا بھید سلوی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اپنے گھر واپس پہنچ کر ندا اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ نہ جانے کیوں یہ بات اس کے گمان میں بھی نہیں آئی تھی کہ اویس شادی شدہ ہے اس نے اویس کو دور سے دیکھا تھا اور وہ بھی چند منٹ کے لیے مگر۔۔۔ اس نے سوچا اویس بیوی کے بارے میں بدنصیب کس طرح ہے کیا وہ بیمار ہے اس سے علیحدگی اختیار کر چکی ہے۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے وہ بے چین ہو گئی۔

اتوار کے دن ندا سلوی کی طرف گئی تو دیکھا برابر والی کوٹھی کے پھاٹک پر مالی کھڑا باڑھ تراش رہا تھا۔ اس نے پوچھا ”مسٹر اویس کا بنگلہ یہ ہے؟“ اس نے بتایا۔

”جی آپ کو کس سے ملنا ہے۔“

”اویس صاحب سے۔“ اس نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ لان پر ایک روش پر ایک ننھی سی بچی ایک چھوٹی سی گاڑی میں گڑیا کو بٹھائے گاڑی چلاتی ہوئی ایک طرف جا رہی تھی عمر شکل سے چار سال کی ہو گی ندا سمجھ گئی کہ یہ اویس ہی کی بیٹی ہے اس نے خود کو ملامت کی کہ خواہ مخواہ ایک شادی شدہ بال بچہ دار مرد کی محبت میں خود کو مبتلا کر کے اوپنی اور واپس پلٹ گئی۔ اس کے بعد اس نے اویس کا خیال دل سے نکال دیا۔ اور سلوی کے گھر آنا جانا بھی یک دم ترک کر دیا۔

جب بیوی بچے والے ایک مرد کے فراق میں زندگی برباد کرنا کس عقل مند کا مشورہ ہے۔

کالج میں ندا امتحان میں اتنے اچھے نمبروں سے پاس ہوئی کہ اسی کالج میں ٹیچر کی ملازمت مل گئی۔ گھر پر اس ملازمت بھی پسندیدہ تھی۔ سب خوش تھے ندیم نے بھی امتحان میں کامیابی حاصل کی ایک فرم میں معقول مشاہرے پر بہت اچھی پیش کش ہوئی تو اس نے فوراً قبول کر لیا اور کراچی چلا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے اپنے ایک خط کے ہمراہ ایک فوٹو بھیجا جس میں وہ ایک فیملی کے ہمراہ کھڑا تھا۔ جس میں ایک حسین نوجوان لڑکی بھی کھڑی تھی۔ ندیم نے اس کے بارے میں بتایا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے ندا کو یہ سب سن کر بہت خوشی ہوئی۔

☼ ☼ ☼

ایک دن سلوی ندا سے ملنے آئی تو باتوں باتوں میں کہنے لگی۔

”اویس صاحب اب لکھ پتی بن جائیں گے ان کو ایک بہت بڑا ٹھیکہ ملا ہے۔ تم نے بھی تو انہیں دیکھا ہے نا۔ ویسے زندگی بڑی تلخ ہے ان کی بیوی ایک بچی کو چھوڑ کر مر گئی۔“

”کیسے مر گئی؟“ ندا نے پوچھا۔

”ایک حادثہ ہو گیا تھا اس میں ہلاک ہو گئی۔ اس وقت ان کی بچی کی عمر صرف چند ماہ کی تھی۔“ ندا کا دل واقعی دکھی ہو گیا اس نے دکھ سے کہا ”بن ماں کی بچی کا دل کیا کڑھتا ہو گا۔“

”کہے گا کیا جوں توں گاڑی چل رہی ہے۔ اویس صاحب اگلے ہفتے آ رہے ہیں کویت گئے ہوئے تھے نا۔ چھوڑو ان کی باتیں تم سناؤ جاب کیسی جا رہی ہے اور تم آتی کیوں نہیں۔“ سلوی نے بات بدلی تو وہ بھی اسے تفصیل بتانے لگی۔ ندا سلوی کے بے حد اصرار پر اس کے گھر جا رہی تھی اور اویس کی کوٹھی کی طرف نظریں اٹھائے چلی جا رہی تھی کہ دفعتاً پاؤں پھسلا اور وہ سڑک پر گر پڑی ایک چھوٹا سا کتا اس کے پاؤں میں آ گیا تھا اور اب بھونکتا ہوا کوٹھی کے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ ایک لڑکی دوڑتی ہوئی دروازے پر آئی اور ندا کو دیکھ کر چلائی۔

”ابو جی ذرا آیئے جلدی آنٹی گر گئی ہیں۔“

ندا نے چاہا تو یہی کہ کسی طرح اٹھ کر وہاں سے بھاگ جائے مگر کیسے ممکن تھا۔ ایک تو وہ سڑک پر گر

احساسات خوابیدہ ہوتے جارہے تھے۔ ندا نے ان لمحات کے امر ہونے کی دعا مانگی وہ ان ہی میں تصورات میں محو تھی کہ گاڑی کا ہارن سنائی دیا اس نے چونک کر گیٹ کی طرف دیکھا' عنیقہ کی گاڑی اندر آرہی تھی ندا بددل سی ہو گئی۔ اویس اور منیزہ کے ساتھ اتنا اچھا وقت گزرا تھا عنیقہ کی آمد نے اس خوب صورتی کو گہنا دیا۔ اویس بھی جزبز سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ عنیقہ سے سرسری انداز میں مل کر وہ ضروری فون کا بہانہ کرکے اندر کی طرف چلا گیا۔

ندا نے عنیقہ کو دیکھا بیش قیمت لباس' نفیس جیولری کے ساتھ وہ نزاکت سے چلتی اس کے سامنے رکھی اس کرسی پر بیٹھ گئی جس پر ابھی کچھ دیر پہلے اویس بیٹھا تھا۔

ندا کو اسے دیکھ کر عجیب سی کمہائیگی کا احساس ہوا یہ بات عنیقہ نے بھی محسوس کرلی تھی۔ اس کے جسم پر ندا سے کہیں بہتر کپڑے تھے کچھ دیر تک وہ آپ ہی آپ مسکراتی رہی پھر بڑے نرم مگر معنی خیز لہجے میں ندا سے بولی۔

"تمہیں دکھ تو ہو رہا ہوگا کہ اویس ہاتھ سے جارہا ہے۔" عنیقہ کی آنکھیں استہزا سے لبریز تھیں ندا بولی۔

"نہیں مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔"

"اچھا۔" عنیقہ نے طنزیہ لہجہ میں پوچھا۔

"واقعی۔" ندا بولی۔

"مجھے یقین ہے اویس صرف میرا ہے۔"

"تم غلط فہمی میں مبتلا ہو اویس کو وہ بڑی کامیابیاں بلا رہی ہیں جنہیں حاصل کرکے اس کی زندگی بنے گی' لیکن اس کامیابیوں کے لیے اسے مجھ جیسی شریک زندگی درکار ہے تم جیسی نہیں۔" ندا کا خون کھولنے لگا' لیکن اس نے غصہ ضبط کرلیا۔ کیونکہ وہ سمجھ گئی کہ عنیقہ اس کو غصہ دلانے کی کوشش میں ہے۔ اس نے ہنس کر جواب دیا۔

"اویس بچے تو ہیں نہیں' انہیں بھی معلوم ہوگا ہی کہ انہیں کیا درکار ہے اور کیا نہیں درکار ہے۔"

عنیقہ بولی۔

"مجھے یقین ہے کہ مجھ سے ملنے کے بعد اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں' میں مردوں کی فطرت کو خوب اچھی طرح سمجھتی ہوں۔"

"ضرور سمجھتی ہوگی۔" ندا نے کہا۔

"لیکن اویس کے علاوہ ایک اور مرد کو بھی تم سے شادی کی آس دے رکھی ہے۔"

"وہ کون ہے؟" عنیقہ نے انجان بن کر پوچھا۔

"میرا بھائی ندیم۔" عنیقہ کھکھلا کر ہنس پڑی۔ بولی۔

"وہ تو ابھی بچہ ہے۔ اس کے پاس ابھی اتنا کہاں کہ میرا خرچ برداشت کرے تمہیں کیا معلوم کہ میرے اخراجات کیسے شاہانہ ہیں۔ ویسے ندیم اچھا لڑکا ہے مگر مجھے تو مالدار شوہر چاہیے۔" ندا سے ضبط نہ ہوسکا اس نے کہا۔

"تم تو بڑی قابل نفرت لڑکی ہو۔" عنیقہ ہنس کہنے لگی۔

"کوؤں کے چلانے سے ڈھور مرا نہیں کرتے تمہیں مجھ پر اس لیے غصہ آرہا ہے کہ میں اویس کو تم سے چھین رہی ہوں جس پر تم قبضہ کرنا چاہتی ہو۔ اکیلے میں خوب ڈورے ڈال رہی تھیں۔" ندا نے کڑی نگاہوں سے عنیقہ کو دیکھا۔ عنیقہ نے حقارت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں نے تمہیں آگاہ کردیا ہے اب تم یہاں سے اپنا بوریا بستر اٹھالو مجھے برا بھلا کہنے اور کوسنے کاٹنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تمہاری حیثیت اور شکل صورت اس قابل نہیں کہ اویس جیسے آدمی کی شریک زندگی بن سکو۔" تو ندا طنزیہ ہنسی پھر بولی۔

"تم بہت دل چسپ لڑکی ہو۔ تم جیسوں کے بارے میں' میں نے پڑھا تو تھا' مگر کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔"

"اب پڑ گیا نا بس' میں یہ ہی بتارہی تھی تمہیں۔" عین اسی وقت منیزہ اپنے کمرے سے باہر نکلی اس کے ایک ہاتھ میں چینی کا ایک پیالہ تھا جس میں وہ چھوٹی چھوٹی سنہری مچھلیاں تھیں وہ ندا کو مچھلیاں دکھا چکی تھی اور اب عنیقہ کو دکھانا چاہ رہی تھی۔ منیزہ مچھلیوں کا وہ پیالہ لیے ہوئے عنیقہ کی طرف بڑھی مگر جب وہ اس کی قریب پہنچی تو اچانک پیر لڑکھڑانے کی وجہ سے اوندھے منہ گری پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر عنیقہ کے گود میں گرا اور اس کا تمام پانی عنیقہ کے کپڑوں پر پڑا عنیقہ تنک کر یک دم اٹھ کھڑی ہوئی اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ دانت پیستے ہوئے آپے سے باہر ہو کر چیخی۔

"کم بخت بدتمیز کہیں کی۔" اور بچی کے منہ پر "طمانچہ" دے مارا۔ منیزہ کے رخسار پر عنیقہ کا طمانچہ ندا کو ایسے معلوم ہوا جیسے کسی نے اسے مارا ہو اس کا خون جل اٹھا۔ وہ دوڑ کر منیزہ کے پاس پہنچی۔ عنیقہ کوفت سے اپنے کپڑوں کو گھور رہی تھی جو مچھلیوں کے پیالے کے رنگ دار پانی سے خراب ہوچکے تھے وہ غصے سے کپکپا رہی تھی۔

منیزہ نے روتے ہوئے کہا۔

"میں نے جان کر پیالہ تھوڑی گرایا ہے۔" اور بلک بلک کر رونے لگی۔ عنیقہ نے اس کے دونوں کندھے پکڑے اور جھٹکے دیتے ہوئے دانت پیس کر بولی۔

"نہیں تو نے جان کر گرایا ہے مردار کہیں کی۔" ندا نے آگے بڑھ کر منیزہ کو اس گرفت سے چھڑالیا۔ منیزہ ندا سے چمٹ کر سسکیاں لینے لگی۔ عنیقہ اسے گھورتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میرا بہترین لباس اس نے ستیاناس کردیا ہے۔ میں اس گھر میں آجاؤں پھر اس کے سب کس بل نکال دوں بہت سر پر چڑھا رکھا ہے۔"

جب تک جھاڑیوں میں سے اویس نکلا اس کی آنکھیں غصے سے انگارہ بنی ہوئی تھیں بولا۔

"جی ہاں میں نے اپنی لڑکی کو بہت سر پر چڑھا رکھا ہے۔" اویس کو دیکھ کر عنیقہ نے فوراً لب و لہجہ بدل کر کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں کپڑے دھل دھلا جائیں گے۔"

"جی نہیں۔" اویس نے طنزاً کہا۔

"کم بخت نامراد لڑکی نے جان کر آپ کے کپڑے ایسے خراب کیے ہیں کہ اب کیا دھل سکیں گے اور یہ جوڑا لاکھوں روپے کا تو ضرور ہوگا۔ اس کو ابھی اور مار پڑنی چاہیے۔"

"سوری ابو۔" منیزہ باپ کے سینے سے چمٹتے ہوئے بولی۔ "میں نے جان کر نہیں پھینکا۔" اویس اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"اٹس او کے بیٹا۔" عنیقہ نے خوشامدانہ لہجہ اختیار کیا' مگر اویس کا دل اس کی طرف سے سخت خراب ہوچکا تھا بولا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کے کپڑے خراب ہوگئے اب آپ کو ہوٹل پہنچنے کی جلدی ہوگی۔ میں ڈرائیور کو کہہ دیتا ہوں وہ آپ کو ہوٹل پہنچا آئے گا۔" پھر ندا کی طرف رخ کرکے بولا۔

"ابھی نہیں جائیے گا مجھے کچھ بات کرنی ہے آپ سے۔" اور منیزہ کو سینے سے چمٹا لیا۔

ندا حیران پریشان یہ سب دیکھ رہی تھی۔ عنیقہ پیر پٹختی جاچکی تھی۔ اویس ندا کی جانب مڑا اور نرمی سے بولا۔

"عورت کا حسن مرد کے لیے ایک مقناطیسی کشش رکھتا ہے' مگر ایک چیز اور ہے جس کے مقابل حسین ترین عورت کا جادو بھی بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔ جانتی ہیں کیا؟" ندا نے نفی میں سر ہلایا۔

"اولاد۔" اویس نے منیزہ کو خود سے لگاتے ہوئے کہا۔

"آیئے اندر چلیں۔ ہماری فیملی آج مکمل ہے۔" اور تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے گھر میں داخل ہوگئے۔

☼ ☼

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ مگر وہ اس سے بات نہیں کرتی... مگر زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔ میں اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو اس کے کالج میں ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعویٰ بھی کرتی ہے... رخسار اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے... اور روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رومیلہ، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے... اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو پیلس میں ٹریٹ کی دعوت دیتی ہے۔ اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، ذکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب غریب شرط کو قبول کرلیتا ہے۔ اور انہیں پیلس میں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے... رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے... اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کردیتا ہے... اب آگے پڑھیں۔

۴۴ — چوالیسویں قسط
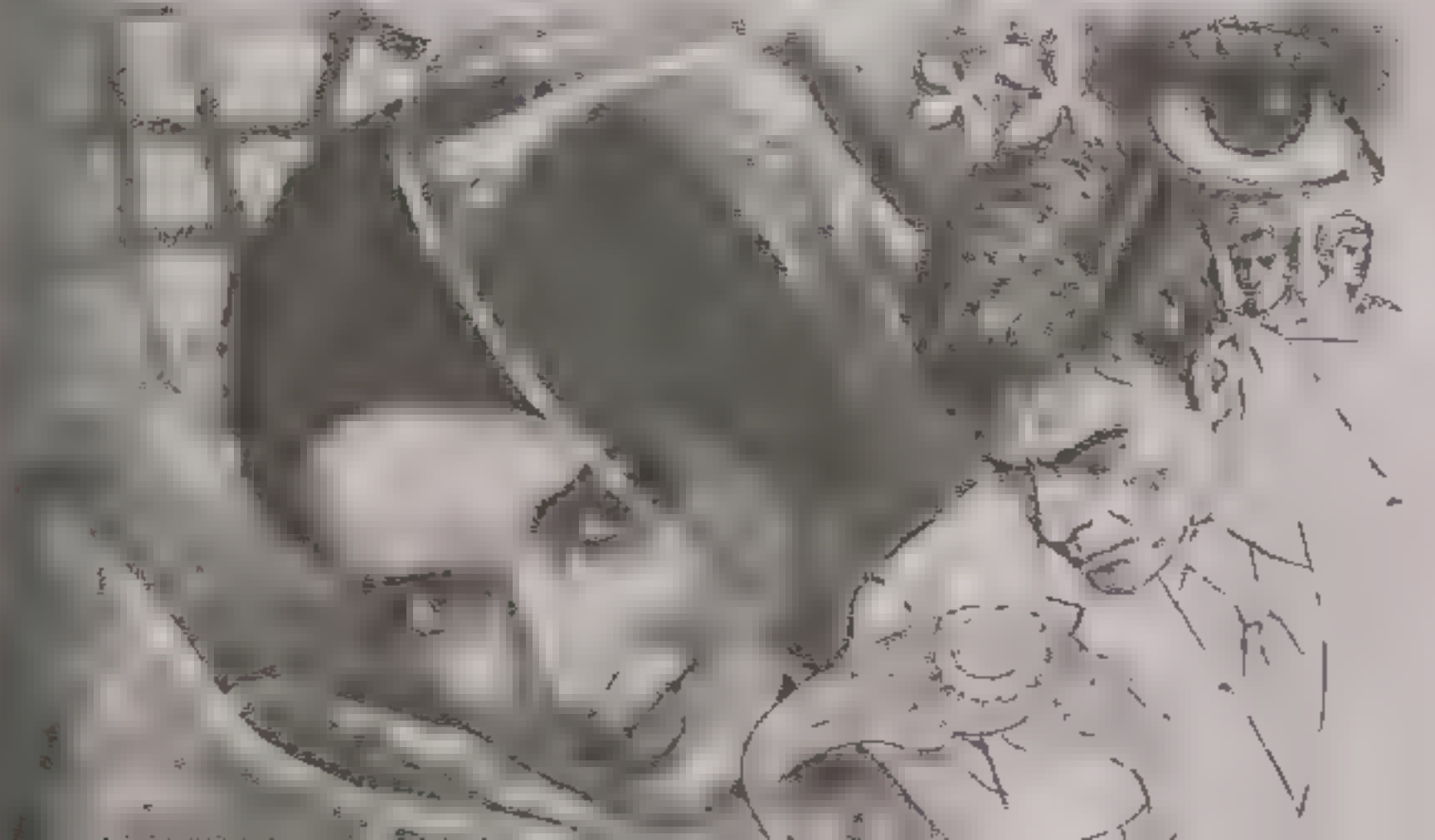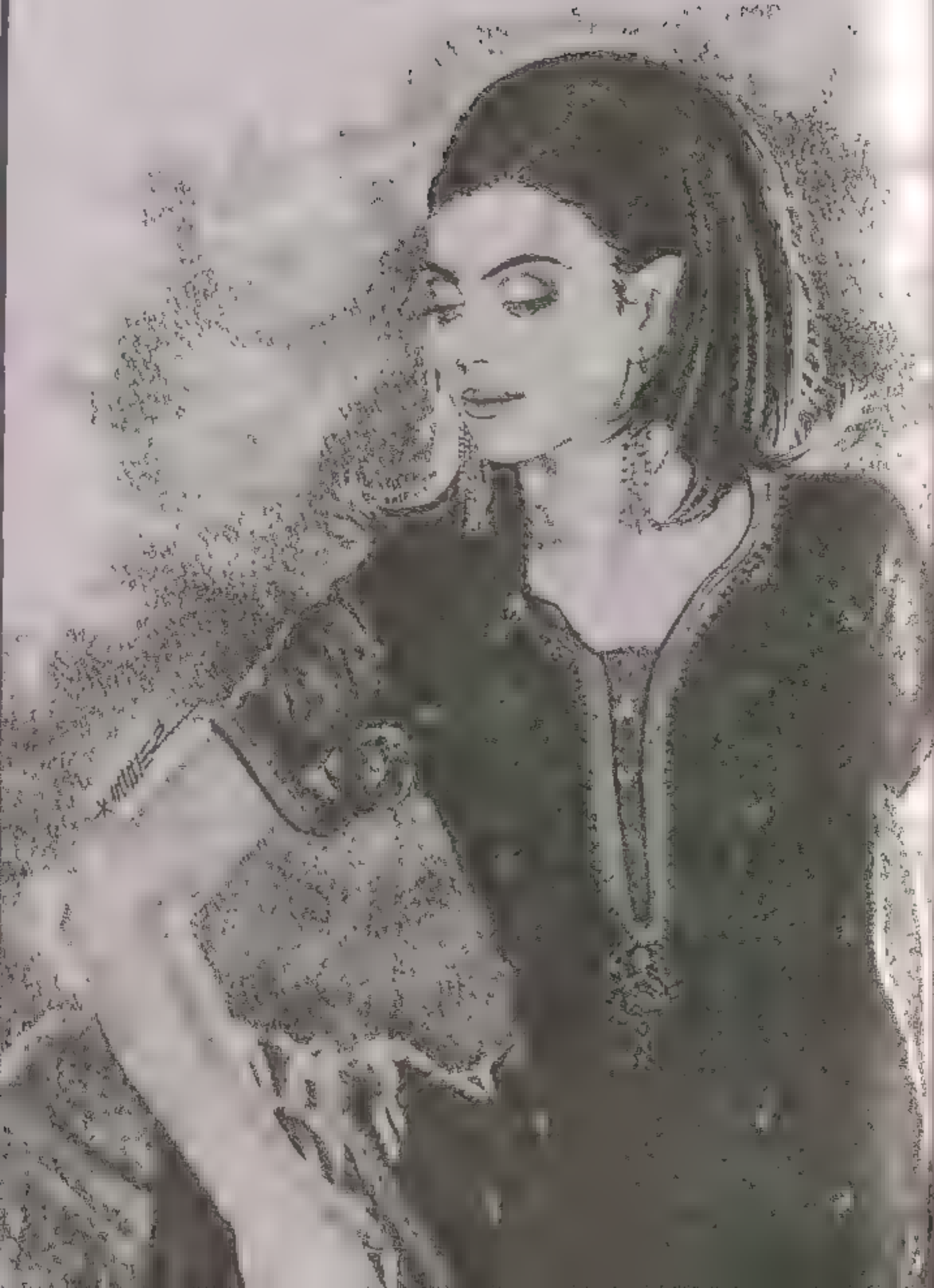
"سمیر کی انگلش ڈیپارٹمنٹ میں پڑھنے والے لڑکوں سے جھڑپ ہوگئی وہ سارے لڑکے ڈنڈے وغیرہ لے کر سمیر اور اس کے دوستوں پر حملہ آور ہو گئے ہیں۔" خرم حیرانی سے حمید کو دیکھنے لگا۔

انگلش ڈیپارٹمنٹ میں خاصے سیاسی قسم کے لڑکے موجود تھے وہ عموماً دوسروں کے معاملے میں کم ہی دخل دیتے تھے لیکن جب کوئی ان کے معاملوں میں دخل اندازی کرتا تو وہ اسے بخشتے بھی نہیں تھے۔

خاصے خطرناک قسم کے ان لڑکوں سے خرم وغیرہ ہمیشہ الگ ہی رہے تھے۔ سمیر کی ان لوگوں سے لڑائی ہونے کا مطلب یہی تھا کہ سمیر کا اور اگینگ صفحہ ہستی سے غائب ہو جائے گا۔

"کس بات پر لڑائی ہوئی ہے؟" خرم نے پوچھا۔

"یہ تو ابھی پتا نہیں۔ وکی کا میسج آیا ہے وہاں کینٹین کے پاس زبردست جھگڑا ہو رہا ہے۔ میں وہیں جا رہا تھا تم نظر آ گئے تو تمہیں بتانے آ گیا۔ چلو چل کر دیکھتے ہیں۔" حمید خاصا جوشیلا ہو رہا تھا اپنی بات ختم کرنے کے ساتھ ہی تیزی سے اس طرف چل پڑا جہاں ہاتھ سے اشارہ کر رہا تھا۔

خرم نے بھی فوراً اس کی پیروی کی دور سے ہی ان دونوں کو ایک جگہ پر ہجوم نظر آگیا تو وہ دونوں بھی اس کے نزدیک چلے آئے۔ ابھی وہ دونوں ہجوم میں داخل بھی نہیں ہو سکے تھے کہ گولی چلنے کی دل خراش آواز نے سب کو دہلا دیا اور اس کے بعد ایسا شور بلند ہوا کہ کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دے سکے۔

ہجوم میں جمع لوگ ادھر سے ادھر بھاگنے لگے ابھی تک صرف ہاتھوں سے مار پیٹ ہو رہی تھی اور لوگ اس منظر کو کسی فلم کے فائیٹ سین کی طرح مزے لے کر دیکھ رہے تھے مگر انگلش ڈیپارٹمنٹ کے ایک لڑکے نے ریوالور نکال کر فائر کیا تو سب کو اپنی اپنی جانوں کی فکر لاحق ہو گئی اور جس کی جہاں سمجھ میں آیا منہ اٹھا کر سرپٹ دوڑنے لگا۔

ہجوم کچھ منتشر ہوا تو سامنے کا منظر کھل کر واضح ہو گیا۔ گولی کس لڑکے نے چلائی تھی یہ تو خرم نہیں جان سکا البتہ گولی لگی سمیر کو تھی وہ بیچ میدان میں چاروں خانے چت پڑا تھا۔

اس کے کندھے سے خون نکل رہا تھا جو اس کی سفید قمیص کو تیزی سے سرخ رنگ میں تبدیل کر رہا تھا جبکہ سمیر تکلیف کی شدت کے باعث بالکل بے حرکت پڑا تھا۔

انگلش ڈیپارٹمنٹ کے لڑکے تو فوراً ہی فرار ہو گئے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ سمیر کے دوست بھی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

ایک طرح سے وہاں اتنا بڑا ہجوم تھا لیکن کوئی بھی سمیر کی مدد کرنے آگے نہیں بڑھا تھا جبکہ اس کے کندھے سے اس تیزی سے خون بہہ رہا تھا کہ اگر اسے فوراً اسپتال نہ پہنچایا گیا تو اس کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ خرم چند ثانیے کے لیے یہ منظر دیکھ کر سن ہو گیا مگر بہت جلد اس کے حواس بحال ہو گئے اور وہ تیزی سے سمیر کے سر پر پہنچ گیا۔

اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہی خرم نے اس کی نبض چیک کی تھی اور یہ جانتے ہی کہ وہ زندہ ہے خرم نے اس کے بے سدھ پڑے وجود کو پوری جان لگا کر اٹھایا اور اپنے کندھے پر لٹکا کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

خرم کو سمیر کی مدد کرتا دیکھ کر ہجوم میں مچی افراتفری ایک دم ساکت ہو گئی۔ جس کی خرم نے پروا نہیں کی۔ تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ تب ہی وکی اس کے راستے میں آگیا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو خرم؟ سمیر کی جان بچا رہے ہو ارے مرنے دو اسے۔" خرم کے پاس اس کی فضول بات کا جواب دینے کا وقت تھا نہ ہمت۔ سمیر کو اس طرح کندھے پر ڈال کر پارکنگ تک جانا ایک خاصا محنت طلب کام تھا لہٰذا وہ بے کار گفتگو میں اپنی جان ہلکان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جبکہ اسے بدستور گاڑی کی طرف جاتا دیکھ کر وکی تیزی

...س کے ساتھ ہی چلنے لگا یہ اور بات تھی کہ اس کی زبان اس کے بالکل مخالف چل رہی تھی۔

"کیا ضرورت ہے اس کی مدد کرنے کی۔ کمل کے ساتھ مل کر اس نے تمہیں کتنا تنگ کیا ہے اور پھر نا جانے اس کی انگلش ڈیپارٹمنٹ کے طلحہ وغیرہ سے کس بات پر لڑائی ہو رہی تھی۔ کیوں سمیر کی وجہ سے ان خطرناک لوگوں سے دشمنی مول لے رہے ہو اور پھر سمیر کو گولی لگی ہے بھلے ہی ساری یونیورسٹی اس بات کی گواہ ہے کہ یہ کام تم نے نہیں کیا مگر کورٹ میں آ کر گواہی کون دیتا ہے اگر سمیر بیان دینے سے پہلے مر گیا تو کہیں پولیس تمہیں ہی اس کے قتل کے الزام میں نہ دھر لے۔ سمیر کے دوست بھی اس خطرے کے پیش نظر فوراً بھاگ گئے بس تمہیں ہی شوق ہے ہیرو بننے کا۔" وکی رکے بغیر ایک سانس میں بولے گیا۔

جب تک خرم پارکنگ میں اپنی گاڑی تک پہنچا اس کی سانس بری طرح پھول چکی تھی کندھا اور گردن ایسے شل ہو گئے تھے کہ ایک پل کو اس کا واقعی دل چاہا وہ سمیر کو یہیں زمین پر گرا کر خود بھی بیٹھ جائے۔ مگر اپنی گاڑی کے قریب پہنچتے تک جیسے اسے ایک نئی قوت مل گئی۔ پارکنگ میں داخل ہوتے ہی ہارون اپنی گاڑی تیزی سے لیے اس کے عین سامنے آ رکا تھا جبکہ برابر والا دروازہ کھول کر نادر برق رفتاری سے گاڑی سے اترا اور پیچھے کا دروازہ کھول کر خرم کی طرف بڑھا کہ سمیر کو اس میں ڈال سکے۔

"ارے پاگل ہو گئے ہو تم دونوں۔ بجائے خرم کو سمجھانے کے تم اس کی مدد کرنے آ گئے۔ ارے یہ زویا نہیں ہے کوئی خوب صورت حسین لڑکی۔ جسے بچا کر اسپتال پہنچا کر اس کی نظروں میں ہیرو بنا جا سکے یہ سمیر ہے سمیر۔ ساری یونیورسٹی کو لگتا ہے کہ کمل نے سمیر کی خاطر بھی خرم کو گھاس نہیں ڈالی اور بالا خر اس کی وجہ سے ان کی منگنی بھی ٹوٹ گئی اور تم اس کی جان بچانے کے لیے پولیس وغیرہ کے جھمیلے میں پڑنا چاہ رہے ہو تم تینوں کا دماغ چل گیا ہے۔" وکی کی زبان کسی طور رکنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

مگر خرم کی طرح نادر بھی خاموشی سے اسے گاڑی میں ڈالنے میں مصروف رہا اور وکی کو جواب تک دینا ضروری نہیں سمجھا۔ جب وہ کسی نہ کسی طرح اسے پچھلی سیٹ پر لٹانے میں کامیاب ہو گئے تب انہوں نے خود بھی گاڑی میں بیٹھ کر تیزی سے گاڑی کے دروازے بند کیے اور وکی کو وہیں اکیلا چھوڑ کر اس پر دھول اڑاتے اسپتال کی طرف جانے کے لیے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔

سیٹ کی بیک سے ٹیک لگا کر خرم نے کئی گہرے گہرے سانس لیے اور جب اس کی حالت کچھ بحال ہوئی تو اس نے جیب سے موبائل نکالا اور فرقان حسن کے دوست جو محکمہ پولیس میں ڈی آئی جی تھے انہیں کال کرنے لگا۔

وہ فرقان حسن کے کافی اچھے دوست تھے۔ بلال اختر کا یہ گھر جو اب فرقان حسن کا تھا فرقان حسن نے ان سے مشورے کے بعد ہی خریدا تھا۔ انہوں نے ہی گھر کے متعلق فرقان کو ساری معلومات دی تھی کہ اس گھر کے مکینوں کا خیال ہے کہ یہاں کسی روح کا بسیرا ہے وغیرہ وغیرہ۔

خرم کو یقین تھا اسپتال کا عملہ سمیر کے کندھے میں لگی گولی کو دیکھ کر اسے لینے میں ٹال مٹول کرے گا جبکہ سمیر کو فوری طبی امداد کی سخت ضرورت تھی۔

ڈی آئی جی صاحب کو فون کر کے وہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ساری کارروائی عمل میں لا سکتا تھا۔ انہوں نے اس کا فون سنتے ہی سب سے پہلے یہی کہا۔

"یہ تم نے کس پرابلم میں ہاتھ ڈال دیا ہے اب دعا کرو کہ وہ لڑکا پولیس کو اسٹیٹمنٹ دینے سے پہلے مر نہ جائے ورنہ تم مشکل میں آ سکتے ہو۔ خیر تم اسپتال پہنچو میں سب انتظام کرتا ہوں۔" خرم کو ان سے اسی جواب کی توقع تھی۔ فون بند کر کے اس نے سکون سے آنکھیں بند کر لیں اور سر سیٹ کی بیک پر گرا لیا۔

ڈی آئی جی صاحب نے واقعی ان لوگوں کے پہنچنے سے پہلے سب سنبھال لیا لہٰذا ان کے پہنچتے ہی سمیر کو ہاتھوں

"جب تم میرے ساتھ کھانے پر اس کے گھر گئے تھے تب تم دونوں کا رویہ دیکھ کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے تم دونوں آپس میں کوئی تعلق ہی نہیں ہے مگر آج..." انہوں نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ خرم کو سر سے پیر تک دیکھا اور اور سیڑھیاں اتر گئیں۔

خرم کچھ دیر تو کھڑا مسکراتا رہا پھر اپنا کمرہ بند کر کے اس نے موبائل اٹھا لیا۔

موبائل آن کرنے پر ان گنت میسجز سامنے آگئے اس میں نمل کے بھی ایس ایم ایس موجود تھے مگر وہ فی الحال پڑھنے کی بجائے اسے سننا چاہتا تھا لہٰذا وہ اسے کال ملانے لگا۔ نمل نے بھی دوسری گھنٹی پوری ہونے سے پہلے ہی فون ریسیو کر لیا۔

"ہیلو خرم کہاں ہو تم میں کب سے تمہیں فون کر رہی ہوں۔" نمل کی آواز میں اتنی بے چینی تھی کہ کچھ لمحوں کے لیے خرم کچھ بول ہی نہیں سکا اور ان کچھ لمحوں میں ہی نمل نے جانے کیا کچھ سوچ لیا تب ہی جھنجلائے ہوئے انداز میں بولی۔

"ہیلو خرم تم کچھ بول کیوں نہیں رہے کیا تمہیں پولیس نے اریسٹ کر لیا ہے۔" خرم کی بے اختیار ہنسی نکل گئی۔

"مجھے پولیس کیوں اریسٹ کرے گی میں نے کیا کیا ہے؟"

"لیکن یونیورسٹی میں تو سب یہی کہہ رہے تھے کہ پولیس تمہیں ہی گرفتار کرے گی ہمارے ملک میں تو جو جان بچانے پہنچتا ہے سب سے پہلے اسی کو دھر لیا جاتا ہے۔" نمل بولتے ہوئے روہانسی ہو گئی تو خرم ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

اچانک اس کی ساری پریشانی خرم کو بخوبی سمجھ میں آ گئی تھی آج صبح ہی تو اس نے بتایا تھا حسام نامی ایک لڑکے کے بارے میں جسے پولیس نے بغیر کسی قصور کے حراست میں لے لیا تھا اور پھر تھرڈ ڈگری ٹارچر کر کے اسے ہمیشہ کے لیے معذور کر دیا جس کے بعد چند دن پہلے اس کی زندگی کا اختتام خودکشی پر ہوا تھا۔

نمل نے جب سے یہ سنا ہو گا کہ وہ سمیر کو اسپتال لے کر گیا ہے اور اب خود اسی کے خلاف پولیس کیس بن سکتا ہے اس کی جان سولی پر اٹکی ہوگی تمام ذرائع سے خرم کی خیریت معلوم کرنے میں جب وہ ناکام ہوگئی تب ہی اس نے سخت مجبوری کے عالم میں خرم کے گھر فون کیا ورنہ اس کے گھر والوں سے بات کرنا وہ بھی ان حالات میں جب ان سے رشتہ بظاہر ٹوٹ چکا ہو نمل کے لیے ہرگز آسان نہ ہو گا۔

"نہیں نمل وہ بے چارے اور ہوتے ہیں جو پولیس کے مظالم کا شکار ہو جاتے ہیں مجھ پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہے۔ میں سمیر کو اسپتال میں داخل کر کے سیدھا اپنے گھر آیا تھا اور تب سے اب تک موبائل آف کر کے سو رہا تھا مجھے ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ تمہیں فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دے دیتا اصل میں مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تمہیں اتنے وہم ستا رہے ہوں گے۔" خرم رسانیت سے اسے سمجھانے لگا۔

دوسری طرف نمل جو اتنے گھنٹوں سے ایک عذاب میں مبتلا تھی خرم کی خیریت سے ہونے کا سن کر ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"کیا ہو گیا ہے نمل میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھتا تھا تم اتنی بزدل نکلیں۔" خرم صرف اس کا دھیان بٹانے کے لیے اپنے لہجے کو شوخ بناتے ہوئے بولا ورنہ حقیقتاً تو اسے دکھ ہوا تھا کہ نمل اس کی وجہ سے اتنی پریشان رہی اور وہ مزے سے موبائل بند کیے سوتا رہا تب ہی نمل روتے ہوئے بولی۔

"میں بہادر نہیں ہوں خرم اور کچھ لوگوں کے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں۔ امی، سنبل، رومیسہ اور تمہارے لیے میرا دل بہت کمزور ہے۔ پہلے ہی حسام والے واقعہ کو لے کر میں اتنی ڈسٹرب تھی اور پھر اس پر تمہارا سمیر کو

بچانے کے لیے خود کو خطرے میں ڈالنا... اگر تھوڑی دیر اور تمہاری خیریت پتا نہ چلتی تو میں تو شاید مر ہی جاتی۔" وہ اتنی بے ساختگی سے بولی کہ خرم کتنی ہی دیر اس کی بات کے سحر میں گرفتار خاموش کھڑا رہا۔

دوسری طرف نمل کو بھی اتنی دیر اپنی گھٹن نکالنے کا موقع مل گیا مگر جب روتے ہوئے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں تب خرم کو بولنا پڑا۔

"بس کرو یار۔ تمہارے آنسو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں کہ میں سوتا رہا اور تم..."

"ہاں تو تمہیں شرمندہ ہونا بھی چاہیے ذرا شرم نہیں ہے تمہیں کہ کم از کم یونیورسٹی کے اور کسی شخص کو نہ سہی مجھے ایک فون ہی کر دیتے۔" نمل نے بگڑ کر اس کی بات کاٹ دی۔

"او کے سوری غلطی میری ہے آئی ایم سوری۔ اصل میں نادر اور ہارون میرے ساتھ تھے۔ سمیر کو اسپتال پہنچا کر ہم تینوں نے آپس میں طے کیا تھا کہ لوگوں کے سوالوں اور انکوائری سے بچنے کے لیے فی الحال کسی سے بات کریں گے نہ ملیں گے کچھ گھنٹوں میں سمیر کی حالت کا اندازہ ہو جائے گا پھر پولیس اور طلحہ وغیرہ کے گروپ سے سمیر اور اس کے گھر والے خود ہی نمٹ لیں گے۔ میں اتنا تھک گیا تھا کہ میں تب ہی سو گیا ورنہ تمہارا میسج دیکھ کر تم سے تو بات کر ہی لیتا لیکن خیر وہ جو کہتے ہیں نا کہ ہر کام اچھے کے لیے ہوتا ہے تو واقعی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ اگر اتنی دیر میں پتا نہ رہتا تو تمہارا یہ روپ کبھی سامنے نہ آتا بلکہ اگر مجھے اندازہ ہوتا کہ تم میرے لیے اتنا رو سکتی ہو تو یہ منظر دیکھنے کے لیے بہت پہلے ہی سمیر کو خود ہی گولی مار دیتا۔" اپنی بات پر خرم خود ہی زور سے ہنسا جبکہ نمل واقعی چڑ گئی۔

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے خرم۔ تم اتنی بری سچویشن کو انجوائے کر رہے ہو تمہیں پتا ہے تم کتنی بڑی مشکل میں پھنس سکتے تھے۔"

"ہاں پھنس سکتا تھا مگر تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ سمیر اب خطرے سے باہر ہے لہٰذا وہ بیان دے دے گا اور اب مجھ پر کوئی بات نہیں آ سکتی۔" خرم بولا تو نمل جرح کرنے والے انداز میں کہنے لگی۔

"ہاں مجھے پتا ہے سمیر کو ہوش آ گیا ہے۔ تم سے تو کانٹیکٹ ہو نہیں رہا تھا میں تب سے فیس بک آن کیے بیٹھی ہوں۔ حالانکہ یونیورسٹی کی یہ تھرڈ کلاس فیس بک میں نے کبھی سرچ نہیں کی۔ اتنے گھٹیا کمنٹس ہوتے ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ ان کے گھر میں گھس کر ان کی اتنی پٹائی کروں کہ دماغ ٹھیک ہو جائے سب کا۔" نمل کے چبا کر کہنے پر خرم ہنس پڑا اور اپنا کمپیوٹر آن کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"ایسا کیا لکھ دیا بے چاروں نے"

"اندازہ کرو ان لوگوں کو بے چارہ تو مت کہو ہم دونوں کو تو سب سے زیادہ اس فیس بک کو بھگتنا پڑا ہے ابھی بھی سمیر [illegible] ہوئی ہے معلوم نہیں وہ زندہ بچے گا یا نہیں۔ ایک انسان مر رہا ہے اور یہ بے حس لوگ اسے بھی لڑائی ایکشن اسٹوری کہہ رہے ہیں۔" نمل شدید غصے میں بول رہی تھی۔

خرم کا کمپیوٹر آن ہو چکا تھا اس کے سامنے بھی اس حادثے کو لے کر اتنے تبصرے تھے کہ سب کو پڑھنا ایک وقت طلب کام تھا۔

خرم سرسری سی نظر ڈالتا آگے بڑھتا گیا، لیکن سمیر اور اسے لگنے والی گولی کی بجائے اسٹوڈنٹس نے خرم کا اس کی جان بچانے کی کوشش پر زیادہ تعجب اور دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

نمل کا کہنا واقعی سچ تھا کچھ لوگوں نے تو انتہا کر دی تھی ان کا خیال تھا کہ نمل نے خرم سے منگنی سمیر کی خاطر توڑی تھی لہٰذا جب سمیر کی طلحہ وغیرہ سے لڑائی ہو رہی تھی تب خرم نے کہیں سے چھپ کر سمیر پر گولی چلائی اور پھر خود ہی اس کی جان بچانے آ گیا۔

اپنے یہ احساسات خود اس کے اپنے لیے حیران کن تھے اسے خود سے ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ وہ بھی کسی کے لیے اس طرح اور اس حد تک سوچ سکتی ہے۔
وہ محبت کو حماقت نہیں سمجھتی تھی لیکن اس کا یہ ضرور سوچنا تھا کہ شدید محبت انتہا پسند کرتے ہیں جو زندگی میں اعتدال نہیں رکھ سکتے۔
مگر یہ اس پر اور اک ہوا تھا کہ محبت وہی ہوتی ہے جو شدید ہو ورنہ بصورت دیگر وہ صرف ایک پسندیدگی ہوتی ہے جو وقتی ابال بھی ہو سکتا ہے۔
اس لیے اپنے احساسات سے آگاہی نے اسے ایک انوکھی طمانیت بخشی تھی کیونکہ اسے پہلی بار پتا چلا تھا کہ کسی کے آگے ہار کر بھی انسان اتنا خوش ہو سکتا ہے۔
اور یہ اس کی خوشی کی انتہا ہی تھی کہ وہ خرم کی تعریفیں پڑھ کر اتنی مگن ہو گئی تھی کہ خرم کے اچانک خاموش ہو جانے کو محسوس نہ کر سکی۔
اسے محسوس ہی نہیں ہوا کہ وہ خود ہی بولے جا رہی ہے اور دوسری طرف سوچوں میں غرق خرم اسے سن ہی نہیں رہا۔
تبھی خرم کے موبائل کی دوسری لائن پر گھنٹی بجنے لگی تو خرم موبائل کان سے ہٹانے پر مجبور ہو گیا اسکرین پر ہارون کا نام دیکھ کر خرم کا اس سے بات کرنے کا ارادہ تو نہیں تھا مگر فی الوقت وہ نمل کی بات سن نہیں پا رہا تھا سو نمل کو فون بند کرنے کے لیے کہنے لگا۔
"نمل، ہارون کا فون آ رہا ہے میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔"
"چلو ٹھیک ہے۔ آگے کے تبصرے ضرور پڑھ لینا جب سمیر کی جان بچ جانے کی اطلاع ملی ہے تب لوگوں نے باقاعدہ افسوس کا اظہار کیا ہے کہ اب بے چاری نمل کنفیوژ رہے گی کہ خرم اور سمیر میں سے کس کا انتخاب کرے سمیر اگر مر جاتا تو نمل کے لیے فیصلہ آسان ہو جاتا۔" جب یہ تبصرہ نمل نے پڑھا تھا تو اس کا خون کھول اٹھا تھا لیکن اب خرم کو بتاتے ہوئے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔
خرم نے اس کی بات پر کوئی بھی تبصرہ کیے بغیر فون بند کر دیا اس کی نظریں بدستور اسکرین پر تھیں اس نے ہارون کا فون اٹینڈ کیے بغیر موبائل سوئچ آف کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کا ذہن اس وقت جو سوچ رہا تھا اسے مکمل یکسوئی کی ضرورت تھی وہ ذرا سی بھی مداخلت نہیں چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

آج زوبیہ کو غائب ہوئے تیسرا دن تھا اور آج تیسرے دن بھی بلال اختر آفس نہیں گئے تھے حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی پریشانی کی وجہ سے کام چھوڑ کر گھر میں بیٹھ گئے ہوں۔
مگر پہلی بار انہیں سارا بزنس، ساری ڈیلز، ساری میٹنگز اور سارا پروفٹ سب بے کار کی باتیں اور بے جا بھاگ دوڑ لگ رہی تھیں۔
ایسا لگ رہا تھا جیسے زندگی بھر جو کچھ بھی کیا ہو سب بے مصرف رہا ہو ان کا کام سے کیا دل اچاٹ ہوا تھا لگ رہا تھا زندگی میں کچھ بچا ہی نہیں ہے کیونکہ کام کے علاوہ ان کی زندگی میں کچھ تھا ہی نہیں۔
ٹھیک یہی حال عائشہ اختر کا تھا اپنی پارٹیز، اپنی شاپنگ اور پارلر کے ریگولر وزٹ ہی ان کی زندگی کا محور تھے یہ سب چیزیں چھوڑ تو انہوں نے تب ہی دی تھیں جب زوبیہ پاگل خانے میں بھرتی ہوئی تھی۔
مگر تب انہیں لگتا تھا یہ ایک وقتی پریشانی ہے جس سے وہ جلدی نکل آئیں گی مگر اب ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے

زندگی ہمیشہ کے لیے رک گئی ہو اور اس سے آگے کبھی نہیں بڑھے گی۔
زوبیہ کو لاپتا ہوئے تیسرا دن ہو گیا تھا وہ عجیب طرح کے نفسیاتی دباؤ کے تحت بلال اختر کے پاس بھی بیٹھنا نہیں چاہتی تھیں مگر بلال اختر خود ہی زبردستی انہیں کمرے سے کھینچ کر لاؤنج میں لے آئے تھے کہ وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر ناشتے کے طور پر کم از کم ایک سلائس ہی کھا لیں حالانکہ اب تو کچھ دیر میں کھانے کا وقت ہونے والا تھا۔
مگر ان دونوں کی ہی بھوک بالکل ختم ہو گئی تھی صبح کا ناشتہ تک تو ان دونوں نے کیا نہیں تھا تو دوپہر میں کھانا بھلا کون کھاتا ہے۔
بلال اختر کے اصرار پر وہ کمرے سے باہر آ کر بیٹھ تو گئیں مگر چائے کا ایک سپ تک نہیں لیا۔
"خود کو سنبھالو عائشہ اگر تمہاری صحت گر گئی تو زوبیہ کے ملنے کے بعد تم اس کا خیال کیسے رکھو گی۔" بلال اختر نے رسانیت سے کہا تو عائشہ اختر خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔
"اسے بھی ہمارے بارے میں سب پتا ہے۔" عائشہ اختر کھوئے کھوئے انداز میں بولیں۔
"کسے؟ کیا پتا ہے؟" بلال اختر کی سمجھ میں خاک نہیں آیا۔
"خرم، فرقان حسن کا بیٹا۔ جنہیں ہم نے اپنا وہ گھر بیچا تھا جو گھر تو کبھی تھا ہی نہیں بس ایک بددعا تھی۔" عائشہ اختر کسی ٹرانس کے عالم میں بول رہی تھیں۔
"اسے کیا پتا ہے؟" بلال اختر حیرانی سے بولے۔
"یہی کہ میں نے اپنی ماں کے ساتھ کیا کیا تھا۔"
"اسے کیسے پتا؟ اور تمہیں کیسے پتا کہ وہ سب جانتا ہے؟" بلال اختر چونکے۔
"میں کل ان کے گھر گئی تھی۔"
"کیا؟ کب؟"
"کل رات کو اچانک خیال آیا۔ زوبیہ گھر کے پیچھے بنے سرونٹ کوارٹر میں جا کر بیٹھ جاتی تھی کہیں ایسا تو نہیں کہ پاگل خانے سے بھاگ کر آنے کے بعد وہ اس گھر میں سرونٹ کوارٹر میں جا چھپی ہو جہاں ہم آدھی رات کو اپنے والدین سے چھپ کر ملتے تھے۔"
بس یہ خیال آتے ہی میں نکل گئی۔ مگر وہاں جا کر یہ بتانے کی ہمت نہیں ہوئی کہ زوبیہ کو سرونٹ کوارٹر میں تلاش کرنے آئی ہوں۔
وہ تو یہی سوچتے کہ زوبیہ کے ساتھ ساتھ اس کی ماں کی دماغی حالت بھی خراب ہو گئی ہے لہٰذا صرف خرم سے بات کر کے آ گئی کہ شاید اسے کچھ علم ہو زوبیہ کے متعلق۔
لیکن وہاں جا کر پتا چلا اسے زوبیہ کے بھاگ جانے کی کوئی خبر نہیں لیکن اسے ہمارے بارے میں سب پتا ہے بالکل چلتے وقت مجھے پتا چلا تھا ورنہ میں اس کی آنکھیں پڑھنے کی کوشش کرتی کہ وہ میرے متعلق کیا سوچ رہا ہے۔
مجھے گھٹیا سمجھ رہا ہے۔ یا ایک زبردست اداکارہ جو ماں کو بے وقوف بنا لے وہ معصوم لڑکی تو نہیں ہو سکتی۔"
عائشہ اختر خود کلامی کے انداز میں بول رہی تھیں۔
"وہ ایسا کچھ نہیں سوچ رہا ہو گا لیکن اسے پتا کیسے چلا؟" بلال اختر کچھ چڑ کر بولے۔
"جب اللہ تعالیٰ کو ذلیل کرنا ہوتا ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح راز فاش کر ہی دیتا ہے۔ جب زوبیہ کو ہی سب پتا چل گیا تو خرم تو غیر ہے وہ کچھ بھی جان لے کیا فرق پڑتا ہے۔
پتا نہیں زوبیہ نے میرے متعلق کیا سوچا ہو گا جب اسے خبر ہوئی ہو گی کہ اس کی ماں اتنی بڑی ڈرامے باز اپنی ماں

ہو چکے تھے لہٰذا انہوں نے بغیر کسی تردّد کے اسے اندر بلا لیا۔
کالی چادر اچھی طرح اوڑھے وہ لڑکی جوان کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی تھی وہ انہیں ایک ہی نظر میں کہیں دیکھی ہوئی لگی تھی مگر انہیں دماغ پر زیادہ زور دینے کی ضرورت تھی نہ عادت چنانچہ وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے مخصوص (صرف دنیا والوں کے لیے) نرم لہجے میں پوچھنے لگے۔
"ہاں بیٹی بولو کیا بات ہے؟" ان کے حلاوت سے پوچھنے پر وہ خاموشی سے ان کی شکل دیکھتی رہی۔
"کیا پریشانی ہے کھل کر بولو بالکل جھجکنے اور شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔
میرے خیال سے تم رات میں بھی آفس آئی تھیں اس وقت میں یہاں تھا نہیں اور صبح سے بھی تم یہیں بیٹھی ہو۔
مجھے بتایا تھا اسسٹنٹ نے۔ مگر میں مصروف تھا اس لیے اندر نہیں بلا سکا۔" وہ اس کی جھجک ختم کرنے کے لیے تفصیل سے کہنے لگے۔
وہ واقعی مصروف تھے اکاؤنٹ جو کہ ان کا پسندیدہ شعبہ تھا وہ اسے کھنگال رہے تھے لہٰذا کسی ضرورت مند سے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
"مجھے پتا ہے آپ بہت مصروف ہوتے ہیں جب میں پہلی دفعہ آپ سے ملنے آئی تھی کاش میں اس وقت آپ کی مصروفیت دیکھ کر آپ کے گھر جانے کی بجائے مایوس ہو کر اپنے ہی گھر لوٹ جاتی تو آج مجھے آپ کے پاس آنا نہیں پڑتا۔" عظمت خلیل اس کی بات پر کچھ چونک سے گئے۔
"میرے گھر"
انہوں نے پرسوچ انداز میں دہرایا۔
"اتنی پرانی بات تو نہیں ہے کہ آپ مجھے پہچانتے ہی نہیں۔ میں شمائلہ ہوں۔ حسام کی بہن" وہ بالکل سپاٹ لہجے میں بول رہی تھی۔
عظمت خلیل کو ایک دم سب یاد آ گیا ابھی دو دن سے نیوز میں دوبارہ حسام کا ذکر آیا تھا لہٰذا پورا واقعہ ان کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ بلکہ وہ ایکدم کرسی پر سیدھا ہوتے ہوئے بڑے درد بھرے لہجے میں کہنے لگے۔
"ارے بیٹا میں۔ میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے تمہیں نہیں پہچانا۔ اصل میں روز اتنے لوگوں سے ملتا ہوں کہ سب کے چہرے یاد نہیں رکھ سکتا۔ ہاں البتہ حسام کا چہرہ مجھے واقعی یاد ہے اس نوجوان کی تصویر تو جیسے آنکھوں کے سامنے چھپ گئی ہے۔
بہت شدید افسوس ہوا ہے مجھے اس کے خودکشی کرنے کے بارے میں سن کر۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس جیسے بہادر لڑکے نے یہ قدم کیسے اٹھا لیا۔ تمہاری والدہ اب کیسی ہیں میں نے سنا ہے ان کی حالت بھی کافی سیریس ہے۔" انہوں نے ایک کے بعد ایک کئی باتیں کر دیں مگر شمائلہ بدستور سپاٹ چہرہ لیے ان کے سامنے بیٹھی رہی۔
حسام کی موت کو ابھی اتنا وقت نہیں ہوا تھا کہ وہ افسوس کرنے والے کو اتنے سکون سے دیکھ سکتی بلکہ جوان بھائی کی موت پر تو صبر آنے میں بھی ٹائم لگتا ہے کافی عرصے بعد اگر کوئی شخص تعریف کرے تو گھر والوں کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے اس کا اتنا سنجیدہ اور بالکل بے تاثر چہرہ عظمت خلیل کو الجھن میں مبتلا کرنے لگا۔
"بیٹا تمہیں کوئی بات کرنی ہے تو جلدی بتا دو مجھے آگے بھی لوگوں سے ملنا ہے۔" عظمت خلیل نے اس بار لہجہ ہلکا سا سرد بنا لیا تو وہ بھی ان کی طرح سرد سے لہجے میں کہنے لگی۔
"ہوں آپ کو تو بہت لوگوں سے ملنا ہوتا ہے تاکہ آپ کی شہرت میں بھی اسی شرح سے اضافہ ہو۔ جتنے زیادہ ضرورت مند۔ اتنی زیادہ شہرت۔ اتنا زیادہ نام۔ اتنی زیادہ ہی واہ واہ۔"

لیکن کیا آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ آپ کو دعائیں دینے کے ساتھ ساتھ آپ کو بددعائیں دینے والوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے اور مظلوم کی بددعا تو عرش ہلا دیتی ہے اس سے بہت ڈرنا چاہیے کیونکہ ساری دعائیں ایک طرف اور ایک مظلوم کی بددعا ایک طرف۔ عظمت خلیل کو اس کا لیکچر سخت ناگوار گزرا۔ تبھی نخوت سے کہنے لگے۔
"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ لیکن مجھے کوئی مظلوم بددعائیں دیتا کیونکہ میں ظالم نہیں ہوں جو کسی پر ظلم کرتا ہے اس کے خلاف بددعا پر عرش ہلتا ہے دوسروں کی خدمت میں سرگرداں اللہ کے بندوں کے لیے تو کائنات کی ہر چیز دعاگو ہوتی ہے۔"
شمائلہ کے چہرے کے تاثرات واضح طور پر تبدیل ہو گئے۔ وہ اپنے ہونٹ اور آنکھیں سکیڑ کر عظمت خلیل کو دیکھنے لگی جیسے ان کے منہ سے یہ جملہ سننا اس سے برداشت نہ ہوا ہو اسی لیے جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں دہکتے کوئلے جیسی تپش تھی۔
"انسپکٹر قادر کو آپ نے جاب سے برطرف کرا دیا تھا وہ دوسرے ملک جا کر سیٹل ہو گیا ہے جس نے میرے بھائی کی زندگی تباہ کی تھی وہ عیش سے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہ رہا ہے۔
لیکن اب جا کر مجھے پتا چلا ہے کہ وہ شخص تو صرف ایک مہرہ تھا اس ساری بازی کے پیچھے شاطر دماغ تو کسی اور کا تھا۔
اصل مجرم انسپکٹر قادر نہیں بلکہ وہ شخص ہے جس نے کانسٹیبل کو خریدا اور ان کے ذریعے انسپکٹر قادر کو اتنا اکسایا کہ اس نے وحشیوں کی طرح میرے بھائی پر تشدد کیا اور اسے زندگی بھر کے لیے بستر پر ڈال دیا کہ وہ اپنی مرضی سے پانی کا ایک گلاس تک اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔
میں نے سنا ہے آپ کی بیوی ٹانگوں سے معذور ہے آپ نے اپنے گھر میں ایک ایسے انسان کو دیکھا ہے جو معمولی سی چیزوں کے لیے دوسروں کا محتاج ہے وہ کام جو ہمارے لیے ایک عام بات ہے ان کے لیے ایک حسرت اور ایک خواہش ناتمام ہے۔
اتنی بے بسی اور بے کسی آپ صبح شام اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں پھر بھی آپ کے دل میں خوف خدا پیدا نہیں ہوا۔ آپ کو یہ خیال نہیں آیا کہ جس تکلیف میں اس نے اس انسان کو مبتلا کیا ہے وہی محتاجی وہ آپ کو بھی دے سکتا ہے۔
آپ نے صرف اپنے کیس کو اسٹرونگ بنانے کے لیے ایک بے قصور نوجوان کو جس بے جا میں پڑے رہنے دیا بلکہ اسی تھانے کے ایک حوالدار کے ذریعے انسپکٹر قادر سے اس پر اتنا ٹارچر کرایا کہ وہ جو ایک بیوہ ماں کا واحد سہارا تھا معذور ہو کر رہ گیا۔
صرف اس لیے کہ ایسا کر کے آپ اس انسپکٹر کی وردی اتروانا چاہتے تھے نقصان تو صرف اور صرف میرے بھائی کا ہوا وہ انسپکٹر تو بدنامی سے منہ چھپ کر ملک سے بھاگ گیا اور باہر جا کر کہیں نہ کہیں جاب پر بھی لگ گیا۔
مگر میرا بھائی اور میرا گھر تو زندہ درگور ہو گیا میرے بھائی نے آخر تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ میری ماں کی حالت بھی اتنی نازک ہے کہ اس کے بچنے کے امکان بھی بہت کم ہیں اور پھر صرف جسم کے زندہ رہ جانے کا کیا فائدہ ہے جب روح ہی مر چکی ہو۔ میرا تو پورا گھر تباہ ہو گیا۔ ہم نے آپ کا کیا بگاڑا تھا ہم نے تو کبھی کسی کو تکلیف نہیں دی تھی۔"
شمائلہ نے بات تو بڑے غصے میں شروع کی تھی مگر بولتے بولتے وہ بالکل ہی روہانسی ہو گئی۔
عظمت خلیل ہکا بکا بیٹھے اسے سن رہے تھے کئی بار انہوں نے اس کی بات کاٹنے کی کوشش کی مگر وہ اتنے تسلسل سے بول رہی تھی کہ وہ کچھ کہہ ہی نہ پائے آخر جب وہ تھک کر ہانپنے لگی تب انہوں نے کہنا شروع کیا۔

میرے پاس کچھ بچا ہی نہیں جسے بچانے کے لیے میں ڈروں مجھے تو صرف اپنے بھائی کے مجرم کو اس کے انجام تک پہنچانا ہے۔ جس نے نہ جانے میرے بھائی جیسے اور کتنے بے گناہوں کو تکلیف پہنچائی ہوگی۔

اس کے اس صاف ستھرے چہرے کے پیچھے جو مکروہ انسان ہے مجھے صرف اسے منظر پر لانا ہے بعد میں میرے ساتھ جو بھی ہو مجھے کوئی پروا نہیں۔" شمائلہ غصے کی شدت سے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اس کا تنفس بڑھتا جا رہا تھا۔

عظمت خلیل کو کسی کی اتنی باتیں سننے کی عادت نہیں تھی وہ ساری مروت بالائے طاق رکھتے ہوئے انٹرکام کی طرف بڑھ گئے۔ اس وقت اس لڑکی سے بات کرنا خود اپنی بے عزتی کرانا تھا اس کی حالت ایسی تھی کہ اسے آسانی سے شیشے میں نہیں اتارا جا سکتا تھا لہٰذا بہتر یہی تھا کہ اسے اپنے آفس سے نکال باہر کیا جائے چنانچہ ریسیور اٹھاتے ہوئے انہوں نے نہایت شان بے نیازی سے کہا۔

"تم مجھے منظر پر کیا لاؤ گی یہ کام تو وہ انسپکٹر قادر اور کانسٹیبل تک نہیں کر سکے جو پولیس میں تھے اور مرد تھے جبکہ تم میرے ادارے سے لیے پیسوں سے اپنے بھائی کا علاج کرانے والی ایک کمزور اور معمولی لڑکی ہو۔ انسان اتنی بڑی بڑی باتیں کرنے سے پہلے اپنی اوقات بھی دیکھ لے تو شرمندہ ہونے سے بچ سکتا ہے۔"

"ٹھیک کہا تم نے عظمت خلیل۔ بڑی بڑی باتیں کرنے سے پہلے انسان اپنی اوقات دیکھ لے تو شرمندہ ہونے سے بچ سکتا ہے اگر وہ دو پولیس والے مرد ہو کر بھی کچھ نہیں کر سکے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارے خلاف کوئی بھی کچھ نہیں کر سکے گا۔

اللہ تعالیٰ کی لاٹھی کو ایسے ہی بے آواز نہیں کہتے اسے جب سزا دینی ہو تو وہ ایک کمزور لڑکی سے بھی بہت کچھ کرا سکتا ہے فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا تو اسے مچھر جیسی معمولی مخلوق کے ہاتھوں اسی لیے اس کے انجام تک پہنچایا تھا کہ کوئی بھی شخص غرور کرنے سے پہلے اپنی اوقات دیکھ لے۔" شمائلہ بڑے اعتماد سے بول رہی تھی۔

عظمت خلیل ریسیور ہاتھ میں پکڑے کچھ مشکوک نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ اس کے جارحانہ انداز بتا رہے تھے جیسے وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی ہو۔

مگر اس کے ارادے کیا تھے؟

عظمت خلیل جیسے اس کے چہرے سے کچھ اخذ کرنے کے لیے ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگے اور اگلے پل واقعی ان کے ہوش اڑا لے گیا تھا۔

شمائلہ جو بڑی سی کالی چادر اوڑھے آئی تھی اس نے چادر کا ایک حصہ ہٹاتے ہوئے اپنا بایاں ہاتھ جو اس نے اب تک چادر کے نیچے چھپا رکھا تھا اسے باہر نکال لیا۔

اس ہاتھ میں ایک شیشی تھی جس میں پیلے رنگ کا محلول موجود تھا اس محلول کے اوپر تیرتے جھاگ نے ایک پل میں عظمت خلیل پر انکشاف کر دیا تھا کہ یہ کوئی عام محلول نہیں ہے بلکہ سیسے کی قسم کا کوئی تیزاب ہے۔ شمائلہ یہاں تک ایک تیزاب کی شیشی لے کر آنا صاف ظاہر کر رہا تھا کہ اس کا اب اگلا قدم کیا ہوگا۔

عظمت خلیل بری طرح ہراساں ہو کر کچھ کہنے ہی والے تھے مگر قدرت نے انہیں اب تک بہت مہلت دی تھی بس ایک ہی لمحے میں وہ مہلت ختم کرتے ہوئے گناہ کی رسی کو ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔

صرف چند سیکنڈ لگے تھے شمائلہ کو شیشی کھول کر تیزاب کو عظمت خلیل کے چہرے پر پھینکنے میں اور کمرے کا منظر ہی بدل گیا۔

عظمت خلیل کی فلک شگاف چیخوں نے در و دیوار ہلا دیے تھے انہیں لگ رہا تھا ان کے چہرے سے آگ نکل رہی ہے اور ان کا پورا وجود جھلستا جا رہا ہے۔

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

سنہری آنکھوں میں ذہانت کی چمک لیے۔ وہ باوقار انداز میں اپنے گارڈز کے ہمراہ چلتی طویل راہداری کو عبور کرتے ہوئے اپنے آفس میں پہنچی جہاں کئی ضروری امور اس کی توجہ کے منتظر تھے۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ وقت کی پابند نہ تھی یا دیگر سرکاری افسروں کی طرح عیش پسند تھی۔ اس کی رہائش گاہ آفس سے کافی دور تھی اور کل رات ہونے والی مسلسل بارش سے اس پسماندہ گوٹھ کی کچی سڑکیں نہایت ابتر حالت اختیار کر چکی تھیں۔ ڈرائیور کو بہت احتیاط سے گاڑی چلانا پڑی۔ نتیجتاً وہ اپنی جاب کے پہلے ہی دن ٹائم سے کافی لیٹ ہو چکی تھی۔ لہٰذا مزید ٹائم ضائع کیے بغیر اس نے اپنی نشست سنبھالی اور کام شروع کر دیا۔

☆ ☆ ☆

"لگتا ہے آج بھی بارش خوب برسے گی۔" اس نے اپنی سرکاری رہائش گاہ کے آرام دہ کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ موسم ابر آلود تھا اور بارش کے سو فیصد امکانات نظر آرہے تھے۔

بارش کے خیال سے ہی اس کے ذہن میں اس گوٹھ کی کچی سڑکوں کی ابتر حالت کا تصور آن ٹھہرا۔

"پتا نہیں اس گوٹھ کے ایم پی اے اور ایم این اے اپنے سارے فنڈز کدھر لگا دیتے ہیں؟" اس نے افسردگی سے سوچا۔

تب ہی سیل فون کی گنگناہٹ نے اس کے خیالات میں دخل اندازی کرتے ہوئے اس کی سوچوں کے تسلسل کو توڑا اور وہ سر جھٹک کر فون کی جانب متوجہ ہوئی۔

اسکرین پہ نظر آتا نمبر دیکھ کر لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"السلام علیکم دادو جان۔"

"وعلیکم السلام' کیسی ہے دادو کی کمشنر بیٹی؟ بھئی سرکاری کرسی ملتے ہی بوڑھے دادا اور دادی کا خیال تک نہ آیا۔ کیا بھول بیٹھی ہو ہمیں؟" ان کی خفگی بھری ٹیلی فونک میٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ وہ زیر لب مسکرا دی۔

"آپ کو کہاں بھول سکتی ہوں دادو! آپ کے اور دادا کے علاوہ میرا ہے ہی کون؟ بس یہاں کا نیا ماحول اور جگہ تو ایڈجسٹ ہونے میں ٹائم لگے گا نا۔"

"تو کیا ضرورت تھی اس دو ٹکے کی نوکری کے سبب اتنی دور جانے کی؟ غضب خدا کا کل کی بچی اور وہ بھی انجان علاقہ' پتا نہیں کس قسم کے لوگ ہیں اور یہ وڈیرے تو ہوتے بھی بڑے ظالم ہیں بیٹا۔"

"ایں۔ دو ٹکے کی؟" روا کی سوئی وہیں اٹک گئی۔ دادی بڑے سکون سے اپنی ناپسندیدہ چیز کو "دو ٹکے" کر دیتی تھیں' چاہے وہ کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو۔

"خدا کا خوف کریں دادو' قسمت والوں کو ملتی ہے یہ نوکری اور پھر تبدیلی کی ضرورت تو ان ہی پسماندہ علاقوں میں ہے نا' اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس گوٹھ کے حالات بدلنے کا وسیلہ بنایا ہے تو میں ناشکری کیوں کروں دادو؟"

"جانتی ہوں بیٹا' اچھی طرح جانتی ہوں کہ تمہیں اپنے "چمن" سے کتنا پیار ہے اور کیوں نہ ہو' یہ محبت تو تمہارے خون میں ہی ہے۔" دادو کا لہجہ فخریہ تھا۔

"بس آپ دعا کریں دادو کہ میں اپنے فرض کو اچھی طرح نبھا سکوں۔" اس کی آنکھوں میں امید کے جگنو جگمگا اٹھے۔

☆ ☆ ☆

"آپ نے بلایا تھا بابا سائیں؟" ضیغم سکندر نے مودب انداز میں میر ہاشم سکندر علی کو دیکھا۔

"ہاں سائیں' بیٹھو' کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" ان کے لہجے میں مخصوص جاگیردارانہ رعب تھا۔

وہ سامنے رکھے سنگل صوفے پہ بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"بات یہ ہے سائیں' تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم ہمارے اکلوتے وارث ہو' ہم چاہتے ہیں کہ اب تم بھی ہمارے ساتھ سیاسی معاملات میں حصہ لیا کرو۔ جاگیر کی دیکھ بھال میں دلچسپی لو سائیں۔" ضیغم کو ان کا بار بار "سائیں" کہنا اور مخصوص لہجہ خاصا دلچسپ لگتا تھا۔

"جی بابا سائیں' حکم کریں۔" ان کو جواب کے لیے منتظر دیکھ کر اس نے سعادت مندی دکھائی۔

"کل ہی مجھے خبر ملی ہے کہ ہمارے علاقے میں نیا کمشنر تعینات ہوا ہے اور وہ نیا کمشنر کوئی مرد نہیں' بلکہ عورت ہے۔" ان کے لہجے میں نخوت سمٹ آئی۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم اس سے ملو اور اس کو اس علاقے میں رہنے اور کام کرنے کے "دستور" سے آگاہ کرو۔ باقی کی بات تم خود بھی سمجھتے ہو۔"

"جی بہتر۔" اس نے سر ہلایا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ "جسے آپ "دستور" کہتے ہیں وہ دراصل جنگل کا قانون ہے۔" اس نے تلخی سے سوچا۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے آفس میں بیٹھی روزمرہ کے معمولات نپٹا رہی تھی جب پیون نے اسے میر ضیغم سکندر علی کی آمد کی اطلاع دی۔ اس کی اجازت پاتے ہی وہ باہر نکل گیا اور چند لمحوں بعد ضیغم سکندر علی اندر داخل ہوا۔

اس نے فائل ایک طرف رکھتے ہوئے اس کی سمت نگاہ کی' چمکتی شفاف آنکھوں والا اونچے لمبے قد کا خوش شکل نوجوان اپنے حلیے سے کہیں سے بھی وڈیرہ نہیں لگتا تھا۔

"السلام علیکم۔" مہذب انداز میں سلام کرتے ہوئے وہ اس کے سامنے رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

"وعلیکم السلام۔" وہ مسلسل اسے کھوجتی نظروں سے دیکھ رہی تھی بہرحال زندگی میں پہلی بار کسی "وڈیرے" سے ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا تھا۔

"لیکن اس میں تو وڈیروں والی کوئی بات نظر نہیں آرہی۔" اس نے دادو کی بیان کی گئی خصوصیات کو یاد کیا۔ جن میں سے کوئی بھی اسے مقابل بیٹھے رئیس زادے میں نظر نہ آئی۔

"جی فرمائیے' کیا خدمت کر سکتی ہوں آپ کی؟" وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تو ضیغم نے اس کے مراقبے سے نکل آنے پہ شکر ادا کیا۔

"مجھے بابا سائیں نے آپ سے ملنے کا حکم دیا تھا۔ ہم چاہتے ہیں کہ گزشتہ تمام سرکاری افسروں کی طرح آپ بھی ہمارے سسٹم اور "اصول و قوانین" کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ جس میں نہ صرف ہماری بلکہ آپ کی بھی بھلائی ہوگی۔"

"کون سے اصول و قوانین؟ جہاں تک بات پاکستان کے آئین اور انٹرنیشنل لاء کی ہے تو ان سے میں بخوبی واقف ہوں' آپ کے ہاں کوئی اور "دستور" رائج ہے کیا؟"

ضیغم سکندر علی کو اس کی پراعتماد' نڈر آنکھیں حواس پہ چھاتی محسوس ہونے لگیں۔ کافی دیر بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہوا۔

"میں زیادہ لمبی بات کرنے کا قائل نہیں' آپ کو اتنا سمجھنا ہوگا کہ اگر ہم مل کر کام کریں گے تو آپ بھی خوش اور ہم بھی جبکہ آپ کا عدم اعتماد بلکہ "عدم تعاون" حالات کو کشیدہ کر سکتا ہے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں مسٹر ضیغم سکندر علی۔ تاہم ایک بات واضح کرتی چلوں کہ فیوڈل سسٹم کے عیب چھپانے میں مجھ سے کسی قسم کے تعاون کی امید مت رکھیے گا۔" اس کا انداز دو ٹوک تھا۔

"اب کہنے کو کچھ نہیں بچا۔" ضیغم نے سوچا۔ بہرحال اتنا تو وہ پہلے ہی جانتا تھا کہ وہ ایک ہارا ہوا کیس جیتنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنے بڑوں کے ظالمانہ سفاک فیصلوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ اسی لیے اس نئی کمشنر "روا نیفان" کو سمجھانے کی ایک آخری کوشش ضروری تھی۔

"تم جانتی ہو' تمہارا یہ فیصلہ تمہارے لیے کتنی مشکلات کھڑی کر دے گا۔" براہ راست "آپ" سے "تم" تک آتے ہوئے اس نے اسے حالات کی سنگینی کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

"میں کسی انجام سے نہیں ڈرتی۔" اس کے اعتماد

میں ذرا برابر فرق نہ آیا۔ میر ضیغم سکندر علی پر تاسف نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

کافی دیر تک بستر پہ کروٹیں بدلنے کے باوجود اسے نیند نہ آئی تو وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلی آئی۔ باہر دیکھتے ہوئے اس نے میر ضیغم سکندر علی سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں سوچا تو اس کا فکر مندی چھلکاتا لہجہ فوراً دھیان پر قابض ہو گیا۔ روایتی انداز میں دھمکانے کے بجائے خلوص دل سے اسے حالات کی سنگینی کا احساس دلانے والا میر ضیغم سکندر علی کتنی ہی دیر تک اس کے ذہن پہ چھایا رہا۔

وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہاں "باغیوں" کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے۔ اسی لیے ذہنی طور پر ہر طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھی۔ کچھ دیر مزید سوچوں میں الجھے رہنے کے بعد وہ سر جھٹک کر وضو کرنے چل دی کیونکہ وہ کبھی بھی اس ناسور کا حصہ نہیں بن سکتی تھی جس نے اس کے "چمن" کی جڑیں کھوکھلی کر ڈالی ہیں۔

☼ ☼

اس دن ضیغم سکندر علی اس کے آفس سے تو اٹھ آیا مگر ذہن مسلسل اسی معاملے میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ جدی پشتی ایک جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی رگوں میں ایک وڈیرے کا خون دوڑ رہا تھا۔ ایک روایتی اور سفاک وڈیرے کا خون۔

وہ جانتا تھا کہ اس کے بابا سائیں اپنے مفاد کے لیے اولاد کو بھی نہیں بخشیں گے۔ پھر بھی... پھر بھی اس کا دل کیوں اس نئی سرکاری آفیسر کی حمایت کر رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔

لیکن بابا سائیں سے بغاوت کی جرأت اس میں نہ تھی۔

"بہتر ہے جو جیسا ہے ویسے ہی رہنے دیا جائے۔" اس نے مایوسی سے سوچا۔

صبح وہ ناشتے کی میز پر آیا تھا تو بابا سائیں وہاں پہلے ہی موجود تھے۔ انہیں سلام کرتے ہوئے اس نے ان کے ساتھ والی کرسی سنبھالی۔ ابھی سیدھا ہو کے بیٹھا بھی نہ تھا کہ بابا سائیں کی آواز سنائی دی۔

"ہاں سائیں! ایک ذمہ داری سونپی تھی تمہیں؟" جس سوال سے بچنے کی کوشش تھی وہ سامنے آ چکا تھا۔

"جی بابا سائیں! میں مل چکا ہوں اس کمشنر سے۔"

"بابا! سمجھا دیا ہے نا اس کو سب کچھ؟" ان کا لہجہ رعونت لیے ہوئے تھا۔

"جی! سمجھا دیا ہے۔" اس نے صفائی سے جھوٹ بولا، جبکہ بابا سائیں مطمئن ہو کر ناشتا کرنے میں مصروف ہو گئے۔

اگلے دن وہ پھر ردا کے آفس میں موجود تھا۔ اسے دیکھ کر ردا گہری سانس بھر کے رہ گئی۔ وہ اندازا کر سکتی تھی کہ وہ دوبارہ اسے آمادہ کرنے آیا ہو گا۔

"جی فرمائیے۔"

"ایک درخواست کرنی تھی آپ سے۔" لہجہ عاجزی سے کہا گیا جبکہ لبوں پہ ہلکا سا تبسم رکا ہوا تھا۔

"کیسی درخواست؟" وہ سنجیدہ تھی۔

"آپ کو ہمارے سسٹم سے اختلاف ہے، ہم سے تو نہیں نا؟ تو پھر دوستی تو ہم میں ہو ہی سکتی ہے۔" اس کے لبوں پہ واضح مسکراہٹ تھی۔ ردا حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بڑی خاموشی سے اس کے تاثرات سے محظوظ ہو تا رہا۔

"تم باقی وڈیروں کی طرح نہیں لگتے؟ ڈراما کر رہے ہو یا سچ کچھ مختلف ہو؟" وہ کھل کر ہنس دیا۔

"بھئی وڈیرے بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں نا! اگر میں "وڈیرا" نہیں لگتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" اس نے شکل پر مسکینی طاری کرنے کی کوشش کی۔ ردا ہنوز خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

"دراصل میں بچپن سے لے کر اپنی ایجوکیشن مکمل ہونے تک یو کے میں اپنے ماموں کے پاس رہا لہٰذا بندہ آپ کے ذہن میں موجود "وڈیرے کی خصوصیت" پہ پورا نہیں اتر سکتا۔" اس کی آواز میں ہلکی سی شرارت تھی جبکہ لہجہ سنجیدہ تھا۔

"اگر تم منفرد ہونے کا دعوا کرتے ہو تو اس گوٹھ کے غربت میں پستے لوگوں کے لیے کچھ کرو۔

کیوں نہیں؟ یا پھر تمہیں بھی یہ خوش فہمی لاحق ہے کہ اس گوٹھ کی ہر زمین، جائیداد سے لے کر ہر جیتے جاگتے انسان تک سب کچھ تمہاری ملکیت میں آتا ہے؟" نہایت چبھتے لہجے میں اس نے پوچھا تو کچھ دیر تک میر ضیغم سکندر علی کچھ بول نہ سکا۔ خاصی دیر بعد اسے اس کی آواز سنائی دی۔

"میں ڈرتا ہوں بابا سائیں سے، ان سے بغاوت نہیں کر سکتا۔" دھیمے لہجے میں اس نے سچ بول دیا۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ منافقت سے پاک لہجے میں نہایت سچائی سے اپنی بزدلی کا اعتراف کرنے والا یہ "وڈیرا" اسے دل کے قریب محسوس ہوا۔

اسے اس علاقے میں آئے ہوئے تین ماہ گزر گئے۔ جہاں اس نے اپنی "اوپر" بھیجی گئی رپورٹس میں میر ہاشم سکندر علی کے غیر قانونی کاموں پر پردہ نہ ڈالتے ہوئے ان سے کھلی دشمنی مول لی تھی۔ وہیں ان کے بیٹے میر ضیغم سکندر علی کے ساتھ اس کی دوستی مضبوط ہو چکی تھی۔

اب دونوں ہی ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی سے گریز کرتے تھے۔ نہ تو ردا نے دوبارہ اس کو فیوڈل سسٹم سے بغاوت پہ اکسایا اور نہ ضیغم نے اس کو اس کے فرائض ایمان داری سے ادا کرنے سے روکا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ کسی بھی پیش آنے والی متوقع ناخوشگوار صورت حال سے خائف ضرور تھا۔ آج بھی روز مرہ کے معمول کی طرح اس کے آفس چلا آیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اس نے ادھر ادھر بکھری فائلز دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک ضروری کام مکمل کر رہی ہوں۔ شام تک میں اسے فائنل کر دینا چاہتی ہوں۔" اس نے ایک دفعہ سر اٹھا کے اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ مصروف ہو گئی۔

"ردا!" خلاف معمول اس نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا تو وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"بابا سائیں تمہارے کاموں سے سخت مشتعل ہیں اور غصے میں کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔" وہ پریشان نظر آ رہا تھا۔

"جی! میں جانتی ہوں بلکہ وہ میرے ٹرانسفر کی کوشش بھی کر چکے ہیں۔" وہ سکون سے کہتے ہوئے دوبارہ کام کرنے لگی جبکہ ضیغم سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"اگر تمہارا ٹرانسفر ہو جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔" ردا نے اسے گھورا تو وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"تمہیں میرے یہاں رہنے سے کیا تکلیف ہے؟"

"تمہاری وجہ سے تو ساری تکلیفیں ہیں۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔ مگر دل کسی انجان خدشے سے دھڑک رہا۔ وہ دوبارہ اس سے بے نیاز ہو کر کام میں مصروف ہو چکی تھی۔

میر ہاشم سکندر علی اب خالصتاً اپنے روایتی ہتھکنڈوں پہ اتر آیا تھا۔ کئی دن سے اس کے کارندے ردا کے آفس آ کے اسے دھمکاتے، مگر اس پر ان دھمکیوں کا رتی برابر اثر نہ ہوا تھا۔ وہ بڑے نڈر انداز میں اپنے موقف پہ ڈٹی رہی اور اپنے فرائض ادا کرتی رہی۔

آفس میں بیٹھ کر کام کرتے ہوئے اس کا دھیان ضیغم کی طرف گیا جو دو دن سے غائب تھا۔ کچھ سوچنے کے بعد اس نے اس کے سیل فون پہ کال کی جو فوراً پک کر لی گئی۔

"السلام علیکم۔" ضیغم کا تھکا تھکا سا لہجہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

"وعلیکم السلام کدھر غائب ہو دو دن سے؟"

"آپ کی طرف سے مسلسل ٹینشن لے لے کر بیمار پڑ چکا ہوں محترمہ!" وہ خاصا تپ کر کہہ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اچھا۔ پھر میرے آفس آ جاؤ، تمہاری بیماری کا علاج کرتے ہیں۔" اس نے شرارت سے کہہ کر کال ڈسکنیکٹ کر دی۔ اس کے اندازے کے عین مطابق وہ پندرہ منٹ میں اس کے آفس میں موجود تھا۔

انیسویں قسط

قشار ذہن میں جلتا رہا شرر نہ ہوا
یہ سنگِ راہ بنا شمعِ رہ گزر نہ ہوا
بڑا عجیب لطیفہ ہے ابن آدم کا
ستم ظریف خدا بن گیا بشر نہ ہوا

سفر تیزی سے جاری تھا۔ منزل جادہ بہ جادہ قریب سے قریب تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ذہنی خلفشار اپنی جگہ لیکن جوں جوں وہ اپنی منزل سے قریب ہونے کا یقین پا رہا تھا اسے یک گونہ سکون بھی محسوس ہو رہا تھا۔ جسم تھکن سے چور تھا تو روح اس بوجھ سے نڈھال تھی جسے آج وہ اتار دینا چاہتا تھا۔

گاڑی اپنی پوری رفتار سے رواں دواں تھی۔۔۔ اور شاید اسی رفتار سے اس کی سوچ کا سفر بھی جاری تھا۔

اس نے ایک نظر دائیں جانب کے چڑھے ہوئے شیشے کی طرف دیکھا۔ جہاں ٹی وی اسکرین کی مانند تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے مناظر گزر رہے تھے۔ چند لمحوں تک وہ بے خیالی کے سے انداز میں ان مناظر کی سمت متوجہ رہا۔ پھر ایک طویل سانس لیتے ہوئے اپنی نشست پر گردن جما کر آنکھیں بند کر لیں۔ آج اس کے عقب میں باوردی گارڈز کی گاڑیاں موجود نہیں تھیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ڈرائیور بھی موجود نہیں تھا بلکہ آج گاڑی اس کی فرم کا منیجر ڈرائیو کر رہا تھا۔ یہ تبدیلی ضرور کسی خاص بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا جو پر اسرار تھا۔۔۔ سمجھ میں نہ آنے والا۔

منیجر نے گاڑی ڈرائیو کرتے کرتے بیک ویو مرر میں جھانکتے ہوئے ایک نظر اس کی جانب دیکھا لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ اس الجھن کو سلجھانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا لیکن بہرحال فرزان کا مزاج شناس ضرور تھا۔ سو وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ سوال نہیں کرنا۔ صرف انتظار کرنا ہے اس وقت تک جب تک فرزان خود کچھ نہ بتا دے یا معاملہ اپنے آپ کھل کر سامنے آ جائے۔ سو اس نے طویل سانس لی اور اسٹیئرنگ ویل گھماتے ہوئے گاڑی اس خوب صورت اور عظیم الشان بلڈنگ کے سامنے جا روکی جس پر لگے ہوئے سائن بورڈ کی پیشانی پر جلی حروف میں لکھا ہوا "یاور زمان اینڈ کمپنی" کا نام صاف دکھائی دے رہا تھا۔

گاڑی رکی تو اس کے نتیجے میں لگنے والے ہلکے سے دھچکے نے فرزان کو اس بات کا بخوبی احساس دلا دیا کہ وہ اپنے اس کامیاب سفر کے آخری پڑاؤ پر آن پہنچا ہے۔ منیجر نے مؤدب انداز میں عقبی دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"سر! ہم یاور زمان اینڈ کمپنی کے آفس کے سامنے کھڑے ہیں۔۔۔" فرزان نے اپنے بر نشست پر رکھی ہوئی فائل اٹھا لی اور پھر ڈھیلے ڈھالے انداز میں گاڑی سے نکل کر چاروں جانب ایک بھرپور نگاہ ڈالی پھر اس کی نظریں آپ ہی آپ آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔

بصارت کا یہ سفر آخر کار منیجر کے چہرے پر آ کر اختتام پذیر ہوا، پھر فرزان کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی اور اس کی مخصوص آواز منیجر کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

وقت کے ہاتھ میں لحت کی تلوار نہ تھی
ورنہ مقتل کی کوئی راہ بھی دشوار نہ تھی

"آؤ آج اس قرض کی ادائیگی بھی کر دیں۔۔۔"
جملہ مکمل کرنے کے بعد وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کلاں ڈور کراس کر گیا۔ منیجر اس کے پیچھے تھا۔ گیٹ پر مؤدب کھڑے ہوئے باوردی دربان نے سلام کیا تو سر کی جنبش سے جواب دیتے ہوئے فرزان کے پیچھے پیچھے آفس میں داخل ہو گیا۔

فرزان رکے بغیر آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔۔۔ منیجر بدستور اس کے تعاقب میں تھا۔۔۔ اگلے لمحے اس کے قدموں کی جنبش تھمی تو منیجر نے دیکھا کہ دروازے پر منیجنگ ڈائریکٹر کی تختی آویزاں ہے۔ فرزان دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو گیا تو منیجر نے قدرے ہچکچاہٹ بھرے انداز میں ایک نظر مؤدب کھڑے اردلی کی جانب دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بھی اندر داخل ہو رہا تھا۔

یاور زمان کی سرد اور سپاٹ نظروں نے فرزان کا استقبال کیا اور اس کی پیشانی پر نمودار ہونے والی ترچھی لکیروں نے اسے سلامی دی لیکن وہ ان سب باتوں سے بے نیاز لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی ٹیبل کے سامنے پہنچا اور ایک کرسی گھسیٹتے ہوئے اطمینان سے بیٹھ گیا۔

دونوں کی نظریں ٹکرائیں تو کمرے کا سکوت مزید گہرا ہو گیا۔ چند لمحوں تک اسی گمبھیر خاموشی کی چادر چھائی رہی دونوں نظروں ہی نظروں میں جیسے ایک دوسرے کو تولتے رہے پھر یاور زمان کی تلخ آواز سنائی دی۔

"تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر نہ تو مجھے حیرت ہوئی نہ ہی خوشی کا احساس پیدا ہوا اور نہ ہی مجھے تمہارے آنے کا مقصد سمجھ میں آیا ہے۔۔۔

خوشی اپنی جگہ لیکن یہ پوچھنے کا حق میں بہرحال رکھتا ہوں کہ تم نے اتنی جلد میرے سامنے آنے کی جرأت کیوں کی؟"

فرزان چند لمحے پر خیال نظروں سے اس کی جانب دیکھتا رہا جیسے وہ اس کے لبوں سے ادا ہونے والے جملوں کی معنویت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو پھر وہ اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔

"خوشی تو مجھے بھی تم سے مل کر کبھی نہیں ہوئی۔۔۔ اور یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ میری آمد کا مقصد تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکا ہو گا۔

مجھے یقین ہے کہ تم نے زندگی میں کبھی کوئی کام بنا مقصد کے نہیں کیا ہو گا۔ مگر کچھ کام انسان بلا مقصد بھی کر گزرتا ہے۔۔۔ لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آنے کی کیونکہ تم ان جذبات کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے جن کے زیر اثر رہتے ہوئے انسان اندھی کھائیوں میں بھی چھلانگ لگا دیتا ہے۔۔۔"

فرزان ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا تو یاور زمان کی کاٹ دار آواز بلند ہوئی۔

"جذبات پر کلاس دینے آئے ہو؟ تم جیسے لوگوں کو تمیز ہی کہاں ہوتی ہے کہ وہ جذبات کو سمجھ سکیں۔۔۔

اگر تم میں یہ اہلیت ہوتی تو تم کسی کے جذبات سے کھیلتے ہی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ فلسفہ تمہارے دماغ میں بھوسے کی طرح بھرا ہوا ہے۔ چرب زبانی تمہارا ہنر ہی نہیں تمہاری فطرت میں شامل ہے۔۔۔ بات کو خوامخواہ طول دینے کی کوشش مت کرو، میرا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے۔ دوٹوک انداز میں بتاؤ کیوں آئے ہو؟" فرزان نے تحمل سے سنا اور پھر سرد لہجے میں بولا۔

"تمہاری ساری باتوں کے جواب اس انداز میں دے سکتا ہوں کہ تم میں پھر کوئی سوال اٹھانے کی سکت ہی باقی نہ رہے لیکن میں یہاں تمہارے جملوں کی کاٹ سے محظوظ ہونے یا اپنے زور خطابت کا لوہا منوانے نہیں آیا۔۔۔ یہ میری اور تمہاری آخری ملاقات ہے بہتر ہو گا کہ سماعتوں کے سارے پردے کھول کر میری بات پوری توجہ سے سنو۔

یاور زمان! تم کہتے ہو کہ میں جذبات کو نہیں سمجھ سکتا۔۔۔ لیکن میں جو اس وقت تمہارے سامنے بیٹھا ہوں
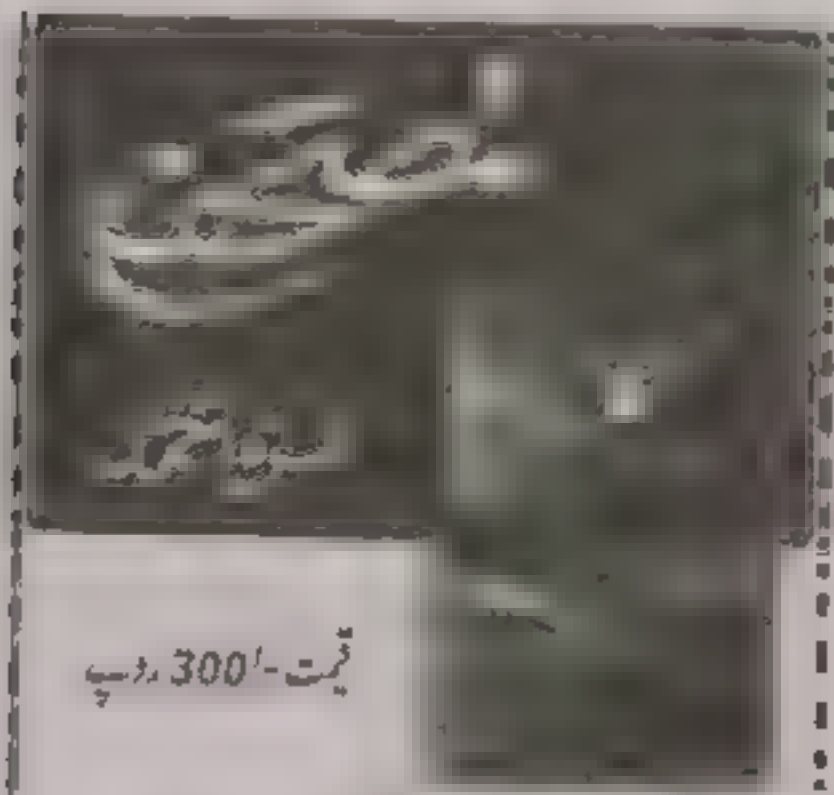
یہ جذبات ہی کی بدولت ہے صرف ایک احساس ہے جس کے زیر اثر میں یہاں کھنچا چلا آیا۔ تمہارا اوڑھنا بچھونا، سونا جاگنا۔۔۔ صرف اور صرف ایک ہی چیز ہے۔" فرزان ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کو بلند کر کے کمرے کے چاروں جانب گھماتے ہوئے بولا۔

"یہ۔۔۔ یہ سب کچھ۔۔۔ یعنی یہ نمود و نمائش۔۔۔ یہ دولت، یہ کاروبار تمہاری عبادت بھی یہ ہی ہے اور تمہارا مذہب بھی۔۔۔

نیکی وہ ہوتی ہے کہ ایک ہاتھ سے کی جائے تو دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ اتنے متقی اور پرہیز گار تو تم ہو نہیں کہ نیکیاں کرتے پھرو۔۔۔ ہاں مجھ پر تم نے ایک احسان ضرور کیا تھا۔۔۔ وہ رقم مجھے بطور قرض دے کر جو میں تمہیں واپس لوٹا چکا ہوں۔۔۔ میرا کہنا اب بھی یہ ہی ہے کہ میرا موجودہ کاروبار، بینک بیلنس اور اس سے منسلک دیگر تمام چیزیں میری اپنی محنت کا ثمر ہیں۔"

"غلط فہمی ہے تمہاری۔۔۔ تم سمجھتے۔۔۔" یاور زمان نے گرج کر کہنے کی کوشش کی لیکن فرزان کی دھاڑ نے اس سے بھی اونچی آواز میں بلند ہو کر اس کا جملہ کاٹ دیا۔

"بولو نہیں۔۔۔ صرف سنو۔۔۔ میرا نام فرزان ہے وہ فرزان جو تہی دست تمہارے گھر آیا تھا۔ تم نے مجھے رقم فراہم کر کے مجھ پر احسان کیا یہ تمہاری سوچ ہے۔ تمہاری رقم شکریے کے ساتھ واپس کر چکا ہوں۔۔۔ احسان مجھ پر تمہارا نہیں بلکہ تمہاری اس معصوم بہن کا ہے جس نے مجھ جیسے شخص کو موت کے منہ سے نکال کر واپس اپنے قدموں پر کھڑا کر دیا۔۔۔ اسپتال کے بستر سے اٹھا کر اپنے گھر میں لا بٹھایا۔۔۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ مجھے صرف اپنے گھر میں ہی جگہ نہیں دے رہی بلکہ مجھے اپنے دل میں بھی جگہ دے رہی ہے۔ غلطی میری ہے کہ میں ہمیشہ اس زعم میں رہا کہ بس "میں" ہوں۔ باقی سب جھوٹ ہے۔ یاور زمان! شاید تم نہیں جانتے کہ میں دنیا کا بدقسمت ترین انسان ہوں۔۔۔ میں وہ آدمی ہوں جو نہ تو اپنے باپ کی محبتوں کا قرض اتار سکا، نہ ماں کی ممتا کے سائے تلے سانس لے سکا نہ بیوی کی محبت کے بدلے میں اسے محبت دے سکا، نہ بھائی کی محبت کی قدر کر سکا۔ مجھ سے تو [illegible] ہی لوگوں نے محبت کی، ان لوگوں نے جو میرے اپنے [illegible] وہ لوگ جو میرے خاندان میں شامل تھے، ان سب [illegible] محبتوں کے جواب میں محبتیں نچھاور نہ کر سکا تو کسی [illegible] محبت کا جواب محبت سے کیسے دے سکتا ہوں۔۔۔ [illegible] مغرور نہیں ہوں یاور زمان! مجبور ہوں۔۔۔ لیکن احسان فراموش ہرگز نہیں۔۔۔"

فرزان ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا اور پھر گود میں رکھی ہوئی فائل اٹھا کر یاور زمان کے سامنے پٹختے ہوئے بولا۔

"یہ اس فرشتہ صفت لڑکی کے قدموں پر نچھاور [illegible] ہوں جس کی محبت کا نام لے کر تم فرزان کی قیمت کا [illegible] چلے تھے اور قیمت بھی وہ جسے تم قرض کا نام دیتے ہو [illegible] قرض وہ جسے وصول کرنے کے بعد بھی تمہارا پیٹ نہیں بھرتا۔۔۔ تم نہ تو اس لائق تھے اور نہ ہی اس حیثیت کے مالک کہ مجھ سے میری مرضی کے بغیر ایک دمڑی بھی وصول کر سکتے۔۔۔ یہ تو خواب دیکھنے والی ان آنکھوں کا صدقہ اتار رہا ہوں جو احسان کرنے کے بعد بھی کوئی خراج طلب نہیں کرتیں۔۔۔ میں نے اپنی ساری جائیداد، کاروبار [illegible] آج تک اس شہر نے جو بھی کچھ دیا تھا سب کا سب میں نے فریال کے نام کر دیا ہے۔ میرے پاس جو کچھ بھی تھا آج کے بعد وہ سب کچھ فریال کا ہے۔ میں اسے وہ تو نہیں دے سکا جو وہ چاہتی تھی لیکن وہ دے کر جا رہا ہوں جو میں چاہتا ہوں۔۔۔ سمجھے مسٹر یاور زمان!"

فرزان نے اپنا جملہ مکمل کیا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پلٹ کر واپس دروازے کی جانب بڑھا تو کمرے کے وسط میں ہکا بکا کھڑا اس کا منیجر بھی جلدی سے [illegible] پیچھے لپکا۔ ٹھیک اسی وقت فرزان کے قدموں کی حرکت رک گئی، وہ پلٹ کر یاور زمان سے مخاطب ہوا۔

"محبت اور کاروبار میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے یاور زمان! جس دن دو اور دو چار کے چکر سے باہر نکلو گے [illegible] جاؤ گے۔ جانتا ہوں کہ تمہاری سمجھ دانی بہت کمزور ہے [illegible] پھر بھی جاتے جاتے ایک شعر ضرور سناؤں گا۔ میرے جانے کے بعد غور کرنا شاید سمجھ جاؤ۔

خوشی کا زہر کسی شیشہ الم میں رہا
میرا شعور صدا وہم بیش و کم میں رہا
کسی نے چھین لی بیوہ کے سر سے چھاؤں مگر
فقیہ شہر عمامے کے پیچ و خم میں رہا"

فرزان اور منیجر آگے پیچھے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے لیکن یاور زمان کی نظریں ابھی تک دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

سوچا اسے تو میں کئی رنگوں میں کھو گیا
عالم تمام اس کے حسیں پیرہن سا تھا
جو شاخ شوخ تھی وہ اسی کے لبوں سی تھی
جو پھول کھل گیا وہ اسی کے دہن سا تھا

رنگ بھی انسانی زندگی پر اپنے نقوش چھوڑ جاتے ہیں کیونکہ رنگوں کا ہماری زندگی میں گہرا عمل دخل ہوتا ہے۔ رنگ خوشیوں کے ہوں یا دکھوں کے تاثر بھرپور رکھتے ہیں۔

رنگوں نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ دکھوں کے تمام رنگ بے رنگ ہو چکے تھے اور اب اس کی زندگی بہار کے رنگوں میں نہا گئی تھی۔ وہ ان ہی تر و تازہ اور شوخ رنگوں کے زیر اثر چلتا ہوا دسترخوان تک آ پہنچا جہاں ذکیہ بیگم پہلے سے موجود تھیں۔ اس نے ان کے چہرے پر نظر دوڑائی جہاں بکھرے رنگ رونما ہونے والی تبدیلیوں کا مژدہ سنا رہے تھے۔ اس نے صبح بخیر کہتے ہوئے اپنی جگہ سنبھالی۔ امی جان کی طبیعت پوچھی اور پھر اخبار اٹھا کر اس پر نظریں دوڑانے لگا۔ یہ پہلی تبدیلی تھی جسے اس گھر میں وہ خود لے کر آیا تھا۔ امی جان کی تنہائی اور اکیلے پن کو مدنظر رکھتے ہوئے پچھلے کچھ عرصے میں اس نے کئی ایک تبدیلیاں کی تھیں جن میں سے ایک تبدیلی کا نام صبح کا اخبار تھا۔ اذان کے دکان پر چلے جانے کے بعد ذکیہ بیگم باقاعدگی سے اخبار پڑھنے لگی تھیں۔ ٹھیک اسی لمحے برتنوں کی کھنکھناہٹ سنائی دی تو اس نے اخبار پر سے نظریں ہٹا کر گھر کی اس دوسری تبدیلی کی جانب دیکھا جس کا نام صفیہ ماسی تھا۔ صفیہ ماسی امی کے ایک لاولد کزن کی بیوہ تھیں۔ غربت اور نامساعد حالات کی وجہ سے ان کے گھر کی چیلے تو چیزیں بکیں پھر گھر بھی بک گیا۔ کمانے والا موجود نہ ہو تو آخر کب تک گزارا چل سکتا ہے۔ سو رفتہ رفتہ گھر بیچ کر حاصل ہونے والی رقم بھی ختم ہو گئی اور یوں حالات اتنے خراب ہو گئے کہ اگر اذان آگے بڑھ کر انہیں گھر نہ لے آتا تو وہ بے چاری سڑک پر آ جاتیں۔ بڑی ہی محبت کرنے والی اور ایکٹیو خاتون تھیں جنہوں نے آتے ہی نا صرف گھر کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی بلکہ بڑی حد تک ذکیہ بیگم کی تنہائیاں بھی دور کر دی تھیں۔

اب اذان کو ان کے چہرے پر تنہائیوں اور اداسیوں کے وہ اجاڑ رنگ نظر نہیں آتے تھے بلکہ وہ نسبتاً ہشاش بشاش رہتی تھیں۔ اذان نے اخبار ایک جانب رکھتے ہوئے پلیٹ میں سے سلائس اٹھایا اور اسے دانتوں سے کترتے ہوئے کہا۔

"بیٹھیے نا ماسی! آپ بھی ہمارے ساتھ ناشتا کریں۔۔۔"

"جیتے رہو بیٹا! میں تو بس چائے کا ایک کپ پیوں گی۔۔۔ کھانا تو دوپہر میں ہی کھاتی ہوں۔۔۔ صبح صبح مجھ سے تو کھایا ہی نہیں جاتا۔ تم ناشتا کرو میں چائے لے کے آتی ہوں۔ وہ ضرور تمہارے ساتھ بیٹھ کر پیوں گی۔"

صفیہ ماسی نے واپس پلٹتے ہوئے جواب دیا اور کچن کی جانب بڑھ گئیں۔ ٹھیک اسی لمحے اذان کی سماعتوں سے ذکیہ بیگم کی آواز ٹکرائی۔

"اذان بیٹا! تھوڑی دیر میں تمہاری مختاراں خالہ آنے والی ہیں آج ہم لوگ ماہم کے گھر جائیں گے۔ میری کوشش ہے کہ یہ کام جلد سے جلد ہو جائے۔ کیا تم اس بارے میں کچھ کہنا چاہو گے۔" اذان نے ایک نظر ان کے چہرے پر ڈالی پھر ان کی نگران آنکھوں کی تاب نہ لا کر جلدی سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔

"میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں؟ یہ آپ کا کام ہے۔ آپ جیسے مناسب سمجھیں۔"

"مناسب تو بیٹا تم پہلے ہی سمجھ چکے ہو۔ میں تو تمہاری ہی خواہش کو آگے بڑھا رہی ہوں۔ پسند تمہاری ہے تو رائے بھی ضرور دے سکتے ہو۔ اس میں بری بات کیا ہے۔"

ذکیہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔ اذان جو اس دوران پانی کا گلاس منہ سے لگا چکا تھا۔ گلاس واپس رکھتے ہوئے جلدی سے بولا۔

"ٹھیک ہے امی جان! آپ لوگ چلے جایئے، میں تو دکان پر جا رہا ہوں۔" اور پھر اٹھ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ صفیہ مامی جو چائے کے برتن اٹھائے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں اذان کو باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر با آواز بلند بولیں۔

"اذان بیٹا! چائے تو پیتے جاؤ۔"

"آپ پئیں مامی! میں دکان پر پی لوں گا۔"

اور پھر کمرے سے باہر نکل کر سیدھا بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ ٹھیک اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو باہر مختاراں خالہ نظر آئیں جن کے دونوں ہاتھوں میں بڑے بڑے شاپنگ بیگ لٹکے دکھائی دے رہے تھے۔

"السلام علیکم خالہ!" اذان نے ایک جانب ہٹ کر نہیں راستہ دیتے ہوئے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔! جیتے رہو بیٹا۔۔۔!" جواباً مختاراں خالہ نے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔

"ہاتھ خالی تھیں ہیں پیار نہیں دے سکتی۔۔۔ اور ویسے بھی پیار دینے والی تمہارے لیے جلد لا رہے ہیں۔"

اذان نے گھبرا کر مختاراں خالہ کی جانب دیکھا جن کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ٹپٹا کر سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جلدی سے بولا۔

"وہ۔۔۔ وہ امی جان اندر ناشتا کر رہی ہیں۔" اور پھر جلدی سے باہر نکل گیا۔

مختاراں مسکراتے ہوئے اندرونی حصے کی جانب بڑھی اور پھر جیسے ہی اندر داخل ہوئی، ذکیہ بیگم کی مسرت آمیز آواز سنائی دی۔

"لو بھئی مختاراں! بڑی عمر ہے تمہاری ماشاء اللہ۔۔۔ ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ آجاؤ ادھر۔۔۔ میرے پاس ہی آجاؤ۔" ذکیہ بیگم نے دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے ایک جانب سرکتے ہوئے کہا۔

"اور بھئی صفیہ تم کیسی ہو؟" مختاراں نے شاپنگ بیگ ایک طرف رکھتے ہوئے صفیہ سے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔۔۔ آپ سنائیں۔" صفیہ نے انکساری سے جواب دیا۔

"میں کیا سناؤں گی۔۔۔ ہمارے سننے سنانے کے دن تو گئے۔۔۔ اب تو ان بچوں کی باری ہے۔ سننے سنانے کی کسی کی نہیں ہیں سناتے خوب ہیں۔" مختاراں نے شگفتگی سے کہا تو ذکیہ بیگم اور صفیہ دونوں ہی مسکرا دیں۔

"یہ لیں گرم گرم چائے پئیں۔۔۔ میں آپ کے لیے آملیٹ بنا کے لاتی ہوں۔"

"نہیں نہیں بس چائے ہی کافی ہے۔ سردی بھی بہت ہے اور پھر بس کی سائڈ میں مجھے جگہ ملی، کھڑکی کا شیشہ بھی بند نہیں ہو رہا تھا پوری طرح، سارے رستے ٹھنڈی ہوا لگتی رہی۔ اب سر میں درد ہو رہا ہے۔ چائے کی تو ویسے بھی بڑی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ذکیہ بی بی! آپ نے تیاری کی؟ کب تک چلیں گے سمدھیانے کی طرف؟" مختاراں نے صفیہ سے بات کرتے کرتے اچانک ذکیہ بیگم سے دریافت کیا۔

"لو بھئی کر لو بات، تیاری کس بات کی؟ بارات تھوڑی لے کے جانی ہے۔ بس مٹھائی کا ڈبا لیں گے بات پکی ہو گئی تو لڑکی کے ہاتھ پر شگون کے طور پر کچھ پیسے رکھ دیں گے اور بس۔۔۔ تمہارا ہی انتظار تھا تم تو ناشتا کر نہیں رہیں، چائے پی لو تو چلتے ہیں۔۔۔" ذکیہ بیگم نے جواب دیا۔

پھر اسی طرح کی ہلکی پھلکی باتوں کے دوران چائے پی گئی۔۔۔ اور پھر تینوں تیار ہو کر ماہم کے گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔

☆☆☆

کئی در کھل بھی جاتے ہیں جو اک در بند ہوتا ہے
ہم ایسے لوگ پناہ اب دوانہ ڈھونڈ لیتے ہیں
اندھیرا کتنا ہی گہرا ہو، راتیں کتنی کالی ہوں
پرندے اپنا اپنا آشیانہ ڈھونڈ لیتے ہیں
مگر یہاں ایک آشیانے نے دوسرے آشیانے کو

ڈھونڈ نکالا تھا۔ زرق برق کپڑوں میں ملبوس مگر میک اپ سے بے نیاز چہرے کے ساتھ اس وقت وہ کوئی حسین پرندہ ہی دکھائی دے رہی تھی جسے اب بابل کے گھر سے اڑان بھر کے پیا کے دیس تک کا سفر طے کرنا تھا۔

اس نے چائے کی ٹرے سلیقے سے تپائی پر رکھی اور پلٹ کر آہستہ قدمی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کمرے میں صرف ماہم کی والدہ، اذان کی والدہ ذکیہ بیگم، مختاراں، صفیہ اور نیلم باقی رہ گئیں۔

ذکیہ بیگم جب مختاراں اور صفیہ کے ساتھ گھر سے نکلی تھیں تو پہلے نیلم کے گھر پہنچیں اور پھر اسے ساتھ لے کر یہ قافلہ ماہم کے گھر آن پہنچا۔ راستے میں نیلم "سب اوکے" کی رپورٹ پہلے ہی دے چکی تھی۔ اس نے تمام تر معاملات کو بخوبی ہینڈل کر لیا تھا۔ ذکیہ بیگم اور ان کے خاندان کے حوالے سے بھرپور تعارف وہ ماہم کے گھر والوں سے کروا چکی تھی۔ سو اس نے یہ ساری باتیں راستے ہی میں ذکیہ بیگم کے گوش گزار کر دیں اور اس وقت وہ اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے خاصی مطمئن یوں بھی تھیں کہ صورت حال ان لوگوں پر پہلے ہی واضح تھی۔ ان کی آمد کی غرض و غایت سے آشنا ہونے کی بدولت ماہم کے گھر والوں نے ان کی خاطر داری کے لیے اچھا خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ ماہم کی والدہ اور والد آپس میں دیر تک مشاورت کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ "رشتہ" شریف خاندان سے ہے اور "لڑکا" برسر روزگار ہے، پڑھا لکھا ہے، اچھی شکل و صورت کا مالک ہے سو ماہم کی والدہ کو مجازی خدا کی جانب سے گرین سگنل مل گیا تھا۔

ذکیہ بیگم کو بھی تمام لوگ خاصے معقول لگے تھے لیکن جب انہوں نے چائے لے کر آتی ماہم کو دیکھا تو بے اختیار اس کی بلائیں لیے بغیر نہ رہ سکیں۔ وہ دل ہی دل میں بیٹے کی پسند کی قائل ہو گئیں۔

ماہم کے چائے رکھ کے کمرے سے واپس باہر نکلنے تک کے مختصر عرصے میں وہ یہ فیصلہ کر چکی تھیں کہ ہونہ ہو یہ پرندہ ان کے آنگن میں جگمگانے کے لیے بنا ہے۔ ان کے ذہن میں بے اختیار ہی کسی شاعر کے دو مصرعے گونج اٹھے۔

ستارے، چاندنی، مے، پھول، خوشبو
کوئی شے آپ سے بڑھ کر نہیں ہے

اور واقعی اس سے بڑھ کر اور اس سے بہتر دلہن شاید وہ تلاش نہ کر پاتیں۔ وہ دل ہی دل میں فیصلہ تحریر کر رہی تھیں کہ ٹھیک اسی وقت ماہم کی والدہ نے چائے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا۔

"چائے لیجیے نا بہن۔۔۔! ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ کن سوچوں میں کھو گئیں آپ؟"

"سوچیں کیا ہوں گی بہن! ہاتھ بھر سے لے کر قد کے برابر آجانے تک ماؤں کی سوچیں ہمیشہ اپنی اولاد ہی کے گرد گھومتی ہیں۔ ان کی خوشیاں ان کی مسکراہٹیں، ہر ماں کی اولین ترجیح ہوتی ہے۔۔۔ میرا بیٹا مجھے بہت پیارا ہے لیکن آج میں اسے آپ کی ممتا کے سپرد کر کے آپ کی بیٹی کو اپنی آنکھوں کا نور اور کلیجے کی ٹھنڈک بنانا چاہتی ہوں۔ کیا آپ اپنے گھر کی روشنی کو میرے آنگن میں اجالے بکھیرنے کی اجازت دیں گی۔" ذکیہ بیگم کی گفتگو کے اختتام پر قدرے تامل کے بعد ماہم کی والدہ گویا ہوئیں۔

"آپ بڑی خوب صورت گفتگو کرتی ہیں اور آپ کا لہجہ بھی آپ کی شخصیت کی طرح میٹھا اور پر اثر ہے۔۔۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ آپ کے خاندان کی عزت و شرافت کو پورا شہر جانتا ہے۔ آپ کی آمد سے پہلے ہم پوری طرح معلومات حاصل کر چکے ہیں۔ میرے لیے یہ بات بہت خوشی کا باعث ہے کہ میری بیٹی ایک ماں کی آغوش سے نکل کر دوسری ماں کی گود میں جا رہی ہے۔۔۔ مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔"

"بس تو پھر نیک کام میں دیر کیسی؟ اسی ہفتے کا کوئی دن مقرر کر کے آپ بھی اس فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہو جائیں تاکہ ہم اس پھول کو لے جا کر اپنے باغ کی زینت بنائیں۔" مختاراں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"ہاں بہن! بس اب دیر نہ کیجیے۔" صفیہ نے بھی مختاراں کی ہاں میں ہاں ملائی تو ذکیہ بیگم کی سوالیہ نظریں سمدھن کے چہرے پر جواب تلاشنے لگیں مگر وہ خاموش

رہیں پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد قدرے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولیں۔

"لیکن ۔۔۔ اتنی جلدی ۔۔۔؟ آپ تھوڑا وقت تو دیں ہمیں۔ ماہم ابھی پڑھ رہی ہے۔ اس کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی اور پھر شادی کی تیاریوں کے لیے بھی تو کچھ وقت درکار ہوگا۔"

ان کا جملہ ختم ہوا تو اب بات آگے بڑھانے کی ذمہ داری یقیناً ذکیہ بیگم کی تھی سو وہ ذمہ داری نبھاتے ہوئے بولیں۔

"چھوڑیں نا بہن! آپ بھی کس زمانے کی باتیں کر رہی ہیں۔ اگر آپ میرے اذان کو اپنا بیٹا تسلیم کر رہی ہیں اور میں آپ کی ماہم کو اپنی بیٹی تو پھر ان فضول رسموں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ کیسی تیاریاں؟ بے جا نمود و نمائش کے نہ تو ہم قائل ہیں اور نہ ہی آپ کو کسی مشکل میں ڈالیں گے۔ رہی بات بٹیا رانی کی تعلیم کی تو اذان پڑھا لکھا، سلجھا ہوا اور سمجھدار انسان ہے اب وہ دقیانوسی دور تو رہا نہیں کہ ادھر لڑکی کی شادی ہوئی اور ادھر اس نے چولہا چوکا سنبھال لیا اور باہر جانا تو دور دروازے سے جھانکنے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی۔۔۔ اور میں بھی آپ کے گھر بہو لینے نہیں ماہم کو اپنی بیٹی بنانے آئی ہوں۔ تعلیم وہ شادی کے بعد بھی جاری رکھ سکتی ہے۔ ہاں اگر وہ اپنی مرضی سے تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا چاہے تو ہم اسے مجبور بھی نہیں کریں گے۔ آپ نے ہاں کی ہے تو پھر ہماری یہ درخواست بھی مان لیں۔ میں تو بس اب جلد از جلد اپنی بچی کو گھر لے جانا چاہتی ہوں۔"

"ہاں نا، کل کرے سو آج کر، آج کرے سو اب ۔۔۔ جوڑے آسمانوں پر بننے والا وہ مالک دو جہاں بناتا ہے۔ اگر اس نے ان دونوں کا نصیب جوڑ کر ایک کر دیا ہے تو ہمیں بھی ظالم سماج بن کر دیوار اٹھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ میرے خیال میں تو جمعہ کا دن مناسب رہے گا اور مبارک بھی ۔۔۔ آج بدھ ہے۔ ہم جمعہ کو بارات لاتے ہیں اور اپنی بیٹی کو لے کر اپنے گھر جاتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا ۔۔۔"

صفیہ نے ذکیہ بیگم کی بات کو سہارا دے کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مگر اتنی جلدی ۔۔۔؟ میں ۔۔۔"

"مگر وگر کچھ نہیں ۔۔۔ جمعہ کا دن بڑا مبارک دن ہے۔ بس اب انکار نہ کیجیے گا۔"

مختاراں نے بھی جلدی سے کہا۔

"لیکن بہن میں اتنا بڑا فیصلہ اکیلی کیسے کر سکتی ہوں اس کے لیے تو مجھے ماہم کے ابو سے مشورہ کرنا پڑے گا۔ آپ ہمیں تھوڑا سا وقت تو دیں۔ ہم ایک دو دن میں مشورہ کر کے بتاتے ہیں۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کے لیے دو دن انتظار کیا جائے۔ بھائی صاحب گھر پر ہی تو موجود ہیں آپ ان سے مشورہ کریں۔ ہم اتنی دیر تک چائے کا ایک اور کپ پی لیتے ہیں۔"

صفیہ نے ان کی بات کو درمیان سے اچکتے ہوئے اور صرف بات ہی نہیں اچکی وہ خود بھی اچک کر اپنی جگہ سے اٹھیں اور تھرماس اٹھا کر واقعتاً سب کے کپوں میں مزید چائے انڈیلنے لگیں۔ ماہم کی امی نے بے چارگی سے ذکیہ بیگم اور مختاراں کی جانب دیکھا لیکن جب ان دونوں نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا تو چار و ناچار انہیں اٹھنا ہی پڑا۔

پھر کچھ ہی دیر کے بعد جب ان کی واپسی ہوئی تو خوب صورت خوان پوش سے ڈھکی ہوئی ایک ڈش بھی ان کے ہاتھوں میں تھی۔ قریب آ کر انہوں نے ڈش پر سے کپڑا ہٹایا تو اس میں سجی ہوئی مٹھائی نے یہ راز عیاں کر دیا کہ وہ لوگ یہ مہم سر کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔

نیلم نے اٹھ کر جلدی سے ان کے ہاتھ سے ڈش لیتے ہوئے ایک رس گلا اٹھا کر ماہم کی امی کے منہ کی طرف بڑھایا اور پھر وہ خوشی خوشی سب کو مٹھائی کھلانے لگی۔ مسرت سب کے چہروں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ نیلم کا شوخ انداز اور اس کے تمتماتے ہوئے رخسار بھی اس بات کا بین ثبوت تھے کہ اس رشتے کے طے ہو جانے سے اسے بھی دلی خوشی ہوئی ہے۔

دل ہتھیلی پر لیے سب نے قطاریں باندھ دیں
سب نے آنکھوں کی سجائی کہکشاں تیرے لیے
اپنی امیدوں کے تارے تیرے آگے رکھ دیے
کر دیا سب نے زمیں کو آسماں تیرے لیے

☆☆☆

میں جلوہ صد رنگ ہوں یا موج صبا ہوں
احساس کی چوکھٹ پہ کھڑا سوچ رہا ہوں
اک جام تو پی لینے دے اے گردش دوراں
پھر تجھ کو بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں کیا ہوں

امیر ہو یا غریب، شاہ ہو یا گدا، انسان بہر حال انسان ہوتا ہے جو ہمیشہ گردش دوراں کے سامنے بے بس ہی رہا ہے۔ تقدیر کی ڈوریاں جب ہلتی ہیں تو عروج کو زوال اور بلندیوں کو پستیاں نصیب ہوتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔۔۔ عروج و زوال زندگی کا حصہ ہیں مگر جس نے عروج دیکھا ہو وہ زوال پذیر ہونے کے بعد اکثر اپنے حواسوں میں نہیں رہتا۔ شعور و آگہی اس سے نظریں چرانے لگتے ہیں۔ ایسے عالم میں احساس ہی وہ نعمت ہے جو انسان کو پستیوں سے ایک بار پھر بلندیوں کے سفر کی جانب گامزن کرتا ہے لیکن یہ سفر ہمیشہ احساس کی چوکھٹ پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اگر انسان احساس کی اس دہلیز کو کراس کر جائے تو اسے انسان سے جانور بنتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔

ہر چیز حدود و قیود میں ہی اچھی لگتی ہے اور انسانیت کے بھی معیار متعین ہیں۔ احساس کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر لڑکھڑائے اور ڈگمگائے بغیر ثابت قدم رہنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے کیونکہ جب احساس جاگ اٹھتا ہے تو بہت سے جذبے دم سادھ لیتے ہیں۔ بہت سی سوچیں طمانیت کی چادر اوڑھ لیتی ہیں تو بہت سے سرکش خیالات جسم و جاں میں بھونچال پیدا کر دیتے ہیں اور جب بھونچال آتے ہیں تو مکانات ہی نہیں بستیوں کی بستیاں زیر و زبر ہو جاتی ہیں۔ یہ تباہی کبھی کبھی نئی آباد کاریوں کی بنیاد ثابت ہوتی ہے تو کبھی کبھی یہ کھنڈرات شہر خموشاں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یہ مد و جزر بڑے بپھرے ہوئے انداز میں اٹھتے ہیں۔ جب طغیانیاں عروج پر ہوں تو اکثر پتوار چھوٹ بھی جایا کرتے ہیں۔ اندھی موجوں کے دوش پر ان سرکش طوفانوں سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے اپنے وجود کو قائم رکھنا جاں گسل مرحلہ تو ضرور ہے لیکن جنگ جیت کر آنے والا ہی غازی کہلاتا ہے۔

جنگ جاری تھی اور ابھی وہ یہ فیصلہ کرنے سے عاری تھا کہ اس کا شمار شہیدوں میں ہوگا یا غازیوں میں۔۔۔ سفر جاری تھا۔ گاڑی پختہ سڑک پر دوڑتی ہوئی فاصلوں کو آڑے ہاتھوں لے رہی تھی تو اس کے اندر اٹھتے ہوئے جوار بھاٹے اسے پچھاڑنے کے در پے تھے۔ طوفان کا شور ایک ہلکے سے ہچکولے کے ساتھ ہی تھم گیا اور یہ خفیف سا جھٹکا ایک بار پھر گاڑی کے رکنے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

ایئرپورٹ کی عظیم الشان عمارت پر نظر پڑی تو اس کے وجود میں حرکت نمودار ہوئی۔ منیجر نے گاڑی پارک کرنے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ سے باہر نکلتے ہوئے گاڑی کا عقبی دروازہ کھول دیا تھا۔ اس کے قدم گاڑی سے باہر نکلے اور وہ اپنے دونوں ہاتھ منیجر کے کاندھوں پر دائیں بائیں جماتے ہوئے بولا۔

"میرا اور آپ کا ساتھ بہت خوش گوار رہا، زندگی حادثات و تجربات سے عبارت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ تجربہ میرے لیے تکلیف دہ نہیں رہا۔ زندگی کی سڑک بڑی طویل ہے۔ سفر جاری رہتا ہے۔ مسافر چڑھتے، اترتے رہتے ہیں اور یوں گاڑی چلتی رہتی ہے۔ آپ کو ابھی بہت ترقی کرنی ہے۔ آگے بڑھنا ہے۔ لمبا سفر ہے۔ وقت ضائع مت کیجیے اور اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ نئی منزلوں کی جستجو جاری رکھیے گا۔ ساری ذمہ داریاں کسی اور کو سونپ دی ہیں۔ مگر آپ کو آپ کے فرائض سے سبک دوش نہیں کیا۔ اسی محنت ایمان داری اور لگن کے ساتھ کام کرتے رہیے گا۔ میری دعائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔ میں بھی مسافر ہوں، میرا پڑاؤ آ گیا ہے، مگر آپ کو آگے بڑھنا ہے سو مجھے اجازت دیجیے ۔۔۔ اللہ حافظ۔"

فرزان نے گفتگو ختم کی اور پلٹ کر ایک جھٹکے سے مڑتے ہوئے ایئرپورٹ کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔

منیجر نے نم ناک آنکھوں سے اس کی پشت کو گھورا۔ ہونٹ کپکپائے مگر قوت گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکا جب کہ فرزان تیز قدمی سے چلتا ہوا

چند ہی لمحوں کے بعد اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ منیجر نے ایک طویل سانس لی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو مسل کر جیسے دھندلاہٹوں کو جھٹکنے کی کوشش کی اور پھر مردہ قدموں سے چلتے ہوئے واپس ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا۔

گاڑی ریورس ہوئی اور پھر مڑ کر دوبارہ واپسی کا سفر کرنے لگی۔

ایک ستون کے پیچھے کھڑے فرزان کی نظریں اس وقت تک گاڑی پر مرکوز رہیں جب تک کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ کافی دیر تک وہ چپ چاپ کھڑا رہا پھر ایک طویل سانس لیتے ہوئے پلٹ کر آگے بڑھا تو ارد گرد پورا شہر آباد نظر آیا، خاصی چہل پہل تھی، کوئی اپنی منزل پر جانے کے لیے سامان سے لدا پھندا عمارت میں داخل ہوتا نظر آیا تو کوئی استقبال کرنے والے عزیز و اقارب کے ساتھ باہر نکلتا ہوا۔ طرح طرح کے لوگ، بھانت بھانت کی بولیاں بولتے دکھائی دیے۔ ہر کوئی اپنے حال میں مست تھا۔ لیکن اس کی بڑبڑاہٹوں پر توجہ دینے والا وہاں کوئی نہ تھا۔

بولنے والو مری روح کے دروازے پر
اپنی بھٹکی ہوئی چپ چاپ صدائیں مانگو
کھو گیا ہوں میں غم زیست کے اندھیاروں میں
عمر بھر اب میرے ملنے کی دعائیں مانگو

☆☆☆

کلیوں کی طرح پھوٹ سر شاخ تمنا
خوشبو کی طرح پھیل چمن تا بہ چمن تو
اب کیوں نہ سجاؤں میں تجھے دیدہ و دل میں
لگتا ہے اندھیرے میں سویرے کی کرن تو

تازہ شگوفوں کی مانند پھوٹنے والی نرم و ملائم اور دبیز سویرے کی کرنیں دن بھر کی تکان اوڑھے اب قدرے مرجھا گئی تھیں۔۔۔ شام اپنے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے عروس شب بننے کی تیاری کر رہی تھی تو دوسری جانب آنکھوں میں امیدوں کے سینکڑوں دیپ جلائے، دل میں ہزاروں ارمان چھپائے ماہم پیا گھر سدھارنے کے خواب بن رہی تھی۔

گھر میں خاصا گہما گہمی کا عالم تھا۔ بہت سی لڑکیاں اور بہت سی بزرگ خواتین جمع تھیں لیکن ان سب لوگوں کے درمیان کٹی پتنگ کی مانند چکرائی دوڑتی بھاگتی اور ہر محاذ پر اکیلی پورا آتی نیلم سب سے نمایاں نظر آ رہی تھی۔ بزرگ خواتین ایک جانب حلقہ بنا کر بیٹھی اپنی جوانی کو یاد کر کے ایک دوسرے کے کانوں میں اپنی اپنی قصہ گوئی کے ہنر انڈیل رہی تھیں۔ لڑکیاں صحن کے وسط میں کھڑی پلان کر رہی تھیں کہ گانوں کے مقابلے میں کون کون حصہ لے گا، ٹپے کون سنائے گا۔۔۔ ڈھولک کون بجائے گا۔ ان کی گفتگو کی مکھیوں جیسی یہ بھنبھناہٹ اس وقت دب کر رہ گئی جب لہکتی ہوئی نیلم ان کے قریب پہنچی اور پھر اس کی آواز ان سب کی آوازوں پر حاوی ہو گئی۔

"حد ہو گئی۔۔۔ بھئی رمشا یہ گول میز کانفرنس آخر کب تک چلے گی۔ لوگوں کو پتا تو چلنا چاہیے کہ اس گھر میں کوئی شادی ہو رہی ہے۔

اور نائلہ! تم۔۔۔ تم بھی یہاں کھڑی میٹنگ میں شامل ہو؟ کوئی ہلا گلا شروع کرو نا۔۔۔ لگتا ہے تم سے نہیں ہو گا مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔۔۔ چلو یہاں آؤ سب میرے پیچھے۔۔۔ عالیہ تم بھی۔" اور وہ صحن کی افقی دیوار کی جانب بڑھ گئی جہاں ایک ٹیبل پر ڈیک اور دائیں بائیں بڑے بڑے اسپیکرز رکھے نظر آ رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈیک آن کیا اور پھر پلے کا بٹن پش کر دیا اور فضا ایک خوش الحان آواز سے ترنم ریز ہو گئی۔

کوئی کر کے بہانہ سانوں مل ماہی وے
راتاں آ گئیاں چاننیاں
ہو ساڈا کلیاں نئیں لگ دا دل ماہی وے
راتاں آ گئیاں چاننیاں

"نیلم! یہ کیسا گانا لگا دیا؟ مجھے تو کچھ اور ہی محسوس ہو رہا ہے۔" عالیہ کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ہاں نا۔۔۔ نیلم آپی کے اندر کی آواز ہے۔" نائلہ نے بھی بھرپور حصہ لیتے ہوئے کہا۔ رمشا کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔

"ماہم داج تے نیلم دا رج۔"

اس نے دیدے مٹکاتے ہوئے کہا اور نیلم بے چ

جھینپ کر رہ گئی۔ شاید وہ ذہنی طور پر اس تابڑ توڑ حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"کیا بدتمیزی ہے؟ مقصد کیا ہے بھئی تم لوگوں کا؟ اس گھر میں شادی ہو رہی ہے اور شادی بیاہ میں ایسے ہی گانے چلائے جاتے ہیں۔"

نیلم کا لہجہ خاصا احتجاجی اور مدافعانہ تھا۔ نیلم کا جواب سن کر دونوں نے یوں معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور ایک ساتھ آواز نکالی "ہوں۔۔۔" اور نیلم جیسے بوکھلاہٹ آمیز نذار میں تاپ کر رہ گئی۔

"ہاں بھئی جب کسی کی شادی ہو تو اپنے جوڑے کی یاد تو آتی ہی ہے نا۔"

عالیہ نے عالمانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو نیلم اس کی طرف لپکتے ہوئے بولی۔

"عالیہ کی بچی! تم یوں باز نہیں آؤ گی۔۔۔ میں تمہارا گلا دبا دوں گی۔۔۔ میرا کوئی جوڑا ووڑا نہیں ہے۔" نیلم کو اپنی جانب لپکتا دیکھ کر عالیہ نے یکلخت بڑی بوڑھیوں کی جانب دوڑ لگا دی اور حلق پھاڑ کر چلائی۔

"آنٹیو! بچاؤ"

دیگر تمام لڑکیوں کی ہنسی چھوٹ گئی اور ماحول زعفران زار ہو گیا۔ عالیہ نے بھاگتے ہوئے رخ موڑا اور ماہم کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ نیلم اس کے پیچھے پیچھے تھی اور ان دونوں کے پیچھے باقی لڑکیاں بھی جیسے اسی انتظار میں تھیں کہ سب کی سب ماہم کے پاس پہنچ جائیں۔

ماہم جو ان کی باتیں سن کر مسکرا رہی تھی انہیں دیکھ کر اپنی مسکراہٹ روکنے لگی کہ عالیہ بولی۔

"یہ دیکھو دلہن ہنس رہی ہے۔ ذرا جو شرم ہو۔۔۔ دلہنیں تو اپنی شادی پر روتی ہیں اور یہ ہنس رہی ہے۔"

ماہم بے چاری عالیہ کی بات سن کر خفیف سی ہو گئی۔

"لو بھلا رونے کی کیا بات۔۔۔ اپنے ماہی کے پاس جا رہی ہے تو خوش تو ہو گی۔" نیلم نے عالیہ کو ڈپٹا۔ نیلم کی بات سن کر ماہم کے چہرے پر امڈنے والی شرم کی سرخی دیدنی تھی۔

"اب دیکھو صرف نام سن کر چہرے پر کتنا نکھار اور رنگ آ گئی ہے۔ ملن ہو گا تو یہ سب ڈھائے گی۔" عالیہ نے معنی خیزی سے کہا تو ماہم سرعت سے سر جھکا گئی۔

"اوہو۔۔۔ اتنا کیوں شرما رہی ہو۔ یہاں دور دور تک ابھی اذان صاحب نہیں ہیں۔" رمشا نے بھی ماہم کے سرخ چہرے کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے چھیڑا۔ اس بار ماہم نے سر جھکائے ہی رکھا۔ وہ ان سب کی باتوں سے بہت کنفیوژ ہو رہی تھی۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان کی باتوں کا کیا جواب دے۔ پھر نیلم نے ہی اس کی مدد کی۔

"اچھا بس اب بند کرو تم لوگ اپنی یہ فلمی باتیں۔ اس بے چاری کو معاف کر دو۔ پھر کسی اور موقع پر اپنے بدلے لینا۔۔۔ اٹھو اور ابٹن گھول کر لاؤ اور عالیہ تم نے مہندی لگانے کے لیے کون منگوا لیے نا؟ رات میں مہندی لگانی ہو گی تا کہ صبح تک بہت اچھا رنگ آ جائے۔" نیلم نے تمام لڑکیوں کو مصروف کیا تو ماہم نے بھی سکون کا سانس لیا۔ رمشا مسکراتی ہوئی اٹھی اور ابٹن لانے کمرے سے باہر نکل گئی۔

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

فاخرہ گل

آٹھویں قسط ۸
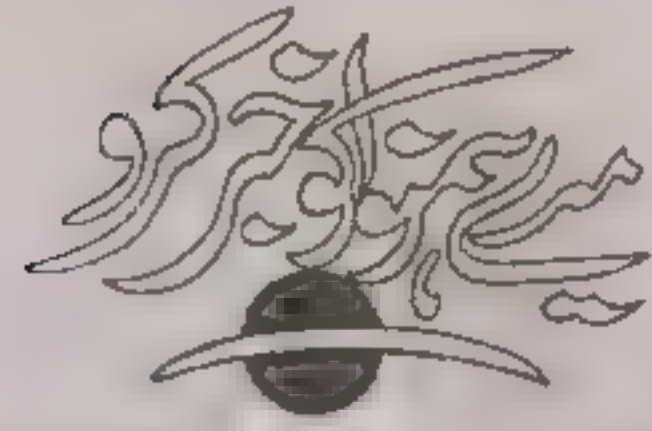
تو نے کیا کچھ نہیں دیا مجھ کو
میں بہت شاد ہوں اداس نہیں
اس میں کچھ تلخیاں بھی ہوتی ہیں
دوستی شہد کا گلاس نہیں

میری کے چرچ سے باہر آئی تو چہرے کے تاثرات حسب توقع تھے۔ پھولا ہوا منہ اور روٹھے روٹھے انداز۔۔۔ اسے باہر آتا دیکھ کر مہربانو اور کنول دونوں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ کنول نے کھسیا کر شرمندگی سے مہربانو کی طرف دیکھا اور اس کے لبوں پر بکھری ہمت بڑھاتی مسکراہٹ پر اپنے اندر حوصلہ جمع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میری کی طرف متوجہ ہوئی جو مکمل طور پر اسے نظر انداز کرتے ہوئے مہربانو کے پاس آکر رک گئی تھی۔

"آئی ایم سوری یار! میری باتوں سے تم ہرٹ ہوئی ہو نا؟"

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔" میری کی طرف سے بڑا روکھا سا جواب آیا۔

"دراصل میں یہ سب کہنا نہیں چاہتی تھی، پتا نہیں کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔۔۔ تم یقین کرو میری! آئی نیور ایون تھنک لائک دز۔" کنول کسی طریقے اس کا دل صاف کرنا چاہتی تھی مگر دل میں آیا میل لفظوں سے نہیں انسانی رویوں سے صاف ہوتا ہے اور اس کے لیے رویوں کا سچا اور پر خلوص ہونا بھی شرط ہے۔

"یہ سب صرف کہنے کی باتیں ہیں کنول! کیونکہ آئی بلیو کہ غصے میں انسان کے منہ سے صرف اور صرف وہی نکلتا ہے جو اس کے ذہن کی سوچ ہوتی ہے اور تم نے بھی وہی کہا جو تم سوچتی ہو۔ بٹ اٹس او کے کوئی بات نہیں۔"

"کوئی بات کیوں نہیں یار۔۔۔! یہ بہت بڑی بات ہے اور خاص طور پر میرے لیے تو بہت شرمندگی کی بات ہے کہ میں نے تمہیں ہرٹ کیا۔ مگر یقین کرو غصے میں انسان بعض اوقات خود اپنے غصے کی تسکین کے لیے بہت مبالغہ آرائی بھی تو کرتا ہے صرف اس لیے کہ اس طرح وہ سمجھتا ہے کہ اس کا غصہ کم ہو جائے گا۔"

مہربانو نے خاموش رہ کر دونوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا بھرپور موقع دیا تھا۔ جو مکمل خاموشی سے دونوں اطراف کا مکالمہ اس امید پر سنتی رہی کہ اب دونوں کا یوں ایک دوجے کے لیے دل میں بدگمانی رکھنا خود اس کے لیے بھی تو قابل برداشت نہیں تھا۔ اس لیے وہ چاہتی تھی کہ اس کی کسی بھی طرح کی دخل اندازی کے بجائے وہ دونوں خود ہی آپس میں تمام غلط فہمیوں کو دور کر لیں جن کا اب سے چند لمحے پہلے تک کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

"ایک ماں جب اپنی اولاد کو غصے میں برا بھلا کہتی ہے تو بھلا بتاؤ کیا وہ دل سے کہتی ہے؟ نہیں نا۔۔۔ اسے تو اپنی اولاد دنیا کی ہر قیمتی چیز سے بڑھ کر محبوب ہوتی ہے تو پھر وہ کیوں کرتی ہے ایسا؟" کنول نے مثال ہی کچھ اس طرح کی دی تھی کہ میری لاجواب ہو کر رہ گئی تھی مگر چہرے سے ناراضی کا اظہار البتہ ابھی تک ہو رہا تھا۔ کنول کو امید تھی کہ وہ اس بات کے جواب میں کچھ کہے گی مگر میری کی خاموشی اس کے لیے مزید دل گرفتگی کا سبب بنتی رہی۔

لمحے انتظار کے بعد شکایتی نظروں سے اس نے خاموش بیٹھی مہربانو کو دیکھا اور جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر کے یہاں وہاں دیکھتی میری سے کہا۔

"ٹھیک ہے اگر تم مجھے معاف نہیں کرتیں تو میں ابھی چرچ سے جا کر کسی کو بلا لاتی ہوں کہ وہ ہی اب ہمارے درمیان کا فیصلہ کریں۔" بات کرتے ہی وہ تیز قدموں سے اس سے پہلے کہ چرچ کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھتی، میری اس کی غیر متوقع بات پر بری طرح چونکتے ہوئے اس کے پیچھے لپکی اور ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"پتا ہے کنول! جب ہم ایڈمیشن کے بعد پہلی دفعہ ملے تھے تو یہی الفاظ تھے، یہی ہمارا رویہ تھا جو ہمیں ایک دوسرے کے اتنے قریب لے آیا کہ سب ہمیں رشتے دار خیال کرنے لگیں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ ہمارے یہی الفاظ اب ہمیں ایک دوسرے سے اس قدر دور لے جائیں کہ لوگ تو کیا ہم خود بھی ایک ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے باوجود ایک دوسرے کو اجنبی سمجھنے لگیں۔" سر جھکا کر کنول نے نفی میں سر ہلایا۔

"اپنے لفظوں کو ادھار کی رقم کی طرح سوچ سوچ کر اور احتیاط سے استعمال کرنے والے لوگ ہی ہر دل عزیز قرار پاتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ میں تمہارے لفظوں سے بہت بری طرح ہرٹ تو ہوئی تھی مگر اس بات کا بھی اتنا عرصہ اکٹھا رہنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ تمہاری سوچ ایسی نہیں ہے۔ بس شاید "پائے کے سالن" سے دوری ہی کی وجہ سے تمہیں جو فرسٹریشن تھی وہ تم نے مجھ پہ نکالی ہے۔" شگفتہ انداز میں کہے گئے میری کے آخری جملے نے تینوں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

"رئیلی لو یو میری! تم واقعی میری بہت اچھی دوست ہو۔" بے اختیار کنول، میری کے گلے لگ گئی تھی۔

مہربانو بھی دونوں کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی اپنا آپ ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ میری نے کنول کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے دل صاف کر کے یقیناً دوستی جیسے اہم رشتے کو بچایا تھا جس کے لیے خود مہربانو بھی اس کی شکر گزار تھی۔

"ویسے اگر آج تم مجھے معاف نہ کرتیں نا تو۔۔۔ میں ایک انتہائی قدم اٹھانے کا سوچ چکی تھی۔" چھوٹے بچوں کی طرح گردن نیچے کر کے اوپر دیکھتے ہوئے کنول نے اس انکشاف سے دونوں کو حیران کر دیا تھا۔

"کیا۔۔۔؟ آر یو میڈ؟" میری حیرت سے چیخی۔

"ہاں میں نے اچھی طرح سوچ لیا تھا کہ اگر تم نے مجھے معاف نہ کیا تو میں ہاسٹل جا کر۔۔۔" کنول نے منہ بسورتے ہوئے دونوں کو دیکھا جو حیرت سے آنکھیں پھیلائے اس کی طرف متوجہ تھیں۔

"کیا کرنے والی تھیں تم؟" مہربانو نے اس جذباتی لڑکی کو لمحہ بھر کے لیے انتہائی تشویش ناک نظروں سے گھورا۔

"یہی کہ اگر میری نے مجھے معاف نہ کیا تو میں ہاسٹل جا کر "پائے کا سالن" نہیں کھاؤں گی۔" بات ختم کر کے خود کنول ہی کی ہنسی کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ میری اور مہربانو بھی یوں بے ساختہ ہنسیں جیسے تیز دھوپ کے بعد ایک دم برسات ہونے لگی ہو۔ ہنسی کے ساتھ ہی اب وہ تینوں اسٹاپ کی طرف بڑھ رہی تھیں جہاں سے انہیں شاپنگ کرنے جانا تھا۔ کنول یہی سوچ رہی تھی کہ میری کو تو شاپنگ پسند ہے اس لیے مہربانو کے لیے بھی کوئی اچھی سی چیز پسند کرا کے بھی گفٹ کرے گی۔ یوں بھی وہ طے شدہ ٹائم ٹیبل کے عین مطابق ہی وقت پر چرچ سے واپس آ گئی تھیں جبھی مطمئن تھیں۔

☆☆☆

آج کا دن ہمیشہ گزرنے والے دنوں سے کچھ مختلف ثابت ہوا تھا۔ جبھی تو شاہ زین شام کے وقت حسب معمول جب آفس سے اپنے گھر کے لیے نکلا کچھ منفرد سا محسوس کیا۔

شاہ سائیں سے ملنے کے بعد سے اب تک وہ اپنی ذات میں جو تبدیلی محسوس کرنے لگا تھا اس کا سبب خود اس کی سمجھ سے باہر تھا اور یہ کوئی اس کی پہلی ملاقات بھی نہیں تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ علیحدگی میں آج اس کی ان سے پہلی ملاقات تھی اور شاید اسی لیے خود کو اہمیت دینے کے خیال سے وہ اپنے مزاج کو کچھ ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ آفس ٹائمنگ کے دوران ہی سب سے کچھ دیر پہلے ہی جب ثمینہ نے گھر سے اسے فون کیا تھا اور اسے گھر آتے ہوئے ایک گڈ نیوز کے بارے میں اشارہ دیا تھا، تب بھی اسے حیرت ہوئی تھی کہ آخر یہ آج کا دن اس کے لیے کیا کیا سمیٹ کر آنے والا ہے۔ اسی کیفیت میں گھر میں داخل ہوا تو رمین اپنی کتابیں سنبھالے نکل رہی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے رک کر اسے دیکھا، سلام کرنے کے انداز میں گردن کو نیچے کی طرف ہلکی سی جنبش دی اور آگے بڑھ گئی۔

"بھائی! آج اتنی دیر کر دی آپ نے۔۔۔؟ کب سے انتظار کر رہی ہوں آپ کا۔" ثمینہ نے اسے اندر آتا دیکھا تو صوفوں پر کشن ترتیب سے رکھنے کا عمل چھوڑ کر فوراً لپکی۔ اماں بھی قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں مگر اس کی آمد کی اطلاع ہوتے ہی قرآن پاک بند کر کے آنکھوں اور سینے سے لگانے کے بعد ہونٹوں سے لگا کر چوما اور جزدان میں لپیٹ کر رحل کے ساتھ ہی الماری کے سب سے اوپری شیلف میں رکھ کر ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"دیر۔۔۔؟" شاہ زین حیران ہوا تھا۔ "ٹائم دیکھو ذرا، بلکہ میں تو آج پانچ سات منٹ پہلے ہی آ گیا ہوں۔"

"ثمینہ۔۔۔! جاؤ بیٹا جلدی سے کھانا گرم کر دو، تب تک شاہ زین بھی ہاتھ منہ دھو لے۔" شاہ زین اماں کے پاس جا کر بیٹھا تو انہوں نے فوراً ثمینہ کو کچن میں جانے کا کہہ دیا ورنہ جانتی تھیں کہ ثمینہ فوراً سے پہلے شاہ زین سے وہی بات ڈسکس کرنا چاہے گی جس کے بارے میں وہ شام ہی کو اسے اشارہ دے چکی تھیں۔

نہ چاہتے ہوئے چار و ناچار ثمینہ کچن میں گئی اور منٹوں کا کام سیکنڈوں میں کرنے کی دھن میں لگ گئی۔ شاہ زین بھی اٹھا، آفس شوز اتار کر آرام دہ سلیپرز پہنے، موبائل چارجنگ پر لگایا اور ثمینہ کے کھانا رکھنے کے دوران کپڑے تبدیل کر کے آ بیٹھا۔ ثمینہ کو آج اس کے چہرے پر کچھ تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ خود اماں کو بھی لگا کہ جیسے آج کچھ منفرد سا ہے۔ جبھی خوشی سے مسکراتے لبوں کے ساتھ اسے دیکھے گئیں مگر ثمینہ بھلا اتنی دیر کہاں برداشت کرنے والی تھی جبھی سالن کا ڈونگا اور خالی پلیٹ شاہ زین کی طرف بڑھانے کے بعد سلاد سے گاجر کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے مخاطب اماں کو مگر در پردہ شاہ زین سے دریافت کرنے کے انداز میں آخر بول ہی پڑی۔

"اماں۔۔۔! آپ کو کیا لگتا ہے کہ صرف خوش خبری کا اشارہ دینے پر بھائی اتنے خوش ہیں تو مکمل خوش خبری پتا چلنے پر بھائی کا کیا ردعمل ہوگا؟"

"خوش خبری۔۔۔؟" شاہ زین کو جیسے کچھ یاد آیا۔

"ارے ہاں۔۔۔ وہ خوش خبری تو بتاؤ کہیں کالج کی چھٹیاں تو نہیں آ رہیں اگلے ہفتے؟" مسکراتے ہوئے شاہ زین نے پوچھا اور کھانے سے پہلے ایک گلاس پانی پینے لگا۔

"جی نہیں، کوئی چھٹیاں نہیں آ رہیں اور ویسے اگر آپ کو گڈ نیوز کے بارے میں یاد بھی نہیں تھا تو اتنے خوش باش ہونے کی کیا وجہ تھی؟"

نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے شاہ زین کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے جو ثمینہ کے منہ پر سجے تفتیشی انداز کو دیکھ کر مزید گہرے ہوئے تو اس نے استفہامیہ انداز سے دیکھتے ہوئے اماں کی طرف رخ موڑا جو کھانا کھانا چھوڑ کر بڑی پُرشفقت نظروں سے اسی کو دیکھ رہی تھیں۔

"کسی دوست سے ملاقات ہوئی ہے کیا آج؟"

''لیکن اماں! آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں؟'' مائیں اپنی اولاد کا چہرہ پڑھ سکتی ہیں، اس بات کا تجربہ اور یقین تو اسے پہلے سے تھا آج پھر تجدید ہوگئی تھی۔

''تمہارا چہرہ بتا رہا ہے بیٹا! کہ آج معمول سے ہٹ کر کچھ ایسا ضرور ہوا ہے جو تم بتانا چاہ رہے ہو۔'' چھوٹا سا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے وہ دھیما سا مسکرائیں۔

''ہاں بھائی! جلدی سے بتائیں کیونکہ میرے پاس بھی ایک گریٹ نیوز ہے آپ کو بتانے کے لیے۔''

''چلو پھر پہلے تم کہو کہ کیا بات ہے تمہارے پاس؟''

''نہیں بھائی! چیٹنگ نہیں چلے گی بالکل بھی، میں نے آپ سے پہلے پوچھا تھا اس لیے پہلے آپ ہی بتائیں گے۔''

''ارے ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔'' چمچے سے دہی پودینے کی چٹنی اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اس نے بات شروع کی۔

''دراصل آج ہماری فیکٹری کے اونر آفس آئے تھے، اُن کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھ کر جو بات چیت ہوئی، اس نے ذہن پر اتنا مثبت اثر ڈالا کہ بس تب سے پتا نہیں کیوں خود میں بڑی فریشنس محسوس ہو رہی ہے۔''

''ہاں بیٹا! ہوتا ہے ایسا بھی۔'' اماں نے تائید کی۔

''کچھ لوگوں کو بات کرنے کا ڈھنگ ہوتا ہے، الفاظ کی جادوگری سے ہر شخص آگاہی نہیں رکھتا، مگر جو لوگ حساس دل و دماغ اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں ان کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ دوسرے دلوں کو یک دم تسخیر کر لیتے ہیں۔''

''ہاں بالکل، میں بھی کہیں پڑھ رہی تھی کہ ایک نابینا شخص خالی ٹوپی سامنے رکھ کر بیٹھا تھا اور ساتھ ہی تختی لگا رکھی تھی کہ ''میں اندھا ہوں میری مدد کیجیے'' مگر کافی دیر گزرنے کے بعد بھی ٹوپی میں صرف دو چار ہی سکے گرے تو اس کی مخالف سمت میں موجود ایک شخص اٹھا اور تختی کی عبارت بدل ڈالی اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹوپی میں سکوں کی جھنکار بڑھنے لگی۔ پتا ہے اماں! اُس دکان دار نے کیا لکھ دیا تھا؟'' ثمینہ نے اماں کو مخاطب کیا اور ان کی مکمل دلچسپی محسوس کر کے اپنی بات جاری رکھی۔

''میں اندھا ہوں میری مدد کیجیے'' کو مٹا کر اس نے لکھا ''آج کل بہاروں کا موسم ہے، رنگ برنگے پھول کھلے ہیں مگر میں انہیں دیکھ تو کیا محسوس بھی نہیں کر سکتا۔ ایسے میں کیا آپ میری مدد نہیں کریں گے؟''

''مینشنز تو میں پہلے بھی اُن کے ساتھ شیئر کرتا ہوں مگر پتا نہیں کیوں اماں! آج کی ملاقات میں وہ خود سے قریب بھی محسوس ہوئے اور اپنائیت کا بھی احساس کچھ ایسا کہ گویا کوئی دوست بہت عرصے بعد ملا ہو، پہلے کبھی ایسے احساسات نہیں ہوئے میرے۔''

اماں نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔

''حالانکہ شاہ سائیں کی شخصیت میں اتنا رعب ہے کہ فیکٹری کے لوگ ان کے سامنے بہت محتاط رہتے ہیں، باوجود اس کے کہ انہوں نے آج تک کسی کو کچھ کہا بھی نہیں سب کے سامنے۔''

''شاہ سائیں۔۔۔!'' اماں نے زیرِ لب دوہرایا۔

''نام کیا ہے اُن کا؟''

''حیدر شاہ نام ہے اُن کا۔''

اماں نے غیر محسوس طریقے سے منہ میں جاتا نوالہ واپس رکھ دیا تھا۔

''اوہو اماں! ان باتوں کو چھوڑیں نا تاکہ میں بھی بھائی کو گڈ نیوز بتاؤں۔'' ثمینہ کو اپنی بات کرنے کی جلدی تھی۔

''اچھا چلو تم بتاؤ فوراً کیا بات ہے؟'' شاہ زین نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ اماں نے کھاتے کھاتے کیوں پلیٹ آہستگی سے پرے کھسکا دی تھی یہ بات دونوں محسوس نہیں کر پائے تھے۔

''ہم آپ کی شادی کر رہے ہیں اور وہ بھی میرٹ جنسی بنیادوں پر۔'' شرارت سے کہتے ہوئے وہ مسکرائی۔

''شادی۔۔۔؟ میری۔۔۔؟ تم ٹھیک تو ہو؟'' شاہ زین نے بے یقینی سے پہلے اسے اور پھر اماں کو دیکھا۔

''کیوں اماں۔۔۔! بتائیں نا بھائی کو کہ ہم آج کل ان کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہے ہیں۔'' شاہ زین نے ثمینہ کی بات پر استفہامیہ انداز میں اماں کو دیکھا جو ان دونوں کی بات پر تاثرات سے عاری چہرہ لیے بیٹھی تھیں۔

''اماں! کیا کہہ رہی ہے یہ؟''

''ہاں بیٹا! تو کچھ غلط بھی تو نہیں کہہ رہی نا، میرا خیال ہے کہ اب تمہاری شادی کر دینی چاہیے۔'' ایک گہری سانس کے ذریعے انہوں نے ذہن میں مجتمع خیالات کو رخصت کیا اور خود کو حال کا حصہ بناتے ہوئے شاہ زین کی بات کا جواب دے کر اسے مزید حیران کر دیا۔

''لیکن اماں۔۔۔ یہ سب، اس طرح کیسے؟'' گھر میں یہ معاملہ بغیر کسی وجہ کے بس یونہی غیر متوقع طور پر اٹھایا گیا تھا سو اس کا حیران ہونا لازمی تھا۔ یوں بھی تب اور اب میں بہت فرق تھا۔ اگر آج سے پہلے وہ سب کچھ نہ ہو چکا ہوتا جس کے بعد ندی اسے چھوڑ گئی تھی تو معاملہ قدرے مختلف ہوتا مگر اب تو وہ یہ سب سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ثمینہ اور اماں کی باتوں نے اس کی رگ رگ میں تھکن بھر دی تھی۔ تبھی ان کا جواب سنے بغیر ہی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اس سے پہلے اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ کبھی وہ یوں ماں کے سامنے سے اٹھ کر تنہائی کی تلاش میں چلا آیا ہو۔ مگر وہ ان کے سامنے اپنا ضبط توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس قدر جذباتی پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے کمرے میں آ پناہ لی۔ بصورت دیگر اسے ہمیشہ سے اپنے احساسات و جذبات پر مکمل کنٹرول رہا تھا۔ نہایت ٹھنڈے اور دھیمے مزاج کا مالک ہونے کے باوجود جانے کیوں اس وقت وہ انتہائی جذباتی کیفیت کے زیر اثر تھا۔

اماں اور ثمینہ نے خاموشی سے اسے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔

ثمینہ نے چپ چاپ ٹیبل پر سے کھانے کے برتن سمیٹ کر کچن میں رکھے۔ چند لمحوں پہلے اس کے مزاج میں اتری شوخی سردی کی دھوپ کی طرح اچانک ہی کہیں جا چھپی تھی۔ لگتا تھا جانے کتنے ہی عرصے سے گھر کی دیواروں پر خاموشی کا ڈیرہ ہے۔ اماں نے جان بوجھ کر شاہ زین کو کچھ دیر کے لیے تنہائی کو سونپا مگر پھر برداشت نہ ہو سکا تو اٹھ کھڑی ہوئیں مگر اپنے ساتھ ہی کھڑی ہوتی ثمینہ کو دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے شاہ زین کے کمرے کی طرف بڑھیں۔

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا
اب اس کا حال سنائیں کیا
کوئی مہر نہیں کوئی قہر نہیں
پھر سچا شعر سنائیں کیا

بنا آہٹ کے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتی اماں کے قدم تو وہیں کمرے کی دہلیز پر ہی رک گئے تھے۔ بیڈ کے دائیں طرف آرام دہ کرسی پر آنکھیں سامنے رکھی کتابوں پر جمائے اس وقت وہ خود اپنے ہی وجود سے بے خبر معلوم ہو رہا تھا۔ ندی سے دوری ہونے کے بعد اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمکتی دمکتی روشنیوں کی جو لہریں خود اماں نے دیکھی تھیں وہ اب ماند پڑ چکی تھیں۔ عجیب بے حس و حرکت انداز میں یوں اسے سامنے بک ریک پر نظریں گاڑے دیکھ کر اماں کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ ساتھ والے گھر میں بجتے دھیمے میوزک کا فسوں تھا یا اندرونی خلفشار۔۔۔ اماں کے اپنے کمرے میں آمد کو وہ ہرگز محسوس نہیں کر پایا تھا۔

اک آگ غمِ تنہائی کی
جو سارے بدن میں پھیل گئی
جب جسم ہی سارا جلتا ہو

پھر دامنِ دل کو بچائیں کیا

انہیں اُس پل شدت سے احساس ہوا تھا کہ شاہ زین کس قدر تنہا ہے، نہ دوست نہ رشتے دار۔۔۔ وہ پھر سے اپنے اُسی خول میں سمٹ کر رہ گیا تھا جس میں ندی سے ملنے کے بعد دراڑ پڑ گئی تھی۔ اپنی ذات کی قید میں وہ رفتہ رفتہ بے بس ہوتا جا رہا تھا اور اپنے اکلوتے بیٹے کی یہ کیفیت دیکھ کر خود اماں کا دل لہو لہو ہو رہا تھا۔ مگر کیا کرتیں خود وہ بھی تو بے بس و مجبور تھیں۔ ہزار چاہنے کے باوجود بھی وہ اس کے دل کی یہ خواہش پوری نہیں کر پا رہی تھیں اور بدلے میں چاہتی تھیں کہ وہ حالات سے سمجھوتہ کرے، بالکل اسی طرح جیسے وہ بچپن سے اپنے ہم عمر اور کلاس فیلوز کے پاس مختلف چیزیں دیکھ کر کرتا آیا تھا مگر اب معاملہ قدرے مختلف تھا اسی لیے دل کی طرف سے مزاحمت کا گراف بھی نسبتاً بلند تھا۔

اماں ہلکے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس آئیں اور بیڈ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئیں تو ان کی آمد کا احساس ہوتے ہی وہ چونکا۔ انہیں یوں اچانک بنا آہٹ کے اپنے سامنے دیکھ کر وہ چند لمحے کے لیے حیران ہوا مگر پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر حسبِ عادت ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ اماں کی انگلیاں اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے اپنے ہونے کا احساس دلا رہی تھیں جبکہ آنکھیں بند کیے شاہ زین کا ذہن اس وقت بالکل خالی تھا، دماغ بھی سن لگ رہا تھا۔ باوجود کوشش کے وقت کا دماغ سے کوئی بھی رابطہ نہیں بن رہا تھا اور اسی کو مگوی کیفیت میں وہ بہت دیر تک خاموش رہنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ ندی کے لیے اپنے جذبات کو بس خود تک ہی محدود رکھ کر اپنی وجہ سے کبھی بھی اماں کو پریشان نہیں کرے گا مگر کیا کرتا آج آخر ایسا ہو گیا تھا اور پھر وہ بھی تو ایک انسان ہی تھا۔ آخر کب تک اپنے اوپر ملمع چڑھائے اماں اور ثمینہ کے سامنے اداکاری کرتا رہتا سو آج شاید وہ تھک گیا تھا۔

”کیا بات ہے؟ تمہیں اچھا نہیں لگا یہ تذکرہ؟“ اماں کی دھیمی مگر پُر شفقت آواز پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”آپ کو کیا لگتا ہے اماں؟ مجھ سے تو کہیں زیادہ آپ سمجھتی ہیں نا مجھے۔“ سر اٹھا کر اس نے اماں کو دیکھا تو ان کے لیے کچھ بھی کہنا مشکل سا ہو گیا۔

”میری جان، زندگی میں ہمیشہ وہ سب تو نہیں ہو پاتا جس کی ہم توقع کر رہے ہوں اور اسی کا نام زندگی ہے۔ جسے ہم نے اس کی تمام تر تلخ و شیریں حقیقتوں کے ساتھ قبول بھی کرنا ہے۔“ شاہ زین کی سرمئی آنکھوں میں زندگی ساکت و جامد حالت میں ہونے نہ ہونے کے درمیان کہیں معلق تھی۔

”دن کے کسی پہر کمرے میں بھاری سیاہ پردے گرا کر اور روشنی کی تمام راہیں بند کر کے اگر ہم رات تخلیق کر لیں یا رات کو ہزاروں روشنیاں جلا کر اپنا کمرہ جگمگا لیں تو پھر بھی دن اور رات دونوں اپنی جگہ اسی طرح قائم و دائم رہیں گے اور اس جھوٹی تسلی کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہوگا، یہ بات تم اچھی طرح جانتے بھی ہو اور سمجھتے بھی۔۔۔ سمجھتے ہو نا؟“

انہوں نے اس بات کی یقین دہانی کرنی چاہی تھی کہ آیا وہ ان کی باتیں سن رہا بھی ہے یا نہیں مگر جواب میں اثبات میں گردن ہلاتے شاہ زین کو دیکھ کر اب وہ مطمئن ہو گئی تھیں سو بولیں۔

”بیٹا! کبھی بھی کسی بھی انسان کی طرف سے کی گئی ناقدری پر نہ کڑھنا کیونکہ قدر و قیمت کا تعین ہمیشہ وقت کرتا ہے اور درجات اوپر متعین ہوتے ہیں۔ اگر انسانی رویوں میں الجھو گے تو زندگی بھر الجھے رہو گے۔ بس عیب اور غیب کے جاننے والے کے ساتھ اپنے معاملات سلجھائے رکھو۔ ساری الجھنیں اور مسائل دور ہو جائیں گے۔“

شاہ زین نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اس صبر کے پیکر کو دیکھا تو دل جیسے درد سے بھرتا چلا گیا۔ آج تک اپنی زندگی میں انہوں نے کون سا سکھ دیکھا تھا۔ خوشیوں کا موسم کب ان کی ذات پر اترا تھا، خود شاہ زین کو یاد نہیں پڑتا تھا۔ جوانی میں ہی بیوگی کی چادر اوڑھ کر جس طرح سے انہوں نے بغیر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے اپنے بچوں کی پرورش کی انہیں تعلیم دلائی یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ میکے اور سسرال کا کوئی بھی فرد ان سے آخری بار کب ملا ہو، یہ شاید انہیں خود بھی یاد نہیں ہوگا۔ ان کی اپنے بچوں کے ساتھ اس قدر محبت اور ان کے لیے کی گئی دن رات کی شبانہ روز محنت ہی تھی جس نے انہیں محلے کے تمام باسیوں میں انتہائی معتبر بنا دیا تھا۔

آج سے پہلے ان کی زندگی میں آنے والی مشکلات اور دکھوں کو کم کرنا شاہ زین کے بس کی بات نہیں تھی۔ مگر اب جب کہ وہ اپنی زندگی میں آنے والی اس ممکنہ خوشی کی آس اس کی ذات سے لگائے بیٹھی ہیں تو کیا وہ ان کی خوشی کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا اور اگر وہ ابھی ان کے اس ارادے کو ملتوی بھی کر لے تو کیوں؟ کس کے لیے؟ اور کس کے انتظار میں؟

اس نے دل گرفتگی سے سوچا۔

یوں بھی ہم زندگی کو محض انفرادی طور پر صرف اور صرف اپنی زندگی سمجھ کر بھی تو نہیں گزار سکتے کیونکہ ہماری زندگی میں بہت سے دوسرے لوگوں کا بھی حصہ اور حقوق شامل ہوا کرتے ہیں اور اگر ہم اپنے حصے کے اور کیے جانے والے حقوق اور فرائض کو رد کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے بھی تو امکان غالب ہے کہ خود زندگی ہمیں روند کر رکھ دے اور اب یہ وقت شاہ زین کے لیے اپنے حصے کے حقوق اور فرائض ادا کرنے کا تھا جبھی چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے اماں کے ہاتھ تھام لیے۔

”میں آپ کی بات کبھی ٹال سکتا ہوں کیا؟“

خاموش آنکھوں مگر مسکراتے ہونٹوں سے شاہ زین نے ان کے آگے سر جھکا کر گویا ان کے جینے کی عمر دگنی کر دی تھی۔ جس طرح سوتے جاگتے کی کیفیت انتہائی اذیت ناک ہوتی ہے اور چند لمحوں کی گہری نیند بھی ذہن کو پرسکون کر دیتی ہے بالکل اسی طرح وہ آج تک ندی اور اس کی یادوں میں جکڑا ہونے کے باعث جس اذیت سے دوچار تھا اور اس سے بڑھ کر اماں اور ثمینہ کے سامنے جو ہر وقت خوش رہنے کی اداکاری کرنا پڑتی تھی اس نے شاہ زین کو اب تھکا دیا تھا۔ یہ امر اپنی جگہ ایک روشن حقیقت کی طرح موجود تھا کہ شاہ زین کو ندی سے محبت تھی اور رہے گی جو جگہ اس کے دل میں ندی کے لیے ہے وہ اب کسی اور کو دینا خود شاہ زین کے بس کی بات نہیں تھی مگر وہ اتنا خود غرض بھی نہیں تھا کہ اماں کی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیتا، ان کے جذبات، ان کے ارمان، ان کی چھوٹی چھوٹی حسرتیں اور خواہشات بھی تو اسی نے پورے کرنے تھے۔

سو بے حد سوچ و بچار کے بعد اس نے بغیر کسی بحث کے اماں کی خواہش کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ انہیں بتا دیا تھا کہ اس کے لیے اُن کی خوشی سے بڑھ کر نہ تو دنیا کا کوئی جذبہ اہم ہے اور نہ ہی کوئی احساس اور اُن کے ساتھ جڑا یہ پکا اور کھرا رشتہ اس کے لیے دنیا بھر کے تمام رشتوں سے معتبر بھی ہے اور سچا بھی۔

مختصر الفاظ میں آج شاہ زین نے اماں کو اپنی آنے والی تمام زندگی کے لیے پاور آف اٹارنی تھما دی تھی اور تب ایک بار پھر اماں نے اس کی خوشیوں کے لیے دل سے دعا کی تھی۔ ایک بار پھر اس نے اماں کے گھٹنے پر سر ٹیک دیا تھا، اُن کی انگلیاں پھر سے اس کے بال سنوار رہی تھیں اور دل بے اختیار دعائیں دیے چلا جا رہا تھا۔ تب شاہ زین نے آخری مرتبہ ندی سے بات کرنے کا سوچا جو اب تک یقیناً اس کی بھابھی کی اطلاع کے عین مطابق کسی اور کی ہو چکی تھی۔ ”تو کیا اب اس کا ندی سے بات کرنا مناسب ہوگا؟“

دماغ پھر سے عقل کی چھڑی تھامے سامنے آن کھڑا ہوا تھا مگر اس نے فی الحال کچھ بھی سوچنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

گول ٹکیا سے زرد سورج کی شعاعیں دھیرے دھیرے منعکس ہو رہی تھیں۔ شام کے سائے بڑھ

آہستگی اور غیر محسوس طریقے سے کھجور، ناریل اور یوکلپٹس کے درختوں پر اپنا عکس ثبت کیے جا رہے تھے۔ لان کی سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر پام کے پودوں کی بے حد قریب محرابی سیڑھیوں کے ساتھ بالکونی سے گرتی بوگن ویلیا کی شاخیں زمین کی سمت جھکی سبک ہوا کے ساتھ یہاں وہاں خراماں خراماں جھول رہی تھیں۔ پام کے مور پنکھ جیسے پتوں والے پودے ہوں یا بوگن ویلیا کی کاسنی پھولوں سے ڈھکی ہلکورے لیتی بیل، بلوبیل کے پھول ہوں یا گلاب، چنبیلی اور موتیے کے خوب صورت پودے، آج بھی کی چھب نرالی نظر آتی تھی اور کیوں نہ آتی منشی چاچا کی زیر نگرانی ایک ایک پودے کو رنگین برقی قمقموں سے سجا جو دیا گیا تھا۔ وسیع و عریض لان میں گھاس کا سبز قالین بچھا تھا۔

تین چار ملازمین بڑی تن دہی سے ان مقامات پر مچھر مار اسپرے کرنے میں مصروف تھے جو فرداً فرداً ان کے ذمے لگائی گئی تھیں۔ میران بھی لان کے عین وسط میں دائیں سے بائیں ٹہلتا ہوا فون پر کسی سے بات چیت میں مصروف تھا۔ اس کی باڈی لینگویج سے یہ بات جاننا بالکل مشکل نہیں تھا کہ کوئی کام اس کی مرضی کے برعکس ہونے جا رہا ہے جسے وہ روکنے کی کوشش میں ہے۔ فون پر اس کے اس طرح بات کرنے یا سمجھانے کا انداز شاذ ہی دیکھا جاتا تھا اور شاید ابھی مزید کچھ دیر وہ اسی طرح بے چینی کے عالم میں یہاں سے وہاں چکر کاٹتا رہتا کہ حویلی کے بیرونی اطراف سے گاڑی کے نامانوس ہارن کی آواز پر فون بند کر کے اس طرف متوجہ ہوا۔

اسلحے سے لیس چوکیدار نے بڑی سرعت سے گیٹ کھولا۔ حسب معمول دایاں ہاتھ ماتھے تک لے جا کر معمولی سا جھکتے ہوئے سلام کیا اور گاڑی کے اندر داخل ہو جانے کے بعد اسی تیزی سے گیٹ بند بھی کر دیا۔ بیش قیمت گاڑی روش پر سے گزرتی ہوئی وسیع و عریض لان کا فاصلہ طے کر کے پورچ تک پہنچ کر رک گئی تھی۔ جہاں اس سے پہلے میران کی چمچماتی سیاہ جیپ موجود تھی۔ میران کی Luxus کی جیپ، سائیں کے زیر استعمال Porsche اور اب ... والی گہری سرمئی رنگ کی Rolls Royee۔۔ روپیہ پیسہ بڑی خاموشی سے گفتگو کیے جا رہا تھا۔

چند ہی ساعتوں بعد سفید کلف دار شلوار سوٹ کے ساتھ، تلے والی سنہری جوتی پہنے رحمٰن شاہ گاڑی سے نکلا۔ نزدیک ہی موجود مزارعوں کے سلام کا جواب دینے کا تکلف کیے بغیر ایک اچٹتی ہوئی نظر چاروں طرف کی گئی آرائش و زیبائش پر ڈال کر میران کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اس کے اپنی طرف بڑھتے قدموں کی پروا کیے بغیر اندر کی طرف چل دیا۔ میران جو پہلے ہی فون پر ہونے والی بات چیت کے نتیجے میں اکھڑا اکھڑا سا تھا اب رحمٰن شاہ کے اس رویے نے اسے جلا کر رکھ دیا تھا اور رحمٰن شاہ کا تعلق ایک تو اس کے ننھیال سے تھا اور پھر اب مستقبل قریب میں وہ جس رشتے پر فائز ہونے جا رہا تھا اس نے میران کو ہر صورت احتیاط اور صبر کا دامن تھامنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر دراصل حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کا زور ہمیشہ اپنے سے نیچے والوں پر ہی چلتا ہے۔ اس بھول کے ساتھ کہ بعض اوقات زمین پر پڑا، بظاہر حقیر سا پتھر بھی اسے منہ کے بل گرا سکتا ہے۔ سو ہاتھ میں تھامے ہوئے موبائل کو بند مٹھی میں بھینچتے ہوئے حویلی کے اندر پہنچے تو دیوار پر ٹانگے گئے بارہ سنگھے کے سینگوں کے عین نیچے موجود صوفے پر رعب اور طنطنے کے ساتھ رحمٰن شاہ کو بیٹھے دیکھا۔ آگے بڑھ کر مصافحہ کرنے کے بعد میران نے سامنے ہی کڑھائی والی رنگین چادر اوڑھے ملکانی سائیں کو کندھے جھکائے بیٹھے دیکھا تو ایک عجیب سے احساس نے آن گھیرا۔

وہ آج تک کبھی بھی کسی کے بھی سامنے یوں ہار مان کر بیٹھی نظر نہیں آئی تھیں۔ چال ڈھال میں تو اکڑ تھی ہی مگر بیٹھتی بھی یوں تھیں کہ ریڑھ کی ہڈی تک میں خم نہ آنے دیتیں۔ گردن بھی کھجور کے درخت کی طرح ہمیشہ سیدھی ہی رہتی مگر آج۔۔۔ ان کا یوں شکست خوردہ سا چہرہ۔۔۔ میران کو لگا تھا جیسے کہ اس کے دل میں ماں کے لیے محبت آج پہلی دفعہ جاگی ہو، ایک عجیب طرح سے اس کے ذہن میں جیسے نامانوس سے جذبات ڈوب اور ابھر رہے تھے۔ سامنے بیٹھی ملکانی سائیں کا چہرہ سر شام ڈوبنے والے چاند کی مانند بے رنگ تو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور پھر اس وقت رحمٰن شاہ کے سامنے ان کا یوں بیٹھنا گویا سیاہ فام مفتوح کا سفید فام قیدی حاکم کی یاد دلا رہا تھا اور عجب اسے پتا نہیں کیوں سامنے بیٹھا شخص تب ہی برا لگا تھا۔ جبھی خاموش قدموں سے چلتا ہوا اس صوفے تک پہنچا جس پر ملکانی سائیں بیٹھی تھیں۔ ان کے دائیں طرف کی نشست پر سوتی اپنے اگلے ہونٹ پر سر رکھے بیٹھی گول مٹول آنکھوں سے ملکانی سائیں کو دیکھ رہی تھی سو میران نے بائیں طرف جگہ سنبھالی تو رحمٰن شاہ نے اپنی بات دوبارہ سے شروع کی جسے وہ یقیناً اس کے آنے سے پہلے کر رہا تھا۔

"چاچی! یہ تو تمہیں بھی پتا ہے نا کہ نہ تو میرا باپ سگا اور نہ ہی ماں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ جب باقی سارے کام تو بے شک وہی کریں گے مگر مہربانو کے لیے کپڑے، جوتے، زیور وغیرہ یہ سب میں خود ہی خریدوں گا۔ بس مجھے انگوٹھی وغیرہ کا ناپ دے دو۔"

ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بائیں پاؤں کو ہلاتے رحمٰن شاہ نے بازو صوفے کی پشت پر دراز کرتے ہوئے کہا تو ملکانی سائیں نے چور نظروں سے ساتھ بیٹھے میران کو دیکھا اور ہچکچاتے ہوئے بولیں۔

"ہاں تے پتر وہ تے سب ٹھیک ہے پر۔۔۔"

رحمٰن شاہ کی پیشانی پر چند سلوٹیں بڑی سرعت سے نمودار ہوئی تھیں۔ میران شاہ البتہ خاموشی سے بیٹھا ان دونوں کے تاثرات جانچ رہا تھا۔

"میرا مطلب ہے کہ اگر شادی بعد وچ کر لیتے تے فیر۔۔۔؟"

"بعد میں۔۔۔؟" رحمٰن شاہ فوراً سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

"او چاچی! بعد میں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کوئی کھیتوں کو پانی لگانا ہے یا فصلوں میں کیڑے مار دوا کا اسپرے کرنا ہے کہ آج نہیں تو کل کر لیں گے۔"

ملکانی سائیں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر رحمٰن شاہ کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

"اور میرا احسان مانو چاچی احسان، کہ اس سے شادی کر رہا ہوں ورنہ اس قبیلے کے لیے مہربانو کو اگلے بارہ سال تک بٹھائے رکھنا تاکہ دولہا سے شادی کرنے کے لیے کم از کم بالغ ہو جائے۔" احسان جتاتے ہوئے رحمٰن شاہ نے بڑا گہرا طنز کیا تھا جس پر میران کا ردعمل یقینی تھا۔ یوں بھی کسی بھی عمل پر ردعمل کے حق سے دستبردار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان فطرت کی طرف سے جذبات کے باب میں رکھے گئے اپنے حصے سے دستبردار ہو رہا ہے۔ اچھا یا برا، شدید یا کم مگر ردعمل بہرحال فطرت کا خاصہ ہے۔

"یہ آپ کس لہجے میں بات کر رہے ہیں اماں سائیں سے؟ یہی بات آرام سے اور دھیمے لہجے میں بھی تو ہو سکتی ہے کہ نہیں۔" میران کے لفظوں سے زیادہ اس کی باہر کو ابلتی آنکھیں بول رہی تھیں۔ رحمٰن سے اپنی تعلق داری کا لحاظ تھا ورنہ شاید اب تک وہ اس کا گریبان پکڑ چکا ہوتا۔

"چل چل منہ بند رکھ اپنا۔ تیرے تو میں منہ نہیں لگنا چاہتا۔۔۔" رحمٰن شاہ کی آواز مزید بلند ہوئی۔

"اور یہ جو آنکھیں دکھا رہا ہے نا مجھے، نکال کر ہاتھ پہ رکھ دیتا اگر تیرے ننھیال والوں کا لحاظ نہ ہوتا تو۔۔۔" میران شاہ بھلا اس طرح کی دھمکیاں سننے کا کب عادی تھا ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا مگر اس سے پہلے کہ آگے بڑھتا یا مزید کچھ کہتا ملکانی سائیں بڑی سرعت سے اس کے آگے دیوار بن کر کھڑی ہو گئیں۔

"پتر! یہ کیا کر رہے ہو دونوں۔ او ماں صدقے جائے رحمٰن سوہنا میں نے تے بس اک بات کی تھی پر توں تے ایک دم ہی غصہ ہو گیا۔"

"جانتا ہوں چاچی سب جانتا ہوں، تیری اک بات کے پیچھے بھی سو باتیں ہوتی ہیں ہمیشہ۔" ایک زہر خند مسکراہٹ میران کی طرف اچھالتے ہوئے ایک بار پھر اس نے ملکانی سائیں کو دیکھا۔

"اور چاچی سمجھا دے اپنے لاڈلے کو بھی۔۔۔ ادب کیا کرے اب میرا، آخر کو اس کی بہن کا گھر والا بننے والا ہوں۔"

میران اس بات کے جواب میں محض دانت پیس کر رہ گیا تھا۔

"اگر تھوڑا سا بھی پڑھ لکھ جاتے تو شاید خود بخود ادب کرنے لگتے۔ مگر اب ویسے نہ سہی تو اپنی بہن ہی کے واسطے رحمٰن بھائی عزت تو آپ کی کرنی ہی پڑے گی۔"

رحمٰن شاہ اس وقت میران کے ضبط کا امتحان بنا ہوا تھا اور ہزار بار زبان کو دانتوں تلے دبا کر رکھنے کی کوشش کے باوجود بھی بات منہ سے نکل ہی گئی۔ حالانکہ وہ اپنے اور اس کے درمیان نئے جنم لینے والے رشتے کی باریکی سے بخوبی واقف بھی تھا اور اسے یہ احساس بھی تھا کہ اس کے منہ سے نکلا ہوا کوئی بھی ایسا لفظ جو رحمٰن شاہ کی ناپسندیدگی کا باعث بنے وہ مہربانو کی زندگی میں بھی تلخیاں گھول سکتا ہے۔ مگر کیا کرے اسے زبان پر قابو رکھنے کی عادت ہی نہیں تھی جبھی یہ پہلی کوشش بھی مکمل طور پر ناکام ثابت ہوئی۔ مگر خلافِ توقع اور حیرت انگیز طور پر رحمٰن شاہ کا قہقہہ اس کے ساتھ ساتھ ملکانی سائیں کو بھی چونکا گیا تھا۔

"ہاہاہا۔۔۔ اچھا ہی ہے نا میں نہ تو تیری طرح یونیورسٹی گیا، ورنہ ہی کسی لڑکی نے دُم پکڑ کر باہر پھینکا، آخر عزت تو ہے نا میری، کوئی گالی دے تو اس کی زبان کھینچنے کی تو ہمت ہے میرے اندر۔" زہر میں گھلی ہلکی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انتہائی تلخ جملوں کو ان کی سماعت کے حوالے کرتا رحمٰن شاہ میران کے لیے مکمل طور پر سیر کے ساتھ سوا سیر بنا ہوا تھا اور ملکانی سائیں جو میران کے ساتھ یونیورسٹی میں ہونے والے تمام واقعات کی تفصیل سے ناواقف تھیں، نا سمجھی سے ان دونوں کے چہرے دیکھنے لگیں۔ غصے کے مارے میران کا برا حال تھا اور جس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنے غصے کا اظہار کر نہیں پا رہا تھا۔

"رحمٰن سوہنیا کنا مسلیاں (مسئلوں) وچ پے گئے ہو؟" میران کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کی تنبیہ کرتے ہوئے خوشامدی انداز اختیار کرتے ہوئے انہوں نے موضوع بدلنا چاہا تھا۔

"چاچی! کوئی ناپ دے دے، انگوٹھی اور چوڑیوں کا، نہیں تو میں اندازے سے ہی ہو بتا دوں۔"

"رات کو نو بجے پتر میں نے بات کرنی ہے اس سے، حویلی آنے کا کہوں گی نا فیر توں کل یا پرسوں آ کے تے ناپ لے جائیں۔"

"ہوں۔۔۔" رحمٰن شاہ نے پُرسوچ انداز میں مونچھوں کو بل دیا اور گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟ نو بجے سے پہلے وہ بات نہیں کر سکتی؟"

"اس کا مسئلہ نہیں ہے پتر! میتوں بہت کم ٹیم ہے ابھی، بس ایسی لئی۔"

"ویسے چاچی ایک بات مانے گی میری؟" ... جھجکتے ہوئے اس نے میران کے وجود کو مکمل طور پر نظر انداز کر رکھا تھا۔

"آج نہیں تو اور دو چار دنوں میں ہماری شادی تو ہونے ہی والی ہے تو۔۔۔ اگر مجھے مہربانو کا نمبر مل جاتا تو۔۔۔"

"یہ رسم و رواج ہمارے خاندان کے نہیں ہیں بھول گئے کیا آپ۔۔۔" میران نے لفظ چباتے ہوئے کہا تو رحمٰن شاہ کے لہجے کی تلخی پھر سے لوٹ آئی۔

"وہاں اتنی دور غیر مردوں کے ساتھ تعلیم پڑھائی کرنا اور تمہارا یہاں اجنبی لڑکیوں کے ساتھ عیاشیاں کرنا، ہاں یہ بھی تو رسم و رواج ہیں ہمارے خاندان کے۔ ہے نا چاچی؟" ملکانی سائیں نے بے چارگی سے میران کی طرف دیکھا۔

"اگر کسی کے بھی دل میں کوئی غلط فہمی ہے تو وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لے کہ ان حیلوں بہانوں سے میں اپنے حق سے پیچھے ہرگز نہیں ہٹوں گا۔ ساری دنیا کو پتا ہے کہ میں بارات لے کر آؤں گا عین اُسی روز جب ہمارا یہ شہزادہ بارات لے کر جائے گا۔ یہی بات ہوئی تھی نا چاچی تیرے بھائیوں کے سامنے۔۔۔" رحمٰن شاہ نے تائید چاہی۔

"او تے سب ٹھیک ہے پر ایہہ گل ٹھیک نہیں کہ مہربانو کی تعلیم مکمل ہو جائے۔"

"نہ چاچی نہ، تعلیم مکمل کر کے بھی تو اس نے تیری طرح ملکانی بن کر حویلی میں ہی بیٹھنا ہے نا تو پھر کیا ضرورت ہے اتنے سال اور ضائع کرنے کی۔ ویسے بھی میں لڑکیوں کو پڑھانے لکھانے کے حق میں نہیں۔ قرآن پڑھیں اور اللہ اللہ کریں بس۔۔۔" بات ختم کر کے رحمٰن شاہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"چاچی تیرے لیے اماں سائیں نے جھمکا سیٹ بنوایا ہے، وہ بھی کنگن سمیت، بابا سائیں بھی سگے نہ ہونے کے باوجود پیسہ ہوا کی طرح اڑا اور پانی کی طرح بہا رہے ہیں۔"

جواب میں مکمل خاموشی تھی۔ جسے رحمٰن شاہ نے اچھی طرح محسوس کیا اور اسی بات کے ردعمل کے طور پر جاتے ہوئے سلام دعا کیے بغیر باہر نکل گیا۔ البتہ اس کے ملبوس سے اٹھتی تیز خوشبو دیر تک ملکانی سائیں اور میران کو اس کی موجودگی کا احساس دلاتی رہی۔

اور اسی دن درحقیقت میران کو احساس ہوا کہ وہ ایک بہن کا بھائی ہے اور اسی کی خاطر آج وہ رحمٰن شاہ کی عزت کرنے پر خود کو زبردستی آمادہ کرتا رہا تھا۔ کیا یہ رشتہ واقعی اتنا پاور فل ہے کہ آج وہ اپنی عادت کے برعکس صبر کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ملکانی سائیں جو ہمیشہ ہر ایک کے ساتھ انتہائی فاصلہ رکھ کر بڑے رکھ رکھاؤ سے بات کیا کرتی ہیں، آج رحمٰن شاہ کے سامنے خوشامدی لہجہ اپنانے پر مجبور ہو گئیں۔ کیا بیٹیوں کے والدین اس قدر بے بس ہوتے ہیں؟ رحمٰن شاہ جو کہ شادی سے پہلے ہی اس انداز میں بات چیت کر رہا ہے تو داماد ہونے کے منصب پر بیٹھتے ہی اس کا اندازِ گفتگو کیا ہونے والا ہے؟ اور اگر اتنی زمین جائیداد اور روپے پیسے کی مالکن ہوتے کے باوجود بیٹی کا معاملہ سامنے ہونے پر ان کا انداز ایسا تھا تو عام لوگوں کو کیا کیا نہیں سہنا پڑتا ہوگا ان مکار اور جلاد نما دامادوں کے ہاتھوں۔

اور رحمٰن شاہ جیسے لوگ جو اپنے ساس سسر کے ساتھ اس طرح کا سلوک روا رکھتے ہوں تو وہ ان کی نازوں پلی بیٹیوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار نہیں کرتے ہوں گے۔

اور سچ ہی تو ہے کہ زیادہ تکلیف دہ دانت کا درد، بازو کا یا سر کا نہیں ہوتا بلکہ سب سے زیادہ تکلیف دہ درد وہی ہوتا ہے جس میں انسان خود مبتلا ہو، جو دکھ ہم خود محسوس کرتے ہیں وہی ہمیں سب سے بڑا دکھ معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے آج میران شاہ کے یہ احساسات تھے۔ اس نے ملکانی سائیں کو دیکھا جو سوفی کو سینے سے لگائے اس کے نرم و ملائم فر جیسے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے صوفے کی بیک سے اپنی پشت ٹکا کر بند آنکھوں سے جو کچھ سوچ رہی تھیں۔ آج میران کے لیے یہ کوئی معمہ نہ تھا۔ اس نے چاہا کہ آگے بڑھ کر انہیں کچھ مطمئن کرے مگر ہاتھ میں پکڑے موبائل فون کی اپنی طرف متوجہ کرتی آواز سن کر اس کی اسکرین پر جگمگاتا نام دیکھ کر باہر نکل آیا۔

☆☆☆

☆☆☆

پڑے جب دھوپ تو سر پر کبھی سایہ نہیں کرتے
ہم ایسے دوستوں پر وقت کو ضائع نہیں کرتے
ہنسی جن کی کبھی سورج کی کرنوں سی مثالی تھی
تمہارے بن قسم لے لو وہ مسکایا نہیں کرتے
تمہاری یاد میں گزرا ہوا ہر پل اثاثہ ہے
تمہاری یاد میں تو گل بھی مرجھایا نہیں کرتے

خدا اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ضرور ہے مگر پھر اس آزمائش سے نکلنے کی تدبیر بھی انسان کے ذہن میں وہی ڈالتا ہے اور جب اس تدبیر کے عمل میں آنے کا وقت ہو تو حالات کو سازگار اور موافق بنانے کی ذمہ داری بھی اسی کی ہوتی ہے۔

ندی کی مخصوص بیل کی آواز سن کر عادل کو سلاتی

ثروت آپا اور بیڈ روم میں موجود عائشہ بھابھی لمحہ بھر کے لیے چونکی ضرور تھیں مگر پھر ثروت آپا اوں آں کرتے ننھے منے کی جانب متوجہ ہو گئیں اور عائشہ بھابھی کی توجہ اسی وقت بجتے فون نے اپنی جانب مبذول کروالی۔ البتہ دل کے بے حد گھبرانے پر کمرے سے نکل کر لان میں موجود چترالی سیڑیوں کی کرسی پر بیٹھی امی کی جان گویا کسی نے مٹھی میں لے لی تھی اور دل اچھل کر حلق میں چلا گیا۔ بیل دینے کے اس انداز سے ندی کے علاوہ کسی اور کا ہونا خارج از امکان تھا۔ جبھی سوکھتے حلق اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ یہاں وہاں دیکھ کر وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی تمام تر ہمت جمع کر کے بیرونی گیٹ کھول کر دیکھا مگر وہاں کسی کو بھی نہ پا کر مایوسی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔

"کوئی بھی نہیں ہے؟"

دائیں بائیں دیکھتے ہوئے انہوں نے خود کلامی کی پھر گیٹ کے عین بائیں طرف موجود نیم کے درخت کے موٹے سے تنے کے پیچھے چادر میں لپٹی پٹائی ندی کو دیکھا تو اس پل انہیں ایسا لگا جیسے وہ بھی اپنی ٹانگوں پر مزید کھڑا نہیں رہ پائیں گی۔

"ندی بیٹا۔۔۔!"

ان کی آواز سنتے ہی ندی درخت کے پیچھے سے نکل کر ان کے پاس آ کر رکنے لگی مگر انہوں نے فوراً آنکھوں کے اشارے سے اسے کمرے کی لان میں کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے فوراً سے پیشتر اندر جانے کے لیے کہا اور چند لمحوں بعد خود پیچھے کے رستے کے بجائے سیدھے رستے سے لاؤنج کی طرف بڑھیں جہاں سامنے ہی موجود عائشہ بھابھی ہاتھ میں فون پکڑے ان کی منتظر تھیں۔

"کون تھا باہر؟" کھوجتی نظروں سے تفتیشی لہجے میں پوچھا گیا سوال امی نے سنا ضرور مگر نظر اٹھا کر انہیں دیکھنے کے بعد جھوٹ بول کر جواب دینے کے بجائے خاموش رہ کر گزر جانے کو ترجیح دی تو یک دم ذہن میں ابھرنے والے خیال کے باعث انہی

قدموں پر پلٹ کر انہوں نے امی کے بیڈ روم کا دروازہ کھولا اور ندی کی کھوج میں یہاں وہاں کمرے میں نظریں دوڑانے لگیں اور اس سے پہلے کہ وہ ندی کی غیر موجودگی کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرتے واپس پلٹتیں واش روم کا دروازہ دھیرے سے کھول کر دھلے ہوئے چہرے کے ساتھ ندی ان کے سامنے سے گزر کر قطعاً انہیں نظر انداز کر کے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔

"امل کب سے ثروت کے نمبر پر فون کر رہا تھا اٹھایا تو چاہیے تھا تمہیں۔ وہ کوئی فارغ نہیں ہے کہ بس بیٹھا تمہیں فون ہی کرتا رہے۔"

ان پر عجیب جھنجھلاہٹ سوار ہو چکی تھی، جبھی خواہ مخواہ اس پر برس پڑیں۔ اسی دوران امی بھی کمرے میں داخل ہو چکی تھیں۔

"لو بات کرلو، اب اس نے میرے موبائل پر کیا ہے۔"

وہ بھائی کے سامنے بری نہیں بننا چاہتی تھیں اسی لیے فون اسے دے رہی تھیں بصورت دیگر انہیں کبھی گوارا نہ ہوتا کہ ندی ان کے فون سے اپنے بھائی کی ہمدردیاں سمیٹے۔

"میں جب تک یہیں بیٹھی ہوں۔"

سوجی ہوئی آنکھوں اور بے رونق چہرے کو ایک نظر دیکھتے ہوئے بھابھی نے فون اسے دینے سے پہلے کان سے لگایا مگر رابطہ تو جانے کب کا منقطع ہو چکا تھا۔ سو انہوں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک گہری سانس لیتے ہوئے بیٹھنے کا ارادہ ترک کیا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں نے کہا تھا نا کہ وہ اتنا فارغ نہیں ہے، فون بند کر دیا ہے اس نے۔"

اب اگر فون آتا بھی تو وہ ریسیو نہ کرنے کی وجہ فون کے کمرے میں ہونے اور اپنے کچن میں ہونے کا بہانہ کر سکتی تھیں۔ جبھی مطمئن بھی تھیں اور صرف وہی نہیں ان کے اٹھ جانے پر خود امی اور ندی نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ جیسے ہی وہ اٹھ کر کمرے سے

نکلیں ناصر بھائی کی گاڑی بھی گھر میں داخل ہو گئی تھی جس کی آواز ندی کے کانوں میں طوفان سے قبل چلتی تیز ہواؤں کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ امی بیڈ پر اپنے مخصوص انداز میں بیٹھی تھیں۔ ندی نے کمرے کو اندر والی سائیڈ سے لاک کیا اور خود بھی دونوں ٹانگوں کو سمیٹ کر گھٹنوں پر ٹھوڑی دھر کر چند لمحے کے لیے لفظوں کو اپنے اندر ترتیب دیتی رہی۔ بار بار تھوک نگلتی اور ہونٹوں پر زبان پھیرتی ندی نے سامنے موجود صبر اور ہمت کے پیکر کو دیکھا۔ ان کے سامنے آنسو نہ بہانے کا عہد تو وہ خود سے کرتی ہی آئی تھی اور اب سے نبھانے کی باری تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ پے در پے جذباتی دھچکوں کے باعث اب ان کے لیے یہ آخری امید ٹوٹنے کا صدمہ بڑا کٹھن ثابت ہو سکتا ہے اسی لیے پہلے تو سوچا کہ اصل بات کو چھپا جائے اور ان کو اس حقیقت سے بے خبر رکھا جائے کہ اب دنیاوی طور پر اس کے پاس کسی سہارے کی امید تو کیا خیال بھی باقی نہیں بچا ہے اور شاید وہ یہ بات کبھی بھی دیتی کہ امی نے بڑے دھیمے مگر پُرسوچ انداز میں خود ہی بات کا آغاز کیا۔

"اگر شاہ زین اور اس کی فیملی گھر چھوڑ کر کہیں اور شفٹ ہو گئے ہیں اور آج کل میں اس کی شادی بھی متوقع ہے تو۔۔۔ تم نے پھر کیا سوچا ہے؟"

"امی۔۔۔!" حیرت نے اس کی زبان کو جیسے گنگ کر ڈالا تھا۔ بھلا وہ یہ سب کیسے جان سکتی ہیں جسے چھپانے کی کوشش خود وہ کر رہی تھی۔

"آ۔۔۔ آپ کو کیسے پتا چلا سب کچھ؟" ندی کی بات کے جواب میں انہوں نے بڑی خاموشی سے تکیے کے نیچے سے اس کا وہی والٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا جو اس سے کہیں کھو گیا تھا جواباً ایک بار پھر حسب سابق ندی کی سوالیہ آنکھیں ان کے چہرے پر جا رکیں۔

"شاہ زین کے گھر کے سامنے ہی تمہارا والٹ گر گیا تھا اور ان کا پڑوسی موٹر سائیکل پر گھر تک پہنچا کر گیا ہے، اللہ کی رحمت سے میں اس وقت لان میں ہی بیٹھی تھی اس لیے گیٹ میں نے ہی کھولا اور مختصراً شاہ زین کا بھی پوچھ لیا اور تب سے میں وہیں باہر ہی بیٹھی تھی۔" ندی نے سر جھکا لیا تھا۔

"بچے کو اندر بلا کر چائے پانی نہیں پوچھ سکی، اس بات کا بھی دل کو بہت ملال ہے، اب اللہ معاف کرے۔"

"میری وجہ سے جانے ابھی کتنے ہی ملال آپ کے دل کو سہنے پڑیں گے نا۔" وہ شاہ زین کے یوں ساتھ چھوڑ جانے پر خود کو پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ مجرم تصور کر رہی تھی۔ میاں محمد بخش کے کلام کا ایک فقرہ "جناں بچے پاپ کمائے کتھے گئیں تیرے گھر دے" رہ رہ کر اس کے ذہن میں بانسری کی افسردہ سی دھن کی طرح پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ امی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما تو وہ ان سے لپٹ گئی۔

"مجھے معاف کر دیں امی۔۔۔! خدا کا واسطہ ہے مجھے معاف کر دیں، میں نے آپ کو بہت دکھ دیے ہیں اور میں۔۔۔ شاید میں یہی کچھ ڈیزرو کرتی ہوں جو میرے ساتھ ہو رہا ہے۔"

"میری جان۔۔۔! تم نے مجھے کوئی دکھ نہیں دیا، کوئی تکلیف نہیں دی، ہم نے خود اپنا ہی بویا ہوا کاٹا ہے۔۔۔ تم تو بچی تھیں تمہیں کیا خبر، جیسی تربیت ہم نے کی تم اسی تراش خراش کے ساتھ پروان چڑھتی گئیں۔ قصور ہمارا اپنا ہے۔۔۔ اگر ہمیں آج تمہاری کچھ عادتوں پر اعتراض ہے تو غلطی ہم بڑوں سے ہوئی، کیوں تمہاری شخصیت میں ان عادات کو پروان چڑھنے دیا جن کے باعث آج تمہیں موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔۔۔ تم ناصر کے سامنے پلی بڑھیں جوان ہوئیں اور آزادی کے ساتھ دوستوں کے ساتھ گھومتی پھرتی رہیں، تب تک تو وہ خود تمہیں لاتا لے جاتا رہا، اب ایک دم۔۔۔" امی نے ناصر بھائی کے متعلق کوئی بھی بات کرنا تقریباً چھوڑ رکھی تھی مگر آج اپنی بچی کے ڈانواڈول ہوتے مستقبل نے شاید ان کی زبان کا قفل کھول دیا تھا۔

"تیز رفتار سے چلتی گاڑی کو بھی یوں ایک جھٹکے سے روکا جائے تو حادثہ یقینی ہوتا ہے پھر تم سے یا کسی بھی انسان سے یہ توقع کیوں کر لیتے ہیں ہم لوگ۔"

"نہیں امی! غلطی میری ہی ہے، آپ خود کو یا کسی بھی اور کو بلیز قصور وار نہ سمجھیں۔۔۔ جانے انجانے میں مجھ سے ہی کچھ ایسا ضرور ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ وقت دیکھنا پڑا۔"

"ہاہ ہا۔۔۔ بس جو قدرت کو منظور۔" امی نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے تقدیر اور نصیب کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

"ویسے امی ایک بات سمجھ نہیں آئی اب تک۔" امی کے سامنے خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی کوشش میں پوری طرح کامیاب ندی کا پست اور تھکاوٹ سے چور لہجہ اس کے چہرے کے ساتھ مل کر اس کوشش سے بغاوت کر چکا تھا۔

"قدرت بعض اوقات ایسے فیصلے کیوں کرتی ہے جس سے ہنستے بستے گھر اجڑ جائیں، دل ٹوٹ جائیں اور کئی زندگیاں تباہ ہو جائیں۔ وہ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا اس قدر دکھی کیوں کرتا ہے انسان کو۔"

"شش۔۔۔۔!" امی نے فوراً گردن نفی میں ہلاتے ہوئے اس کے خشک ہونٹوں پر اپنی شہادت کی انگلی رکھ دی تھی۔

"دکھی نعوذ باللہ وہ نہیں کرتا بیٹی! اکثر اوقات ہمارے اپنے اعمال کا عکس ہی ہماری خوشیوں کو دھندلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح جیسے گرم پانی کھولنے پر اس کی بھاپ سے شیشہ دھندلا جائے تو غلطی شیشے یا بھاپ کی کون گنے گا۔ فطری بات ہے نا کہ نہ پانی کھولایا جاتا اور نہ ہی شیشہ دھندلاتا۔"

"لیکن امی۔۔۔!"

"جب بھی کوئی مشکل، پریشانی یا دکھ آ پہنچے نا بیٹا! تو اس کی رحمت کی طرف دیکھ کر یہ گمان کرو کہ یقیناً یہ آزمائش ہے کیونکہ جو جتنا محبوب ہوتا ہے اس کی آزمائش بھی اتنی ہی کڑی ہوتی ہے۔۔۔ لیکن ہاں یہ بھی یقین رکھنا کہ اللہ آزمائش میں ڈالنے کے بعد بخوبی نکال بھی لیتا ہے۔" ندی کو محسوس ہو رہا تھا شاید امی بیٹھ نہیں پا رہیں، شاید کافی دیر سے بیٹھے رہنے سے ان کی کمر میں درد ہو رہا تھا۔ جبھی سا پیچھے کھسک کر انہیں لیٹنے میں مدد دی اور ان کے ساتھ ہی لیٹ گئی۔

"پتا نہیں امی! مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتا کہ یہ ہماری آزمائش کیا کم ہو چکی ہے کہ سلسلہ تھم ہی نہیں رہا۔" امی نے عینک اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی

"ویسے آپ کو کیا لگتا ہے ہمارے ختم ہونے سے پہلے کیا یہ آزمائش ختم ہو جائے گی۔" ان کی طرف کروٹ لے کر کہنی تکیے پر ٹکانے کے بعد اس نے دائیں ہاتھ کا تکیہ بنا کر اس پر سر رکھا۔ ندی کی اس بات پر امی کا روم روم دکھا اور کرب کی حدت سے سلگ اٹھا تھا۔ اس دفعہ انہوں نے اپنا رخ ندی کی طرف موڑا۔ آج کا دن ان کی زندگی کے سخت ترین دنوں میں سے ایک تھا کہ جب ندی کے گھر سے جانے کے بعد سے ان کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ دعائیں مانگ کر اب تو جیسے زبان بھی تھکن سے نڈھال تھی اور سامنے وہ لاڈلی بیٹی جس کی آنکھیں وقت بے وقت رونے سے اصلی شکل کھو چکی تھیں۔ سفید مگر بے رونق چہرہ جس پر اب انہیں زندگی کی سرخی مفقود نظر آئی تھی اور ضبط کے باعث ان کے دانتوں جیسے ہموار دانتوں تلے دبے ہونٹ۔۔۔ جس کے ذرا سے منہ بسورنے پر گھر والوں کا خون خشک ہو جاتا تھا اب رو رو کر اپنے اصلی نقش کھو رہی تھی تو کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ ان کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس کے بال سنوارتے ہوئے بالآخر اسے حوصلہ دینے کو وہ بولیں۔

"سب آزمائشیں ختم ہو جائیں گی میری جان! تم بس خود کو اپنے رب کے حوالے کر دو اور۔۔۔ اور پرسکون ہو جاؤ۔" بلاشبہ اس وقت وہ اپنے ضبط کی آخری حدوں پر تھیں۔

"پرسکون ہو جاؤں امی؟" ندی تڑپ اٹھی تھی۔

حیرت اور ناسمجھی اس کے چہرے پر مئی جون کی دھوپ کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔

"یونیورسٹی سے گھر آتے ہوئے پوائنٹ کی بس میں قدم رکھتے ہی تم کس قدر بے فکر ہو جاتی ہوگی نا کہ بس اب ڈرائیور انکل تمہیں بحفاظت منزل تک لے ہی جائیں گے، ان پر بھروسہ ہونے کی وجہ سے نہ تو تم نے کبھی روٹس پر دھیان دیا ہوگا اور نہ ہی روڈ پر موجود ٹریفک کی مشکلات کا۔" وہ یہ سب تمہید سمجھ نہیں پا رہی تھی مگر پھر بھی اثبات میں سر ہلا کر انہیں بات کو جاری رکھنے کا اشارہ دیا۔

"تم اپنی منزل تک پہنچ تو جاتی ہو لیکن رستے میں دوسرے کئی لوگ مختلف اسٹاپس پر اتر کر تمہارا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں کیونکہ ان کی منزل اور رستہ وہیں تک کا ہوتا ہے۔"

"لیکن امی۔۔۔!"

"بالکل ایسے میری بیٹی تم بھی اپنے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھا لو کہ تمہاری زندگی کی گاڑی کو چلانے والی وہ ذات صرف اور صرف خدا کی ہے جو یقیناً تمہیں بحفاظت منزل تک تو لے جائے گا مگر شاید کچھ لوگوں کی منزل تم سے پہلے ہو اور ان کے لیے متعین کردہ رستہ تم سے پہلے ختم ہو جائے اور وہ رستے میں ہی تمہارا ساتھ چھوڑ جائیں۔"

"جیسے بابا۔۔۔!" ندی کے منہ سے بالکل لاشعوری طور پر اچانک ہی نکلا تھا۔ امی نے حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور سوچا کہ کس قدر محروم ہوتی ہیں وہ لڑکیاں جن کے سر پر باپ کا سایہ نہیں ہوتا۔ قدرت کی طرف سے عطا کردہ سب سے بڑی نعمت، سب سے منفرد انعام اور سب سے بڑھ کر ایک ایسا رشتہ جس کے ہوتے ہوئے دنیا والے اپنی زبانوں کے آگے بند باندھنے پر ہر صورت مجبور ہوتے ہیں، ایک ایسا سائبان جس کے نیچے پناہ گزین موسم کی شدت سے بے خبر سکون سے اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ ایک ایسا درخت جو سورج کی جھلسا دینے والی شعاعوں کو خود تک روکے رکھتا ہے۔ جو آندھیوں کے جھکڑوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ جو ہر سرد گرم سہہ کر بھی دوسروں کو اپنی گھنی چھاؤں تلے پرسکون اور محفوظ رکھتا ہے۔

"ہاں۔۔۔ اور شاید شاہ زین بھی۔" انہوں نے ندی کے سامنے حقیقت کا آئینہ لا رکھا تھا اور حقیقت بلاشبہ ندی کے لیے بے حد کڑوی اور تلخ تو ضرور تھی مگر وہ اسے تبدیل بھی تو نہیں کر سکتی تھیں۔

"اس کا اور تمہارا ساتھ یہیں تک تھا، اس لیے اب اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچو کہ اب آگے تمہیں کیا کرنا ہے؟"

میں کیا کروں گا اگر وہ نہ مل سکا امجد
ابھی ابھی میرے دل میں یہ خیال آیا ہے

اور ندی جو کبوتر کی طرح اب تک آنکھیں بند کیے خطرہ موجود نہ ہونے کا یقین کیے بیٹھی تھی۔ امی کی باتوں نے جیسے اس کی آنکھیں ایک جھٹکے سے یوں کھول دیں کہ سامنے چکا چوند روشنی ہونے کے باعث ایک دم چندھیا گئیں۔ اسی پل ثروت آپا کے موبائل کی چیختی بیل نے دونوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ استفہامیہ نظروں سے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ندی نے فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف مل تھا جو اس سے بے حد پریشان معلوم ہو رہا تھا اور ڈرائیو کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے بات کر کے مسئلے کا کوئی حل نکالنا چاہتا تھا۔

"کیسی ہو ندی؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"بس ٹھیک ہی ہوں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں اداسی در آئی تھی

"ہوں۔۔۔ معلوم ہوا ہے مجھے سب پتہ، لیکن۔۔۔"

"پرسہ دے رہے ہو مجھے؟" کم از کم ندی کو اس کے لہجے سے یہ محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگا تھا گویا اس نے ندی سے تعزیت کرنے کو ہی فون کیا ہو۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تمہارا لہجہ اور الفاظ دونوں سن کر مجھے واقعی افسوس ہوا ہے۔"

"ہونہہ۔۔۔ میری تو ہر چیز ہی غلط اور قابل

افسوس ہے اب، یہ مجھے پہلے بھی پتا چل گیا ہے۔ اس اطلاع کی ضرورت نہیں تھی۔"

"تم میری بات کو غلط لے رہی ہو ندی اور تم جانتی ہو کہ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔" وہ اس کے دوستانہ استفسار کو منفی رنگ دے رہی تھی اور یہ بات اس کے لیے کسی طور بھی قابل برداشت نہیں تھی اور خود ندی کو بھی اس چیز کا احساس ہو چلا تھا کہ وہ اسے بغیر کسی غلطی کے سرزنش کر رہی تھی۔

"آئی ایم سوری اگو۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"ڈونٹ وری، آئی نو دیٹ۔" وہ سمجھ سکتا تھا کہ ندی جو کچھ بھی کہہ رہی تھی وہ محض اس کی وقتی فرسٹریشن تھی اور بس۔

"لیکن ندی اب تمہیں ایک نئی زندگی جینی ہے۔ یہ مایوسی، اداسی اور بے بسی کا غلاف اتار پھینکو خود سے اور ایک دفعہ پھر پہلے جیسی۔۔۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ نہیں اگو! مجھے پہلے جیسا نہیں بننا، اب مجھے وہ بننا ہے جو میں شاید کبھی تھی ہی نہیں اور یا پھر۔۔۔ پتا نہیں۔"

وہ لفظوں کے آگے ہتھیار ڈال گئی تھی۔

"سب سے پہلے خود کو ریلیکس کرو ندی اور۔۔۔"

"اگو! ایک لمحے کے لیے تصور کرو کہ کوئی شخص رات کو ہنسی خوشی اپنے بھرے پرے کنبے کے ساتھ سوئے اور رات میں سونے کے دوران ہی گھر کی چھت گر جائے اور تمام افراد لمحہ بھر میں ملبے تلے دب کر ایک دوجے کے لیے اجنبی ہو جائیں، ساتھ ہونے کے باوجود بہت دور، سامنے ہونے کے باوجود پوشیدہ۔ ایسے میں ایک انسان اسی ملبے تلے زندہ بچ جائے اور وہیں پڑا کراہ رہا ہو، رشتوں کے یوں پل بھر میں چھن جانے پر نوحہ کناں ہو، اپنوں کے یوں ساتھ چھوڑ جانے پر نہ تو ماتم کر سکے نہ بین۔۔۔ اور خود اسے بھی خبر نہ ہو کہ وہ اس حالت میں کب تک جیے گا، تو اس پر کیا بیتے گی؟ موت تک کا سفر ان صدیوں نما گھڑیوں میں کیسے طے کرے گا؟"

ایک بار پھر اکمل کی بات کاٹ کر عجیب بے خودی کے عالم میں وہ بولتی ہی گئی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کی آنکھوں سے نکلتے بے آواز آنسو اب اس کا تکیہ بھگو رہے تھے۔ اکمل جان گیا تھا کہ اس وقت وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہ رہی ہے اسی لیے چپ چاپ ہوں ہاں کرتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے ایک بہترین سامع کا کردار ادا کیا۔

"میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، سب کے ہوتے ہوئے بھی میں نے تنہائی کا عذاب اور کرب سہا۔ جب مجھے سہارا چاہیے تھا میرے اپنے خونی رشتے میرے لیے اجنبی ثابت ہوئے۔ میری ماں کے علاوہ کوئی کندھا ایسا نہ تھا جس پر سر رکھ کر میں اپنے اعتبار اور بھروسے کی میت پر آنسو بہا سکتی۔۔۔ اور شاید ہمیں اپنی ماں کے وجود کی قدر و قیمت کا احساس شدت سے ہوتا ہی تب ہے جب ہم دکھی ہوں، جب ہم چاہتے ہوں کہ کوئی ایسا ہو جو ہمارا دکھ درد بانٹ کر ہمیں تسلی دے سکے، ہماری آزمائشیں ختم ہونے کی دل سے دعا کرے۔۔۔ اگو! یقین جانو مجھے ان دنوں میں احساس ہوا کہ خدا نے اپنی کتنی ہی صفات کی جھلک ایک ماں کے پیار میں عطا کی ہے اور پھر انہی صفات کے بدلے اور صدقے اس کے پاؤں میں جنت اتار دی۔"

لمحہ بھر رک کر اس نے سانس لیا اور آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش میں آنکھیں مسلتی اسی کو دیکھ کر پھر بولی۔

"لیکن اگو! بس، اب اور نہیں۔ اب مجھے ہر حال میں اپنی ماں کی مسکراہٹ واپس لانی ہے، ایک نئی زندگی شروع کرنی ہے۔ ایک ایسی زندگی جس میں ماضی کی ہلکی سی شبیہ بھی نظر نہیں آئے گی کسی کو and you know I always follow my words۔"

"ویری گڈ ندی! I really appriciate it۔"

ندی نے اوپر تلے دونوں ہونٹوں کو دباتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں بند کیں۔

"ایک بات کہوں اگر مائنڈ نہ کرو تو۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے جھجک گیا تھا۔

"ہاں بولو!"

"میں اور آپی بہن بھائی ضرور ہیں مگر ہم دونوں ایک الگ شخصیت اور مختلف مزاج کے لوگ ہیں۔ عائشہ آپی نے تمہاری زندگی دشوار کرنے میں بہت کردار ادا کیا ہے، شرمندگی تو ہے مگر حقیقت ہے اور میں اسے تسلیم کرتا ہوں لیکن تمہارے رستے میں ان کے ہاتھوں بچھائے گئے کانٹے اگر میں چننا چاہوں تو۔۔۔؟"

"جذبات کا شکار مت بنو اگو! اور حقیقت کو تسلیم کرو۔" وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ چکی تھی جبھی فوراً ٹوک دیا۔

"تمہاری نئی زندگی میں ماضی کی کوئی جھلک نہیں ہوگی۔ ابھی تمہی نے تو کہا تھا نا۔" اس نے دفاع کرنا چاہا۔

"بے شک ایسا ہی ہوگا، لیکن مجھے اپنی نئی زندگی کے لیے کسی کی بھیک یا رحم نہیں چاہیے، خدا کے لیے تو مجھ پر ترس مت کھاؤ۔"

"تم غلط سوچ رہی ہو، میں بس تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"کسی اور کے گناہوں کی تلافی کرنے کے لیے تم اپنے جذبات کو فراموش کر دو گے؟ سب کو اپنا اپنا بویا خود کاٹنے دو اکمل! یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ میں نے شاہ زین کو کتنی شدت سے چاہا تھا اور اس دل نے کتنا ٹوٹ کر اسے پانے کی دعا کی تھی تم مجھ سے میری زندگی میں کیا حیثیت چاہتے ہو؟ اور میں یہ جاننے کے باوجود کہ تم آئس کریم پارلر میں ملنے والی لڑکی کو ہر جگہ صرف اس کی جھلک دیکھنے اور اس سے بات کرنے کی خواہش میں کس طرح پاگل ہو تمہیں کیا جگہ دے پاؤں گی اپنی زندگی میں؟" اکمل شرمندہ ہو گیا تھا کیونکہ اپنی تمام کیفیات سے اس نے خود ہی تو آگاہ کیا تھا ندی کو۔

"میں تمہارے خلوص کی قدر کرتی ہوں اگو! بس میرے لیے دعا کرتے رہنا اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" اور تب اکمل نے ایک بار پھر اس کی دائمی خوشیوں کے لیے بے حد دعا کرتے ہوئے بوجھل دل کے ساتھ گاڑی ایک سپر اسٹور کے سامنے جا روکی۔

☆☆☆

ستارے جو دمکتے ہیں
کسی کی چشم حیراں میں
ملاقاتیں جو ہوتی ہیں
جمال ابرو باراں میں
یہ نا آباد وقتوں میں
دل ناشاد میں ہوگی
محبت اب نہیں ہوگی
یہ کچھ دن بعد میں ہوگی
گزر جائیں گے جب یہ دن
یہ ان کی یاد میں ہوگی

اسکول، کالج اور اس کے بعد زندگی کا خوب صورت دور "یونیورسٹی کا زمانہ" جس کا سحر ساری زندگی انسان کو جکڑے ہی رکھتا ہے۔ جس کی حسین یادیں خاموشی میں بھی لبوں پر مسکراہٹیں بکھیر دیتی ہیں اور دل ایک مرتبہ پھر ماضی میں پلٹ جانے کو مچلتا رہتا ہے اور سونے پہ سہاگہ اگر اس دور میں اچھے دوست میسر ہوں تو یہی دن ایک اثاثہ ثابت ہوتے ہیں۔

مہربانو، کنول اور میری بھی بلاشبہ آپس کے تعلقات کی کسوٹی پر خود کو پرکھنے کے بعد ہمیشہ خود کو خوش نصیب خیال کرتیں، وہ تینوں ہی دوستی کے رشتے کو ایک فرض سمجھ کر نبھایا کرتیں اور اسی بات کا نتیجہ تھا کہ تھوڑی دیر بھی ایک دوسرے سے نہ تو خفا رہ پاتیں اور نہ ہی دل میں کسی بھی قسم کی کوئی بدگمانی پالتیں۔ سو آج بھی جو کچھ ہوا اسے ان تینوں نے ہی رات گئی بات گئی کے مصداق اپنے ذہن سے نکال پھینکا تھا اور اب خوش گپیاں کرتے ہوئے شہر کے مشہور ترین ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہو رہی تھیں۔ مہربانو کی تمام شاپنگ تو ان دنوں میں ہوتی جب وہ چھٹیوں

میں گاؤں جاتی۔ تب ملکانی سائیں اور وہ ڈرائیور کے ساتھ جاتیں اور ضرورت کی ہر چیز خرید لاتیں۔ اسی لیے مہر بانو کو کبھی بھی ہاسٹل میں کسی ایسی چیز کی ضرورت نہیں پڑی تھی جس کے لیے خاص طور پر اسے یہاں آنا پڑتا۔ البتہ کنول اور میری چونکہ بہت جلدی جلدی اور مختصر چھٹیوں کے بجائے چند طویل چھٹیوں میں ہی گھر جانے کو ترجیح دیتی تھیں اس لیے انہیں کسی نہ کسی چیز کی ضرورت پڑ ہی جاتی تھی اور جس کے لیے وہ اکثر اوقات اسی شاپنگ مال پر آنے کو بہتر خیال کرتیں جس کی بنیادی وجہ ایک ہی جگہ پر کپڑوں، جوتوں اور ہیئر بینڈز سے لے کر کتابوں اور میوزک کی ڈیز کا مل جانا تھا۔ اس سے پہلے وہ کالج ٹائم آف ہونے کے فوراً بعد دوپہر میں ہی آجایا کرتی تھیں اور آرام سے اپنی مطلوبہ اشیاء کی خریداری کر کے اور بعض اوقات وہیں کھانا کھا کر ہاسٹل کے طے کردہ وقت سے پہلے واپس بھی پہنچ جاتیں۔

مگر آج صورت حال اس لیے ذرا مختلف ہو چکی تھی کہ ان کا کافی سارا وقت چرچ آنے جانے میں بھی صرف ہوا تھا۔ اسی لیے آج جب وہ اس کئی منزلہ شاپنگ مال پر پہنچیں تو اس کے بند ہونے میں صرف آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ اکثر دکان دار رش کم ہونے اور وقت ختم ہونے کے باعث اپنی چیزیں سمیٹ رہے تھے۔ کا دکا دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ تینوں نے منہ بسورتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''کیا خیال ہے واپس چلیں؟ شاپس بھی دیکھو آہستہ آہستہ بند ہو رہی ہیں۔'' مہر بانو نے تجویز دی۔

''اگر ابھی چلے گئے تو پھر دو ڈھائی ہفتے تک تو پتا ہے نا شیڈول کتنا ٹف ہے، پھر کہاں ٹائم ملے گا۔''

''اور پھر ڈائی سیکشن کے لیے کل جو بک چاہیے اس کا کیا کریں گے؟ وہ تو ہم تینوں میں سے کسی کے پاس بھی نہیں ہے نا۔'' کنول نے بھی میری کی بات کی تائید کی۔

''یا ایسا کیوں نہ کریں، تم نے تو کوئی اور چیز نہیں لینی نا۔''

''نہیں تو۔۔۔'' کنول کے مخاطب کرنے پر مہر بانو بولی۔

''تو پھر تم اوپر سے جا کر بک لے آؤ، ہم جب تک اپنی کچھ چیزیں خرید لیتے ہیں۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے، اس طرح ٹائم بھی بچ جائے گا اور ہمارا کام بھی نبٹ جائے گا۔'' میری کی بات سے مہر بانو بھی متفق نظر آئی اور انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے اپنی چادر مزید سمیٹتے تک تبی۔

''جس کا کام پہلے ختم ہو جائے وہ فون کر کے دوسروں سے پوچھ لے گا اور اس کے بعد بس اسٹاپ سے بس پکڑ کر ہاسٹل۔'' میری نے قصہ نبٹایا اور تینوں مختلف سمتوں کی طرف رخ کر کے چلی گئیں۔

کنول نے میری کے ساتھ ساتھ مہر بانو کے لیے بھی کچھ گفٹ لینے کا سوچ رکھا تھا مگر کیا۔۔۔؟

اور اس کیا کے آگے ایک بڑا سا سوالیہ نشان تھا جو اس کے سامنے جھول رہا تھا اور سر پر شاپنگ مال کے بند ہونے کے ساتھ ساتھ رات نو بجے سے پہلے واپس ہاسٹل پہنچنے کی تلوار بھی لٹک رہی تھی جبھی تو وقت کم اور مقابلہ سخت ہونے کے باعث پہلے تو ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں گھمانے کے بعد سب سے پہلے ان دونوں کے لیے فرینڈ شپ کارڈ سلیکٹ کرنے کا سوچا اور اس کے بعد اس کا ارادہ تھا کہ وہ ان دونوں کو کوئی اچھا سا پرفیوم گفٹ کرے گی۔

میری کو اپنے شوز لینے تھے سو وہ ادھر ادھر ونڈو شاپنگ کرنے اور ڈریسز میں آج کل کے ٹرینڈز چیک کرنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے ڈائریکٹ اس سمت کی طرف چل دی جہاں سے ایک بار پہلے بھی وہ اپنے لیے جوتے خرید چکی تھی۔

مہر بانو نے چونکہ بک لینی تھی اس لیے اسے لفٹ کا سہارا لے کر تیسری منزل پر آنا پڑا۔ اتنے بڑے شاپنگ مال میں جوتوں، کپڑوں، زیورات وغیرہ کی کئی دکانیں تھیں مگر کتابوں کی محض ایک ہی دکان تھی جس سے یہاں آنے والوں کی علمی پیاس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں آ کر ہمیشہ مہر بانو کو ایک عجیب سا سکون ملتا۔ نئی کتابوں کو کھول کر ان کی ورق گردانی کرنے کے دوران ناک سے ٹکرانے والی نئی کتابوں کی مخصوص اور مانوس خوشبو اسے ہمیشہ اپنے بچپن کے دنوں میں لے جاتی جب وہ اپنی نصاب کی نئی کتابوں کو یونہی بار بار سونگھ کر تمام خوشبو اپنے اندر اتار لینا چاہتی تھی۔ مطلوبہ کتاب منتخب کرنے کے بعد ہاتھ میں تھام لینے کے بعد میری اور کنول کے فون کے انتظار میں وہ یونہی مختلف کتابیں دیکھتی رہی کیونکہ اس کے خیال میں نیچے جا کر ان کے انتظار میں کھڑا ہونے سے کہیں بہتر تھا کہ وہ اپنا وقت ان کتابوں کے ساتھ گزارتی اور اسی دوران اس نے دو مزید کتابوں کو بھی خریدنے کے لیے منتخب کر لیا۔ آرام سکون سے دکان میں گھوم پھر کر کتابوں کا جائزہ لیتی مہر بانو کو یہ احساس تک نہیں ہوا تھا کہ شاپ کیپر اب صرف اس کے انتظار میں کھڑا ہے۔ پتا چلا تو تب، جب خود اس نے مخاطب کیا۔

''میڈم! اگر آپ کو مزید کتابیں چاہئیں تو پلیز کل تشریف لے آئیں، مارکیٹ بند کرنے کا ٹائم ہو رہا ہے۔'' دکان دار نے بڑے مہذب انداز میں سے وقت کا احساس دلایا تو وہ چونکی اور کاؤنٹر پر پیسے دیتے ہوئے اطراف میں نظر دوڑائی تو اس فلور پر تقریباً تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں اور اکا دکا لوگ اب لفٹ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اس نے بھی تجات میں پیسے دیے اور جس لفٹ کی طرف سارے لوگ جا رہے تھے اسے چھوڑ کر دوسری لفٹ کا بٹن پریس کیا تو احساس ہوا کہ لفٹ پہلے سے اوپر ہی والی فلور پر موجود تھی جبھی فوراً ہی لفٹ کا دروازہ کھلا، وہ اندر داخل ہو کر ابھی سیدھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کے پیچھے کوئی اور بھی لفٹ کے اندر آن کھڑا ہوا۔

''آپ۔۔۔؟''

لفٹ کا دروازہ بند ہوتے ہی جہاں مہر بانو، اکمل کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی وہیں اکمل بھی قدرت کے اس حسین اتفاق پر ایک خوش گوار حیرت کا شکار تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مہر بانو کو یوں اتنے نزدیک سے بھی کبھی دیکھ سکے گا۔ یہ سب تو شاید اگر خواب میں بھی ہوتا تو ہو سکتا ہے کہ وہ یقین کر لیتا مگر یہ ایک حقیقت تھی۔ اس بات کا یقین کرنے کے لیے دل تو چاہا کہ لمحہ بھر کے لیے خود کو چٹکی ہی کاٹ لے مگر اس کی نوبت لفٹ کے تینوں اطراف میں موجود شیشوں کے باعث آئی ہی نہیں کہ جہاں نظر اٹھتی اکمل کو اپنے ساتھ مہر بانو کا وجود نظر آتا اور روم روم خوشی سے جھوم اٹھتا کہ آٹھ اشخاص کی گنجائش والی اس لفٹ میں اس وقت صرف وہی دونوں موجود تھے اور اس کا دل چاہ رہا تھا اس سے پہلے کہ چند ہی لمحوں میں لفٹ انہیں گراؤنڈ فلور پر پہنچائے وہ کم از کم اسے اپنے دل کا کچھ احوال تو سنا ہی دے۔ آج ملنے والے قربت کے یہ چند لمحے پھر جانے کبھی نصیب ہوں یا نہیں۔

تیری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

اب سے کچھ دیر پہلے تک نندی کی وجہ سے دل میں جو بوجھل پن پیدا ہو چکا تھا وہ مہر بانو کو دیکھتے ہی کہیں جا چھپا تھا۔ اس کے برعکس مہر بانو یہ بات محسوس کرنے کے باوجود کہ وہ ایک شریف انسان ہے انتہائی ڈری ہوئی تو ضرور تھی مگر اس کے سامنے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش میں اپنے جوتوں پر نظر جمائے اس لیے بھی کھڑی تھی کہ سر اٹھا کر جہاں بھی دیکھتی شیشوں کی مہربانی سے اکمل کی پرشوق نظریں اس کے سامنے ہوتیں جس کے وجود سے اٹھتی پرفیوم کی مسحور کن خوشبو کو وہ گہری سانس لے کر گویا اندر اتار چکی تھی۔ وہ جو کبھی بلا ضرورت لڑکوں سے مخاطب نہ ہوتی تھی اور انتہائی ضرورت کے وقت بھی وہ کنول یا میری ہی کے ذریعے کام نکالتی اور لاسٹ آپشن کے طور پر کسی سے بھی براہ راست بات کر لیتی آج اس کے ساتھ لفٹ میں تنہا موجود تھی اور اگر کبھی، کسی طور میران اسے دیکھ لے تو۔۔۔؟

اس خیال نے ذہن میں آتے ہی اس کے جسم پر کپکپی کی ایک لہر دوڑائی تھی جسے خود اکمل نے بھی محسوس کی اور وہ جو اس سے بات کرنے کا سوچ رہا

تھا، اس کے رویے کو دیکھ کر خاموش رہنے پر اپنے ذہن کو تیار کیا اور ٹھنڈی آہ بھر کر مخالف سمت رخ کر لیا وہ کبھی نہیں چاہتا تھا کہ مہربانو کے ذہن میں تاثر پیدا ہو کہ وہ اسے اکیلا سمجھ کر تنگ کر رہا ہے اور اس کے یوں رخ موڑنے پر مہربانو جس کا دل پہلے ہی عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا اس کی شرافت کی قائل ہو گئی تھی اور اس کے دل میں اکمل کے اس عمل سے بلاشبہ اس کی عزت پیدا ہوئی تھی مگر ایک بات جو دونوں کو ہی خلاف معمول محسوس ہوئی تھی یہ کہ اب تک تو انہیں گراؤنڈ فلور پر پہنچ جانا چاہیے تھا مگر وہ دونوں ہی لفٹ میں موجود تھے اور وہ بھی یوں کہ انہیں لفٹ کے حرکت میں آنے کا بھی احساس تک نہیں ہوا تھا۔ دو، تین، پانچ منٹ مگر آخر کب تک۔۔۔

ان کا چونکنا لازمی تھا۔ مہربانو نے بوکھلاہٹ میں ایک دو تین دفعہ مسلسل لفٹ کے بٹن پر ہاتھ مارا۔ خود اکمل بھی تشویش کا شکار تھا کیونکہ بٹن کے عین اوپر موجود تین کے ہندسے کے مطابق وہ لوگ ابھی تک اسی فلور پر موجود تھے جس پر سے وہ لفٹ کے اندر داخل ہوئے تھے۔

''لفٹ خراب تو نہیں ہے؟''

پہلی مرتبہ مہربانو نے شدید گھبراہٹ کے عالم میں اسے مخاطب کیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید اکمل کی کیفیت اور مختلف ہوتی مگر اس وقت موقع کی نزاکت کو وہ خود بھی سمجھ سکتا تھا۔ جبھی پوری طرح کوشش کر لینے کے بعد بولا بھی تو محض چند الفاظ۔

''آئی تھنک سو۔۔۔''

''کیا۔۔۔؟ مگر اب کیا ہوگا؟ کب کھلے گی یہ؟ باہر لوگوں کو کیسے پتا چلے گا کہ ہم اندر ہیں؟ کون آئے گا ہمیں نکالنے؟'' حیرت اور خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ یہ سب تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا اور اب اگر لفٹ نہ کھلی تو۔۔۔؟ اس سے آگے وہ کچھ بھی سوچ نہیں پا رہی تھی۔

''پلیز آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔ یہ سامنے لفٹ سروس کا فون نمبر موجود ہے نا۔ ابھی انہیں فون کرتے ہیں اینڈ آئی ہوپ کہ وہ فوراً آ کر لفٹ کھول دیں گے۔'' اکمل نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سادہ سے لہجے میں اس نے یوں دوستانہ انداز میں اسے تسلی دی تھی کہ مہربانو کو لگا جیسے اب واقعی مسئلہ حل ہونے والا ہے اور جیسے اسے سب مسئلے سلجھانے آتا ہو۔

بمشکل تھوک نگلتے ہوئے اس نے ہینڈ بیگ سے پانی کی چھوٹی بوتل نکالی اور انہیں قدموں پر بیٹھ کر منہ سے لگالی۔ محسوس یہ ہوتا تھا کہ گویا ٹھنڈے ہوتے جسم کے ساتھ اب وہ دوبارہ ٹانگوں پر کھڑی نہیں ہو پائے گی۔ مساموں میں سے ٹھنڈے پسینے کے قطرے نکل کر لباس میں جذب ہوتے جا رہے تھے۔ آنکھوں کے آگے نمودار ہوتی نیم تاریکی اور نارنجی و نیلے رنگ کے چھوٹے بڑے دائرے شاید اس کا ذہن دنیا و مافیہا سے بے خبر کرنے میں کامیاب ہو جاتے مگر صورت حال کی سنگینی اس کے سامنے تھی اور وہ کسی صورت اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ کر خود کو محض آتی جاتی سانسوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی، جبھی آنکھیں آخری حد تک کھول کر بار بار پلکوں کو جھپکاتے ہوئے اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ویسے بھی وہ جانتی تھی کہ لفٹ کے اندر سروس کے فون نمبر ہوتے ہی اس قسم کی ایمرجنسی یا پرابلم کے لیے ہیں مگر اکمل کے چہرے کے تاثرات شاید کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔ مہربانو گردن اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے اس لمبے چوڑے انسان کو دیکھ رہی تھی جس کے چہرے سے لگتا تھا کہ جیسے کسی نے اسے بلندی سے ایک دم اچانک نیچے کی طرف یوں دھکا دیا ہو کہ اس کا وجود ہوا میں معلق اپنے ہونے نہ ہونے کے بارے میں فیصلہ کرنے میں مصروف اور پاؤں زمین کو چھونے کے انتظار میں بے یقینی کا شکار ہوں۔

''وہ۔۔۔ فون تو میرا گاڑی میں ہی رہ گیا۔'' مہربانو کو یوں ٹکٹکی باندھ کر خود کو دیکھتے پا کر اکمل کی شرمندگی مزید گہری ہو گئی تھی۔ ندی سے بات کرنے کے بعد دل پر یوں اداسی کی دھند گہری بن کر چھائی تھی کہ اسے خیال ہی نہیں رہا کہ وہ اپنا فون لیے بغیر ہی گاڑی سے باہر نکل آیا۔

''چچ، چچ۔۔۔ چلیں کوئی بات نہیں، میرے پاس ہے نا فون۔'' نفسیاتی مریضوں کے سے انداز میں مہربانو نے اپنے ہینڈ بیگ سے فون نکال کر اسے پکڑایا تو ضرور مگر اکمل کے چہرے کے تاثرات میں کوئی کمی نہ آئی۔

''مہربانو! آپ کا فون تو بند ہے، شاید اس کی چارجنگ ختم ہو چکی ہے۔'' اکمل نے آہستگی سے فون واپس اس کی طرف بڑھایا تو اسے یاد آیا کہ کنول کے کہنے پر جب وہ ہاسٹل فون کرنے والی تھی چارجنگ تو تب سے ختم تھی اور اگر اس نے پورے ٹائم پر ملکانی سائیں کو فون نہ کیا اور یا ان کی آتی ہوئی کال ریسیو نہ کی تو۔۔۔ حویلی میں کیا ہنگامہ مچ جائے گا اور وہ یہاں سے نکلے گی بھی کیسے۔۔۔ کیا پوری رات اسے یہاں اکیلے اس شخص کے ساتھ گزارنی پڑے گی۔

گلے میں نمودار ہوتے خود رو کانٹوں کی بدولت اس سے تھوک بھی نگلا نہیں گیا تھا اور پھر لمحہ بھر میں جانے کیا دل میں آئی کہ اٹھ کر لفٹ کے دروازے کو بری طرح پیٹنے لگی کہ شاید کوئی متوجہ ہو جائے۔ مگر یہ ممکن بھی کیسے تھا۔ اس وقت وہ تیسری منزل پر موجود تھی جہاں سے اس کے سامنے ہی اکثر دکانیں بند ہو چکی تھیں اور باقی ہو رہی تھیں۔ اکا دکا لوگ بھی اس وقت نیچے کی طرف رخ کیے ہوئے تھے جب وہ لفٹ کے اندر داخل ہوئی۔

اکمل نے دروازہ پیٹتی مہربانو کو دیکھ کر بے بسی سے لب بھینچے۔

معاملے کی حساسیت اور نزاکت اس کے سامنے تھی۔ وہ جانتا تھا کہ پوری رات ہاسٹل سے باہر رہنے پر اسے کیا کیا فیس کرنا پڑ سکتا ہے اور وہ خود۔۔۔ وہ بھی تو اسی معاشرے کا حصہ تھا یہ الگ بات تھی کہ مرد ہونے کے ناتے اس کے سب عیب اور خامیاں جلدی چھپ سکتی تھیں مگر وہ۔۔۔ مہربانو۔۔۔!

دروازہ پیٹ پیٹ کر وہ وہیں تھک کر بیٹھ گئی تو اس کی آنکھوں سے ابلتی دہشت اور چہرے کی موت سی خاموشی نے اکمل کو لاشعوری طور پر لفٹ کے کونے کے مزید نزدیک کر دیا تھا۔

☆☆☆

اچانک پھر بچایا ہے کسی نادیدہ ہستی نے
مگر کیسے ہوا یہ معجزہ معلوم کرنا ہے
تجھے کچھ یاد ہے کس وقت کل میں یاد آیا تھا
مجھے اے ماں! تیرا وقتِ دعا معلوم کرنا ہے

ثمینہ اماں کے کہنے پر چائے بنا کر لائی تھی اور ابھی چائے پینے کے دوران جان بوجھ کر ثمینہ نے شاہ زین کے سامنے زمین کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ ابھی بات ابتدائی دور میں ہی تھی کہ اماں نے زمین کے متعلق اپنے خدشات ثمینہ کے آگے رکھے۔ شاہ زین البتہ خاموشی سے چائے پینے میں یوں مصروف تھا کہ گویا بولنے سے اس میں سے ذائقہ ختم ہو جائے گا اور یا پھر اسے لگتا تھا کہ ذہن سے وہ الفاظ بھی محو ہو گئے ہوں جن سے گفتگو کا آغاز یا اختتام کیا جا سکتا۔

''ثمینہ بیٹا! تم جو زمین کی بات لے کر بیٹھی ہو، جانتی بھی ہو کہ وہ کون ہے، کہاں سے ہے؟ یا یہ کہ اس کی کہیں اور بات چیت تو طے نہیں ہو چکی؟''

''تو اماں! اس میں کیا پرابلم ہے بھئی؟ میں ابھی فون کر لیتی ہوں۔'' ثمینہ کی ایکسائٹمنٹ کا تو عالم ہی نرالا تھا۔ فون کے نزدیک ہی تو بیٹھی تھی سو وہیں سے رخ موڑ کر فون اٹھایا، ہاتھ میں پکڑی چائے کی پیالی سامنے گول میز پر رکھی اور کشن گود میں رکھ کر نمبر ملایا۔ فون کسی معمر خاتون نے اٹھایا تھا، جن کی آواز ان کی عمر اور کمزوری کی گواہی دے رہی تھی۔ زمین کا دریافت کرنے پر انہوں نے ہولڈ پر فون رکھ کر زمین کو آواز دی اور چند لمحوں بعد زمین کی سوئی سوئی آواز ثمینہ کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ ساتھ ہی اس نے فون پر موجود بٹن دبا کر اسپیکر آن کر دیا تا کہ اماں ساری ہونے والی بات چیت خود سن لیں اور اسے دوہرانا نہ پڑے۔

''آئی ایم سوری زمین! شاید آپ سو رہی تھیں

اور میں نے ڈسٹرب کر دیا۔"

"نہیں تو، نہ ہی میں سو رہی تھی اور نہ ہی آپ نے مجھے ڈسٹرب کیا، ان فیکٹ میں تو خود اگلے چند منٹوں میں آپ کو فون کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کنفیوژ تھی۔"

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں؟" ثمینہ نے الجھ کر اماں کی طرف دیکھا جو پوری توجہ سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"وہ دراصل۔۔۔ ثمینہ۔۔۔!" چند لمحے رک کر زمین نے لفظوں کو ترتیب دیا۔

"اب شاید ہماری ملاقات نہیں ہو گی۔"

"نہیں ہو گی کیا مطلب؟" خلاف توقع ہوتی بات چیت ثمینہ کو حیران کیے ہوئی تھی۔ اماں اور شاہ زین کے چہرے پر البتہ حیرت یا چونکنے کے کوئی تاثرات نہیں تھے، دونوں ہی بڑے کمپوز طریقے سے ان دونوں کے درمیان ہوتی بات چیت سن رہے تھے۔

"مطلب تو نہ ہی پوچھو تو میرا خیال ہے بہتر ہے کیونکہ میں بتانا نہیں چاہتی۔"

"لگتا ہے شادی ہو رہی ہے آپ کی اچانک۔"

ثمینہ کی سوچ آج یہیں پر ختم تھی اور اس کے انداز نے زمین کو ایک تلخ ہنسی ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ جسے خود ثمینہ نے بھی محسوس کیا۔ اس نے جس امید اور خیال سے فون کیا تھا وہ ٹوٹنے پر یوں بدمزا ہوئی گویا کسی نے سوتے میں اس پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو، سامنے پڑی گرما گرم چائے اب صرف ایک رنگ دار محلول کے طور پر نظر آتے ہوئے اپنا مزا اور خوشبو کھو کر بے وقعت محسوس ہو رہی تھی۔

"اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یوں اچانک۔۔۔؟"

"ہوں۔۔۔" زمین نے ہنکارا بھرا۔ اتنے سارے دنوں میں وہ یہ تو جان چکی تھی کہ ثمینہ یوں ٹلنے والی نہیں ہے اور اس کا یوں ایک دم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ حافظ کہنا یقیناً اسے دنوں تک پریشان رکھے گا جبھی کچھ سوچنے کے بعد بولی۔

"یہ سمجھو کہ آنٹی کی دعاؤں نے تم سب کو بڑی مصیبت سے بچا لیا ہے۔ ایسی مصیبت جو میرے توسط سے تم سب تک پہنچتی مگر ڈونٹ وری اب ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔" زمین کے انکشاف نے جہاں ثمینہ کو اچھلنے پر مجبور کیا تھا وہیں اماں اور شاہ زین بھی چونک گئے تھے۔

"ثمینہ! سچ کہوں تو شروع کے دنوں میں تم سے ناواقفیت کا اظہار اور حیرت سب درست تھا کیونکہ میں واقعی کبھی اس کالج میں گئی ہی نہیں تھی وہ نہ ہی میں کوئی اسٹوڈنٹ ہوں، بس اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ضرور تھی۔"

"مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا زمین!"

"خود کو اتنا مت الجھاؤ، بس اتنا ہی جان لو کہ میں آئی نہیں تھی مجھے بھیجا گیا تھا جس کی محبت میں، میں پاگل تھی اور جسے حاصل کرنے کی خواہش میں، میں نے اپنی عزت وقار سب داؤ پر لگا دیا، اس نے میرے خالی دامن میں اپنی محبت اور عمر بھر کی رفاقت کی بھیک ڈالنا اس شرط پر گوارا کیا تھا کہ میں کسی بھی طرح سے اس شخص کو نیچا دکھاؤں جس کی وجہ سے اس کی بدنامی پوری یونیورسٹی میں بھی ہوئی تھی اور دوستوں میں بھی۔"

چائے کا گھونٹ کے لیے شاہ زین کے لبوں تک جاتا جاتا کپ وہیں رک گیا تھا، ایک جھٹکے سے تینوں کی نظریں ایک دوجے سے یوں ٹکرائیں کہ آنکھوں کا حجم حقیقت سے دوگنا ہو چکا تھا، ثمینہ کا منہ کھلا کا کھلا رہا اور اماں کے چہرے پر یوں دھیرے دھیرے زردی پھیلنے لگی جیسے شفاف پانی میں نیل کا ایک قطرہ گرے اور آہستہ آہستہ سارے پانی میں نیلاہٹ گھول کر اس کی اپنی شناخت ختم کر دے۔

"میں شاہ زین کی کلاس فیلو تو نہیں مگر یونیورسٹی فیلو ضرور تھی اور سارے معاملے سے واقف بھی۔۔۔ جب تک شاہ زین ہماری یونیورسٹی میں نہیں آیا تھا میران اور میری بہت اچھی دوستی تھی، لیکن اس کے یونیورسٹی جوائن کرنے اور ندی سے دوستی کے بعد

دونوں کی دوستی آہستہ آہستہ یک طرفہ ہوتی گئی اور محبت تو ویسے بھی ہمیشہ بس میں نے ہی اس سے کی تھی۔ ہونہہ۔۔۔ کیونکہ پہلے میران کا خیال تھا کہ ندی کسی بھی لڑکے سے اس طرح کی دوستی کرنا پسند نہیں کرتی جیسی اس کی اپنے بچپن کے دوست زبیر سے تھی اور وہ بھی صرف چونکہ دوستی تھی اس لیے سب کی طرح وہ بھی مطمئن تھا لیکن۔۔۔"

لہجے میں صدیوں کی مسافت کی تھکن لیے وہ چند لمحے رکی۔ پھر ثمینہ، اماں اور شاہ زین اپنی اپنی جگہ یوں منجمد بیٹھے تھے جیسے کسی جادوگر نے منتر پھونک کر ساکت و جامد کرتے ہوئے صرف اور صرف سانس لینے کی آزادی بخشی ہو۔

"شاہ زین کے یونیورسٹی آنے، ندی سے دوستی ہونے اور پھر ان کی دوستی کے محبت میں بدل جانے کا علم ہو جانے پر وہ تلملا اٹھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک اعلا سیاسی اور مال دار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اس لیے ندی پر پہلا "حق" اس کا ہے اور یہ بھی کہ ندی شاہ زین پر اسی کو فوقیت دے گی مگر۔۔۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہ ہوا، پتا نہیں میری دعاؤں کا اثر تھا یا ان کی محبت۔۔۔ ہمیشہ ہی میران کو ناکامی ہوئی اور پھر آخر کار وہ سب ہوا جو شہر والوں نے اخباروں میں پڑھا اور زبانوں سے سنا۔"

"زمین یہ سب۔۔۔؟"

"ہاں ثمینہ! یہ سب سچ ہے، اتنا ہی سچ جتنا یہ کہ وہ ایک انتہائی خود غرض انسان ہے، وہ جانتا ہے کہ میں اس سے کس قدر محبت کرتی ہوں اور مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کی شرط اس نے یہ رکھی کہ میں کسی بھی طریقے تم لوگوں کے قریب ہو کر تم سب کا اعتماد حاصل کر کے اس کے شہر والے فلیٹ پر لے جاؤں اور پھر ساری کالونی میں تم لوگوں کو بے عزت کر کے شاہ زین پر ایسے الزامات لگاؤں کہ وہ کبھی اس شہر میں نظر نہ آئے۔"

"اوہ میرے خدا!" اماں نے خود کلامی کرتے ہوئے دائیں ہاتھ سے اپنا سر تھام لیا تھا۔ شاہ زین نے بھی ذہن پر زور دیا تو زمین کا یونیورسٹی میں کبھی کبھار نظر آنا اور میران ہی کے گروپ میں ہونا بھی یاد آ گیا۔ گھر پر تو شاہ زین نے اسے بمشکل ایک دو مرتبہ ہی دیکھا تھا کیونکہ اس کے آنے کے اور زمین کے واپس جانے کے اوقات قدرے مختلف ہوا کرتے تھے۔

"اگر پہلے تم اس کے ساتھ پروپیگنڈا کر کے ہماری ہر طرح بے عزتی کروانے پر تیار تھیں تو اب۔۔۔ اب کیسے ضمیر جاگ گیا تمہارا خود غرض لڑکی!" ثمینہ نے دانت چباتے ہوئے نہ تو اپنے لفظوں سے غصے کو پوشیدہ رکھا اور نہ ہی لہجے سے۔

"مجھے احساس ہے کہ میں نے غلط فیصلہ ضرور کیا تھا، مگر میں مطمئن ہوں کہ اس کے لیے دل میں موجود بے پناہ جذبے کے باوجود میں نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جس سے کسی بھی طریقے سے شاہ زین یا اس کے گھر میں موجود کسی کو بھی کوئی نقصان پہنچے۔۔۔ اماں کی محبت اور تمہاری سادہ طبیعت، ہمیشہ سے میرے کسی بھی ارادے کی راہ میں رکاوٹ ہی رہے۔"

"ہونہہ! یوں کہو کہ اب وہ ہی تمہیں لفٹ نہیں کرا رہا۔" زمین کے اعتراف جرم کے بعد ثمینہ نے یونہی اندھیرے میں تیر چلایا جو کہ عین نشانے پر جا لگا۔ البتہ شاہ زین اب تک تقدیر کے اس معمہ پر حیران تھا۔ وہ جو کہ خاموشی سے ایک کنارے پر ہو گیا تھا اب تک کسی کی تیر کمان کی زد میں تھا اور یہ الگ بات تھی کہ اماں کی کی گئی تمام دعائیں ڈھال بن کر ان تیروں کے سامنے آ کر اسے اب تک محفوظ رکھے ہوئے تھیں۔

"ہاں۔۔۔ اور اب وہ مجھے لفٹ کروائے گا بھی کیوں؟ اگلے ہفتے اس کی اور ندی کی شادی جو ہے۔" زمین کے شکست خوردہ لہجے کے ساتھ ہی ثمینہ نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ اس کے کیے گئے انکشافات درحقیقت ان تینوں ہی کے لیے باعث تشویش بھی تھے اور وجہ فکر بھی۔

"ندی اور میران کی شادی اب ہو رہی ہے تو پھر عائشہ بھابھی کے مطابق جہاں شادی ہونے والی تھی کیا وہاں نہیں ہو پائی؟ کیا انہوں نے انکار کر دیا تھا؟ کیونکہ ندی نے بھی اپنے بھیجے گئے میسج میں شادی کا بتایا تھا اور اگر اب شادی ہو رہی ہے تو وہ بھی میران کے ساتھ۔۔۔۔؟ اور ندی جیسی لڑکی میران سے شادی پر رضامند بھی ہو گئی؟ اگر یہ سب حقیقت ہے تو پھر یونیورسٹی میں جو کچھ ہوا وہ کیا تھا؟"

ایک کے بعد ایک خیالات کا تانتا یوں بندھا کہ محسوس ہی نہیں ہو پایا کہ اتنی دیر سے فون بند کر دینے کے بعد بھی وہ لوگ ایک دوسرے سے کچھ بھی شیئر یا ڈسکس کرنے کے بجائے خاموشی سے اپنے ہی اندر گم ہیں۔ احساس ہوا تو تب جب اماں نے شاہ زین کو پکارا، ان کی طبیعت بگڑ رہی تھی، شاید ایک دم ذہن پر بوجھ ڈالنے سے ان کا شوگر لیول ہائی ہو گیا تھا۔

شاہ زین اور ثمینہ نے انہیں دیکھا تو سب کچھ بھول بھال کر ان کی طرف لپکے۔ وہ صوفے پر ہی نیم دراز ہو چکی تھیں، شاہ زین نے فوراً انہیں جھنجھوڑا، ثمینہ فوراً ہی سامنے میڈیکل باکس میں رکھی گلوکو میٹر نکال لائی اور ان کی انگلی کی پور پر سوئی چبھونے کے بعد نکلنے والے خون کے ایک قطرے کو گلوکو میٹر میں ڈالی جانے والی ننھی سی اسٹرپ پر لگایا اور انگلی کو روئی کی مدد سے صاف کرنے کے دوران دو تین سیکنڈز میں اسکرین پر نظر آنے والا ہندسہ دیکھا تو گویا پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ رزلٹ کے مطابق ان کی شوگر انتہائی زیادہ تھی۔ شاہ زین نے فوراً ہی انہیں ثمینہ کے حوالے کیا۔ کمرے میں جا کر اپنا والٹ اور موبائل اٹھایا اور اسی طرح ٹریک سوٹ اور سلیپرز میں فوراً گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد ثمینہ کی مدد سے انہیں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر اسے اچھی طرح گھر لاک کر لینے کی ہدایت کی اور ہوا کی رفتار سے گاڑی اڑاتا ہوا ہاسپٹل پہنچنے کی سعی کرنے لگا۔

☆☆☆

یہ دنیا جھوٹ مکر سائیں

یہاں سچ کا کون سا گھر سائیں
یہاں خوشبو پیچ سکتی نہیں
یہاں سچ تو ہے پر ساتھ نہیں
یہ تو اور میں کو بھول ابھی
یا مانگ میں لکھ لے ڈھول ابھی
دانتوں میں جیبھ نہ داب سکھی
تیری جیب میں بے بیاہ سکھی
جگ پوچھیں سائیں سب سکھی
تجھے کھا گیا پیٹ کا تاپ سکھی

گاؤں کی عورتیں جوق در جوق ان کی خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے آ رہی تھیں اور ویسے بھی بھلا کیسے ممکن تھا کہ شاہ سائیں کی طرف سے دعوت عام ہو اور لوگ نظر انداز کر دیں۔ آس پاس کے مختلف گاؤں کی سردارنیاں بھی آج پہلا روز ہونے کی وجہ سے مدعو کی گئی تھیں اور بھی فردوس کی نوبیاں مختلف نیوں کی نوکریوں کے ساتھ ساتھ چھوٹوں سے بھی لدی رہی تھیں۔

میران اپنے دوستوں کے ساتھ حویلی کے باہر کونے کے آخری مگر انتہائی کشادہ ہال نما کمرے میں موجود مبارک بادیں وصول کر رہا تھا۔ شاہ سائیں کسی پارٹی عہدے دار کی عیادت کے لیے فوری دوسرے شہر جانا پڑا تھا۔ گھر آنے والے سبھی مہمانوں کو ان کی طرف سے صرف اور صرف میران کی شادی کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی مگر آنے والوں کو مہربانو سے متعلق بھی اس لیے تھا کیونکہ رحمٰن شاہ سب کو اپنی اور مہربانو کی شادی کی بھی نہ صرف خبر دے چکا تھا بلکہ آج سے وہاں پر بھی رسوم کا آغاز ڈھولک رکھ کر کر دیا گیا تھا۔ اس بات کا کہ مہمانوں کے آنے سے ہی ہوا اور نہ رحمٰن شاہ نے کوئی پیغام نہیں بھجوایا تھا ورنہ یوں بھی اگر ایسے میں شک و شبہات اور یہ دنیا کی کیفیت بھی تو وہ صرف ملکانی اور شاہ سائیں کے بیچ تھی ورنہ تو ملکانی سائیں کے بھائی کی بیٹی کی بہو سے رشتہ پکا ہی خیال کر رہے تھے اور ایسے میں جب مہربانو کے نام سے رسومات کا آغاز بھی ہو چکا تھا مگر یہاں سے کسی بھی قسم کی پس و پیش کا مظاہرہ کیا جاتا تو زبان سے پھر جانے کی بدنامی رحمٰن شاہ اور اس کے گھر والوں کے نہیں بلکہ شاہ سائیں ہی کے حصے آتی۔ اب تو خود ملکانی سائیں بھی پریشان تھیں کہ اتنا بڑا فیصلہ انہوں نے آخر کن جذبات میں آ کر شاہ سائیں کی مرضی تو دور کی بات ان کے علم میں بھی لائے بغیر کر دیا۔ اپنے تئیں تو انہوں نے بس باتوں میں ایک بات کی تھی مگر اس بات کو ہی پکڑ لیا گیا اور ان کی شرکت کے بغیر ہی ان کے بھائی رحمٰن شاہ کو آس دلاتے رہے اور اب مسئلہ آن پڑا تھا زبان، انا اور عزت کا۔۔۔

حویلی کی ملازمائیں، مہمان خواتین کے ساتھ گاؤں کی عورتوں کو بھی برابر کا درجہ دے رہی تھیں کہ یہی شاہ سائیں کا حکم بھی تھا۔ جن مشروبات سے دوسری ملکانیوں اور سردارنیوں کی تواضع کی گئی تھی وہی مشروبات گاؤں کی عورتوں کو بھی اسی انداز میں پیش کیے جا رہے تھے۔ وقفے وقفے سے کبھی خشک میووں، ریوڑیوں، گجک اور رنگ دار میٹھی مصری ملی سونف سے بھرے تھال سب کے آگے پیش کیے جاتے تو کبھی سبز چائے، قہوہ اور کشمیری چائے میں سے حسب پسند مشروب حاضر ہوتا۔ ڈھولک کی تھاپ، تالیوں کی گونج اور قہقہوں میں جانے ایک ادھیڑ عمر عورت کو کیا سوجھی کہ مختلف ماہیے گاتی لڑکیوں کے رکتے ہی انہوں نے اداسی بھرا گیت چھیڑ دیا۔

وچھیوں رانیاں
ہائے او میریا ڈاہڈیا ربا
کناں جمیاں کناں نے لے جانیاں

چند لمحے پہلے شوخ و چنچل ٹپوں، ٹپوں اور ماہیوں کے فوراً بعد درد بھری آواز میں گائے جانے والے اس گیت نے سب پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔ قدرت کے طے کردہ قوانین و ضوابط کے آگے بھی کو بے بسی کا اظہار ہونے لگا تھا ورنہ نازوں اور لاڈوں سے پلی ہوئی اپنی راج دلاری بیٹیوں کو بھلا کون یوں کسی اور کے حوالے کرتا۔ دوسری خواتین کے ساتھ صوفے پر بیٹھی ملکانی کو کنیزاں نے آ کر ان کی ہدایت کے مطابق نو بج جانے کی یاد دہانی کروائی تو وہ معذرت کر کے اپنے بیڈ روم میں آ گئیں۔ سونی بھی خراماں خراماں ان کے پیچھے ہی تھی کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہونے پر جیسے ہی آوازیں آنا کم ہوئیں سونی یوں گداز کارپٹ پر نیم دراز ہوئی گویا بہت طویل مسافت چل کے آئی ہو اور یہ بات فطری بھی تھی کہ حویلی کے پرسکون در و دیوار بھلا اس شور و ہنگامے کے عادی ہی کب تھے۔ ملکانی سائیں پڑھی لکھی تو تھیں نہیں مگر اس کے باوجود میران، مہربانو اور شاہ سائیں کے فون نمبرز موٹے موٹے لکھ کر وہ پیپر انہوں نے اپنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر لگا رکھا تھا۔ جب بھی فون کرنا ہوتا وہیں پر کھڑے ہو کر نمبروں کی مشابہت دیکھ کر فون ملا لیا کرتیں اور ہمیشہ ہی دوسری طرف سے ملکانی کا نام فون اسکرین پر دیکھنے کے بعد فوراً ریسیو بھی کر لیا جاتا لیکن خلاف معمول آج ایسا نہ ہوتا ملکانی سائیں کے لیے اچنبھے کا باعث ضرور بنا۔ ایک دو تین گھڑے انہوں نے کتنی ہی دفعہ نمبر ملا ڈالا تھا مگر دوسری طرف سے فون بند ہونے کی اطلاع ایک تکرار کی صورت بار بار سنائی دینے لگی تو ان کا گھبرانا اس لیے بھی لازم تھا کہ آج سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ خود مہربانو کو فون کریں اور وہ ریسیو نہ کرے یا پھر ٹیپ سنائی دے۔

بے چینی کے عالم میں وہ کمرے کے دروازے کی اندرونی سائیڈ سے اٹیچڈ باتھ کے دروازے تک چکر کاٹنے لگیں۔ کریں تو کیا کریں اور کہیں تو کس سے؟

موقع ایسا تھا کہ حویلی مہمانوں سے بھری ہوئی تھی، ادھر میران اپنے دوستوں کے ساتھ شغل میلے میں لگا تھا ایسے میں اگر ان کے منہ سے نکلی بات کسی اور کے کانوں میں پڑی تو جانے سننے والے کیا رنگ دے ڈالیں۔۔۔ اور آج سے پہلے تو کبھی ایسا ہوا بھی

نہیں تھا کہ اس کے فون کی بیٹری نہ ہو، یا فون کبھی ہاسٹل بھول گئی ہو، اس لیے ملکانی سائیں اپنا تمام خیالات کو خارج از امکان ہی قرار دے رہی تھیں مگر پھر ایسا کیوں ہے کہ اس نے عین اس وقت فون بند رکھا ہے جبکہ ان کا آپس میں بات کرنا اسی وقت کے لیے طے ہے۔

کمرے کے یہاں سے وہاں چکر کاٹتے ہوئے ان کے ذہن میں جیسے خیالات کے بھنور تھے جو مسلسل بنتے ہی چلے جا رہے تھے۔ کبھی سوچتیں کہ شاہ سائیں کو اعتماد میں لیں تو کبھی خیال آتا کہ میران سے ساری بات شیئر کرنی چاہیے۔ ان کو یوں بے چین ٹہلتے دیکھ کر سونی اپنا آرام کرنا بھول کر ان کے قدموں سے جا لگی تو وہ وہیں بکھر گئیں اور اسے گود میں لے کر بے اختیار پیار کرنے لگیں۔ مہربانو سے متعلق عجیب سے الٹے سیدھے خیالات ان کے دل کو جیسے روئی کی طرح بوجھل کرنے لگے تھے۔ باہر سے آتی ڈھولک، تالیوں اور گیتوں کی مسلسل آوازیں اب ان کے کانوں میں ہتھوڑوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ "اب وہ کیا کر سکتی ہیں اور ایسا کون ہے جس سے انہیں مہربانو کے متعلق کوئی اطلاع مل سکتی ہے۔" اس خیال پر سوچتے ہوئے ان کے ذہن میں جیسے جھماکا سا ہوا۔ سونی کو گود سے نیچے اتارا، چادر ایک مرتبہ پھر اچھی طرح پھیلائی اور اپنے کمرے سے نکل کر طویل راہداری عبور کرنے کے بعد مہربانو کے کمرے کا تالا کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔

انہیں یاد تھا کہ ایک دفعہ مہربانو نے انہیں بتایا تھا کہ اس کی دوستوں کے نمبر اس کی ڈائری میں لکھے ہوتے ہیں اور اگر کبھی نیٹ ورک پرابلم کی وجہ سے بات نہ ہو پائے تو وہ بے شک ان میں سے کسی کو بھی فون کر لیں تو بات ہو جایا کرے گی کیونکہ وہ تینوں ہر وقت ایک ساتھ ہی ہوتی ہیں۔ کمرے میں سجی خوب صورت کتابوں کے اوپر نیچے گودی میں بنے چاروں شیلف پر ڈائری نظر نہ آنے کے بعد ملکانی سائیں نے سامنے سے اماری کھول کر دیکھی اور پھر یونہی بیڈ کے ساتھ رکھی سائیڈ ٹیبل کا دراز کھولا تو اس میں بالکل سامنے ہی ڈائری رکھی نظر آ تو گئی مگر مسئلہ وہی تھا۔ گہرے نیلے رنگ کی خوب صورت تھیں ڈائری میں ایک یا دو نہیں بہت سے نمبرز مختلف ناموں کے ساتھ لکھے ہوئے تھے، ایسے میں ان کے لیے یہ اندازہ لگانا کہ کون سے نمبرز اس کی حالیہ دوستوں کے ہیں بے حد مشکل اس لیے بھی تھے کہ وہ پڑھنے کی صلاحیت سے محروم تھیں۔ اس وقت ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی طور معجزے کے طور پر ہی سہی اور چند منٹوں ہی کے لیے پڑھنا سیکھ کر ان لڑکیوں کے نمبرز ڈھونڈ لیں جن سے مہربانو کے متعلق کچھ پتا چل پاتا۔۔۔ لڑکی ذات، رات کا وقت اور انجانا شہر۔۔۔ دل میں سو طرح کے وسوسے آنے لگے تھے اور پھر آخر وہ کب تک مہمان خواتین کو چھوڑ کر کمرے میں بیٹھ سکتی تھیں۔ ایک تو ویسے ہی وہ ٹینشن میں تھیں اوپر سے یہ مہربانو کے ساتھ رابطہ نہ ہونا ان کے وجود کو آندھیوں کی زد میں لیے ہوئے تھا۔

"ہو سکتا ہے مہربانو کو رحمن شاہ کے متعلق پتا چل گیا ہو اور اسی وجہ سے اس نے جان بوجھ کر فون بند کیا ہوا ہو۔۔۔" ایک یہ بھی خیال ذہن میں چند لمحوں کے لیے پناہ گزین ہوا تو ضرور، لیکن انہوں نے فوراً ہی رد بھی کر دیا۔ میران کے بجائے اپنے بھائیوں سے رابطے کا خیال بھی انہوں نے ذہن سے جھٹک دیا تھا اور میران کے غصے کا انہیں بخوبی اندازہ تھا۔

اسی وقت دروازے پر بڑی مدھم سی دستک ہوئی اور ان کی اجازت پا کر کنیزاں اندر چلی آئی۔

انہوں نے بغیر کچھ بولے استفہامیہ نظریں اس کے چہرے پر جما کر اس کے بولنے کا انتظار کیا۔

"ملکانی سائیں! باہر سب آپ کا پوچھ رہے ہیں اور اب مجھے آپ کو بلانے کے لیے بھیجا ہے۔"

"آ جانی ہاں باہر وی۔" انہوں نے بہت ہی روکھے انداز میں جواب دیا اور اس سے پہلے کہ وہ واپس لوٹتی پھر سے اسے آواز دے ڈالی۔

"نی کنیزاں۔۔۔!"

"جی ملکانی سائیں۔۔۔!" وہ بڑی تابعداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے انکی قدموں پر پلٹی تھی۔

"کج ناں کج سکول تے توں وی جاندی رہی ہے نا؟" "جی ہاں ملکانی سائیں!"

"تے ایدر آ، ایس ڈیری میں سے کج نام تے پڑھ کے بتا مجھے، میں وی دیکھوں کہ آخر کرلی کیا رہی ہے توں وی اسکول وچ۔۔۔"

ملکانی سائیں کے حکم کی تعمیل تو کرنا فرض تھی ہی سو وہ ان کے قریب چلی آئی ورنہ درحقیقت وہ چھوٹی ملکانی کے ذاتی استعمال میں رہنے والی ڈائری کھولنے میں بے حد جھجک محسوس کر رہی تھی۔ ملکانی سائیں اس کے سامنے فون نمبرز والا صفحہ کھول کر خود بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں۔ کنیزاں نیچے دبیز ایرانی قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی اور آہستہ آہستہ جیسا تیسا پڑھ کر بتانے لگی۔ میری کا نام آتے ہی ملکانی سائیں اچھلیں اور نمبر پر انگشتِ شہادت رکھ کر اسے جانے کو کہا اور خود اسی کمرے سے نمبر ملا لیا۔

دوسری طرف سے جواب آنے میں بمشکل ایک دو سیکنڈ کا ہی وقفہ ہوا تھا کہ میری کی آواز سنائی دی۔

"پتر! میں مہربانو کی ماں بات کر رہی ہوں۔ ذرا میری گل تے کروا دیو مہربانو کے ساتھ۔"

"وہ۔۔۔ آنٹی۔۔۔ ! دراصل۔۔۔" وہ بس سے اتر کر اب کنول کے بس سے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی اور یوں میری کو ان کے یوں فون کرنے کی ہرگز توقع نہیں تھی جبھی کوئی مناسب جواب ڈھونڈ نے لگی۔

"میری! مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ مہربانو کو کہاں ڈھونڈیں اور اب ہاسٹل جا کر یہ بات کیسے چھپائیں گے کہ وہ آج رات ہمارے ساتھ نہیں ہے۔"

بس سے باہر آ کر جیسے ہی کنول میری کے قریب آئی، ہوائیاں اڑتے چہرے کے ساتھ یہ جانے بغیر کہ وہ فون پر بات کر رہی ہے مخاطب ہوئی کہ ہاسٹل آتے ہوئے آج انہیں قوانین سے کہیں زیادہ تاخیر ہو چکی تھی اور اب یہی سوچ رہی تھیں کہ وارڈن کو کیا جواب دیا جائے۔

"مہربانو کتھے ہے؟ کدھر گئی وہ؟ کس دے ساتھ چلی گئی؟"

کنول کی آواز کانوں میں پڑتے ہی ملکانی سائیں کے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی تھی۔ ذہن میں اپنی بیٹی، میران شاہ یا شاہ سائیں کے بجائے رحمن شاہ کا چہرہ پوری نخوت کے ساتھ ابھرا۔۔۔

"نن، نن، نہیں۔۔۔ نہیں تو آنٹی! ایسی بات نہیں ہے وہ دراصل۔۔۔"

ایک تو ان کے اپنے اوسان خطا تھے پھر اب آنٹی کو پتا چل جانے سے وہ مزید خوف زدہ ہو گئیں کہ مہربانو کے گھر کے ماحول کا انہیں بخوبی اندازہ تھا۔

"میرے کولوں اتنی باتیں نا چھپاؤ، سچ سچ بتاؤ مسئلہ کی اے؟" ملکانی سائیں کی رعب دار اور غصیلی آواز پر میری نے سب کچھ سچ سچ بتا کر انہیں حیران پریشان چھوڑتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

شاپنگ مال پر اپنی اپنی خریداری کر کے وہ دونوں تو مقررہ جگہ پر آ پہنچی ہوئی تھیں مگر مہربانو کے نہ پہنچنے اور فون کرنے کی صورت میں اس کے فون کے بند ہونے کا پتا آنے پر وہ کافی دیر وہیں اسے ڈھونڈتی رہی تھیں۔ انتظامیہ چونکہ شاپنگ مال بند کرنے میں مصروف تھی اور ان کے یہ بتانے پر کہ اوپر کے بھی فلورز بند کیے جا چکے ہیں وہ بس اسٹاپ پر بھی کافی دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی تھیں مگر ظاہر ہے کہ جب اس نے آنا تھا نہ آئی۔ سو تھک ہار کر وہ ہاسٹل آ گئی تھیں، وقت پر آ جاتیں تو اتنا مسئلہ نہ تھا مگر اب چونکہ تاخیر ہو چکی تھی اس لیے ان کی کوشش تھی کسی طرح وارڈن کے سامنے یہ ظاہر کیا جائے کہ وہ اندر ہاسٹل ہی میں ہے تاکہ بات نہ پھیلے۔ مگر درحقیقت اس وقت وہ کہاں ہے، یہ خیال ان کے ہونٹ خشک اور آنکھیں ویران کیے ہوئے تھا۔

باقی آئندہ شمارے میں

بقیہ آغا علی عباس

"ارے جی انسانوں سے نہیں' جھوٹ سے نفرت ہے۔"

17 "خواتین کب بری لگتی ہیں؟"

"اف ـــ اس وقت جب بہت زیادہ میک اپ کرتی ہیں اور جب اپنی عمر سے بہت چھوٹی بننے کی کوشش کرتی ہیں۔"

18 "اعتماد کے قابل کون ہوتا ہے لڑکے یا لڑکیاں؟"

"پتا نہیں کبھی آزمایا نہیں ـــ بس ایک دوست ہے اسی پر بھروسہ کرتا ہوں۔"

19 "کن چیزوں کے بغیر نہیں رہ سکتے؟"

"سگریٹ' موبائل فون اور سن گلاسز۔"

20 "غصہ کس پر اترتا ہے؟"

"اپنے کتے پر۔"

21 "بستر کی سائیڈ ٹیبل پہ لازمی چیزیں کیا ہوتی ہیں۔"

"سگریٹ ایش ٹرے' لیپ ٹاپ' موبائل' موبائل چارجر اور بتا نہیں کیا کیا۔"

22 "شادی کے لیے آئیڈیل؟"

"بیوی کے روپ میں سیرت صورت دونوں بہت خوب صورت ہونی چاہئیں۔ میں تھوڑا حسن پرست بھی ہوں۔"

23 "خرچ کرتے وقت کیا سوچتا ہوں؟"

"کہ خرچ پورا ہو جائے کچھ کمی نہ رہ جائے۔"

24 "اپنے لیے سب سے مہنگی چیز کیا خریدی؟"

"لیپ ٹاپ۔"

25 "اپنی کس عادت سے چھٹکارا چاہتا ہوں؟"

"سگریٹ نوشی سے۔"

26 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"

"کہ اپنی ماں کو دیکھوں۔"

27 "تنہائی میں کس سے ہم کلام ہوتا ہوں؟"

"اپنے اللہ سے اور اپنے والد سے کہ اتنی جلدی مجھے اکیلا چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔"

28 "مستقبل کیسا دیکھتے ہیں؟"

"بہت اچھا' بہت روشن مجھے میرا رب میری محنت [illegible]

[illegible]"

29 "موڈ خراب ہو تو؟"

"تو اپنے آپ سے باتیں کر کے دل کی بھڑاس نکالتا ہوں کمرے میں بند ہو کر اور پھر جب موڈ ٹھیک ہو جائے تو باہر آتا ہوں فریش ہو کے۔"

30 "اکثر دعا کرتا ہوں کہ؟"

"اے اللہ مجھے ذرا لمبی عمر دینا' بہت محنت کی ہے' بہت جدوجہد کی' اپنی ترقی دیکھنا چاہتا ہوں اور اچھی زندگی جینا چاہتا ہوں۔ زندگی کو انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔"

31 "پسندیدہ صحافی؟"

"آپ ـــ کیونکہ آپ کے سوالات بہت اچھے ہوتے ہیں۔ کہیں بوریت کا احساس نہیں ہوتا (شکریہ آغا علی عباس)۔"

32 "شخصیت کو کس طرح پرکھتا ہوں؟"

"اس کا انداز گفتگو دیکھ کر کیونکہ میرا خیال ہے کہ انسان کی گفتگو میں اس کی ساری شخصیت پوشیدہ ہوتی ہے۔"

33 "آئینے سے کیا باتیں کرتا ہوں؟"

"یہی کہ مجھے اپنے والد صاحب آغا سکندر کی طرح خوب صورت ہونا چاہیے تھا۔"

34 "کن کھانوں کی خوشبو سے بھوک بھڑک اٹھتی ہے؟"

"کناکٹ کی خوشبو اور ماں کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانوں کی خوشبو سے بھوک بھڑک اٹھتی ہے۔"

35 "بچت کہاں خرچ کرتا ہوں؟"

"کہیں نہیں بچت کو بینک میں جمع کرا دیتا ہوں۔"

36 "موبائل سروس آف ہو تو؟"

"تو سکون رہتا ہے۔ میرے نزدیک یہ رحمت سے زیادہ زحمت ہے۔"

37 "محبت کے بارے میں میری سوچ؟"

"یہ ایک بار نہیں بار بار ہوتی ہے۔"

38 "کیا دعا سے سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں؟"

"جی نہیں ـــ دعا بھی اسی وقت ساتھ دیتی ہے جب آپ دوا بھی کرتے ہیں۔ محنت کریں' دعا کریں کامیابی کی اور فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیں اچھا ہی رزلٹ آئے گا۔"

39 "میری جسمانی ساخت میں کیا اچھا ہے؟"
"میرے بال۔۔۔ بہت پسند ہیں مجھے۔"
40 "شہرت کے بارے میں تاثرات؟"
"اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور میرے خیال میں اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کو اچھی شہرت عطا فرماتا ہے۔"
41 "شدید بھوک میں کیفیت؟"
"اف، بہت بری ہوتی ہے کیونکہ مجھ سے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔"
42 "بھوک کب مرجاتی ہے؟"
"غصے کی حالت میں مگر جب غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو پھر خود ہی کھانا گرم کرکے کھالیتا ہوں۔"
43 "آٹوگراف میں کیا لکھتا ہوں؟"
"زیادہ تر اپنے دستخط کرتا ہوں۔"
44 "ایک بری عادت جواب کم ہوگئی ہے؟"
"جھوٹ بولنے کی مگر اب اللہ کا شکر ہے کہ جھوٹ ضرورت کے وقت ہی بولتا ہوں۔ کسی کو بچانے کے لیے کسی کی ضرورت کے لیے۔"
45 "چہرے کے خدوخال میں کیا چیز بری لگتی ہے؟"
"اپنی ناک۔۔۔ ضرورت سے زیادہ لمبی ہے۔" (قہقہہ)
46 "کن لوگوں پر خرچ کرکے بہت خوش ہوتی ہے؟"
"اپنی فیملی پر، حقیقی خوشی ہوتی ہے۔"
47 "تلملا کر رہ جاتا ہوں؟"
"جب لوگ کہتے ہیں آج کل کیا کر رہے ہو۔۔۔ جبکہ میرے بیک وقت دو تین سیریلز تو آن ایئر ہوتے ہی ہیں۔"
48 "فٹ رہنے کے لیے کیا کرتا ہوں؟"
"جم جاتا ہوں، ایکسرسائز کرتا ہوں۔"
49 "تازگی کا احساس کب ہوتا ہے؟"
"جب سو کر اٹھتا ہوں۔ ساری تھکن دور ہوچکی ہوتی ہے۔"
50 "پاکستان کے بارے میں کیا سوچتا ہوں؟"
"کہ یہ ہمارا نہیں ہمارے سیاست دانوں کا ملک ہے۔"
51 "زندگی میں کمی محسوس ہوتی ہے؟"
"سکون کی، سب کچھ ہے مگر سکون نہیں ہے ذہنی طور پر۔"
52 "گھر میں کس جگہ سکون ملتا ہے؟"
"اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر۔"
53 "کوئی ڈزنی مسٹس گھورے تو؟"
"مسکرا دیتا ہوں۔"
54 "نیند کب نہیں آتی؟"
"ترستا ہوں نیند کے لیے، تھکا ہوا ہوتا ہوں تو دل چاہتا ہے کہ لیٹتے ہی سو جاؤں۔ مگر نہیں نیند نے جلدی آنا ہی نہیں ہوتا۔"
55 "زندگی بری لگتی ہے؟"
"اب نہیں لگتی۔۔۔ مگر جب جدوجہد کا دور تھا تو سوچتا تھا کہ کب اچھے دن آئیں گے۔"
56 "رونا آتا ہے؟"
"بہت آتا ہے، اکثر آتا ہے مگر تنہائی میں۔"
57 "دن گزر جانے پر کیا سوچتا ہوں؟"
"کہ آج میں نے کچھ Achieve بھی کیا یا دن ایسے ہی گزر گیا۔ کچھ اچھا کیا ہو تو سکون ملتا ہے ورنہ بے چینی۔"
58 "دیرینہ خواہش؟"
"ہالی ووڈ میں کام کرنے کا موقع مل جائے۔"
59 "اس دور کی بہترین ایجاد؟"
"کیمرہ۔۔۔ بہت سی چیزیں محفوظ ہوجاتی ہیں جو بعد میں دیکھنے میں بہت اچھی لگتی ہیں۔"
60 "پولیس سے کب ہاتھ ملاتے ہیں؟"
"جب اس کی مٹھی میں کچھ رکھنا ہو۔۔۔ (قہقہہ)۔ کئی بار رشوت دے کر اپنی جان چھڑائی ہے۔"

☆ ☆

کس موقع کا صدقہ افضل ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کس موقع کے صدقہ کا ثواب سب سے زیادہ ہے؟" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "سب سے افضل صدقہ یہ ہے کہ تم تندرستی کی حالت میں صدقہ کرو، جبکہ مال کی حرص تمہارے اندر موجود ہو، تمہیں فقر و فاقہ کا اندیشہ ہو اور تمہیں اپنی زندگی باقی رہنے کی امید ہو۔ اس وقت سے زیادہ صدقہ خیرات میں تاخیر نہ کرو کہ جب روح حلق میں پہنچ جائے تو تم یہ کہنے لگو کہ فلاں کو اتنا دے دیا جائے اور فلاں کو اتنا دے دیا جائے، حالانکہ وہ تو فلاں (ورثاء) کا ہوچکا۔"

(مسند احمد بن حنبل)

صائمہ۔ کراچی

قبر۔۔۔ آخرت کی پہلی منزل

امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ جب کسی قبر کے پاس کھڑے ہوتے تو اتنا روتے تھے کہ آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہوجاتی تھی۔ کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ جنت اور دوزخ کے تذکرے سے اتنا نہیں روتے اور قبر کو دیکھ کر اس قدر روتے ہیں؟ آپؓ نے فرمایا۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔" بلاشبہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے۔ سو اگر قبر کی مصیبت سے کسی نے نجات پالی تو اس کے بعد کی سب منزلیں (حشر و حساب اور پل صراط وغیرہ) آسان ہیں اور اگر اس کی مصیبت سے نجات نہیں پائی تو اس کے بعد کی سب منزلیں اس سے بھی زیادہ سخت ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "قبر سے زیادہ برا اور مصیبت والا منظر میں نے کوئی اور نہیں دیکھا۔"

(جامع ترمذی۔۔۔ سنن ابن ماجہ)

ارم۔ لاہور

اے قوم۔۔۔!

اے قوم! انسانوں کا وہ گروہ، جو بھیڑوں کی زندگی اختیار کرتا ہے، بھیڑیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوتا ہے۔ ہم میں آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو صرف چرواہے کہلانے کے شوق میں جمہور کو بھیڑوں کی زندگی اختیار کرنے پر آمادہ کر رہے ہیں۔ بیڈری کے بعض خواہش مندوں کو اندیشہ ہے کہ جب قوم متحد ہو کر جدوعمل کے میدان میں نکل آئے گی تو ان کی منفی اور تخریبی کارروائیوں کی قیمت گھٹ جائے گی۔ اس لیے وہ قوم کے شیرازے کو ہر قیمت پر منتشر رکھنا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں نے گزشتہ صدیوں میں بارہا ملت کی چٹان کو خود غرضی کے تیشوں سے پاش پاش کیا ہے۔ اسلام ایک تھا لیکن انہوں نے اس کی وحدت کو فرقوں، گروہوں، نسلوں اور خطوں میں تقسیم کیا۔ آلام و مصائب کے ادوار میں جب مسلمانوں میں اتحاد و تنظیم کی روح بیدار ہوئی یہ لوگ میدان میں نکل آئے تھے۔ جب اہل غرناطہ پر مصائب کی گھٹائیں نازل ہورہی تھیں یہ لوگ انہیں عربی، اندلسی اور بربری کے نام پر لڑا رہے تھے۔ جب بغداد پر تاتاری یورش کر رہے تھے، یہ لوگ مختلف فرقوں میں منافرت پھیلانے میں مصروف تھے۔

نسیم حجازی کی تصنیف "خاک و خون" سے اقتباس۔

نجمہ حفیظ۔ کورنگی، کراچی

فرمودات جبران

☆ بڑے سے بڑے غنی اور بڑے سے بڑے فقیر کے درمیان حد فاضل ایک دن کی بھوک اور ایک ساعت کی پیاس ہے۔

☆ عبقریت ایک گیت ہے جسے پرندہ شدید انتظار کے بعد آنے والی بہار کی آمد پر گاتا ہے۔

☆ جمال مشتاق دلوں میں زیادہ درخشاں ہے' بہ نسبت مشاہدہ کرنے والی آنکھوں کے۔

☆ اگر مہمان نہ ہوتے تو گھر قبرستان ہو جاتے۔

☆ اس دنیا میں ایسی کوئی خواہش نہیں جس کا وجود نہ ہو۔

☆ کچلی ہوئی روح بھی فطری ضروریات سے نجات نہیں پا سکتی۔

☆ اگر کسی چیز سے [illegible] چاہتے ہو تو اسے اپنے نفس کے لیے نہ مانگو۔

☆ انسان کے خیال اور اور اک کے درمیان ایک مسافت ہے جسے اس کی آہ پرشوق کے سوا کوئی طے نہیں کر سکتا۔

☆ ایمان دل کے صحرا میں ایک سرسبز و شاداب قطعہ زمین ہے جہاں فکر کے قافلے نہیں پہنچ سکتے۔

حرا قریشی... بلال کالونی' ملتان

انمول موتی

☆ محبت جسد وفا میں ڈھلتی ہے تو امر ہو جاتی ہے۔

☆ ہر آنکھ دیکھتی ضرور ہے مگر محسوس کرنے والی آنکھ بہت کم ہوتی ہے۔

☆ تعلق' جذبے' محبت سب اتنی ہی شدت سے جواب چاہتے ہیں جتنی شدت سے وہ کسی کے لیے پیدا ہوتے ہیں' اگر بندہ ان کی طلب کے مطابق جواب نہ دے تو سب ختم ہو جاتا ہے۔

☆ پتا نہیں کیوں انسان اپنا غم سہہ لیتا خود پر گزری برداشت کر لیتا ہے۔ لیکن جب کسی عزیز ہستی کو اس دکھ کی بھٹی میں جلتا پاتا ہے تو محبت کے چہرے پر جھریاں [illegible] ہیں۔

☆ اگر لگن میں خلوص اور کچھ پا لینے کی تمنا ہو تو پھر ہارا نہیں کرتے۔

☆ محبت [illegible] اگر یہ مرجھا جائے تو زندگی میں [illegible] نہیں رہتی۔

☆ جو [illegible] جائے وہ مقدر نہیں اندیشہ ہے جو بدل جائے وہ صرف امکان ہے مقدر نہیں' جو نہ بدلے وہ مقدر ہے' جو اٹل ہو وہی امر الٰہی ہے۔ وہ نصیب ہے۔

[illegible]

فوزیہ ثمر بٹ... گجرات

[illegible]

ہم نے [illegible] قوم کی بہتری کے لیے بہت سے مشورے دیا تھا کہ [illegible] اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے [illegible] کو [illegible] قرار دیا جائے [illegible] سرکاری [illegible] کو [illegible] ایک دن [illegible] ایک دن چھٹی کریں تو رکھوں [illegible] میں چھٹی کا بہت فائدہ ہو گا کیونکہ کام تو چھٹی کے دن بھی اتنا ہی ہوتا ہے' جتنا دوسرے دنوں میں' بجلی' پیٹرول اور رشوت کی بچت ہو گی۔

ہم حکومت کو مشورے دیتے رہتے ہیں۔ [illegible] ہمیں پتا چلا کہ حادثے [illegible] ڈرائیوروں کی [illegible] ہوتے ہیں تو ہم نے کہا کہ حادثوں کی روک تھام کے لیے ڈرائیوروں کے گاڑی چلانے پر پابندی عائد کر دی جائے۔ ایسے ہی پتا چلا کہ ٹرین کے حادثوں میں پہلی تین' چار بوگیوں میں جانی نقصان زیادہ ہوتا ہے تو ہم نے مشورہ دیا کہ ٹرین کی پہلی تین' چار بوگیاں ہونی ہی نہیں چاہئیں تاکہ جانی نقصان کا اندیشہ نہ رہے۔ لیکن حکومت کے فیصلوں سے لگتا ہے کہ ہم جیسے مشورے دینے والے ان کے پاس بھی موجود ہیں۔ جن کے مشوروں پر عمل کر کے حکومت نے رات کے آٹھ بجے تمام دکانیں اور بازار بند کرنے کا حکم دیا ہے۔

جرائم سربازار ہونے لگے تھے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ بازار بند ہوں تاکہ سربازار جرائم نہ ہو سکیں۔ بہرحال ہمیں خوشی ہے کہ حکومت نے جرائم کم کرنے کے لیے ٹھوس قدم اٹھایا۔ رات آٹھ بجے دکانیں اور بازار بند ہونے سے رات کے جرائم کا قلع قمع ہو جائے گا۔ حکومت کو چاہیے کہ دن کے جرائم کو روکنے کے لیے دن کو بھی تمام بازار اور مارکیٹیں بند رکھنے کا حکم دے تاکہ ملک مکمل طور پر امن کا گہوارہ بن جائے۔

(ڈاکٹر محمد یونس بٹ کی کتاب "بٹ تمیزیاں" سے انتخاب)

حنا خان... کراچی

نیا سال

نئی صبحیں' نئی شامیں' نئے لمحے' نئے ساتھی
مگر اک میں...

کہ جو دیے کا دیا ہوں
فرات وقت پہ بکھرے
گزشتہ سال کی ساری
ادھوری خواہشوں کے
ان گنت ٹکڑوں کو چنتا ہوں
انہیں اک ایک کر کے جوڑتا ہوں
شکل دیتا ہوں
میں پھر اک خواب بنتا ہوں

(امجد بخاری)

ثمینہ وشر عطاری... ڈوگہ گجرات

بیوی

"وہ پہلی بدشکل بیوی" ایک صاحب نے کہا۔
"دوسری بدتر ہے اور تیسری بھی ویسی ہے..."
میں نے پوچھا "ارے! تمہاری اور کتنی بیویاں ہیں؟"
ہنس کر جواب دیا۔ "یہ آٹھویں ترمیم ہے۔"

سیما ممتاز عباسی... [illegible]

خود کفیل

اچھی گزر رہی ہے دل خود کفیل سے
لنگر سے روٹی لیتے ہیں پانی سبیل سے
دنیا میرے پڑوس میں تو رہتی ہے' مگر
میری دعا سلام نہیں اس ذلیل سے

کشور عذرا [illegible]... عبدالحکیم

روشن لفظ

☆ ہر اک کی سنیں اور ہر اک سے سیکھیں' کیونکہ ہر کوئی سب کچھ نہیں جانتا' لیکن ہر اک کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہے۔

☆ شکر ادا کرتے رہا کریں اس رب کا جو برداشت سے زیادہ دکھ نہیں دیتا' مگر اوقات سے زیادہ سکھ ضرور دیتا ہے۔

☆ جو آپ کو خوشی میں یاد آئے۔ آپ اس سے محبت کرتے ہیں' مگر جو آپ کو غم میں یاد آئے سمجھیں وہ آپ سے محبت کرتا ہے۔

☆ اگر قسمت میں سب لکھ دیا جاتا تو میرا اللہ سے جو رشتہ دعا کا ہے وہ کون نبھاتا؟

سارہ چوہدری... ڈوگہ گجرات

لفظوں کی قندیل

☆ بعض اوقات الفاظ سے زیادہ خاموشی میں وضاحت ہوتی ہے۔

☆ کسی انسان کے دماغ میں اندیشہ اور پھر دل میں محبت بیک وقت نہیں رہ سکتے۔

☆ بھلاتے ان کو ہیں جو کہیں دور چلے جائیں' مگر جو ہمارے دل کے مکین ہوں اور مکین بھی ایسے جن کے ہم عادی ہو چکے ہوں' انہیں بھلانے کے لیے زمانے بھی کم پڑ جاتے ہیں۔

☆ کسی کو پا لینا اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا کسی کے دل میں جگہ بنا لینا ہوتا ہے۔

☆ دل بجھ جائے تو شہر تمنا کے چراغاں سے خوشی

حاصل نہیں ہوتی۔

☆ زندگی میں ناکامیاں اس لیے آتی ہیں تاکہ وہ اپنے بعد آنے والی کامیابیوں کے لیے راہ ہموار کر سکیں۔

☆ ہمیشہ بات کے مثبت پہلو کی طرف غور کرو۔ منفی پہلو خود بخود پس منظر میں چلے جائیں گے۔

☆ اگر تم کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو خود سے زیادہ خدا پر یقین رکھو۔

نوشابہ منظور۔۔ بھریا روڈ

بیاں نہ ہو

رونا ہے دل تو روئے لبوں پر فغاں نہ ہو
یہ حکم ہے کہ آگ جلے اور دھواں نہ ہو
زخموں کو پھول اشک کو شبنم کہو کہ اب
صاحب یہ چاہتے ہیں کہ غم کا بیاں نہ ہو

امبر گل۔۔ جھنڈو سندھ

اور یہ جنوری

تیری یادوں کی روانی
اور یہ جنوری
میری باتیں، تری کہانی
اور یہ جنوری
میرا ہاتھ، تیرا ساتھ، لمبی سڑک
اور یہ جنوری
گم سم شامیں، سنہری راتیں
اور یہ جنوری
بہتی ندی، گاتے پنچھی، اڑتی دھند
اور یہ جنوری
کافی، بستر، تری محبت
اور یہ جنوری
تنہا من، تنہا چاند، میرا کمرہ
اور یہ جنوری
میری آنکھیں، میری نیند، میرے خواب
اور یہ جنوری

ثمینہ کوثر عطاری
گجرات

تم سے کہنا ہے

☆ ہماری قسمت کا فیصلہ ہماری زبان کی نوک پہ ہوتا ہے۔

☆ دوست کی نسبت دشمن کو معاف کر دینا آسان ہو جاتا ہے۔

☆ زندگی کی عنایتوں کو ہمیشہ ہنس کر سہو، یہ نہ ہو کہ لوگ تمہارے آنسوؤں کا مذاق اڑائیں۔

☆ کبھی کسی کو مت آزمائیں، ہو سکتا ہے وہ مشکل میں ہو اور آپ کی آزمائش پر پورا نہ اترے تو دکھ تو صرف اور صرف آپ کی ذات کو ہوگا۔

☆ کبھی کسی کو بددعا نہ دیں، یہ نہ ہو کہ یہ کلمہ کسی کی منزل کی راہ میں روڑا اٹکا دے۔

☆ انسان کو اتنا دکھ برائی بات نہیں دیتی جتنا کہ لفظ کاش۔

☆ ایک لمبی زبان انسان کو بہت چھوٹا کر دیتی ہے۔

☆ انسان اپنے ماضی کو کبھی نہیں بھلا سکتا، لیکن اپنے مستقبل کے لیے اچھی کوشش تو کر سکتا ہے۔

☆ فطرت اور سوچ کا فرق ہوتا ہے، ورنہ انسان جیسا بھی ہو دل کا برا نہیں ہوتا۔

☆ انسان کو لفظ نہیں رویے مارتے ہیں۔ بولنے سے پہلے سوچنا نہیں تو کم از کم اپنے لفظوں پر نظر ثانی تو کریں۔

صدف مختار، میمونہ ریاض۔۔ جوسن مسعود

حسن انتخاب

قبضہ دل دیا مجھے میرے مکان کا
میرے جو تھے وکیل عدیم النظیر ہیں
فیس ان کی پوچھتے ہو تو اب اس مکان میں
خود حضرت وکیل رہائش پذیر ہیں

کلام : انور مسعود

عرفانہ احمد۔۔۔ دائرہ دین پناہ

بشریٰ محمود

صدف اور عافیہ، کی ڈائری میں تحریر
محشر بدایونی کی غزل

زمیں کے قرض بھی بستی میں کیسے کیسے ہیں
مکان کیا ہیں سروں پر پہاڑ رکھے ہیں

نہ سوچنے میں دکھوں سے فراغتیں ہیں بہت
جو سوچتے ہیں تو بس سوچتے ہی رہتے ہیں

اندھیری شب میں کھلے آسمان کے نیچے
یہ کون لوگ ہیں جو پتھروں پہ بیٹھے ہیں

کہاں سے رہیں گے روغن مسافر آج کی شام
چراغ جلنے سے پہلے دماغ جلتے ہیں

کچھ اتفاق نہیں جن کے پاؤں کی زنجیر
سنا ہے آئیں گے وہ دیکھیے کب آتے ہیں

یہاں کشش نہیں آبادیوں کی حد کا سراغ
تمام راستے ویرانیوں سے ملتے ہیں

سفینہ، کی ڈائری میں تحریر
گلزار کی نظم

اتنی مہلت کہاں کہ گھٹنوں سے
سر اٹھا کر فلک کو دیکھ سکوں
اپنے ٹکڑے اٹھاؤں دانتوں سے
ذرہ ذرہ کریدتا جاؤں
چھیلتا جاؤں ریت سے انساں
وقت بیٹھا ہوا ہے گردن پر
توڑتا جا رہا ہے ٹکڑوں میں
زندگی دے کے بھی نہیں چکتے
زندگی کے جو قرض دینے ہیں

ظل ہما، کی ڈائری میں تحریر
محسن نقوی کی غزل

وسعت چشم تر بھی دیکھیں گے
ہم تجھے بھول کر بھی دیکھیں گے

زخم پر تہمت کر نہ لب اپنے
زخم کو چارہ گر بھی دیکھیں گے

ہجر کی شب سے حوصلے اپنے
بچ گئے تو سحر بھی دیکھیں گے

اک دعا دل سے چھپ کر مانگی تھی
اس دعا کا اثر بھی دیکھیں گے

اک پرانا سفر تمام ہوا
اک نئی رہگزر بھی دیکھیں گے

گن تو لینے دو بے کفن لاشیں
بے صدا بام و در بھی دیکھیں گے

رات ہونے دو، لوگ سونے دو
چاند کو در بدر بھی دیکھیں گے

چھیڑ کر دل کی راکھ کو محسن
اب کے رقصِ شرر بھی دیکھیں گے

عرشیہ واصف، کی ڈائری میں تحریر
امجد اسلام امجد کی نظم

ساحل،

تمہارے نام کے حرفوں سے بہتر حرف ابجد میں
نہیں ہیں
نجانے کب سے یہ موسم
ستاروں کی طرح دھرتی کے سینے پر فروزاں ہیں
مگر ان کی نگاہوں نے
تمہارے وصل کے لمحوں سے بہتر وقت
دیکھا ہے نہ سوچا ہے
ہوائے منظروں پر آج تک جو کچھ بھی لکھا ہے
تمہارے نام لکھا ہے

خلا میں ٹوٹتے تارے
تمہارے بام سے گزریں تو رکنے کو مچلتے ہیں
فلک کو چومتے جذبے
تمہاری آنکھ سے اتریں تو پاتالوں میں گرتے ہیں
تمہارے خواب سے روشن منارے
وقت کے دریائے بے حد میں نہیں ہیں
تمہارے نام کے حرفوں سے بہتر حرف ابجد میں نہیں
ہیں

صابرہ یار محمد، کی ڈائری میں تحریر
محسن نقوی کی نظم

دسمبر ہمیں راس آتا نہیں،

کئی سال گزرے
کئی سال بیتے
شب و روز کی گردشوں کا تسلسل
دل و جاں میں سانسوں کی پرتیں الٹتے ہوئے
زلزلوں کی طرح ہانپتا ہے
چٹختے ہوئے خواب
آنکھوں کی نازک رگیں چھیلتے ہیں
مگر میں ہر اک سال کی گود میں جاگتی صبح کو
بے کراں چاہتوں سے اٹی زندگی کی دعا دے کر
اب ایک ہی جستجو کا سفر کر رہا ہوں
گزرتا ہوا سال جیسا بھی گزرا مگر سال کے آخری دن
نہایت کٹھن ہیں
مرے ملنے والو
نئے سال کی مسکراتی ہوئی صبح گر ہاتھ آئے تو

تو ملنا
کہ جاتے ہوئے سال کی ساعتوں میں
یہ بجھتا ہوا دل
دھڑکتا تو ہے مسکراتا نہیں
دسمبر مجھے راس آتا نہیں

فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر
اعتبار ساجد کی نظم

یہ سال بھی آخر بیت گیا
کچھ ہیں، یادیں، خواب بیے
کچھ کلیاں، چند گلاب لیے
کچھ نکھرے ہوں پر آب سے، کچھ اجلے دن، کالی راتیں
کچھ سچے دکھ، جھوٹی باتیں، کچھ تپتی رتیں، کچھ برساتیں
کسی یار عزیز کا دکھ پیارا، کسی چاہت سے امید دل کا
جس پہ ہنستا تھا جگ سارا
اس شاعر نے جو حرف لکھے
اس میں تیری یاد کے سائے تھے

وہ لوگ سبھی آخر لوٹ گئے
ان ہنستے بستے لوگوں نے
میرے سارے دکھ اپنائے تھے
پھر میں نے یاد کی مٹی میں
زخمی لمحے دفنائے تھے

فرزانہ، کی ڈائری میں تحریر
صدیق طیبہ مسلم

سلسلہ روز و شب،

یہ دو چار لمحوں کی روشن کرن
اندھیرے میں الجھی ہوئی
اجالا ہی دیکھتی ہے
رگوں میں اداسی بکھرتی چلی جا رہی ہے
خوشی درد کے بازوؤں سے لپٹ کر سسکیاں
لے رہی ہے
یہی زندگی ہے
اسی سے کرن پھوٹتی ہے
مگر میں کرنے کو یہ تھی
بڑی شے ہے، تمنا ہی زندہ رہے
رگوں میں حرارت مچلتی رہے

فضا میں نئے چاند منڈلا رہے ہیں، ستارے چمک رہے ہیں
یہاں ہم زمیں پر
فضاؤں کو بڑے شوق سے دیکھتے ہیں
جہاں گردشیں ہی مقدر لکھتی رہتی ہیں

سنا ہے، اندھیرا اجالے کے دل میں مکیں ہے
فضا ہو، زمیں ہو، یہی سلسلہ ہے
اجالا اندھیرا ہم آغوش ہیں

لبنیٰ مشتاق، کی ڈائری میں تحریر
احمد فراز کی نظم

آئی بینک،

میں تو اس کرب نظارہ سے تڑپ اٹھا ہوں
کتنے ایسے ہیں جنہیں حسرت بینائی ہے
جن کی قسمت میں کبھی دولت دیدار نہیں
جن کی قسمت میں تماشا نہ تماشائی ہے
جو ترستے ہیں کہ کرنوں کو برستا دیکھیں
ان سے کہہ دو کہ وہ آئیں میری آنکھیں لے کر
اس سے پہلے کہ مرا جسم فنا ہو جائے
اس سے پہلے کہ یہ خاکستر جاں بھی نہ رہے
اس سے پہلے کہ حشر بپا ہو جائے
اپنے چہرے پہ لگائے کوئی میری آنکھیں
کون جانے گا لیکن میری آنکھوں کے خواب
کس کو یہ حوصلہ ہوگا کہ ہمیشہ دیکھے
اپنی پلکوں کی صلیبوں سے تڑپتے ہوئے خواب
جن کی کرچیوں کی چبھن روح تماشا کی ہے
زندگی، زندگی بھر کے بے کراں ہے

شگفتہ سلیمان
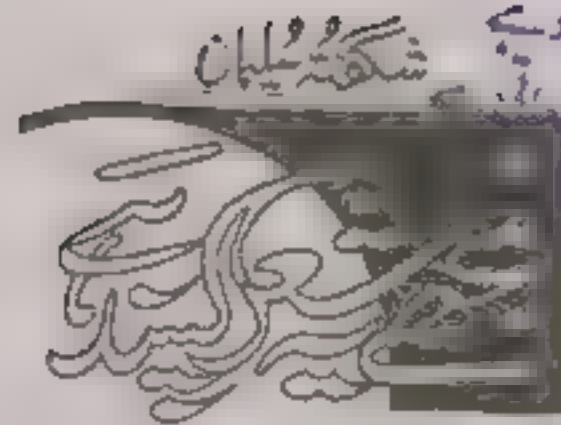
زاہدہ علیم ______ کراچی
خالی ہے دل فقیر کے کشکول کی طرح
اس شہر بے وفا سے وفا کون لے گیا

اقصیٰ ناصر ______ کراچی
ہم شہر بے وفا میں وفا ڈھونڈتے رہے
حیرت بنی کہ جہاں ہے کیا ڈھونڈتے رہے
لمحوں میں کر گیا تھا جو برباد بستیاں
ہم مدتوں وہ دست قضا ڈھونڈتے رہے

عروج ______ فیصل آباد
شہر سنسان ہے صحرا کی طرح
اب وہ ہنگامۂ احباب کہاں

بینش مدثر ______ فیصل آباد
یہ بھی انداز ہمارے ہیں تمہیں کیا معلوم
ہم تمہیں جیت کے ہارے ہیں تمہیں کیا معلوم
ایک تم ہو کہ ہمیں اپنا سمجھتے ہی نہیں
ایک ہم ہیں کہ تمہارے ہیں تمہیں کیا معلوم

صائمہ سندھو ______ کراچی
انداز جنوں ہم کو بھی معلوم ہے لیکن
ہم تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے

نسرین مصطفیٰ ______ حیدرآباد
آج دنیا نے ستم ڈھائے تو دل ٹوٹ گیا
تیری باتیں ترا انداز وفا یاد آیا
کاش ہم تم کو منا لیتے نہ جانے دیتے
مدتوں بعد یہ احساس خطا یاد آیا

صدف عمران ______ کے ڈی اے
یہی انداز تجارت ہے تو کل کا تاجر
برف کے باٹ لیے دھوپ میں بیٹھا ہوگا

رابعہ الماس ______ کراچی
مجھے شادابی صحن چمن سے خوف آتا ہے
یہی انداز تھے جب لٹ گئی تھی زندگی اپنی

مہوش سہیل ______ فتح جنگ
انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینے میں وہ
اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

رخسانہ اقبال ______ اسلام آباد
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو

ثمینہ تاج ______ کراچی
جی چاہتا ہے آج عدم ان کو چھیڑیے
ڈر ڈر کے پیار کرنے میں کوئی مزا نہیں

رخسانہ خان ______ پشاور
پیار سے بڑھ کر نہیں دنیا میں کوئی روشنی
پی گئے یہ روشنی تو آئینہ ہو جاؤ گے
گفتگو میٹھی کرو ہر شخص سے جھک کر ملو
دشمنوں کے واسطے بھی دلربا ہو جاؤ گے

فری جانوی ______ گوجرہ
عجیب رنگ میں گزری ہے زندگی اپنی
دلوں پہ راج کیا اور پیار کو ترسے

ثنا ______ کوئٹہ
تمہی کو چاہتے ہیں ہم تمہی سے پیار کرتے ہیں
یہی برسوں سے عادت ہے اور عادت کب بدلتی ہے

رشیدہ ناز ______ برنالی
جسے چاہو اسے احساس خدائی دے دو
سلسلہ پیار کا رکھو تو عبادت جیسا
ہم بھرے شہر میں تنہا تو نہیں تھے لیکن
کوئی رشتہ نہ ملا پھر تری چاہت جیسا

مینا بخاری، صبا نوشاہی ______ ڈونگہ گجرات
وقت گزرا تو یہ ملال ہوا
ختم اک زندگی کا سال ہوا
کتنی شدت سے کوئی یاد آیا
آج مینا بڑا محال ہوا

ثمینہ کوثر عطاری ______ گجرات
ہمیشہ اک ہی تصویر رہ جاتی ہے آنکھوں میں
یہ پہیلا ہجر ہے اور ایسا منظر کب بدلتا ہے
کسی کو سال نو کی کیا مبارک باد دی جائے
کیلنڈر کے بدلنے سے مقدر کب بدلتا ہے

امبر گل ______ جھڈو (سندھ)
چھپ جاتی ہیں آئینہ دکھا کر تری یادیں
سونے نہیں دیتیں مجھے شب بھر تری یادیں
جب تیز ہوا چلتی ہے بستی میں سر شام
برساتی ہیں اطراف سے پتھر تری یادیں

عذرا ناصر ______ کراچی
اک دیا دل میں جلانا بھی، بجھا بھی دینا
یاد کرنا بھی اسے روز، بھلا بھی دینا
صورت نقش قدم، دشت میں رہنا محسن
اپنے ہونے سے نہ ہونے کا پتا بھی دینا

سیما ممتاز عباسی ______ لاڑکانہ
سال نو کے لیے یہ لب پہ دعا ہے تاباں
لطف کا دور نئے، پیار کا موسم بن جائے

ندا، فضہ ______ کراچی
نیا سال آیا ہے، نئے غم ملیں گے
ستم گر بہت مہرباں کم ملیں گے

سمیرا عبدالغنی بٹ ______ ڈیرہ نجف لودھرے
نہ رنج کا لمحہ کسی کے پاس آئے
خدا کرے نیا سال سب کو راس آئے

نمرہ، اقراء ______ کراچی
گئے موسم میں جو کھلتے تھے گلابوں کی طرح
دل پہ اتریں گے وہی خواب عذابوں کی طرح
کون جانے کہ نئے سال میں تو کس کو پڑھے
تیرا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح

ناصرہ فاطمہ ______ امرہ کلاں
سنئے تو پچھلے سال کے سب اپنی جگہ رہے
سب سوچتے رہے کہ نیا سال آ گیا
خوشیاں جو بانٹتا تو کوئی نئی بات تھی
گزرا ہوا یہ سال بھی عمر میں بڑھا گیا

صائمہ جیجی ______ کراچی
نہ جانے کیا ہوا سال بھر میں
دیا روشن کہ مدھم ہو گیا ہے
ہمیں معلوم ہے اتنا کہ ایک سال
ہماری عمر سے کم ہو گیا ہے

سائرہ احسان ______ لاہور
کون جانے کہ نئے سال میں تو کس کو پڑھے
تیرا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح

بنت ظفر ______ سمن آباد، بورہ
آج کا دن اہم ہے مگر
تیرے آنے سے مزید ہو جائے گا
تجھ سے بچھڑے ہوئے ہیں سال مگر
آج نہ آیا تو صدیوں میں بدل جائے گا

نوشابہ منصور ______ مجبر یارڈ
نئی رتیں، نئے خواب ہیں اور چاہتوں کے سلسلے
سال نو کے سنگ ہیں تیری گلاب رفاقتوں کے سلسلے
کبھی دن بھر تجھے سوچنا، کبھی رات بھر سے جاگنا
تیری یاد سے ہیں جڑے اور جنوری کی شاموں کے سلسلے

عظمیٰ غلام نبی ______ کراچی
اس کو فرصت ہی نہیں وقت نکالے محسن
ایسے ہوتے ہیں بھلا چاہنے والے محسن
وہ اک شخص متاع دل و جاں تھا، نہ رہا
اب بھلا کون میرے درد سنبھالے محسن

رانی ______ کراچی
تم لفظ محترم ہو مثل یروشلم
حرف غلط تو میں ہوں فلسطین کی طرح

ریحانہ اعجاز بخاری

ہری مرچیں

☆ "کیا میں منیجر صاحب سے مل سکتی ہوں؟"
☆ "کیوں نہیں۔۔۔ ! خوب صورت خواتین سے ملنے کے لیے تو وہ ہر وقت تیار رہتے ہیں۔"
☆ "تو پھر ذرا انہیں بتا دیجیے کہ ان کی بیگم ان سے ملنے آئی ہیں۔"

☆ ☆ ☆

☆ "بیگم جمشید! خیریت تو ہے؟ آج آپ کا گلا بیٹھا ہوا ہے؟"
☆ "جی ہاں، پچھلی رات میرے شوہر دیر سے گھر آئے تھے۔"

حنا احمد آرائیں۔۔۔ پٹارو

الارم

کراچی میں بینکوں میں بڑھتی ہوئی ڈکیتیوں کی روک تھام کے سلسلے میں ایک بینک میں الارم سسٹم لگایا گیا۔ کیشیئر کے پاؤں کے قریب فرش میں ایک بٹن نصب کیا گیا جسے دبانے سے قریبی پولیس اسٹیشن میں الارم بج سکتا تھا۔ الارم لگے ابھی تین دن ہی ہوئے تھے کہ دو ڈاکو ٹی ٹی لیے بینک میں آن پہنچے۔ ایک نے گارڈ کو قابو میں کیا۔ دوسرے نے کیشیئر کو گن دکھا کر کیش کا مطالبہ کیا۔

کیشیئر نے کیش تو اس کے حوالے کر دیا مگر ساتھ ہی الارم کا بٹن بھی دبا دیا۔ چند سیکنڈ بعد اس کے قریب رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ کیشیئر نے فون ریسیو کرنا چاہا تو ڈاکو نے گن دکھا کر اسے باز رکھا اور خود ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "اوئے۔۔۔ میں تھانے سے بول رہا ہوں۔ ذرا دیکھ بھال کے بیٹھا کرو۔ تمہیں پتا ہی نہیں ہے، تمہارا پاؤں الارم کے بٹن پر رکھا ہوا ہے۔ پاؤں ادھر سے ہٹاؤ بے وقوف۔۔۔ ادھر تھانے میں الارم بج رہا ہے۔"

زرینہ نعمان۔۔۔ حیدر آباد

مقصد

فلاحی تنظیم کا ایک کارکن دور دراز مقامات پر تعلیم کے فروغ اور اسکولوں کے قیام کی غرض سے چندہ جمع کرنے کی مہم پر نکلا ہوا تھا۔ ایک اسکول میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "پیارے بچو! کیا آپ کو معلوم ہے کہ براعظم افریقہ میں چھ ہزار مربع میل کا ایک علاقہ ایسا بھی ہے، جہاں کوئی چھوٹا سا اسکول بھی نہیں ہے۔۔۔" کچھ لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "اب آپ بتائیں کہ ہمیں کس مقصد کے لیے پیسے جمع کرنے چاہئیں؟"

"افریقہ جانے کے لیے۔" کئی طالب علموں نے یک آواز ہو کر جواب دیا۔

فاخرہ خان۔۔۔ کراچی

دریافت

ایک سائنس دان نے دوسرے سائنس دان کو بتایا۔ "آج میں نے محض اتفاق سے ایک اہم چیز دریافت کر لی۔"

"وہ کیا؟" دوسرے سائنس دان نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مجھے پتا چلا ہے کہ اگر آپ سیاہی کی دوات قریب رکھیں تو کسی بھی فاؤنٹین پین میں سیاہی بھرنے کی زحمت کیے بغیر بھی اس سے لکھ سکتے ہیں۔"

شمائلہ خالد۔۔۔ ٹھٹھہ

صحیح طریقہ

فٹ پاتھ پر لیٹے ہوئے ایک بھکاری کے پاس سے ایک شخص گزرا تو اس نے دیکھا کہ بھکاری کا منہ تو بند ہے۔ لیکن "بابو جی! دس روپیہ کا سوال ہے۔۔۔" کی صدا برابر آ رہی ہے۔ اس نے قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بھکاری کی بغل میں ایک چھوٹا سا کیسٹ پلیئر چل رہا ہے۔ حیرت پر قابو پا کر وہ آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ فقیر کے قریب ایک بورڈ بھی رکھا تھا جس پر لکھا تھا۔ "یہاں پر سگریٹ، پھل، کھانا اور چیک بھی وصول کیے جاتے ہیں۔"

عینی ہاشمی۔۔۔ جھنگ صدر

کلین بولڈ

"یہ ہے وہ پینٹنگ، جسے شروع کرتے وقت مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ یہ کیا چیز بن جائے گی۔۔۔" مصور نے فخر سے اپنی ایک پینٹنگ مہمانوں کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"تو کیا اسے ختم کرنے کے بعد آپ کو پتا چل گیا کہ یہ کیا چیز ہے؟" ایک مہمان نے معصومیت سے پوچھا۔

روبینہ راشد۔۔۔ کراچی

انصاف

ایک ٹیچر کے پاس پیپر چیک کرنے کا کام بہت زیادہ تھا۔ انہوں نے ہاتھ بٹانے کے لیے اپنی بیگم کو بھی ساتھ بٹھا لیا۔ بعد میں بیگم کے چیک کیے ہوئے پیپرز پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ٹیچر موصوف بے اختیار حیرت سے چیخ اٹھے۔ "بیگم! اس اسٹوڈنٹ کو تم نے سو میں سے ایک سو دس نمبر دے دیے۔۔۔ یہ تو انگلش کا پرچہ

ہے۔ اگر میتھ کا پیپر بھی بالکل صحیح ہو تو اس میں بھی سو سے زیادہ نمبر نہیں دیے جا سکتے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن اس اسٹوڈنٹ نے ایک ایسے سوال کا جواب بھی لکھا ہے، جو پیپر میں ہے ہی نہیں۔" ٹیم نے متانت سے جواب دیا۔

شبانہ ہمت۔۔۔ بھریا روڈ

فرمائش

نئے نئے دولت مند ہونے والے ایک صاحب نے ایک پروفیسر صاحب کو بلایا، جو کئی زبانیں جانتے تھے۔

"پروفیسر صاحب! میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے بیٹے کو کوئی غیر ملکی زبان سکھائیں۔ آپ جو ٹیوشن فیس مانگیں گے، وہ میں دوں گا۔" ان صاحب نے فرمائش کی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔" پروفیسر صاحب نے آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "کون سی زبان سکھاؤں۔۔۔ انگریزی۔۔۔ فرانسیسی۔۔۔ جرمن۔۔۔ اطالوی۔۔۔ یا روسی؟"

"بس ان میں سے جو زیادہ غیر ملکی ہو وہ سکھائیں۔"

رابعہ ساجد۔۔۔ لطیف آباد

ڈاکٹر اور حکیم

چار ماہ ہونے کو آئے تھے، شہر کا کوئی لائق ڈاکٹر بچا ہو گا، جس نے ہماری مالی تکالیف میں حسب لیاقت اضافہ نہ کیا ہو لیکن بائیں کہنی کا درد کسی طرح کم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ علاج نے جب شدت پکڑی اور مرض نے پیچیدہ ہو کر مفلسی کی صورت اختیار کر لی تو لکھنؤ کے ایک حاذق طبیب سے رجوع کیا، جو صرف مایوس اور لب گور مریضوں پر عمل مسیحائی کرتے تھے، مریض کے جاں بر ہونے کا ذرا بھی امکان نظر آئے تو بگڑ جاتے اور اسے دھتکار کر نکلوا دیتے کہ جاؤ ابھی کچھ دن اور ڈاکٹر سے علاج کراؤ۔

اللہ نے ان کے ہاتھ میں کچھ ایسا اعجاز دیا تھا کہ ایک دفعہ ان سے رجوع کرنے کے بعد کوئی بیمار، خواہ وہ بستر مرگ پر ہی کیوں نہ ہو، مرض سے نہیں مر سکتا تھا۔۔۔ دوا سے مرتا تھا۔ مرض کے جراثیم کے حق میں تو ان کی دوا گویا آب حیات کا حکم رکھتی تھی۔ غریبوں کا علاج مفت کرتے مگر روسا کو فیس لیے بغیر نہیں مارتے تھے۔

(مشتاق احمد یوسفی کے مضمون سے اقتباس)

سعدیہ شاد۔۔۔ بکیرا شریف

چکر۔۔۔ گھن چکر

مالک نے پہلے نوکر سے پوچھا۔ "تم نے زندگی میں کتنی بار جھوٹ بولا؟"

نوکر نے کہا۔ "جناب صرف ایک مرتبہ۔"

مالک! "اچھا تو تم اس گراؤنڈ کا ایک چکر لگاؤ۔" پھر دوسرے نوکر سے کہا۔ "اور تم نے۔۔۔؟"

دوسرا نوکر بولا۔ "صرف دو دفعہ جناب۔"

مالک۔ "اچھا تو پھر تم دو مرتبہ چکر لگاؤ۔"

اتنے میں تیسرا نوکر اٹھنے لگا تو مالک نے پوچھا۔

"ارے۔۔۔ تم نے تو بتایا ہی نہیں کہ تم نے کتنی مرتبہ جھوٹ بولا ہے۔"

"جناب۔۔۔ میں سائیکل لینے جا رہا ہوں تاکہ مجھے چکر لگانے میں آسانی رہے۔" تیسرے نوکر نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔

مکھن

"مکھن کہاں ہے۔"

"مکھن ختم خلاص۔"

"سارا کھا لیا۔"

"نہیں سارا لگا دیا یہ کھانے کی چیز تھوڑا ہی ہے لگانے کی ہے۔ جس کو لگاؤ پھسل پڑتا ہے۔"

"جو پھسلے گا اس کی ٹانگ ٹوٹے گی۔"

"یہ سوچنا اس کا کام ہے۔ ہمارا کام تو لگانا ہے۔"

(ابن انشاء)

فوزیہ ثمر بٹ۔۔۔ گجرات

☼ ☼

حسن و صحت

ردا

زیتون اور مساج

زیتون کا تیل ہو یا زیتون دونوں مزے دار ہیں۔ کھانا اگر زیتون کے تیل میں پکایا جائے تو یہ نہ صرف رگوں کو صاف رکھتا ہے بلکہ آپ کی جلد کی خوب صورتی میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ یونان میں لوگ زیتون کے تیل سے نہانے کے عادی تھے۔ یہ اسے بطور ایک خصوصی صابن کے استعمال کرتے تھے جس سے ان کی جلد صاف ہو جاتی تھی۔

مغرب میں بیوٹی پروڈکٹس میں زیتون کے تیل کا استعمال لازمی تصور کیا جاتا ہے جیسے لپ بام، شیمپو، نہانے کا تیل، ہاتھوں کا لوشن، صابن، نیل پالش، مساج آئل، خشکی سے بچاؤ کے اجزا وغیرہ۔ زیتون کا تیل جلد کے لیے اچھا تصور کیا جاتا ہے۔ اس کا مالیکیول اسٹرکچر جس کی وجہ سے جلد کے مسام بند نہیں ہوتے ہیں۔ یہ واحد سبزیوں کا تیل ہے جو کہ آپ کی جلد کو سانس لینے کی آزادی دیتا ہے۔

خشک جلد میں نمی پیدا کرنے کے لیے زیتون کے تیل کو براہ راست خشک مقامات پر لگائیں۔ زیتون کے تیل اور ملتانی مٹی کو ملا کر ایک ماسک بنائیں۔ اسے چہرے پر پانچ منٹ کے لیے سوکھنے دیں اور جلد ہی آپ کے سامنے اس کا نتیجہ آ جائے گا۔

اگر آپ کے ناخن کٹے پھٹے اور خشک ہیں، ان میں چمک بھی نہیں تو آپ کی مدد صرف اور صرف زیتون کا

تیل کرسکتا ہے۔ ہلکے نیم گرم زیتون کے تیل میں اپنے ناخن تیس منٹ تک ڈبوئیں آپ کو یقیناً" ایک حیرت انگیز تبدیلی محسوس ہوگی۔

رات کو سونے سے پہلے جسم پر تھوڑا سا زیتون کا تیل لگا لیں اور روئی سے صاف کریں۔ صبح آپ دیکھیں گے کہ آپ کی جلد کتنی نرم و ملائم ہوگی۔

زیتون کا تیل آٹھ چمچ اور پانچ قطرے لیونڈر کے تیل کے ملائیں۔ رات کو سونے سے پہلے اس سے پیروں کا مساج آپ کو ایک سکون کے احساس کے ساتھ آرام بھی دے گا اور حیرت انگیز طور پر پیر نرم ہو جائیں گے۔

زیتون کے تیل کا ہونٹوں پر روزانہ استعمال ہونٹوں کو نرم و ملائم اور خوب صورت بناتا ہے۔

جب آپ کو اپنے چہرے کو نرم اور موئسچرائز کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو زیتون کے تیل سے جلد کا مساج کریں۔ خاص طور پر خشک اور روکھے حصوں پر زیادہ تیل کا مساج کریں۔

چند چمچے زیتون کا تیل اور چند بوندیں اپنے پسندیدہ تیل کی پانی میں ڈال کر نہائیں اس طرح آپ کی جلد نرم اور خوب صورت ہو جائے گی۔

لیموں کے رس میں زیتون کا تیل ملا کر مساج کریں اور ہمیشہ کے لیے جھریوں سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔

چند چمچے زیتون کے تیل سے سر اور بالوں میں مساج کریں اور تیس منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ اس کے بعد معمول کے مطابق شیمپو کرلیں۔ یہ آپ کو دومنہ کے بالوں اور خشکی سے بچاؤ فراہم کرے گا اور آپ کے بالوں کو چمکدار، سلکی اور موٹا کرے گا۔ اگر آپ کے بال پتلے ہیں تو یہ تیل بالوں کو چمکدار اور خوب صورت بنانے کے ساتھ موٹا بھی کرتا ہے۔

پانی کے اندرونی و بیرونی استعمال سے آپ کی صحت پر نہایت مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جب آپ کی صحت اچھی ہوگی تو یقینی طور پر آپ جاذب نظر کہلائیں گی۔

آٹھ گلاس پانی روزانہ کے اصول سے تو ہر کوئی واقف ہے' اس کے علاوہ غسل کرنے سے نہ صرف ظاہری خوب صورتی بحال ہوگی ساتھ ہی ساتھ آپ تازہ دم اور چاق و چوبند بھی نظر آئیں گی۔

صرف معالج کی ہدایت پر غسل سے گریز کرنا چاہیے۔ غسل کے لیے اپنی برداشت اور موسم کے لحاظ سے ٹھنڈا یا نیم گرم پانی استعمال کرنا چاہیے۔ گرمیوں میں دن میں دو دفعہ جب کہ سردیوں میں ایک دفعہ غسل کرنا ضروری ہے۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ آپ روزانہ صابن استعمال کریں۔ صابن سے بچ جانا ممکن ہو تو محض سادے پانی کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔

سردیوں میں نہانے سے قبل نیم گرم زیتون یا سرسوں کے تیل سے پورے جسم کا اپنے ہاتھوں سے مساج کریں۔ اس کے علاوہ بیسن اور دودھ ملا کر پیسٹ بنائیں اور اس کو بطور صابن استعمال کریں۔ آپ کی جلد شفاف اور نرم و ملائم ہو جائے گی۔

لیکن خیال رہے کہ مساج کے بعد تقریباً" آدھے گھنٹے کا وقفہ ضرور ہونا چاہیے۔ غسل کے پانی میں چند قطرے ناریل کا تیل ملا کر نہانے سے خشکی کی شکایت رفع ہو جاتی ہے۔ عام دنوں میں پانی میں ایک چائے کا چمچہ لیموں کا رس اور عرق گلاب ملا کر نہانے سے رنگ صاف ہوتا ہے اور طبیعت ہشاش بشاش رہتی ہے۔

ہفتے میں دو دفعہ جراثیم کش صابن جیسے نیم سوپ یا ڈیٹول سوپ وغیرہ سے ضرور نہانا چاہیے۔ اس سے بیماریوں سے بچاؤ میں مدد ملتی ہے۔

غسل سے فوراً" پہلے اور فوراً" بعد ورزش اور کھانے پینے سے گریز کرنا چاہیے۔ اسی طرح بہت زیادہ سرد یا گرم مقام پر بھی نہیں جانا چاہیے۔ دوران غسل کہنیوں، ایڑھیوں، گھٹنوں وغیرہ کو ضرور کسی جالی دار کپڑے سے اچھی طرح صاف کرنا چاہیے۔ اسی طرح بعد از غسل تولیے سے جسم کو ہلکی سی رگڑ کے ساتھ خشک کرنا چاہیے۔

✲ ✲

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

مکس فروٹ خرما

ضروری اشیا:

دودھ	ایک لیٹر
سویاں	آدھا کپ
الائچی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
عرق گلاب	آدھا چائے کا چمچہ
کیلا (باریک کاٹ لیں)	دو عدد
سیب	ایک عدد (باریک کاٹ لیں)
آم	ایک عدد (باریک کاٹ لیں)
انگور	آدھا کپ
بادام پستے (باریک کٹا ہوا)	دو کھانے کے چمچے
گھی	چار کھانے کے چمچے
کنڈنسڈ ملک	200 گرام

ترکیب:

پتیلی میں دو کھانے کے چمچے گھی گرم کرکے اس میں سویوں کو ڈال کر فرائی کریں جب بھننے کی خوشبو آنے لگے تو پتیلی کو چولہے سے اتار لیں۔

ایک دوسری پتیلی میں دودھ ڈال کر ابال لیں۔ جب ابال آجائے تو اس میں کنڈنسڈ ملک ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ اس کے بعد چولہے سے اتار کر اس میں بھنی ہوئی سویاں، کیلا، سیب، آم اور انگور شامل کر دیں۔ ایک فرائی پین میں بقیہ گھی ڈال کر کٹے ہوئے بادام پستے ڈال کر کڑکڑائیں اور دودھ والے مکسچر پر اس کی بگھار لگا دیں۔

عرق گلاب اور الائچی پاؤڈر شامل کرکے اچھی طرح مکس کرکے سرونگ ڈش میں نکال کر خوب صورتی سے گارنش کریں اور خوب ٹھنڈا کرکے سرو کریں۔

رنگین سویاں

ضروری اشیا:

رنگین سویاں	ایک پیکٹ
گھی	آدھا کپ
چینی	آدھا کپ
کھویا	100 گرام
کھوپرا	حسب پسند
چم چم	حسب پسند
کیوڑا	چند قطرے
دودھ	دو کھانے کے چمچے
سبز الائچی (کوٹ لیں)	چار عدد

ترکیب:

رنگین سویوں کو گرم پانی میں ابال لیں اور پانی نتھار کر سویوں کو الگ رکھ لیں۔ ایک سوس پین میں گھی گرم کر کے اس میں الائچی ڈال کر کڑکڑائیں۔ چینی میں دودھ ڈال کر مکس کر کے اسے گھی میں ڈالیں (احتیاط سے ڈالیں اور ڈالنے سے قبل آنچ بالکل مدھم کر لیں) چمچہ چلائیں چینی گھلنے لگے اور جھاگ بننے لگے تو آنچ درمیانی کر کے اس میں رنگین سویاں ڈال کر مکس کریں بھننے لگے تو اس میں کیوڑا، کھویا اور کھوپرا ڈال کر مکس کریں۔ مزے دار رنگین سویاں تیار ہیں۔ سرونگ پلیٹ میں نکال کر چم چم، کھوئے اور کھوپرے سے گارنش کر کے سرو کریں۔

ناریل کا حلوہ

اشیا:

ناریل (خشک بڑے ٹکڑے)	آدھ کلو
دودھ	ایک لیٹر
چینی	آدھا کلو
گھی	آدھا کپ
بادام	125 گرام
پستہ	100 گرام
کیوڑا	چند قطرے
زعفران	چند ریشے
چاندی کے ورق	دو عدد

ترکیب:

ناریل کے ٹکڑوں کو پانی میں رات بھر بھگو کر رکھ دیں۔ صبح کھرچ کر باریک پیس لیں بادام کو بھگو کر رکھ لیں۔ آدھے پیس لیں اور آدھے کاٹ لیں۔ ناریل، پستے اور بادام کو دودھ میں ڈال کر پکائیں۔ جب دودھ خشک ہو جائے تو گھی ڈال کر بھونیں چینی کا قوام بنا کر ڈالیں اور دھیمی آنچ پر پکنے دیں۔ جب گاڑھا ہو جائے تو زعفران کیوڑے میں بھگو کر ڈال دیں۔ حلوے کو ایک تھالی میں نکال کر پھیلا دیں اور بادام اور پستہ چھڑک لیں اور چاندی کے ورق لگا دیں۔

بنگالی پیڑے

ضروری اشیا:

تازہ پنیر	250 گرام
کھویا	250 گرام
کنڈنسڈ ملک	آدھا ٹن
کھوپرا پاؤڈر	250 گرام
پستے (باریک کٹے ہوئے)	125 گرام
کیوڑا	چند قطرے

ترکیب:

ایک فرائنگ پین میں آدھا کھویا ڈال کر ہلکا سا بھون لیں۔ کھویا، پنیر، کنڈنسڈ ملک اور کیوڑا ڈال کر مکس کر کے یکجان کر لیں۔ پستے میں شامل کر لیں۔ اس آمیزے کو آدھا گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ ہاتھ ہلکا سا گیلا کر کے درمیانے سائز کے پیڑے بنائیں۔ بقیہ کھوپرے میں یہ پیڑے رول کر کے سرو کریں۔

رائس پڈنگ ود اسٹرابیری سوس

ضروری اشیا:

اسٹرابیریز	500 گرام
چینی (پسی ہوئی)	تین کپ
چاول	ایک چوتھائی کپ
لیموں کا رس	دو چائے کے چمچے
دودھ	تین کپ
انڈا	ایک عدد
انڈے کی زردیاں	تین عدد
کریم	ایک کپ
چینی	آدھا کپ

ترکیب:

اسٹرابیریز کو درمیان میں سے کاٹ لیں۔ اس میں آدھا کپ چینی اور تھوڑا پانی ڈال کر پکا لیں تاکہ اسٹرابیریز کا کھٹا پن نکل جائے۔ چاول کو بھگو کر ابال کر اس میں لیموں کا رس ڈال دیں۔ دودھ گرم کریں اس میں بقیہ چینی ڈال کر پکائیں ٹھنڈا کریں۔ اس کے بعد اس میں ایک عدد انڈا اور تین عدد انڈے کی زردیاں ڈال کر پھینٹ لیں اور اسے دودھ چینی کے مکسچر میں مکس کر دیں۔ ڈش میں اسٹرابیری ڈالیں اس پر چاول اور دودھ مکسچر ڈالیں بیس سے پچیس منٹ بیک کریں ٹھنڈا کر کے اسٹرابیری سے سجا دیں اور سرو کریں۔

کوکونٹ رائس

ضروری اشیا:

باسمتی چاول	ایک کپ
زیرہ	چوتھائی چائے کا چمچہ
میتھی	چند دانے
کوکونٹ ملک	ایک کپ
کاجو	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچیں	تین عدد
کری پتا	ایک عدد
رائی	آدھا چائے کا چمچہ
ارد دال	ایک چائے کا چمچہ
تازہ ناریل	دو کھانے کے چمچے (کش کیا ہوا)
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	دو کھانے کے چمچے
لیموں کا رس	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

چاولوں کو دھو کر نمکین پانی میں آدھا گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ چاول چھان کر علیحدہ کر لیں۔ ایک بڑے سوس پین میں تیل گرم کریں اس میں ارد دال، زیرہ، میتھی، کاجو، رائی ڈال کر دو منٹ فرائی کریں۔ ہری مرچیں اور کری پتا شامل کریں۔ چاول مکس کریں۔ نہایت احتیاط سے چاول کو الٹ پلٹ کریں کہ مسالا چاول میں اچھی طرح مکس ہو جائے۔ کوکونٹ ملک ڈیڑھ کپ پانی اور نمک شامل کریں۔ جب ابال آجائے تو آنچ ہلکی کر دیں اور جب چاول تقریباً تیار ہو جائیں تو لیموں کا رس شامل کر دیں۔ دھیرے سے چاول الٹ پلٹ کریں اور دم پر رکھ دیں تیار ہونے پر ہرے دھنیا اور ناریل کے ساتھ سجا کر پیش کریں رائتہ، کڑھی اور چٹنی وغیرہ کے ساتھ نوش فرمائیں۔

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال وجواب شائع کیے جارہے ہیں۔

ذوالقرنین

حمیدہ کوثر۔۔۔ شکار پور

س ۔ بھیا جی! ہمارے یہاں زیادہ تر فلموں کا۔۔۔ اختتام شادی پر ہی کیوں ہوتا ہے؟

ج ۔ کیا فلموں کا بھی نہ ہو آخر کیا چاہتی ہو بی بی۔

انیلا فضل۔۔۔ پشاور

س ۔ نین بھائی! آپ کے عین نکاح کے وقت آپ کی مصنوعی بتیسی گر جائے تو آپ کیا کریں گے؟

ج اب اتنی دیر میں بھی شادی کا ارادہ نہیں ہے۔

قندیل خان۔۔۔ موڑ ایمن آباد

س ۔ ذوقی بھائی۔ آج کے دور میں محبت کو محض فریب سے تشبیہ کیوں دی جاتی ہے؟

ج ۔ وافر مقدار میں ہوگی تو یہی ہوگا۔

مینا گل۔۔۔ لاہور

س ۔ آخر یہ لڑکیاں' آپ سے اتنے اوٹ پٹانگ سوال کیوں کرتی ہیں؟

ج ۔ آپ بھی شامل ہوگئیں ان ہی لڑکیوں میں۔

س ۔ بے یقین راستوں پر چلنے کا فائدہ۔

ج ۔ یہ بزنس نہیں ہے کہ فائدہ اور نقصان دیکھا جائے۔

ام البنین سبحانی۔۔۔ کراچی

س ۔ انسان ہمت کب ہار بیٹھتا ہے؟

ج ۔ جب مستقل نسلے پہ دہلا میں سوالوں کے جواب دینے پڑیں۔

ساجدہ نورین۔۔۔ راجن پور

س ۔

تیری سانسوں کی تھکن' تیری نگاہوں کا سکوت
در حقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم' وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو۔

ج ۔ بالکل صحیح سمجھیں آپ میری یہ عادت ہی ہے۔

ریحانہ صابو گر۔۔۔ ٹھٹھہ

س ۔ بھیا! کیا صرف حوصلے سے انسان آگے بڑھ سکتا ہے؟

ج ۔ ہمارا یقین ہے اس پر۔

نائلہ نگار۔۔۔ فیصل آباد

س ۔ مشورہ کب بلا چوں وچرا مان لیا جاتا ہے؟

ج ۔ جب وہ کسی بے عقل کا دیا ہوتا ہے۔

مدیرہ کرن

نامے میرے نام
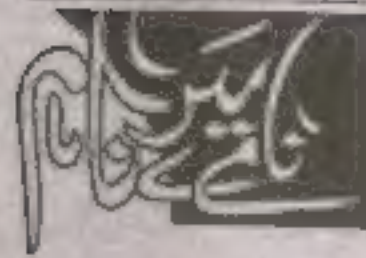
سیما ممتاز عباسی۔۔۔ لاڑکانہ سندھ

افسوس ہے کہ میں ہر ماہ خط بھیجتی ہوں اور آپ بھی ہر ماہ ایسی ہی پابندی سے میرے خط کو کم کر دیتے ہیں۔ جس سے الرجی ہونے لگتی ہے۔

دسمبر کا کرن کھلے بالوں والی ٹائٹل گرل کے ساتھ دسمبری خنک رت کی طرح ساتھا اور اپنے مواد میں تفریح' دلچسپی اور معلومات کے کئی باب رکھتا تھا حمد و نعت کا تبرک' انٹرویوز کا انداز بیاں' ناول کے نگار خانے' مکمل ناولوں کی وسیع رینج' ناولٹ کی ناؤ' افسانے در افسانے اور مستقل سلسلوں نے ہماری سرد راتوں میں نرم گرم احساس کو کرن سا روپ دے دیا ہے۔ اس لیے کرن کا یہ پرچہ سال کا یادگار پرچہ تھا۔

"دردل" کا قصہ نبیلہ عزیز کی زبانی اچھا لگا۔ "آدم کی جنت" میں حیا بخاری نے لفظوں کی نہیں بلکہ دلوں کی جنت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناولٹ میں "دیا اور جگنو" کی کیا بات ہے واہ! افسانے تو مجھے بہت پسند آتے ہیں۔ دسمبر کے شمارے "میں اک قصہ" فہمیدہ نے بڑی خوب صورتی سے تحریر کیا ہے اور پسند آیا۔ باقی مستقل سلسلوں میں شعروشاعری کی انجمن' اخلاقی باتوں کا بیان غرض کہ تمام پڑھنے والی بہنوں کے معیار کی مختصر مگر جامع تحریروں نے کرن کو خوب صورت بنا دیا ہے اور تمام بہنوں کی پسند کی عین مطابق ہے۔ مگر آپ سے پھر بھی یہ گزارش کہ میرے لیٹر کو مس نہ کیا جائے۔ اگر اس کے بعد بھی بار بار وہی ہوا تو دکھ ہوگا۔ تمام بہنوں کی میری طرف سے سال نو کی مبارک باد۔

رخسانہ ملک اختر۔۔۔ ملتان

السلام علیکم پیارے قارئین' مصنفین کیسے ہیں آپ سب' امید ہے ٹھیک ٹھاک اینڈ فٹ فاٹ ہوں گے۔ آپی یہ میرا کسی بھی رسالے میں پہلا لیٹر ہے۔ امید ہے آپ شامل کرکے خوش ہونے کا موقع دیں گی۔ اس بار کرن خلاف معمول کچھ پہلے مل گیا۔ ورنہ ہر ماہ 12 کو ملتا ہے۔ ماڈل بہت پیاری تھی۔ سب سے پہلے "دردل" پڑھا۔ آپی شکر ہے آپ نے ماضی کھولا یہ پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ زری علیزے کی کزن ہے لیکن آپی جب آپ نے ہمیں بے ہوش کرنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو سارے جھٹکے ایک بار دے دیں۔ آپی ہم بھی نہیں چاہتے زری دل آور کی ہو اور پلیز رفتار تیز کریں۔ اب پلیز عدیل اور مدیحہ کے درمیان جودت کو نہ لائیں۔

آپی فوزیہ آپ کا ناول بھی اچھا جا رہا ہے۔ لیکن آپ رومیلہ کے ساتھ اچھا نہیں کر رہیں اور فاخرہ آپی آپ پلیز ندی اور شاہ زین کو ملا دیں مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ شاہ زین مہران کا تایا زاد کزن ہے۔ مجھے یقین ہے ایسا ہی ہوگا اور اگر ایسا ہوا تو شاہ زین اور مہربانو کی شادی ہوگی۔ خیر یہ تو آگے چل کر پتا چل ہی جائے گا آپی مہران کی شادی ندی سے نہ کروائیں۔ فرح آپی کی "حریم دل کے مکین" بہت اچھی تحریر تھی۔ عرینہ اور اسفند کا جب پہلی بار ٹاکرا ہوا ہم نے اس وقت ہی اندازا لگا لیا تھا کہ ان کا ملن ہوگا۔ اس کے بعد "آدم کی جنت" بہت اچھی تحریر تھی۔ آدم کو زمان پر بھروسہ نہیں کرنا تھا۔ غزالہ آپی کی "دیا اور جگنو" بہت اچھی تھی۔ افسانے سارے ہی بہت اچھے تھے۔ خاص طور پر "انمول محبت" نامے میرے نام میں فوزیہ ثمر آپی کا مسکان آپی کا طویل تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپی میرا خط ضرور شائع کرنا۔

ثناء شہزاد۔۔۔ کراچی

دسمبر کا شمارہ دس تاریخ کو ہمارے ہاتھوں میں آیا اور اس کے ہاتھ میں آتے ہی جو خوشی ہوتی ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ کرن رسالہ میرا ایک ایسا ساتھی ہے جس نے مجھے کبھی بھی تنہا نہیں چھوڑا ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ ایک اچھے دوست کی طرح اس رسالے سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اچھی دوست تو میری

ریحانہ آپی بھی ہیں۔ اب آتے ہیں تبصرے کی طرف' ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے اداریہ پہ حاضری دی۔ اس کے بعد حمد و نعت سے دل و روح کو تقویت پہنچائی۔ اس کے علاوہ اریج فاطمہ کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ جلدی جلدی انٹرویوز پڑھے۔ پھر ہم پہنچے اقراء مظفر کے پاس اور ان کے جوابات پڑھ کر ایسا لگا یہ میں ہوں۔ کیونکہ جس طرح انہوں نے اپنے آپ کو بیان کیا میں بھی بالکل ویسی ہی ہوں۔ افسانے کچھ زیادہ متاثر نہ کرسکے۔ بس ایک ہی پسند آیا "انمول محبت" ناولٹ "دیا اور جگنو" اچھا تھا۔ یہ ناولٹ پڑھ کر اندازا ہوا کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو اپنی محبت پانے کے لیے سالوں انتظار کرتے ہیں اور آخر میں ان کی محبت کی جیت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ بہت خوش نصیب ہوتے ہیں جنہیں ان کی محبت ملتی ہے۔

مکمل ناول صرف "حریم دل کے مکین" بہت زیادہ پسند آیا۔ اس میں جس طرح کاغان' مانسہرہ اور جھیل سیف الملوک کے مناظر کو پیش کیا گیا زبردست' مجھے لگ رہا تھا میں بھی ان وادیوں کی سیر کررہی ہوں۔ ویلڈن فرح جی آپ نے تو ہمیں بیٹھے بٹھائے خوب صورت جگہوں کی سیر کروادی۔ دوسرا مکمل ناول "آدم کی جنت" تھا۔ مگر مجھے اس میں آدم کا کردار بالکل پسند نہیں آیا۔ اسے جنت کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ محبت تو ایک دوسرے پر بھروسے اور یقین کا دوسرا نام ہے۔ اس کے علاوہ تیسرا مکمل ناول نہیں پڑھا۔ کیونکہ وہ اسٹارٹ میں ہی بور کرنے لگا تھا۔

"تمہارے میرے نام" میں سب کے خطوط اچھے لگے۔ مجھے ان بہنوں پر حیرت ہوتی ہے جو میرڈ لائف ہوتے کے باوجود بھی ان رسالوں کے لیے وقت نکال لیتی ہیں اور اس کے علاوہ اتنے بھرپور اور تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر بھی ہوتی ہیں۔ آپ لوگ اتنا ٹائم کیسے نکالتی ہیں؟ کیونکہ مجھے لگتا ہے میرڈ لائف بہت ٹف ہوتی ہے۔ میں آپ سب کو داد دیتی ہوں۔ بس اتنا کافی ہے اس بار میرا خط کچھ زیادہ لمبا ہوگیا ورنہ میری بس یہی کوشش ہوتی ہے کہ میرا خط کہیں زیادہ طویل نہ ہوجائے۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ حاضر خدمت ہوں گی۔ تب تک کے لیے اللہ حافظ۔ آپ سب جہاں رہیں خوش رہیں۔ (آمین)

عائشہ خان۔۔۔ ٹنڈو محمد خان

تمام پڑھنے والوں کو پیار بھرا اسلام۔۔۔ سردی کے آتے ہی بیماریوں نے حملہ کردیا طبیعت ناساز ہے۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صحت عطا فرمائے۔ (آمین) ٹائٹل دیکھا بہت پیارا لگا۔ ہونٹ اور ناک کی بالی اچھی لگی۔ سب سے پہلے مقابل ہے آئینہ پڑھا۔ اقراء مظفر' آپ اتنی اداس کیوں رہتی ہیں؟ زندگی سے شاکی' چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہوا کریں' بڑی خوشی ملے گی۔ اریج فاطمہ تو مجھے ویسے ہی اچھی لگتی ہے' اچھا لگا پڑھ کر۔۔۔ ردا اصفہانی کی باتیں بھی اچھی لگیں۔ مگر ان کے والدین کون ہیں؟ میں نہیں جانتی کہ وہ کون سے ڈرامے میں آئے؟ "در دل" پڑھا۔ کیا زبردست قسط تھی۔ دل آور بے بس ہے۔ علیزے کو دل آور کی ضرورت ہے۔ دل آور اور نبیل کی دوستی پر تو رشک آگیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے لیے اپنی محبت قربان کردی۔ مگر زری۔۔۔ کوئی زری سے بھی تو پوچھے کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ کیا اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں۔ مرد جو چاہے گا وہی ہوگا۔ بہرحال بڑا جذباتی منظر تھا۔ جب نبیل اپنی بیوی مومنہ سے ملوانے لے کر آتا ہے اور علیزے بتاتی ہے بلکہ انکشاف کرتی ہے کہ زری اس کی کزن ہے۔ عدیل اور مدیحہ کے سین بھی پسند آئے۔ (ہاہاہا) عدیل کا نبیل کو یقین دلانا اچھا لگا۔ علیزے کو گولی لگ گئی اب دیکھتے ہیں آگے کیا ہوگا۔

افسانوں میں "ایک قصہ" ہی پڑھا ہے بہت پسند آیا نفیسہ ویلڈن۔ حسن و صحت میں چاکلیٹ کا استعمال پڑھا۔ میں ویسے بھی چاکلیٹ بہت کھاتی ہوں۔ چاکلیٹ کے بغیر میرا گزارا نہیں' بلکہ میں بچوں کی چیزیں سب ہی شوق سے کھاتی ہوں۔ میرے شوہر جب بچوں کو دلوا کے لاتے ہیں تو میرا چیزوں کا لفافہ الگ سے آتا ہے۔ "دست کوزہ گر" دوبارہ سے زوبیہ لاپتا ہے کچھ خبر نہیں۔ بے چارے ماں' باپ کا کیا حال ہوگا۔ اب ایسا لگ رہا ہے کہ مستقبل میں زوبیہ اور الیان کی جوڑی بنے گی۔ نانی اور شگفتہ کا رومیلہ کے گھر جانا اور رومیلہ کا خود پر سارا الزام لینا اس کی قدر بڑھا گیا۔ اچھی بات ہے کہ ریاض اور شگفتہ اپنی بچھڑی بہن عائشہ سے تعلق استوار کرلیں۔

مستقل سلسلوں میں "مسکراتی کرنیں" میں ڈراپ سین' نورہ فراز الٰہیہ' شمسہ کھوکھر' وہم' لبنیٰ سومرو' "اف یہ بے چارگی" صدف مختار پسند آئیں۔ "یادوں کے دریچے"

سے کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ صرف آمنہ کنول' ناہید کی ڈائری کچھ پسند آئی۔ شعروں میں اقراء صائمہ ـــــ نسرین' کراچی' حافظ سمیرہ این بی' صبا' ثمینہ' ڈوگر' مریم ملک گوجرانوالہ کے شعر پسند آئے۔ "تمہارے میرے نام" میں خود کو شامل دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ شاہ شہزاد سے کہنا ہے کہ آمین تم آمین اور شمع مسکان' معذرت چاہتی ہوں۔ سوچا تو تھا کہ شمع کہاں ہے۔ مگر ذکر نہیں کیا۔ آئندہ جلدی جلدی انٹری دینا اور شکریہ تبصرہ پسند کرنے کے لیے۔ باقی تمام بہنوں کے تبصرے بھی پسند آئے۔

ایک پیغام دینا چاہتی ہوں تمام بہنوں کو' اگر ہم معاشرے کے بگاڑ کو ٹھیک کرنا چاہتے ہیں تو کم از کم وہ فارورڈ میسج یا ایسے لطیفے جو اخلاق سے گرے ہوئے ہوں انہیں ڈیلیٹ کردیں۔ کم از کم ہم ایسا کرکے اس معاشرے کے لیے کچھ تو کرسکتے ہیں۔ ہے نا؟ اوکے اب اجازت چاہتی ہوں آئندہ ماہ کوشش کروں گی کہ جامع تبصرہ کے ساتھ حاضر ہوں۔ اللہ آپ سب کو خوش رکھے۔ (آمین)

ممتاز انیس۔۔۔ کراچی

میں کرن کی گزشتہ تیس سال سے قاری ہوں ایک دفعہ میرا خط 2004ء میں شائع ہوا تھا۔ پھر اس کے بعد میں نے لکھا ہی نہیں' آج بہت سالوں بعد ایک سروے کے جوابات لکھے ہیں۔ پلیز شائع کیجیے گا۔ کیونکہ اس سال میری شادی کی پچیسویں سالگرہ ہے اور میں کرن کے ساتھ اپنی سلور جوبلی منانا چاہتی ہوں کرن اور شعاع سے ہی میں نے زندگی گزارنے کا فن سیکھا بہت سے نشیب و فراز زندگی میں آئے۔ مگر اللہ کا کرم اور ان ڈائجسٹوں کی مہربانی سے اچھے گزر گئے۔

اب تو ماشاء اللہ میری دو بیٹیوں کی شادی ہوچکی ہے ایک نواسا اور دو نواسیاں ہیں بیٹا الحمدللہ یونیورسٹی کے پہلے سال میں پڑھ رہا ہے۔ جو کچھ سیکھا وہ انہیں ڈائجسٹوں سے سیکھا۔ چونکہ شادی جلدی ہوگئی تو زندگی گزارنے کا سلیقہ بھی انہیں سے سیکھا اپنی شادی کی سالگرہ پر میں خصوصی طور پر کرن کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ اللہ اس کے لکھنے والوں اور اسے ہم تک پہنچانے میں جتنے لوگوں کی محنت شامل ہے ان سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

صدیقہ مقبول۔۔۔ شکارپور

ہمارا تعلق کرن سے سالوں پرانا ہے۔ ہماری پوری فیملی کرن ڈائجسٹ پڑھتی ہے۔ پھر بھی کسی نے خط لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن آج میں نے خط لکھنے کی ہمت کی ہے۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھا۔ اس کے بعد میری موسٹ فیورٹ رائٹر کا ناول "در دل" پڑھا۔ "در دل" بہت اچھا جارہا ہے۔ علیزہ کو دلاور سے جدا مت کیجیے گا اور پلیز علیزہ کو کچھ مت ہونے دیجیے گا اور زری کا کیا ہوگا؟ نبیل نے ٹھیک نہیں کیا۔ "دست کوزہ گر" میں رومیلہ کا پڑھ کر دکھ ہوا اور زوبیہ کہاں چلی گئی ہے۔ تین قسطوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ ابھی صرف یہ دونوں ناول پڑھے ہیں۔ باقی ان شاء اللہ تسلسل سے تبصرہ کریں گے اور اس خط کو ضرور شائع کیجیے گا۔

رابیلہ حیدر۔ نامعلوم

ویسے ہمارا تعلق کرن سے سالوں پرانا ہے اور یہ تعلق ہماری نانی نے بنایا۔ اب میں اور میری ساری بہنیں پڑھتی ہیں۔ میں فرسٹ ایئر میں پڑھتی ہوں۔ لیکن میں اس محفل میں پہلی بار شرکت کررہی ہوں۔ پلیز شائع ضرور کیجیے گا اور اب آتے ہیں تبصرہ پر۔ نبیلہ جی پتا نہیں لفظوں کا ہنر کہاں سے سیکھا ہے آپ نے۔ نومبر کی قسط میں نبیل نے زری سے جو باتیں کیں اور دلاور نے علیزہ سے جو گفتگو کی خدا کی قسم اتنی خوشی ہورہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے دلاور سامنے کھڑا ہو۔ سچ میں نبیلہ جی کمال کا لکھتی ہیں اور نبیل نے اچھا نہیں کیا۔ مومنہ سے نکاح کرکے بیلن کیا کریں اور پلیز علیزہ کو کچھ مت ہونے دیجیے گا۔ خط لکھنے کی جلدی جلدی میں بس قسط پر گزارہ کیا ہے۔ دعاؤں میں یاد کیجیے گا۔

ثمینہ کوثر عطاری۔۔۔ ڈوگہ گجرات

بزم کرن میں شامل تمام لوگوں کو میرا اسلام۔ ماہ دسمبر کا کرن ہاتھوں میں آیا تو احساس ہوا کہ یہ سال تو اپنی تمام تر خوبیوں' خامیوں سمیت وقت کے کیلنڈر سے نکل گیا۔ کسی کو خوشیاں ملیں' کسی کو غم' کسی کو مال نصیب ہوا اور کسی کا یہ سال بھی فقط انتظار بن کے رہ گیا۔ کوئی اس سال کے آنے پہ خوش تھا تو کوئی جاتے پہ ملال میں مبتلا ہے کہ کیا کیا

چھین کے لے گیا۔ جیسے میری پیاری دوست عطیہ سے یہ سال اس کے جواں سال بھائی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھین کے لے گیا نہ کسی کو دعا کا وقت ملا نہ امین کے الفاظ زیر لب آئے۔ اللہ ان سب کو صبر جمیل نصیب فرمائے۔ (آمین)

وقت کا کام ہے گزرنا اور یہ گزر گیا۔ میری طرف سے تمام بہنوں کو نیا سال مبارک ہو اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ آپ سب کو نیا سال راس آئے خوشیاں آپ سب کی منتظر ہوں آمین۔ اب آجاتے ہیں تبصرے کی طرف تو سب سے پہلے "یادوں کے دریچے سے" سب کا انتخاب مجھے بہت پسند آیا۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" میں تو کمال کی شاعری تھی سب نے بہت خوب صورت اشعار بھیجے۔ اس ماہ کی مسکراہٹیں بس سو سو ہی تھیں۔ سلسلہ وار اقساط بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ بس نبیلہ صاحبہ سے سوال یہ ہے کہ آپ کے ہر ناول میں سیکنڈ ہیرو کی بہن سے محبت کیوں ہوتی ہے ہیرو کو؟ افسانے بھی اچھے تھے۔ ناولٹ پڑھے، نہیں تو تبصرہ ادھار ہے۔ باقی شرط زندگی پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ خوش رہیں، آباد رہیں۔

پلوشہ گل۔۔۔ کوٹ ادو

سب سے پہلے تمام کرن ریڈرز رائٹرز اور کرن ٹیم کو محبتوں بھرا اسلام امید ہے۔ سب خیریت سے ہوں گے۔ میں کرن میں پہلی بار شرکت کررہی ہوں۔ امید کرتی ہوں۔ میری حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ میں کرن کو چھ سال سے پڑھتی آرہی ہوں۔ کرن کے ذریعے ہمیں بہت رہنمائی ملتی ہے۔ ویسے تو کرن اٹھارہ، انیس تاریخ کو ملتا ہے۔ لیکن خلاف توقع اس بار کرن 14 کو ہی مل گیا۔ فاخرہ گل کا مکمل ناول "میرے ہمنوا کو خبر کرو" مجھے بے حد پسند ہے اور ہر ماہ شدت سے انتظار رہتا ہے۔ غزالہ جلیل راؤ کا ناولٹ "دیا اور جگنو" بہت اچھا لگا۔

ڈائری سے عفت جبیں کا انتخاب اچھا لگا۔ "مسکراتی کرنوں" نے واقعی کرنیں بکھیر دیں "کرن کرن خوشبو" سے بشریٰ چوہدری کے اقوال زریں نے ڈائریکٹ دل کو چھو لیا۔ سب کے لیے ڈھیروں دعائیں "اپنا خیال رکھیے گا اور مجھے بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا اجازت دیجیے۔

شکیلہ شہزادی۔۔۔ ملک وال

میری طرف سے کرن ڈائجسٹ کے تمام اسٹاف کو اتنا سارا پیار اور ہیپی نیو ایئر امید کرتی ہوں سب خیریت سے ہوں گے۔ 7 جنوری کو میری سالگرہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ میری تمام سسٹرز مجھے وش کریں۔ اس بار کرن 15 کو ملا۔ سرورق پر براجمان ماڈل بہت جاذب نظر لگ رہی تھی۔ اس کے بعد نبیلہ آپی کے "دردِل" کی طرف بڑھے۔ اس بار کی قسط نے کافی انکشاف کیے پلیز علیزے کو کچھ مت کہیے گا ویلڈن نبیلہ آپی فاخرہ گل پلیز "میرے ہمنوا کو خبر کر" میں تیزی لائیں مہربانی کریں اور ندی کو شاہ زین سے جلدی ملوائیں۔ فرحین اظفر نے بہت فنٹاسٹک لکھا۔ زریاب کا کردار بہت پسند آیا۔ "وہ ایک پری ہے" میں شکریہ ریحانہ جی کہ آپ نے ماہم اور اذان کی شادی کرنے کا سوچا اور جلد ہی ماہم کی غلط فہمی دور کردی۔ باقی تمام رائٹرز نے خوب خوب لکھا۔

اس بار کا شمارہ ہر بار کی طرح بہترین رہا۔ باقی تمام سلسلے بے حد شاندار تھے۔ نامے میرے نام میں اپنا خط نہ پاکر افسوس ہوا۔ مگر تمام بہنوں نے خوب تبصرہ کیا۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" میں ارم ملک، مسز نجیب، سعدیہ مریم، حافظہ سمیرا، صدف عمران، ندا، فضا کا انتخاب پسند آیا۔ "مسکراتی کرنیں" میں صدف مختار سعدیہ اکرام اور سائرہ سہیل کا انتخاب اچھا تھا۔ "یادوں کے دریچے سے" ہما خان اور ارم شمس کی ڈائری پسند آئی۔ "کرن کرن خوشبو" میں فوزیہ ثمر، بشریٰ چوہدری اور ندا علوی کے انتخاب پسند آئے۔ "مقابل ہے آئینہ" میں اقرا مظفر کا انٹرویو پڑھ کر اچھا لگا۔ اپنی باری کا شدت سے انتظار ہے۔ پلیز مجھے برتھ ڈے وش کرنا نہ بھولیے گا۔ یہ میری زندگی کی سب سے یادگار سالگرہ ہوگی اگر آپ سب نے وش کیا تو۔ خدا کرن کو بے شمار کامیابیاں عطا کرے۔ اس امید کے ساتھ خط لکھا ہے کہ ضرور شائع کریں گی اور مایوس نہیں لوٹائیں گی۔

ج: شکیلہ پیاری ادارہ کرن کی جانب سے آپ کو سالگرہ کی بے حد مبارک باد اللہ تعالیٰ آپ کو ڈھیروں خوشیاں نصیب کرے۔ آمین

سائرہ پروا علی۔۔۔ کوٹ چھٹہ

اپنا آپ مٹا ڈالا اس بے کار کی خواہش میں
میرا ذکر کتابوں میں ہو، میرا نام رسالوں میں

سب سے پہلے میں کرن اسٹاف اور قارئین کو نئے سال کی مبارک باد دینا چاہوں گی۔ ایک عرصے کے بعد کرن کی اس محفل میں جلوہ گر ہوئی ہوں۔ وجہ شادی کے بعد گھریلو مصروفیات اور اپنی پریوں (صالحہ اور سنیعہ) کے کاموں میں ایسی الجھی کہ دن آتا ہے اور آکر گزر جاتا ہے، پتا ہی نہیں چلتا۔ اس بار "دردِل" نے قلم اٹھانے پر مجبور کر ہی دیا۔ اس ماہ کی قسط نے تو بے انتہا رلایا۔ سمجھ نہیں آرہا کہ نبیل کے غم پر روئیں یا دل آور شاہ کے۔۔۔ یا زری کی ناکام محبت پر آنسو بہائیں۔ آپی، آپ نے نبیل کا نکاح مومنہ سے کرکے اچھا نہیں کیا۔ دل آور شاہ نے علیزے سے نکاح کیا تو ہم نے صبر کرلیا تھا۔ چلو نبیل تو بے چارہ ہے جو زری کو سہارا دے گا۔ مگر۔ نبیل اور دل آور شاہ جیسی سچی محبت زری سے اور کوئی نہیں کرسکتا۔ یہ کہانی پڑھ کر کچھ اور پڑھنے کا دل ہی نہ چاہا۔ مگر فاخرہ گل کا "میرے ہمنوا کو خبر کرو" اپنی طرف بلا رہا تھا تو ہم اس کی طرف چل پڑے۔ پلیز فاخرہ آپی اب تو شاہ زین اور ندرت کا ٹکراؤ کروادیں اور کتنا ان کی محبت کا امتحان لیں گی آپ۔

"حریم دل کے مکین" اس ماہ کا بیسٹ ناول تھا۔ تینوں مکمل ناولز ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ "دست کوزہ گر" وہی ازلی سستی کا شکار۔ فوزیہ آپی ابھی آپ خرم اور نحل کی منگنی توڑ دیتی ہیں تو کبھی الیان اور رومیلہ کا نکاح۔۔۔ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ ان دونوں کپل میں اب محبت ہوچکی ہے تو اب کیا ہوگا؟ کون اپنائے گا رومیلہ کو؟

مجھے "مقابل ہے آئینہ" یہ سلسلہ بے حد پسند ہے۔ اس میں انیقہ انا اور فوزیہ ثمرین کے جوابات مجھے بہت پسند آئے تھے۔ فوزیہ ثمرین اور شمع مسکان مجھے آپ دونوں بے حد پسند ہیں۔ آپ بے حد اچھا تبصرہ کرتی ہیں۔ مجھے آپ دونوں سے فرینڈ شپ کرنی ہے۔ مگر کیسے؟ ردا اصفہانی کا انٹرویو پڑھ کر یہ کہہ سکتی ہوں کہ ہم دونوں کے خیالات بے حد ملتے ہیں۔

فوزیہ ثمرین۔۔۔ گجرات

سولہ دسمبر کو کرن ملا۔ سرورق اچھا تھا۔ خصوصاً ماڈل کی لوئنگ زبردست لگ رہی تھی۔ حسب عادت اداریہ پڑھا، اچھا لگا، بہت عہد تو ہم نے بھی بہت کیے ہیں مگر آنے والے ہر نئے سال کو ہمارے عہد نامے بھول جاتے ہیں۔ حمد و نعت سے فیضیاب ہونے کے بعد انٹرویوز کو دیکھا۔ کوئی بھی انٹرویو متاثر نہ کرسکا۔ میری بھی صنیبہ ردا اصفہانی کو اسی کی بات ماننی چاہیے۔ لڑکیوں کو ایوں اتنے لاڈ نخرے نہیں کرنے چاہئیں۔ زندگی ہمیشہ گلزار نہیں رہتی۔ "مقابل ہے آئینہ" اقرا مظفر کے تمام جواب تسلی بخش تھے۔ حسن بہت متاثر کرتا ہے۔ اس کا جواب مجھے بھی اچھا لگا۔ "میرے ہمنوا کو خبر کرو" قسط کے آخری میں یہ انکشاف میران شاہ زین کے مالک کا بیٹا ہے اور کیا مہرالنو کے لیے شاہ سائیں شاہ زین کا سوچ رہے ہیں۔ جو بھی ہے کہانی کو اب تک کسی موڑ پہ آنا چاہیے۔

مکمل ناول چار تھے، سب سے پہلے "آنچل" پڑھا۔ اف توبہ کتنی صفائی دکھائی ہے رائٹر نے۔ عورت ہی عورت کی دشمن، نوما بے چاری کو ایک جھوٹ کی اتنی عبرتناک سزا؟ مسز رباب جیسی عورتوں کا انجام ایسی حرام موت ہی ہوتا ہے جنہیں دوسروں کی زندگیاں برباد کرتے ہوئے عذاب الٰہی بھول جاتا ہے۔ رشنا اور زریاب کا ملاپ تحریر کا نچوڑ ہے کہ دنیا ابھی اچھے انسانوں سے بھری پڑی ہے۔ مکمل ناول "آدم کی جنت" حیا بخاری نے ہیروئن ہیرو کے نام تو بہت چن کے رکھے۔ آدم جنت کی چاہ تو بہت رکھتا ہے مگر اپنے اعمال نامے کو نہیں دیکھتا۔ جنت بے چاری خاندانی سیاست کی بھینٹ چڑھ گئی۔ "حریم دل کے مکین" فرح بخاری کی تحریر بھی خاندانی جھگڑوں کی تحریر جائیداد کے لیے کیسے خونی رشتے بدل جاتے ہیں۔ عریبہ کی سمجھ داری اور محتاط رویہ بہت اچھا لگا۔ "دیا اور جگنو" واہ کیا شاندار

محبت ہے۔ دونوں ثابت قدم رہے اور اپنی محبت کو پالیا۔ دیا اور جگنو کا ملاپ نصیب میں تھا۔ تحریر نئی نہیں تھی پھر بھی پڑھ کر اچھی لگی۔ افسانوں کے موضوع پرانے تھے پھر بھی اچھے لگے۔ "اک قصہ" سبق آموز تھا۔ بیٹیوں کو ہمیشہ ماں باپ کی عزت کا خیال رکھنا چاہیے۔ اب اک محبت پانے کے لیے باقی کے رشتوں کو رسوا کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ ایسی تحریریں مشعل راہ ہیں۔ "لیگ پیس" کتنے حساس موضوع کو بیان کیا ہے۔ کبھی کبھی ایسی ہی چھوٹی باتیں دلوں میں زہر بھر دیتی ہیں۔ ارم بے چاری کی لیگ پیس کھانے کی خواہش اتنی بے دردی سے پوری ہوئی۔

مستقل سلسلے اس بار کچھ پھیکے پھیکے لگے وجہ یہ کہ ہم جو کہیں بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ کرن کرن خوشبو میں نادیہ نواز کا علاج اور مسکراتی کرنیں "نویرہ فراز کا ڈراپ سین مسکرانے پہ مجبور کر گیا۔ ورنہ تو تمام لطیفے پڑھ کر ایسا فیل ہو رہا تھا کہ میں دو کا پہاڑہ پڑھ رہی ہوں۔ شاعری میں رانی کا شعر اچھا لگا۔ نامے میرے نام میں شمع مسکان، ثناء شہزاد، عائشہ خان، سماریہ چوہدری کا تبصرہ شاندار تھا۔ سماریہ چوہدری دوستی کی کیا بات ہے یہ لو میں ہاتھ بڑھاتی ہوں تھام لو۔ لو جی ہو گئی نا پکی دوستی۔ والسلام دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

امبر گل...... جھڈو سندھ

یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنی گھریلو مصروفیات کے سبب میں کچھ عرصے سے کرن کے لیے کچھ بھی نہیں لکھ سکی تھی اور جب جب دوستیں مجھے یاد کرتی تھیں تو بہت دل چاہتا تھا مگر میں اب سب سے پہلے ان دوستوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جو کہ وقتاً "فوقتاً" مجھے یاد کرتی رہی ہیں۔ تو سب سے پہلے پیارے کرن آپ کا بہت بہت شکریہ۔ فوزیہ ثمر بٹ، عائشہ، نذر محمد خان، انیقہ انا، نواب زادی سونگی، شمع مسکان اور وہ تمام بہنیں سب کا بہت بہت شکریہ اور سب کو نئے سال کی بھی مبارک باد۔

چلیں جی اب کچھ تبصرہ 2013ء کے آخری کرن پر۔ حیرت انگیز طور پر کرن اس بار 13 تاریخ کو ہی ل گیا، ٹائٹل اچھا لگا۔ پھر انٹرویوز میں جھانکی ماری کہ شاید کسی پسندیدہ بندے یا بندی کا انٹرویو ہو پر نہ جی شاہین جی آج کل کچھ ڈھیلی ڈھیلی یا پھر سست ہو گئی ہیں انٹرویوز کرکے تو کوئی نئے بندے نہیں مل پا رہے ہیں انہیں۔ "مقابل ہے آئینہ" میں اقرا مظفر کے جوابات اچھے لگے۔ اب باری آتی ہے مکمل ناولز کی تو جناب نبیلہ جی بے حد معذرت کے ساتھ پلیز اب اس کا اینڈ کر دیں کہ بے جا طوالت کی وجہ سے اس ناول کا اسٹارٹ میں جو چارم تھا وہ اب ختم ہو چکا ہے۔ تین سال تو ہو چکے ہیں اور یہی بات میں فوزیہ صاحبہ سے بھی کہنا چاہوں گی کہ آج کل جس اسٹائل کی ہم لوگ زندگی گزار رہے ہیں اس کے حساب سے اب ہر چیز کو فاسٹ ہو جانا چاہیے اور مدیرہ جی آپ سے بھی یہی گزارش اور مودبانہ درخواست ہے کہ پلیز اب جو بھی ناول شروع کیجیے گا وہ کم از کم دو سال میں ختم ہو جائے تو اچھا لگے گا میں تو کئی بار یہی بھول جاتی ہوں کہ کہانی کے اسٹارٹ میں کیا کیا سین ہوئے تھے۔

مکمل ناولز میں سے سب سے پہلے "حریم دل کے مکین" کو پڑھا۔ واقعی بہت سوفٹ اور اچھا پیارا سا ناول لگا مجھے تو۔ فرح بخاری مبارک باد کی مستحق ہیں۔ حیا بخاری کا "آدم کی جنت" بس سو سو لگا۔ البتہ "آئینے" کو پڑھ کر میرے حساس دل سے تو درد کی لہریں نکلنے لگیں اور کچھ دیر تک تو دل و دماغ کو ایسے جکڑے رکھا کہ آخر ہو کیا رہا ہے ہماری اس دنیا میں۔ فرحین صاحبہ سے بس یہی کہنا ہے مجھے کہ بس تھوڑا سا ہتھ ہولا ہی رکھیں۔ ہم سے برداشت نہیں ہوتیں اس طرح کی تحریریں ــــــ "دیا اور جگنو" تو ابھی تک پڑھنے کا ٹائم ہی نہیں ملا۔ افسانوں میں صرف "انمول محبت" اچھا لگا۔ "لیگ پیس" ٹائپ افسانہ شاید پہلے بھی پڑھ چکے ہیں ہم لوگ۔ "کرن کرن خوشبو" میں رفعت جاوید، فوزیہ ثمر، عائشہ، سلمیٰ ندا اور عنبرین مفتی کی تحریریں اچھی لگیں۔ "یادوں کے دریچے سے" رانی، فرزانہ اور آنسہ ناہید کا انتخاب پسند آیا۔ اشعار تو سبھی اچھے تھے۔ مسکراتی کرنیں، صائمہ، خدیجہ، رشیدہ، ندا، میمونہ، صدف کی منتخب کردہ تحریروں نے مسکراہٹ بکھیر دی تھی ہمارے لبوں پر۔ "حسن و صحت" میں کام کی باتیں اچھی تھیں۔

"نامے میرے نام" میں عائشہ، فوزیہ کو بوندی کی تفصیلات بتاتی نظر آئیں اور فوزیہ جی آپ نے یہ کیوں لکھا ہے کہ خوشی مجھے راس نہیں آتی یار یہ ایسی ناامیدی کی باتیں نہیں کرتے کیونکہ مایوس ہونا تو گناہ ہے۔ آپ سے پہلے بھی کہا ہے اور اب بھی کہتی ہوں کہ مجھ سے دوستی کر لیں۔ آپ کے سارے دکھ، درد اور غم دور ہو جائیں گے اور ڈیئر عائشہ اور شمع مسکان یار آپ دونوں بھی بہت اچھی ہو اور جب جب مجھے یاد کرتی ہو تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

☼ ☼